أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ

یہ ہیں وہ لوگ جنکو اللہ نے ہدایت دی آپ انکی سیرت اختیار کیجئے

تذکرہ صوفیائے میوات

۱۹۷۹ء

اسلامی ہند کی تاریخ کا بھولا ہوا ایک اہم باب

تالیف

محمد حبیب الرحمٰن خاں میواتی

میوات اکیڈمی

متصل جامع مسجد گھاسیڑہ ضلع گوڑگاؤں میوات

حرفے چند

میو قوم اور علاقۂ میوات کی تاریخ وتہذیب، شخصیات

وتحریکات، زبان ولسانیات اور شعر وادب کے بارے میں اہم،

نادر ونایاب اور اہم کتابوں، کتابچوں، پمفلٹوں، رسائل وجرائد

کے شماروں اور مضامین کو *پی ڈی ایف* کے ذریعہ سے محفوظ

اور عام کرنے کے لیے میو قوم کا

تحقیقی و تصنیفی ادارہ، *تاریخِ میوات*

کی سرپرستی اور نگرانی میں جہد ومساعی کر رہے ہیں، دوستوں

سے گزارش ہے کہ دل چسپی لیں اور تعاون فرمائیں، ان

کے پاس یا ان کے علم میں کسی بھی نوع کی کتابوں حتیٰ کہ کوئی

خبر، اشتہار، دعوت نامہ، خط، تصویر یا کوئی دستاویز، مطبوعہ

یا غیر مطبوعہ، جو کچھ بھی ہو، ازراہِ کرم ہمیں فراہم کریں

تاکہ اسے محفوظ کر کے دست بردِ زمانہ سے بچایا جاسکے اور اہلِ علم و تحقیق کی اس موادولوازمہ تک رسائی بالکل آسان ہوسکے۔ہم آپ کے تعاون کے دل سے شکر گزار ہوں گے. واضح ہو کہ اس سلسلہ کی کاوشیں:

(1)ڈاکٹر مفتی محمد مشتاق تجاروی کے مقالہ:

"بابائے اردو مولوی عبدالحق اور میوات"

(2)منشی محمد مخدوم تھانوی کی نادرونایاب کتاب:

"مُرقعِ اَلْور"

(3)ڈاکٹر مفتی محمد مشتاق تجاروی کے مقالہ:

"مورخ ملت مولانا سید محمد میاں اور میوات"

4)ڈاکٹر محمد ایوب قادری کے مقالہ:

"میوات میں تبلیغ اسلام کا ابتدائی دور"

5) چودھری کریم خان میو کی کتاب:

تاریخِ میو اور داستانِ میوات

کو پی ڈی ایف کی صورت میں عام کردیا گیا ہے

6) مولانا محمد حبیب الرحمٰن خاں میواتی ندوی کی ضخیم کتاب:

"تذکرہ صوفیائے میوات"

کی پی ڈی ایف کاپی آپ کے زیرِ نظر ہے،

آپ ہمارے لیے دعا فرمائیں کہ اللّٰہ تعالیٰ ہمیں مزید توفیقات سے نوازے، آمین.

(توصیف الحسن میواتی الھندی)

واٹس ایپ نمبر/9813267552

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ

—— یہ ہیں وہ لوگ جنکو اللہ نے ہدایت دی آپ انکی سیرت اختیار کیجیے

تذکرۂ صوفیائے میوات

۱۹۷۹ء

اسلامی ہند کی تاریخ کا بھولا ہوا ایک اہم باب

تالیف

محمد حبیب الرحمٰن خاں میواتی

میوات اکیڈمی

متصل جامع مسجد گھاسیڑہ ضلع گوڑگاؤں میوات

مطبوعہ:- ردولی پرنٹنگ پریس دہلی قیمت ۱۵/۰۰ ۱۹۸۵ء

انتساب

اپنے محسن و مربّی حضرت والد ماجد میاں جی رحمٰن بخش اور والدہ صاحبہؒ کے نام جنہوں نے مجھے پالا پوسا اور پڑھنے لکھنے کے قابل بنایا جنکی توجہ، نگرانی اور دعاؤں کے طفیل مجھے احساس نوشت و خواند ہوا۔

اپنے شفیق و محترم استاد مولوی عبدالمنان دھلویؒ کے نام جنہیں اپنے میو ہونے پر فخر تھا اور میرے قلم کی آڑی ترچھی لکیروں پر ہمیشہ خوشی کا اظہار کیا۔ میری بہت آفرینی و حوصلہ افزائی کی اور اپنے قصائد کا منشی بنایا —— اور اپنے واجب الاکرام استاذ، مخلص دوست عارف باللہ مولانا سید فضل اللہ جیلانی مرحوم کے نام بحیثیت شفیق و کرمفرما جنکی بے پناہ شفقتیں، بیکراں عنایتیں اور مسلسل نوازشیں تا حیات راقم کے حال پر مبذول رہیں مجھے شعورِ حیات دیا، وقت کی قدر و قیمت اور اسکی نزاکتوں سے شناسا کیا، مالوف و غیر مالوف طرقِ حیات اور انکے نشیب و فراز سمجھائے اور مصلحت و رواداری کے رموز و اسرار و منفعت پر متنبّہ فرمایا، وہ ایک جیّد عالم دین، بلیغ انشار پرداز، بلند مرتبت مصنف، شفیق و نکتہ سنج معلم، متقی، پرہیزگار، صابر و شاکر، قناعت پیشہ اور وفا آموز و وفا شعار بزرگ تھے۔ وہ عرفان و تصوف کے بلند مرتبہ پر فائز مگر کبھی ظاہر نہ ہونے دیا، بہت رازدار، اخلاق و مروت کے کوکبۂ عالی کے مسند نشین مگر ذہنی و فکری انارکی کے سخت مخالف، مناظرہ کی باریکیوں سے آشنا مگر انتہائی انصاف پسند، عزم و ارادہ کی چٹان مگر وقتِ ضرورت روئی کی طرح نرم و ملائم۔

قرآن کریم سے عشق تھا۔ اکثر تجوید کے ساتھ اس کا ورد فرماتے، بلا مبالغہ ہزاروں شعر آپ کے ذہن میں عربی و فارسی و اردو کے محفوظ۔ بڑی من موہن تھی آپ کی شخصیت، اسلاف پیشینؒ کی یادگار۔ رحمہم اللہ

[illegible]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تقریب

خداوند کریم کا لاکھ لاکھ شکر و احسان ہے کہ محض اس کے لطفِ بے کران اور کرم بے پایاں سے یہ علمی و تحقیقی اور اصلاحی سفر کسی حد تک پورا ہوا جو جنوری ۱۹۷۸ء میں شروع کیا گیا تھا، تاریخ پڑھنے کا شوق بھی تھا اور لکھنے کی دھن بھی، مگر تکمیلی امور کے تکوینی مراحل صرف شوق و جذبہ سے طے نہیں ہو پاتے، جد و جہد، سعی و عمل اور مسلسل تگ و دو بھی ضروری، اس سے کچھ پہلے "میو قوم اور میوات" کے مصنف چودھری محمد اشرف خاں سے ملاقات ہوئی، کہنے لگے: صوفیۂ میوات پر اگر کچھ کام کرنا ہے تو کر ڈالیے، اس سلسلے میں جو تعاون وہ دے سکتے تھے اس سے دریغ نہ کیا، مگر ان کے ذہنی خاکے میں وسعت و پہنائی نہ تھی، بہت محدود تھا، میرا خیال تھا اور شدید احساس بھی کہ اگر محنت کرنی ہے تو ضابطہ اور ڈھنگ سے ہونی چاہیے۔

کام شروع کیا، گو قدم قدم پر مشکلات کا سامنا تھا، مگر عزم و ارادہ اور توفیق خداوندی سے مشکل حل ہوئی، اور ویران سی وادی میں قافلۂ جہد و محنت کے لیے راہیں کشادہ ہوتی گئیں اور قلم کا مسافر تھکے بغیر چلتا رہا۔ تنکے چن چن کر آشیانہ بنانے کا قصہ سن رکھا تھا لیکن عملی تجربہ کبھی نہیں ہوا، اس دوران اس کی حقیقت آشکار ہوئی، دو تین سال کی لگاتار محنت سے الحمد للہ اچھا خاصا ذخیرہ دستیاب ہو کر مرتب اور دو سو، سوا دو سو علماء و مشائخ میوات کا تذکرہ تیار ہو گیا۔

۱۹۵۴ء میں جب راقم دارالعلوم ندوۃ العلماء کا طالب علم تھا تو مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو یہ فرماتے سنا: میو قوم ایک ہزار سال سے زیادہ عرصہ سے مسلمان ہے، اور اس طویل ترین عرصے میں ان کے درمیان کسی ہادی و مصلح کی عدم موجودگی کے باوجود اس

قوم کا ایمان کے ساتھ وابستہ رہنا حیرت انگیز واقعہ ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے
میں نے عرض کیا: مولانا! ہمارے یہاں ہر گاؤں میں پختہ قبریں ہیں اور میو، قوم
اپنے لیے پختہ قبریں پسند نہیں کرتی، تو کیا یہ ممکن نہیں کہ ان پختہ قبور کے باشندے
اس قوم کے دینی مصلح، مذہبی رہنما اور شیوخِ طریقت ہوں۔ اس وقت اس
سلسلہ میں کوئی واضح خاکہ ذہن نشیں نہ تھا، ایک بات تھی جو آئی گئی ہو گئی۔
مصنف "میو قوم اور میوات" کا تصور صرف اس قدر تھا کہ دو چار ماضی
قریب کے مشہور صوفیاء کے حالات لکھ کر چھوٹی سی کتاب تیار ہو جائے۔ وجہ ظاہر ہے
کہ اگر کوئی زیادہ لکھنے کا ارادہ بھی کرے تو کس برتے پر۔۔۔ مگر کسی موضوع پر مرتب
شکل میں کسی تاریخی دستاویز کا موجود نہ ہونا اس کا ہرگز ثبوت نہیں کہ اصل واقعات
و مواد اور تاریخی شہادتیں بھی ناپید ہیں۔ یہ علمی و تحقیقی تاریخ کا ایک ایسا تجربہ
ہے جس سے تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں اور تاریخ پر کام کرنے والوں کو بار بار
سابقہ پڑا ہے۔(1)

"صوفیۂ میوات" کا موضوع بالکل نیا ہے، نادر اور نامانوس بھی۔ حد یہ ہے کہ
میو قوم کا پڑھا لکھا طبقہ بھی اس جہت سے اس مسئلہ پر غور کرنے کو تیار نہیں۔ میو
قوم کے متعلق کچھ سیاسی ڈپلومیسی، مذہبی طغیانی اور ذہنی و فکری اختناق کے باعث
ایسا بھیانک تصور قائم کیا گیا کہ "میوات" جرائم پیشہ افراد کا جزیرہ سا بن گیا۔
صوفیۂ و دانشوروں کا وہاں کیا کام؟؟ اور پھر اس تصور کو اس قدر دہرایا گیا کہ اس
پر تصدیق کی پرچھائیاں پڑنے لگیں" حالانکہ تاریخ کا دیانت دارانہ اور وسیع
مطالعہ جو عرفی و تقلیدی تاریخ کی کتابوں اور مشہور و متداول مطبوعات میں محدود نہ ہو
اس بات کی تردید کرتا ہے اور ثابت کرتا ہے کہ اصلاح و تجدید کی کوششیں، ملت
اور ظلمت کی کشمکش، باطل تحریکوں، وقت کے فتنوں، اسلام پر اندرونی و بیرونی
حملوں، دشمن اسلام طاقتوں کی سازشوں، اعتقادی و فکری ضلالتوں، علمی و

(1) عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح ص ۴۱

اخلاقی انحرافات و بے عنوانیوں سے نبرد آزمائی اور ان کے مقابلہ میں صف آرائی کا سلسلہ، جوہر اسلام اور روح اسلام کو مصفیٰ و منقح پیش کرنے کی کوشش غیر منقطع اور مسلسل طریقہ پر جاری رہی اس سلسلہ میں اسلام اور مسلمانوں کی اور عام تاریخ کا کوئی جفاکش اور بلند ہمت طالب علم، جس نے اس کو اپنا موضوع غور و فکر بنایا ہو، اگر پورے احساس ذمہ داری اور فرض شناسی کے ساتھ یہ دعوی کرے کہ اس طلائی زنجیر کی ہر کڑی پہلی کڑی سے پیوستہ ہے، اور درمیان میں کوئی کڑی گم نہیں تو اس کو محض خوش اعتقادی اور امت کو فریب دینے کا الزام ہرگز نہیں دیا جاسکتا ہے[1]

میوات کے اہل علم و فضل اور صاحب رشد و صلاح اگر کسی اہلِ قلم کی نظر میں نہ آسکے بالخصوص ظروف اور سوانح نے انھیں روشنی میں نہ آنے دیا، یا اس موضوع پر اختصاصی طریقہ پر مطالعہ کا موقع نہ ملا ہو تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ میوات مشائخ و دانشوروں سے خالی رہا ہے یہ سب حضرات خواہ کسی گروہ سے تعلق رکھتے ہوں، اور ان پر کوئی لقب غالب آگیا ہو، سب اسی راہ۔ اشاعت دین و مذہب کے مسافر تھے۔ جنھوں نے اپنے اپنے وقت اور حالات میں اقامتِ دین کا فرض انجام دیا۔ فرق صرف یہ ہے کہ بعض کے حالات تاریخ کی تیز روشنی میں ہیں اور بعض کے حالات، ان کے خیالات و عزائم اور ان کی مساعی تاریخ کی عربی کتابوں میں مدون نہیں ہیں، اس کے لیے ہمیں مکتوبات و ملفوظات اور غیر مطبوعہ کتابوں کی طرف رجوع کرنا پڑے گا[2] اور مقامی روایات کو بھی۔ دیگر ذرائع کی عدم موجودگی میں اہمیت دیئے بغیر چارہ کار نہیں۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد معلوم ہوگا کہ اس مقصد کے لیے ہر زمانہ میں اپنے موجود محدود وسائل کے ساتھ کوشش بھی کی گئی، اور ہر دور میں علماء حق نے اس سلسلے میں اپنا فرض ادا کیا اور خدا کو راضی اور ضمیر کو مطمئن کیا۔[3]

(۱) عصرِ حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح ص ۱۰۔
(۲، ۳) ص ۱۰۸، ۱۰۹۔

میوٗ قوم کی دینی و مذہبی نفسیات کے سلسلے میں مندرجہ ذیل واقعہ سے اچھی خاصی روشنی مل سکتی ہے : ایک دفعہ ایک میوٗ اور ایک میراثی کسی سفر میں تھے، راہ میں یا منزلِ مقصود پر کسی نے حسب دستور پوچھ لیا : آپ کس قوم اور کس برادری سے ہیں ؟ میراثی بولا : میں تو سید ہوں۔ میوٗ یہ سن کر پریشان ہوا۔ اس نے کافی غور و فکر کے بعد کہا : اگر یہ سیّد ہے تو بھائی۔ عیاذاً باللہ۔ مجھے خدا سمجھیے۔ یہ واقعہ ہمارے سماج میں ایک لطیفہ کی حیثیت سے مشہور ہے، مگر اس کی روح اس کے بعد شروع ہوتی ہے جہاں اسے ختم سمجھ لیا گیا، مسلمانوں کے عقیدہ کے مطابق رسول مقبول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم اشرف المخلوقات ہیں، سادات آپؐ کی آل ہیں اور مسلمانوں میں سب سے بلند مرتبہ سمجھے جاتے ہیں حضور اکرمؐ کی قرابت و خویشگی کے باعث۔ اب سنیے : میراثی جب سیّد بن گیا، جو میوٗ قوم کے خدام میں سے ایک ہے، اور سادات سے اونچی اور کوئی قوم نہیں، اس لیے اس میوٗ نے بظاہر یہ کلمہ کفر کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ ـــــــ

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

اس واقعہ کے پس منظر سے صاف ظاہر ہے کہ میوٗ قوم جہل و بے خبری کے عالم میں بھی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قدر آشنا تھی اور یہ قدر شناسی بغیر مذہبی ذہن و فکر کے ممکن نہیں۔ مذہبی رنگ ہلکا سہی مگر تھا ضرور۔

یہی نہیں کہ وقتی طور پر سیدوں کی پذیرائی ہوئی ہو۔ نہیں۔ بلکہ "سید زادوں کی۔ جو بعض ناگفتنی سوانح کے باعث فقیر کے لقب سے مشہور ہیں۔ عزت و احترام میں کبھی کوئی کمی نہیں آنے دی، اب سے کچھ عرصہ پہلے تک میوٗ فقیر کے برابر چارپائی پر بیٹھنا، یا اس کو اپنا جھوٹا کھانا کھلانا اور اس کے ہاتھ سے حقّہ پینا بری بات سمجھتے تھے[1] میوات میں سادات کے خاندان ۱۹۴۷ء تک آباد رہے اگرچہ اب بھی کہیں کہیں پائے جاتے ہیں مگر اکثریت نقل مکانی کر کے پاکستان ہجرت کر گئی۔

---

(۱) تاریخ میوٗ ص ۱۶۷۔

شمس الدین التمش کے دور میں سادات گردیز سے دو بھائی سید شہاب الدینؒ، سید شمس الدینؒ ہندوستان تشریف لائے۔ سید شہاب الدینؒ کڑا مانکپور چلے گئے اور سید شمس الدینؒ نے دہلی میں رختِ اقامت ڈالی۔ آپکی اولاد دہلی و میوات کے قصبہ جات میں آباد تھی۔ سید بہاء الدینؒ موضع سریٹہ میں سید معین الدینؒ اور سید عز الدینؒ الاصغر بھی اندور میں مدفون ہیں۔ سید ریاض الدینؒ اور دوسرے اینڈوری سادات کی اولاد بھیا پہاڑی میں آباد تھی جو پہلے بھرتپور کی عملداری میں تھا مگر اب ضلع گوڑگانوہ میں ہے۔ سید ریاض الدینؒ شہاب خاں شہیدؒ ۸۰۱ھ کے استاد تھے، جو قصبہ پہاڑی کے بھیا راجہ اور ایک طرح کے حاکم تھے [1]۔

قصبہ سلطانپور میں بھی سادات کی آبادی تھی جو نواح پلول میں ہے اور اسکے متعلق مشہور ہے کہ یہ محمد سلطان بن غیاث الدین بلبنؒ کی بسائی ہوئی نگری ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سید شمس الدینؒ ثانی عرف بھجو جگجوت، جو غیاث الدین بلبنؒ کے عہد کے ہیں، انکی قبر قصبہ پلول میں ہے۔ انکی اولاد بخاری سیدوں کیساتھ سلطان پور میں آباد تھی۔ سید عبدالوہابؒ بخاری کی بہن شرف خاتون سید احمد رسولدار کے عقد میں تھی جنکی اکثر اولاد فرید آباد میں بسی ہوئی ہے [2]۔ جو صرف تبلیغ دین و مذہب اور تعلیم و تربیت کے لیے یہاں مقیم تھی۔

میو قوم کی پوری تاریخ غلامی کے داغ دھبوں سے پاک و صاف ہے۔ اسے کبھی بھی کسی کی غلامی گوارا نہ ہوسکی، ذوالقرنین (سائرس) سکندرِ اعظم اور دارا جیسے عظیم شہنشاہوں کو خاطر میں نہ لانیوالی قوم کیلئے بلبن و تغلق جیسے حکمرانوں کی کیا حیثیت ہوسکتی ہے۔ آزادی کی تڑپ رکھنے والوں کو باقتدار گروہ ہمیشہ غدار و باغی کہتا رہا ہے۔ یہ کردار کشی کا عمل ماضی میں بے دھڑک ہوتا رہا اس پر کوئی قدغن نہیں لگائی گئی، حقیقت کو حقیقت کہنے سے باز رہنا، مکر نانہ پہلے اچھا تھا اور نہ اب۔ معلوم نہیں دانشوروں کی سمجھ میں اس حقیقت نے گھر کیوں نہ کیا۔ چنانچہ ذہن و فکر کی آزادی کو بغاوت کا نام دیکر اس قوم کو جی کھول کر بدنام کیا۔ جب انکی تاریخیں مرتب ہوئیں جنہیں شہنشاہی طمطراق اور

---

[1] تاریخ الائمۃ فی ذکر خلفاء الامۃ (مخطوطہ) ورق ۲۴۹ الف۔ [2] حوالہ بالا

بادشاہی طاقت وجبروت کی داستانیں ہیں اور انکے کارنامے اور انہیں کی سرپرستی میں وہ ترتیب دیگئیں، تو انہیں مفسد وظالم قرار دیا کیوں؟ صرف اس لئے کہ انہوں نے انکی غلامی قبول نہ کی۔ ڈاکو، لٹیرے، چور اور نہ جانے کیا کیا خطابات انہیں دیئے گئے، قابو پانے پر انہیں ذبح کیا گیا۔ اقبالؒ کے لفظوں میں گویا پوری قوم سے خطاب کیا گیا۔

صلہ تیرا، تری زنجیر یا شمشیر ہے میری — کہ تیری رہزنی سے تنگ ہے دریا کی پہنائی

ہم بھی مُنہ میں زبان رکھتے ہیں۔ کہہ سکتے ہیں۔

سکندر حیف تو اسکو جوانمردی سمجھتا ہے — گوارا اسطرح کرتے ہیں ہم چشموں کی رسوائی

ترا پیشہ ہے سفاکی، مرا پیشہ ہے سفاکی — کہ ہم قزاق ہیں دونوں تو میدانی میں صحرائی

میواتیوں کے ڈر سے سرِشام دہلی کے دروازے بند ہوجایا کرتے تھے، دہلی والوں پر خوف و ہراس طاری ہوجاتا تھا، تاریخی کتب کا یہ ایک عام جملہ ہے حیرت ہے کسی تاریخی اسکالر کو اسکی کُنہہ معلوم کرنے کی فکر نہیں ہوئی، ترتیب وتحقیق کے نام پر تاریخی واقعات کو چھلنی کر ڈالا، مگر یہ اہم جملہ جوں کا توں ہے۔ کیا میواتی قوم اسقدر بے لگام تھی یا دہلی میں ہیجڑے آباد تھے جو ایک لمبی مدت تک لٹتے رہے اور کوئی اسکا مداوا نہ کیا؟ واقعہ صرف یہ ہے کہ مطلق العنان شاہوں کو ذہن وفکر کی آزادی برداشت نہ تھی۔

اس قوم نے ہمیشہ اپنی انفرادیت کو قائم و برقرار رکھا، اور قومی "انا" کو مجروح ہونے سے بچایا چھتری ہونے کی وجہ سے انکے ناموں میں سنگھ اور مل تو آجاتا ہے۔ شمع سنگھ، جے سنگھ، چاند مل وغیرہ مگر رام، لال، کرشن، بھگوان، دت یا سہائے وغیرہ جیسے خاص ہندوانہ الفاظ انکے ہاں نہیں پائے جاتے، نیچرل تہواروں میں دلچسپی رکھتے ہیں مثلاً ہولی، جو نئی فصل کی کامیابی پر خوشی کا اظہار ہے۔ انکی بولی یعنی میواتی زبان بھی اس علاقہ کے ہندوؤں کی زبان سے مختلف ہے۔ "میواتی راجستھان کی شمالی مغربی بولی ہے جسکے ڈانڈے ایک طرف برج بھاشا اور دوسری طرف بانگرو سے جا ملتے ہیں۔ اسکا مرکز ضلع الور اور دہلی کے جنوب میں گوڑگانوہ۔"[1] اسلام لانے کے بعد میو قوم میں غیر اللہ کی پرستش کا نہ کبھی رجحان رہا اور نہ عادت۔ ؎

کبھی بھی سرنگوں یہ غیر کے آگے نہ ہو پائے — عبادت کا خیال آیا تو بس اللہ یاد آئے

---

[1] مقدمہ تاریخ زبان اردو ص ۲۷۲، ۲۷۸

مورتی پوجا اور ہندوؤں کے اصلی دیوی دیوتاؤں سے ان کا کوئی واسطہ نہیں تھا اور نہ اب ہے۔ جبھی تو میوؤ شاعر کہتا ہے:

سُن رِی دیُوِی باوَلِی تیمْنے بہاوَ بھنگرایُو
رِینگا چھُٹ گیو شاہ کو تو دُوڑھی ہَٹ جایُو

سادات بلگرام کے یہاں بچہ کی ولادت کے موقعہ پر جہاں بچہ کے والدین اس کا نام تجویز کرتے تھے وہیں پنڈت بھی لازمی طور پر نام رکھنے آتا تھا، وہ کلب علی کو دوست علی کہتا تھا[1] اس طرح میر فیض الحسن ساکن سونی پت کی اولاد کے نام دتی کے چھنا مل رکھتے تھے سراج الحسن اور شمس الحسن۔ موتی اور پنا ہو جاتا تھا، گویا ؎

سمتِ کعبہ سے چلا جانبِ کاشی بادل

مگر میوؤ قوم کے ہاں پنڈتوں کو کبھی ایسا موقعہ نہ دیا گیا کہ وہ پرسنل اور نجی معاملات میں دخیل ہوں۔

نکاحِ بیوگاں ہندوستان کی ہر قوم میں معیوب اور موجبِ ملامت سمجھا جاتا ہے وہ سادات ہوں کہ شیوخ کوئی مستثنیٰ نہیں نومسلم ہریجنوں سے شادی کا بھی تقریباً یہی معاملہ ہے، میوؤ قوم کے ہاں کسی دور میں بھی یہ سب کچھ نہ معیوب رہا اور نہ باعثِ ذلت ورسوائی، نکاحِ بیوگاں کا عمومی رواج ہے، اور کفش دوز وخاکروب جب کبھی دولتِ ایمان سے بہرہ ور ہوئے تو میوؤں نے ان کے ساتھ سماجی رشتے بلا جھجک استوار کیے، میوؤ قوم کے اس طرز سے متاثر ہو کر قطب عالم میاں راج شاہ م ۱۳۰۶ھ کے خلیفہ حضرت چھوٹے شاہ ولایتیؒ نے یوپی کے مغربی اضلاع بلند شہر وغیرہ کے پٹھانوں میں نکاحِ بیوگاں کی ترویج کے سلسلے میں پچیس سال صرف کیے اور ان کی مساعی الحمد للہ بار آور ہوئی[2]

---

(۱) تذکرۃ العابدین (۲) تاریخ بلگرام ص ۹۷

شرافت و نجابت کا سماجی حیثیت سے یہ عجیب و غریب نمونہ میوٗ قوم نے قائم کیا کہ کسی غیر قوم کو نہ ڈولا دیا اور نہ کسی دوسری قوم سے ڈولا لیا، ۱۹۴۷ء تک یہ روایت قائم رہی اس کے بعد قوم کی آبادی میں یکجہتی نہ رہی، بہت حصّہ پاکستان ہجرت کر گیا، گویا "تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے" کی عملی تشکیل کا مظاہرہ کیا، دو ہزار سال پیشتر سندھ سے یہ قوم وسطِ ہند میں پھیلی تھی۔

پیدائش و موت اور شادی بیاہ کی رسموں میں یہ قوم اس قدر کبھی نہیں پھنسی جتنے اور علاقوں میں مسلم عوام و خواص رسم و رواج کے پابند تھے، حکیم الامت تھانویؒ کی ایک کتاب کا نام ہے "اصلاح الرّسوم" اس میں مسلم قوم میں رائج مشرکانہ رسوم کا تذکرہ ہے، میوٗ قوم اس میں مندرج اکثر رسموں سے آشنا بھی نہیں۔ یہاں ساڑھے بتیس روپے مہر کا نام "شرعِ محمدی" ہے۔ چاندی کا بھاؤ سکّہ رائج الوقت کے حساب سے گھٹتا بڑھتا رہا ہے۔ چنانچہ عہدِ خلجی و تغلق سے عہدِ اکبری تک ایک تولہ چاندی آنوں کے حساب سے ملتی تھی۔ عہد بلبن میں جب کا کورانا نے میوٗ قوم کو گوت و پال کے سسٹم میں منظم کیا تھا اس وقت کا یہ قومی سطح کا فیصلہ معلوم ہوتا ہے۔ ممکن ہے بادھاراؤ کی پوتی ششن بدنی کا جب دریا خاں کے ساتھ عقد نکاح ہوا اس وقت یہ مقدار مہر مقرر کی گئی ہو، بہر حال غیر شرعی نہیں ہے۔

میوٗ قوم کے دینی تنزل کی روداد اس قسم کی نہیں کہ وہ اپنے تمام اجزا سمیت منفرد ہو بلکہ یہ چیز قدرِ مشترک کے طور پر ہر جگہ پائی جاتی ہے کیونکہ بدعملی و بے عملی جب کسی گروہ یا قوم میں پھیلتی ہے تو اس وقت وہ تنہا اس کا شکار نہیں ہوتی بلکہ وہ ریلے میں آتی ہے، اس وقت وہ دیگر بے عمل قوموں سے نہ ممتاز ہوتی ہے اور نہ الگ تھلگ رہ سکتی ہے، بے عملی ہر قوم کے قوائے عملیہ کو بے کار کر دیتی ہے بلکہ مرکز تک کو متاثر کر ڈالتی ہے، چنانچہ شیرازِ ہند، جونپور، جو قدیم دور میں اسلامی مرکز رہا ہے، جہاں بڑے بڑے فضلاءؒ مشائخ کبارؒ اور اولیاء عظامؒ پیدا ہوئے، اور سب نے اپنا منصبی فرض ادا کیا مگر جب بے عملی نے وہاں پڑاؤ ڈالا تو اس مرکز کی حالت دگرگوں ہو گئی مولانا کرامت علی

جونپوری (۱۲۱۵ھ ۱۲۹۰) اپنے دور کے جونپور کا حال اپنی تصنیف "زاد التقویٰ" میں تحریر فرماتے ہیں:

> جب اس خاکسار نے پانچ وقت کی اذان شروع کی تو بعضے نادان مسلمان کہتے کہ صبح وشام کی اذان سنی تھی دن کو کبھی نہ سنی تھی، یہ نئی بات نکلی ہے۔[1]

اور شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ نے فرمایا:

> مولوی عاشق الٰہی! ایک بات کہوں۔ ہم نے اپنے بڑوں سے سنا ہے کہ ہندوستان میں علم کی اتنی کمی تھی کہ دور کیوں جاؤ، ہمارے اضلاع میں جنازہ کی نماز پڑھانے والا مشکل سے ملتا تھا۔[2]

کچھ لوگ پوچھتے ہیں کہ آج کل میو قوم اس قدر پس ماندہ کیوں ہے؟ اس کے جواب میں کم از کم مجھے یہ کہنے میں جھجک نہیں کہ پچھلے پچاس سال سے ان کی قیادت ڈھیلی ہو گئی، نہ مذہبی اور دینی حیثیت سے ان کو صحیح طور پر سنبھالا گیا، اور نہ دنیاوی لحاظ سے انھیں ضابطہ کی قیادت مل پائی، مگر مسئلہ اتنے کہنے سے حل نہیں ہو جاتا۔ آخر ایسا کیوں ہوا؟ وہ کیا اسباب و سوانح ہیں جن کی بدولت یہ صحیح قیادت سے محروم رہے؟

دراصل ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں یہ قوم انگریزوں کو بہت کھٹکی، اس کے عزائم و ارادے، جرأت و ہمت، شجاعت و بہادری پر ان کی پوری نظر تھی۔ ان کی یکجائی آبادی بھی انگریزوں کو پسند نہ تھی اس لیے باوجود ایک جگہ جمع ہونے کے انھیں انتظامی طور پر تین صوبوں میں تقسیم کر دیا، پنجاب، یوپی، راجستھان، گوڑگانوہ، متھرا، الور و بھرتپور، اور کچھ ایسے حالات پیدا کیے کہ مسلمان باہم ٹکرا جائیں۔ چنانچہ دیوبندیت و بریلویت خالص سیاسی اصطلاح ہے۔ معاملہ صرف اس قدر ہے کہ دیوبند کے مدرسے کے قیام سے پہلے اہل علم و دین کا جو طبقہ کام کر رہا تھا، وہ اپنے طبعی اضمحلال و انحطاط سے دوچار ہو کر حقیقت میں اپنی قائدانہ صلاحیتیں کھو چکا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جو جماعت

---

(۱) زاد التقویٰ ص (۲) تذکرۃ الخلیل ص ۱۸۱

مسلمانوں کی مذہبی الجھنوں اور دینی پس ماندگی کا مداوا کرنے منظرِ عام پر آئی وہ ایمانی جوش، عملی پختگی، دینی تصلب اور فکری استواری جیسے قائدانہ اوصاف سے پوری طرح مسلح تھی، پرانا طبقہ اپنی کمزوری و انحطاط کے باوجود منصبِ قیادت سے علیحدہ ہونے پر آمادہ نہ تھا، انگریز زخم خوردہ تھا وہ اسی تاک میں تھا کہ ہندوستانی سلطنت کے ان دعویٰ داروں کو کیسے ٹکرایا جائے، اس موقعہ کو غنیمت سمجھ کر اس نے اختلاف کو مخالفت ظاہر کیا اور ان دونوں طبقوں کو ٹکرا دیا، نئی جماعت جب پرانی جماعت پر غالب آئی، تو نئی جماعت کی صفوں میں انتشا پھیلانے کی خاطر ایک اور طبقہ کو ابھارا، یہ تھے غیر مقلد جنھوں نے تقلید جیسے فطری عمل کو کفر بتانا شروع کر دیا، اور مسلمانوں میں سہ محاذی سرد جنگ شروع ہو گئی، بریلویت، دیوبندیت، غیر مقلدیت، اگر غور سے دیکھا جائے تو کچھ مغالطے تھے اور کچھ اوہام جنھیں سنجیدگی سے بیٹھ کر ذرا سی دیر میں دور کیا جا سکتا تھا، مگر واقعہ یہ ہے کہ سامراج نے کبھی مہلت نہ دی، اور معاملہ بجائے سلجھنے کے اور الجھتا چلا گیا "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی کارگر ثابت ہوئی۔ بہادر قوموں کی اگر وقت پر صحیح نگرانی نہ کی جائے تو اس کے جذبات و میلانات غلط رخ اختیار کر لیتے ہیں، جس کا کم سے کم یہ اثر ہوتا ہے کہ کوئی کسی کی نہ مانے کسی کو اپنے سے بڑا نہ سمجھے، مذہبی رہنماؤں کی طبقاتی سرد جنگ شباب پر تھی وہ قومی انحطاط کے وجوہ معلوم کر کے ان کے ازالے کی خاطر وقت کہاں سے لاتے؟ جب انرجی ٹھیک سے کام میں نہ لائی جائے اور طاقت و توانائی کے مصارف بے جان بن جائیں تو واقعہ یہ ہے کہ یہی سب کچھ ہوتا ہے جو رونما ہوا، یہ خلافِ توقع بالکل نہ تھا۔

نزاع و اختلاف سے کمزوری و ہوا خیزی ہوتی ہے، تاریخی طور پر یہ ثابت ہے کہ آریاؤں نے سب سے پہلے قبائلی نظم حکومت اختیار کیا، اور پھر اس کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ اسی کے ہو رہے، بڑی بڑی حکومتوں سے محض اسی باعث

ہاتھ دھونے پڑے۔ گوت وپال کا سسٹم اگر کبھی ظروف وسوانح کے پیش نظر سودمند ہوسکتا تھا تو اسکا یہ مطلب نہیں کہ یہ نظام عمل ہر وقت صحیح ہوسکتا ہے۔ آج کے دور میں مثلاً یہ بالکل صحیح نہیں، ہماری جملہ ترقیات میں یہ سنگین قسم کا روڑا ہے۔ اب قومی مفاد کے متعلق غور وفکر نہیں ہوتا، بلکہ اپنی گوت اور پال کی فکر ہے، جو محدود پیمانے پر اجتماعی بھی مگر انفرادیت کے ذہنی انار کی صاف طور پر اس میں جھلکتی ہے۔ تجربے سے یہ معلوم ہوا کہ اگر اس قوم کی معقول نہج پر تربیت کیجائے تو اس راکھ کے ڈھیر میں بڑی اہم چنگاریاں محفوظ ہیں، اسی قسم کے ماحول میں اقبال نے کہا تھا ؎

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

اور اسی امید پر ہماری یہ سعی وکوشش ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے بار آور فرمائیں۔

وَيَرْحَمُ اللّٰهُ عَبْدًا قَالَ: آمِيْنًا.

آخر میں اپنے محسن وکرم فرماؤں کا شکریہ ادا کرنا بھی بیحد ضروری ہے مَنْ لَمْ يَشْكُرِ النَّاسَ لَمْ يَشْكُرِ اللّٰهَ۔ چودھری محمد اشرف خاں مؤلف "میو قوم اور میوات" قاری دین محمد جامع مسجد حوض رانی بابو شادی خاں دھوج، حکیم سید ظل الرحمٰن تجاوری صدر شعبہ علم الادویہ اجمل خاں طبیہ کالج علیگڈھ مسلم یونیورسٹی، حکیم سید فضل الرحمٰن تجاوری، ڈاکٹر محمد اقبال انصاری صدر شعبہ اسلامیات علیگڈھ مسلم یونیورسٹی، پروفیسر سید محمد سلیم تجاروی شکارپور سندھ، جناب رشید احمد حمزوی پاکستان، حاجی مہتاب خاں نگینہ میوات، حاجی محمد لیسین پنگواں، مولوی محمد ذاکر الوحیدی نبیرۂ حکیم عبدالسلام، مولوی محمد اسحٰق شیخ الحدیث جامعہ رحیمیہ درگاہ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ وغیرہ کا بیحد ممنون ہوں کہ ان حضرات نے فراہمی معلومات میں بھرپور تعاون دیا چودھری رحیم خاں وزیر برق وتوانائی ہریانہ، مولوی محمد سعید امینی صدر مدرس افضل العلوم آگرہ وغیرہ کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ کہ انہوں نے علمی ومالی تعاون سے ہمت افزائی فرمائی۔ مولوی دین محمد سنگاروی خطیب جامع مسجد مدن گیر نئی دہلی نے تصنیف کتاب میں نصرت کی، انکا اور تمام ان رفقاء کا شکر گذار ہوں جنہوں نے کسی بھی طرح میرا ہاتھ بٹایا۔

محمد حبیب الرحمٰن خاں میواتی مؤلف
جوار جامع مسجد مدن گیر نئی دہلی
۵/۸/۱۴۰۴ھ، ۷/۵/۱۹۸۴ء

ترتیبِ عنوانات و فہرستِ مضامین

میوات کی عہد ساز شخصیتیں

پہلا طبقہ

دوسرا طبقہ

تیسرا طبقہ

سلسلۂ مداریہ

فقہاء و دانشوران میوات

سلسلۂ قادریہ

عیون اخبار الحیوانات
١۴٠۵ھ

مقدمہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ الذی خلق الارض والسمٰوٰت العلیٰ ۝ الرحمٰن علی العرش استویٰ ۝ لہ ما فی السمٰوٰت وما فی الارض وما بینہما وما تحت الثریٰ ۝ والصلوٰۃ والسلام علیٰ اولی الرسالات الذین اجتبیٰ ۝ وعبادہ الذین اصطفیٰ ۝ لاسیما علیٰ من ھو بالافق الاعلیٰ ۝ ثم دنیٰ فتدلیٰ ۝ فکان قاب قوسین او ادنیٰ ۝ فاوحیٰ الیہ ما اوحیٰ ۝ وعلیٰ آلہ واصحابہ الذین اموا محجۃ الھدیٰ ۝ اولٰئک الذین ھدی اللہ فبھداھم اقتدہ ۝ بایھم اقتدیتم اھتدیتم ۝ وبہداھم من اھتدیٰ ۝

ہر طرح کی حمد و تعریف خدائے بزرگ و برتر کے لئے زیبا ہے جس نے اپنے بندوں کی ہدایت و رہنمائی کی خاطر انبیاء کرام مبعوث فرمائے صلوٰۃ اللہ علیہم وسلامہٗ۔ اور آخر میں حضور ختمی مرتبت حضرت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ واصحابہٗ وسلم کو بھیجا کہ، امیّوں کو خدا کی نشانیوں کا مشاہدہ کرائیں، ان کی اصلاح و تزکیہ فرمائیں، اور انھیں کتاب و حکمت کا درس دیں ...... اور اسے واضح (کھلی ہوئی) کتاب عطا کی، حکمت و دانائی سے بہرہ ور فرمایا، اور اپنے اس بندے کو وہ تمام چیزیں بتلادیں جو اسے معلوم نہ تھیں۔ پوری کائنات کے لئے رحمت بنا کر بھیجا، اور خلاصۂ موجودات افراد کو اس کی صحبت و ہم نشینی کے لئے منتخب فرمایا، چشم فلک نے جن سے بہتر مجتمع افراد کو نہیں دیکھا، جو ایثار و فدائیت کے مظہر اتم، سراپا اطاعت و ہمہ سپردگی

خلوص وللہیت میں فرد، عبادت و عبودیت میں طاق، بزم میں نرم، رزم میں گرم، اور انھیں نوید رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ سے سرفراز فرمایا..... جس نے عارفوں کے دلوں کو اپنی تجلی کیلئے انتخاب کرکے جلوہ گاہ معرفت والقان فرمایا۔ اور انوار و برکات سے مالامال کرکے تمغۂ اَلَا اِنَّ اَوْلِیَاءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ عنایت کیا ـــــ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ ھَدَی اللّٰہُ فَبِھُدٰھُمُ اقْتَدِہْ ؕ

اور لاکھوں درود و سلام فخر امم، سرکار دو عالم، سرور کائنات، اشرف الموجودات محمد رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کی روح پاک پر، جن کے طفیل یہ کارگہ کون و مکان وجود میں آئی، انبیاء کرام علیھم الصلوٰۃ والسلام کو خلعت نبوت عطا ہوا، اولیاء عظام کو لباس ولایت و تقرب سے آراستہ کیا گیا، اور درود و سلام آپ کی آل پاک رض و اہل بیت مطہر پر، آپ کے اصحاب رض پر۔ ان کے بعد علماء شریعت پر، رہبران طریقت پر اور واصلان حقیقت پر جو آپ کے سچے وارث، آپ کے علوم کے امین، اور آپ کے پیغام کے حامل و ناشر ہیں۔

اے ارحم الراحمین اور اے اکرم الاکرمین ہمیں اپنے پیارے حبیب علیہ الصلوٰۃ والسلام کی، آپ کی آل و اہل بیت عظام کی، صحابہ کرام اور اپنے اولیاء، واجب الاحترام کی محبت و عقیدت اور انکی اطاعت و ہم نوائی مرحمت فرما۔ وَیَرْحَمُ اللّٰہُ عَبْدًا قَالَ، آمِیْنًا۔

اما بعد۔ کامیاب و بامراد زندگی وہی ہے جو یاد الٰہی میں بسر ہو، دنیا کی سرسبزی و شادابی حقیقی کامرانی کو مستلزم۔ ضروری۔ نہیں اس کے اسباب و علائم، آثار و احوال، اور سوانح و کوائف ہی دوسری قسم کے ہوتے ہیں اور نوعیت بھی جداگانہ۔ یہ دولت لازوال اہل اللہ کی صحبت میں میسر ہوتی ہے، اللہ والوں کی صحبت و ہم نشینی کیا کہئے کسی اہل دل سے پوچھیے تو معلوم ہوگا۔

یک زمانہ صحبتے با اولیاء
بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

یہ جواہر کی کانیں ہیں، یہاں سے کوئی آدمی محروم نہیں جاتا، یہ لوگ رحمت الٰہیہ کے سائے میں رہتے ہیں، لَا یَشْقٰی جَلِیْسُھُمْ ـــ صحبت صالح ترا صالح کند۔ آج کے دور میں ترقی نام ہے۔ حد سے زیادہ نئے بننے کا۔ اور مسلمان کی ترقی عبارت ہے خَیْرُ الْقُرُوْنِ کے قرب و اتصال سے، جس قدر بھی اس پر قدیم رنگ ہوگا، اسی قدر عروج و ارتقاء کے ہم آہنگ ہوگا۔

اسلام امن و سلامتی کا مذہب ہے، محبت اور پیار اس کا مسلک ہے، ہمدردی و غمگساری اور خدمت خلق اس کی طریقت ہے، اتحاد و اتفاق، یکجہتی و یگانگت، اخلاق و آدمیت، تہذیب شرافت، شائستگی و متانت، سکون و راحت، حقیقت و صداقت غرض جملہ اوصاف حمیدہ یعنی تمام بھلائیوں کا مجموعہ ہے، اس کے ہر گوشہ میں نیکی و خیر خواہی ہے۔ اور اس عالم رنگ و بو۔ ہاں اس دنیا میں زندگی گذارنے کے لئے یہی سب کچھ چاہیئے، اس سے زندگی میں رونق و تازگی آتی ہے اور فرحت و آسودگی۔

یہ گوہر گرانمایہ قرن اول کے ہر مسلمان کے پاس تھا، صحابہ کرام رض کے دور میں کوئی مسلمان اسکے خلاف تصور بھی نہیں کرسکتا تھا، جوں جوں خیر قرون سے دوری ہوتی گئی، یہ نعمت بے بہا بھی سمٹنے لگی، دنیا کے جھمیلوں میں الجھ کر ہر ایک مسلمان اس کی حفاظت و پاسداری نہ کرسکا۔ بے اعتنائی کے اس اضطرابی ظہور سے اکتاکر اس نے اسلامی اقدار حیات کے صحیح امینوں۔ صوفیائے کرام رح و علماء عظام رح کے ہاں رخت اقامت ڈالا۔ جنھوں نے اپنی کل متاع حیات اس کے لئے وقف کردی، ان کا اوڑھنا، بچھونا، سونا، جاگنا، اٹھنا، بیٹھنا، چلنا، پھرنا، کھانا، پینا اور حرکات و سکنات کے تمام زاویے اس عظیم المرتبت و وقیع نعمت خداوندی کی حفاظت و صیانت اور پرداخت و نگہداری کے لئے وقف ہوگئے مدارس و خانقاہیں اس تمام تگ و دو کے حسین و خوبصورت مظہر اور تاریخ عزیمت و دعوت اس کا سرنامۂ عنوان و تعارفی روداد و توضیحی داستان ہے۔

زندگی کے دشوار گذار صحرا میں اس راہبری، اور جہل و بے خبری کے اندھیرے میں اس چراغ کی سخت ضرورت ہے، اس کے بغیر زندگی کی راہ ـ صحیح معنی میں ـ طے کرنا مشکل نہیں ناممکن ہے، صلاح و فلاح کی مارکیٹ کا یہ معیاری سکہ ہے اس کے بغیر یہاں سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا ـ قومی و ملّی زندگی میں وہی سب کچھ ہوتا ہے جو انفرادی و شخصی زندگی میں، اس کی صبحیں، اس کی شامیں، اس کی دھوپ چھاؤں اس کی چاندنی، اور اس کی بہار و خزاں سب وہی ہیں، اس کے نشیب فراز بھی کسی اور نوعیت کے نہیں ہوتے ـ ضرورت ہے قومی یکجہتی، قومی اتحاد اور قوم کی اجتماعی شیرازہ بندی کی، افراد کے مجموعہ کا نام قوم ہے، اگر یہ سیدھی اور صحیح راہ پر گامزن ہوں تو قومی جہاز کو راہ راست سے کوئی شئے نہیں ہٹا سکتی ـ

ملک کی آزادی، تقسیم اور قیام پاکستان نے جہاں ایک طرف مسلمانوں کے لئے ایک جائے پناہ اور بظاہر محفوظ ٹھکانہ فراہم کیا ہے، وہیں ہندوستانی مسلمانوں کے لئے اضمحلال، اضطراب اور بے اطمینانی کی فضا پیدا کی ہے، ساتھ ساتھ دونوں جگہ ایک نیا دائرۂ عمل، ایک نئی جولانگاہ اور ایک نئی آزمائش بھی مہیا کی ہے: اپنے قومی ورثہ کی حفاظت و نگرانی، اور اس کے کوائف بغیر جھجک کے صحیح طور پر تاریخ کے حوالہ کرنا تاکہ ماضی کے آئینہ میں اپنے کردار و عمل اور عزم و ارادہ کا بھرپور جائزہ لیا جا سکے ـ اور پھر اس تابناک و درخشندہ تاریخ کی روشنی میں مستقبل کی تعمیر مناسب طریقے پر ہو جائے ـ

عمومی اور ہمہ گیر قسم کی تاریخوں میں انفرادی کردار کی نشاندہی نہیں ہو پاتی، گو دیدۂ بینا کو وا کرنے کے لئے یہ کافی ہیں اور عبرت و موعظت بھی کچھ نہ کچھ ہو جاتی ہے مگر انفرادی اور شخصی شعور و فکر کی تہذیب و ترتیب اور جذبات و میلانات کا صحیح امالہ نہیں ہو سکتا جو بنائے مستقبل کا بنیادی پتھر اور اساس اولین ہے ـ ذرہ ذرہ مل کر پہاڑ

بن جاتا ہے، اور قطرہ قطرہ دریا اس لئے ضرورت ہے کہ علاقائی تذکرے جمع ہوں اور علیحدہ علیحدہ قومی تواریخ ترتیب دی جائیں تاکہ پھر پوری ملت اسلامیہ ہند کی تاریخ کی تدوین ہو سکے اگر ایسا نہ ہوا تو جو تہذیب و معاشرہ سینکڑوں سال کی کوششوں سے بنایا گیا، اخلاق و انسانیت اور محبت و رواداری کی جو بلند قدریں استوار کی گئیں اور ادبی و تاریخی سرمایہ جو بڑی محنت و عرق ریزی سے ملک و ملت کے نونہالوں نے فراہم کیا تھا وہ کچھ تو تقسیم وطن کی بدولت تلف ہو گیا جو کچھ باقی بچا ہے وہ ملت کی سرد مہری کی نذر ہو جائے گا ـ

بصورت موجودہ اگر ہم ان تاریخی عظمت و اہمیت کے امین مقامات کے حالات معلوم کرنا چاہیں جنھوں نے ہمارے ماضی کو تابناک بنایا تھا، تہذیب و تمدن کے تاج محل تیار کئے تھے، ہمدردی و خیر خواہی کی قندیلیں روشن کی تھیں ـ تو واقعہ یہ ہے کہ مایوس ہونا پڑتا ہے، کچھ اثاثہ نذر آتش ہوا کچھ غرقاب اور ترک وطن سے کچھ کم یاب و نایاب ـــ مدارس و خانقاہ اسلامی ہند کی تاریخ کے روشن ابواب ہیں اور یہاں اسلامی تعلیمات کی نشر و اشاعت کے اہم اور ناقابل فراموش سلسلے ـ جہاں آدمی کو آدمیت کا سبق اور انسانیت کی تربیت دی گئی، اچھے آدمی بنائے گئے، انسانی ذہن و شعور کو بیدار اس کی قابلیتوں کو اجاگر اور عزائم کو پائدار کیا گیا، قوت عمل کی مناسب نشو و نما ہوئی ـ ہماری عام تاریخوں میں ان درخشندہ و پائندہ ابواب کو ان کی حقیقی جگہ نہ مل سکی جس سے انکی کارکردگی نمایاں ہو کر عبرت و موعظت کے سینکڑوں دروازے کھل کر مفید ملت ہوتے ـ اور ماضی کی ان معلوم راہوں میں مستقبل کا سفر آسانی سے طے ہوتا ـ مگر ؎

فزوں تر حوصلہ دشواریٔ منزل سے ہوتا ہے ـ

ایشیائی ممالک خصوصاً اسلامی دنیا تقریباً ڈیڑھ دو سو سال کے بھیانک دور غلامی سے آزاد ہو کر کھلی فضا میں سانس لینے کے قابل ہوئی ـ برصغیر ہند و پاک کو آزادی

کی نعمتوں سے پوری طرح بہرہ یاب نہ ہو سکا گزشتہ تانیہ کا اسے احساس ہونے لگا ہے اور ادراک بھی۔ ایسے وقت ضرورت ہے کہ پوری ملتِ اسلامیہ ہند و پاک کسی قدر یکجہتی و یگانگت کا مظاہرہ کرے اس کے لئے کچھ قومیں پہلے سے تیار ہیں اور کچھ تیاری میں ہیں مگر اس ملک میں چند ایک قوم ایسی بھی ہیں جنھیں اس تگ و دو سے بظاہر کوئی واسطہ نہیں اور ضروری ہے کہ انھیں اس مرحلہ میں سوادِ اعظم کے ساتھ ملا کر رکھا جائے، ورنہ انکی پس ماندگی پوری ملت کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ کا باعث ہوگی، جو ملت کے لئے اندیشۂ انتشار و اضمحلال ہوگا اور ان کے لئے تباہی کا سلسلہ۔

اس وقت کہ ملک کی ہر قوم میں شعور و جذبہ تنبہ و بیداری عام ہو چکی ہے ہماری قوم میو مقیم ہند اس سے تقریباً مستثنیٰ ہے۔ اس میں اس قسم کا کوئی جذبہ، حوصلہ، امنگ اور عزم و ارادہ نہیں پایا جاتا۔ اب سے ہزار برس پہلے جس ڈگر پر پڑ گئی اسی کو حرفِ آخر سمجھ بیٹھی۔ تاریخ خاموش معلم ہے اور باوقار مربی، کوئی قوم ماضی سے بے نیاز ہو کر مستقبل کو نہیں سنوار سکتی۔

میو قوم کے تاریخی کوائف عموماً سینوں میں محفوظ رہے، اور محض اسی کام کی خاطر ایک پورے طبقہ کی کفالت کا بوجھ اپنے کاندھوں پر اٹھائے رکھا۔ نسب ناموں کی حفاظت کے لئے کبیشر۔ جاگا۔ جو شاہی پرچہ نویسوں کی طرح اس کے سوانح محفوظ رکھتے اور وقائع و ایام کا میراثیوں کو ذمہ دار بنایا ــــ اور یہ واقعہ ہے، جس کے اظہار میں جرأت سے کام لینا چاہیئے، کہ یہ دونوں اپنے منصبی فرائض سے اس عمدگی و خوش سلیقگی سے عہدہ برآ ہوئے کہ دل سے دعا نکلتی ہے مگر آج کا دور پریس کا دور ہے، کوئی بھی شے پریس سے آزاد ہو کر اشاعت پذیر نہیں ہو سکتی، اور میراثیوں کی قوم کا اکثر حصہ تقسیم کے بعد پاکستان ہجرت

کر گیا، کبیشر ضرور یہاں ہیں مگر پہلی جیسی داد و دہش رہی اور نہ ان میں محبت و نشاط۔

گزشتہ پچاس سال کے دوران اس قوم کے تاریخی سوانح کئی ایک مصنفوں کے قلم سے مرتب ہو کر شائع ہو چکے ہیں۔

(۱) تاریخ میوات .... مصنفہ حکیم عبدالشکور صاحب مطبوعہ دہلی ۱۹۱۹ء

(۲) تاریخ میو .... مصنفہ چودھری محمد یعقوب خان قیصری مطبوعہ لاہور

(۳) میو قوم اور میوات ... مصنفہ چودھری محمد اشرف خاں ایم۔اے مطبوعہ دہلی ۱۹۶۰ء

(۴) تاریخ میو چھتری ..... حکیم عبدالشکور م ۱۹۶۱ مرتبہ حکیم اجمل خاں مطبوعہ دہلی ۱۹۶۲ء

(۵) تاریخ میو .... مصنفہ راؤ امرت خاں خوشاب سرگودھا مطبوعہ ۱۹۶۴ء

مگر پھر بھی اس قوم میں کوئی قومی شعور پیدا نہ ہو سکا، اور کسی صالح اور تعمیری انقلاب سے یہ قوم شناسا نہ ہو سکی۔ کیوں؟؟ شاید اس لئے کہ ان کتب میں زیادہ تر اس کی نسلی، قبائلی اور گروہی واردات کا تذکرہ ہے، تاریخ کا وہ جزو جو قوموں کے اجتماعی شعور کو بیدار کرتا ہے، اشہبِ فکر و عمل کو مہمیز لگا کر خوگرِ سعی و جہد کرتا ہے، کم از کم میری کوتاہ نظری و بے بصری کے باعث مجھے ان کتب میں نہ مل سکا۔ اسے یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتب تاریخ اس قوم اور اس کے وطن کی سینۂ گیتی پر موجودگی کی علامت ہیں گویا اس کی خارجی کیفیات کی روداد ہیں، داخلی شئون و کوائف اور قوم و علاقے کی فلاح و بہبود کے دو تارے کو یا چھیڑا نہیں گیا، یا قوم کے افراد نے قابلِ اعتنا نہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔

میں طبعی طور پر مذہبی آدمی ہوں ــــ اور شعور و وجدان، جس قدر بھی مجھے میسر ہے، میری اس کیفیت میں الحمدللہ کوئی تغیر نہ کر سکا۔ مجھے خیال آیا کہ اس قوم کے صرف مذہبی کوائف اور سوانح مرتب کر کے اس کے سامنے رکھوں، گویا قومی صالح روایات کی ترتیب، مذہبی اور ثقافتی

ماحول، سیاسی و سماجی عناصر کی مختصر سی تشریح اور تاریخی و جغرافیائی پس منظر میں صوفیاء و مشائخ اور علماء و دانشوروں کا تذکرہ لکھا جائے، جنھوں نے اس قوم کے اندر ایمانی شمع جلائے رکھی، اگرچہ اس کی لو گاہ بگاہ دھیمی پڑتی رہی مگر اسے بجھنے نہ دیا، مذہب و دین کے ساتھ اس کی وابستگی کو برقرار رکھا۔

اس وقت میوات کے حالات بڑے ناگفتنی ہیں۔ اتحاد و اتفاق، جو قومی شیرازہ بندی کی روح ہے، عموماً مفقود ہے، اور صحیح قیادت بھی نہ ہونے کے برابر ہے، جس کے بغیر قومی جذبات و میلانات پر کنٹرول نہیں ہو سکتا۔ تعلیم کی انتہائی کمی، نئے دور کے تقاضوں سے بے بہرہ، اور نئی دنیا کی سہولتوں سے محروم اگر کوئی زمین کا ٹکڑا ہے تو وہ علاقہ میوات اور اس کے حقیقی باشندے میو قوم کے افراد ہیں، وہ خطہ جس نے عرصۂ دراز تک مشائخ چشت کے پیغام کو سینے سے لگا کر ملک کے گوشہ گوشہ میں پہنچایا، وہ قوم جس نے ملک کی ساکھ کو کبھی آنچ نہ آنے دی اور اس کے عَلَم وقار و عظمت کو سرنگوں نہ ہونے دیا، جس کے جذبۂ ایثار و قربانی کو دیکھ کر گاندھی جی م ۱۹۴۹ء نے کہا تھا —— اگر ملک میں میو قوم جیسی جرأت و ہمت و جاں نثاری پیدا ہو جائے تو چوبیس گھنٹے میں ملک کو آزاد کرا لوں" (تقریر تجیارن ۱۹۲۳ء م) اور جسے وہ "ہندوستان کی ریڑھ کی ہڈی" بتلاتے ہیں۔ اس کے یہ کوائف و شئون تعجب خیز ہے۔

تبلیغی نقل و حرکت، جو آج ایک آفاقی اور بین الاقوامی تحریک بن گئی، اس کا اولین مرکز و میدان عمل یہی علاقہ ہے اور یہاں بسنے والی تمام مسلم قومیں اس کی مخاطب اولین ہیں مگر جس طرح اس تحریک نے دوسری جگہوں پر برگ و بار نکال کر تناور درخت بننے کی کوشش کی، اور اس میں وہ کامیاب بھی ہو گئی، یہاں ایسا نہیں ہو سکا، اس کے عمیق اور دیرپا اثرات جتنے اور علاقوں پر پڑے یہاں یہ صورت نہ ہو پائی، جس قدر گہرائی اور گیرائی کے ساتھ ملک کے دوسرے حصوں میں اس کی چھاپ ہے اس علاقے میں اس کا دسواں حصہ بھی نہیں ہے —— تعلیمی تحریک جسے چودھری محمد یسین خاں مرحوم (م ۱۹۷۹) نے ۱۹۲۰ء میں شروع کیا تھا، وہ بھی گو دم نہیں توڑ رہی ہے مگر حسب توقع اس کے نتائج حوصلہ افزا نہیں۔

میں نے جب اس پہلو سے اس مسئلہ کو اپنے غور و فکر کا موضوع بنایا تو یہ بات پوری وضاحت کے ساتھ سامنے آگئی کہ اس قوم کو اگر بیدار کیا جا سکتا ہے تو صرف مذہبی راستے سے انھیں ان کی قدیم مذہبی، روحانی تاریخ اور اس سرزمین میں آسودہ مشائخ کرامؒ و علماء عظام کے تذکرے سنا کر ان کے اجتماعی ضمیر کو جھنجوڑا جائے۔

ان وجوہ کے پیش نظر میں نے ارادہ کیا کہ سرزمین میوات اور میو قوم کی مذہبی شئون و کوائف مرتب کر کے قوم کے سامنے پیش کروں تاکہ اپنی قوم بیدار ہو کر ترقی پذیر اقوام میں شامل ہو جائے اور اپنے قدیم تاریخی کردار کی روشنی میں اپنے صحیح مقام کے متعین کرنے میں کسی قسم کی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے —— اور ملت کی عمومی تاریخ کے لئے ایک ایسے ناگزیر باب کا اضافہ ہو جسے مورخین نے عموماً نظر انداز کیا، یا اس کی نشاندہی نہ کی۔ اور اس کے بغیر اسلامیان ہند کی کوئی مذہبی اور ملی تاریخ مکمل نہیں رکھی جا سکتی۔

اس سلسلہ میں کام بڑی محبت اور محنت سے کیا ہے۔ محبت ان بزرگانِ دینؒ سے تھی اور ہے، جنھوں نے صدیوں میو قوم کے اجتماعی شعور کو اسلام کے ساتھ وابستہ کئے رکھا، کفر و ارتداد کے جھونکوں، الحاد و بے دینی کی آندھیوں اور شرک و زندقہ کے بگولوں سے ان کے چراغ ایمانی کی حفاظت فرمائی فَجَزَاھُمُ اللّٰہُ وَشَکَرَ مَسَاعِیَھُمْ محنت

یوں کرنی پڑی کہ مجھے ایسے وقت اس کام کی سوجھی کہ جو لوگ اس کام میں کچھ تعاون دے سکتے تھے وہ یا خدا کو پیارے ہو گئے، یا پاکستان کے دوارے پہنچ گئے۔ میرے پیش رو اہل قلم نے گو کچھ روشنی چیا کی مگر اپنے دور میں جس قدر روشنی کے سرو سامان تھے اور جو آسانی انھیں میسر تھی اس سے ضرورت کے مطابق کام نہ لے سکے۔ مثلاً جن حضرات کے شئون و کوائف تذکرہ و تاریخ کی کتب میں نہ آسکے ان کے متعلق ۱۹۴۷ء تک ہر جگہ ایسی مقامی روایات موجود تھیں جن سے ان کی سیرت و سوانح کے وہ پہلو، جو قابل تقلید ہیں، اچھی طرح نمایاں ہو سکتے تھے اب وہ روایات یا زیر زمیں ہیں، یا ورائے سرحد ــــ بہر حال جتنا اور جیسا کچھ مجھ سے بن پڑا وہ پیش خدمت ہے۔

میو قوم اور اس کی خصوصیات

میو قوم قدیم آرین اقوام میں سے ایک قوم ہے جس نے ہر دور میں ہندوستان کی عظمت و بزرگی کو برقرار رکھا، اور کسی حال میں بھی ملک کی ساکھ کو آنچ نہ آنے دی، یہ اس کی بد قسمتی ہے کہ اس کے ماضی کو منضبط و مدون نہ کیا گیا، اور نہ حال کو خوش حال کیا گیا، جب ماضی و حال کے ساتھ یہ بے پروائی برتی گئی تو اس کے مستقبل کی کسے فکر ہو گی؟؟

کون سی قوم ہے کہ اس میں جیالے مردان کار، حوصلہ مند قائد، بلند ہمت جرنیل، روحانی پیشوا، لوح فطرت پر گلکاری اور فکر و نظر کی چمن بندی کرنے والے شاعر و ادیب، قوم کے دماغ میں حقیقت و آگہی اور ایثار و قربانی کا صور پھونکنے والے شعلہ بار خطیب اور حق پسند واعظ پیدا نہیں ہوئے؟؟ ہر قوم اور ہر سرزمین میں ایسے درخشندہ جواہر و آبدار موتی پیدا ہو کر نمایاں ہوتے رہے جنھوں نے عرصہ دراز تک اس قوم اور سرزمین میں ہمت و مردانگی کے چراغ روشن کئے، صلاح و فلاح کی کھیتی کو سنوارا، معاشرہ کو استوار کیا، ادب و شاعری کے چمن لگائے اور تہذیب و تمدن کی گاڑی میں عروج و ارتقار کے پُر لگا کر اُسے قوت پرواز بخشی۔

میو قوم کی تاریخ میں بھی ایسے ایسے اولوالعزم انسان گذرے ہیں جنھوں نے شجاعت و

مردانگی اور ملکی دفاع و مقاومت میں وہ لازوال کردار ادا کیا ہے جسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا، سکندر اعظم کا منہ انھوں نے موڑا۔ اور محمد بن قاسمؒ کو ــــ عرب قافلوں کے ساتھ چھیڑ خانی کر کے ــــ ہندوستان آنے کی دعوت اسی قوم نے دی ــــ جب وہ آئے تو ان کی معاونت کی ــــ اور محمود غزنویؒ جیسے فاتح اعظم کو ہلا ہلا دیا، جیسا کہ جنرل محمد اکبر خاں نے لکھا ہے:

"جاٹ اور میو بہت بہادر اور لڑاکا قومیں تھیں، انھیں لوگوں نے سکندر اعظم کو پریشان کیا تھا، یہی لوگ محمد بن قاسم کے سب سے بڑے مخالف تھے، مگر بعد میں زبردست معاون بنے، یہی تھے جنھوں نے محمود غزنوی کو سومنات سے واپسی پر خاصا ہراساں کیا تھا، اور محض ان کو سزا دینے کے لئے وہ دوسرے سال سندھ پر حملہ آور ہوا"[1]

...... اب یہاں کے ٹھاکر، جاٹ اور میید وغیرہ محمد بن قاسمؒ کے معاون بننے شروع ہو گئے ان میں بعض ایسے بھی تھے جنھوں نے خود بخود اسلام قبول کر لیا تھا، اور بعض اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے بھی اس نوجوان عرب سالار اعظم کی اطاعت کا دم بھرتے تھے[2]

ان ہندی معاونوں نے راجہ داہر کو شکست دینے میں نمایاں کام کیا[3] یہی وہ قوم ہے جس کے ایک فرد نے اکبر اعظم کو کہلا بھیجا جبکہ اکبر نے اسے حاضر دربار ہونے کا حکم صادر کیا تھا ؎

تو دلّی کو بادشاہ میں پاٹن کو راؤ
ہم دلّی ملنے نے آئیں تم ہم سے پاٹن ملنے آؤ

یہی وہ قوم ہے جو ہندوستان کی پرانی قوموں میں سے سب سے پہلے ایمان لائی، اگرچہ ایک ہی وقت میں یہ قوم بھی دولت ایمان سے بہرہ ور نہ ہو سکی، تقریباً چار سو سال کے طویل عرصہ میں

---

[1] محمد بن قاسم کی جہادت فن حرب ص ۶۰
[2]، [3] " " " " " ۱۰۱

پوری قوم نے اسلام قبول کیا مگر اس امتیاز کے ساتھ کہ پھر میو قوم کا کوئی فرد غیر مسلم نہ رہا۔
اسی قوم کے ایک راجہ نے اکبر کے زمانہ میں بڑے اطمینان کے ساتھ کہا تھا اور پھر اپنے اس قول کا پاس و پاس بھی کیا۔

پانچ پہاڑ کی راجائی اور پورو میرو دل
آدھے اکبر بادشاہ آدھے پار ٹوڈر مل

سرزمین میوات کے امتیازات

میوات کی سرزمین بڑی جاذب اور پرکشش رہی ہے، اسے گو شاہی شکوہ و طمطراق میسر نہیں ہوا، نہ نوابی طنطنہ، نہ کبھی یہ حاکمانِ وقت کا عشرت کدہ بن سکی، نہ امیرانِ عالیشان کا نعمت کدہ، ہمیشہ سادہ اور بظاہر بے روپ سی رہی، مگر بڑے بڑوں کے سر یہاں سرنگوں ہوئے، اور غرور و تکبر سے پُر دماغوں کے ایاغ واژگوں، عظیم ترین شہنشاہوں کی عقیدت گاہ، جلیل القدر اولیاء کرامؒ کی قیام گاہ، اکابر علماءؒ کی درسگاہ ــــ اور بادیہ نشین قلندروںؒ کی گذرگاہ بننے کا اس سرزمین کو ہمیشہ سے فخر حاصل رہا ہے، اس سرزمین نے اولیائے کرامؒ کو اپنی گود میں پالا بھی ہے، اور انھیں سنوارا اور سنبھالا بھی ہے، اس نے مشائخ عظامؒ کی ان کے بچپن میں ناز برداری بھی کی ہے، اور بڑے جب ہوئے تو ان کی تابعداری بھی۔ یوں تو اللہ والوں سے ہر قوم ہر گروہ اور ہر سرزمین کو فیض پہنچا ہے، اللہ والوں نے نہ کبھی اپنے کرم کے دسترخوان کو سمیٹ کر رکھا، اور نہ اپنی رشد و ہدایت کی بساط کو لپیٹ کر رکھا، یہ تو ہدایت و رہنمائی کا وہ فیضانِ عام ہے جس میں کوئی چیز رکاوٹ نہیں بن سکتی مگر اس سرزمین کی بات ہی دوسری ہے ؎

نہ اس میں گھاس اگتی ہے نہ اس میں پھول کھلتے ہیں
مگر اس سرزمین سے آسماں بھی جھک کے ملتے ہیں

سپہ سالار سید مسعود غازی (۴۰۵ ش ۴۲۴) جنھیں خاک بہرائچ نے اپنی آغوش میں چھپا کر اپنی کلاہِ افتخار کا موتی بنا لیا ہے، ان کی پیدائش اسی سرزمین کے مرکز اجمیر شریف

میں ہوئی، اور جب وہ بڑے ہوئے تو ان کے عزائم جہاد فی سبیل اللہ کی تجربہ گاہ یہی سرزمین بنی، یہاں ان کے رفقاء کار اور کار دبار جہاد کے لئے ان کے ساتھی تیار کئے گئے۔

اجمیری خواجہ حضرت شیخ معین الدینؒ متوفی ۶ رجب ۶۳۳ھ جب ایمان و یقین کے ابر گوہر بار کو لے کر وارد ہندوستان ہوئے تو ان سے فیضیابی اولاً اور اصالتاً اسی سرزمین کا حصہ اور اس قوم کا مقدر بنی، یہاں کی عام تشنگی کو محسوس فرما کر آپ نے اجمیر کو اپنی قیام گاہ بنایا اور پھر یہاں سے پورے ملک کو اپنے فیوض و برکات سے بہرہ ور فرمایا۔[1]

---

[1] ہندوستان کے جغرافیہ پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے ہی یہ پتہ چل سکتا ہے کہ دہلی اگرچہ پرانے زمانے سے شمالی ہند کی سلطنتوں کی راجدھانی بنتی چلی آئی ہے لیکن اس پر سب سے زیادہ اثر انداز اگر کوئی علاقہ ہو سکتا تھا تو وہ راجستھان تھا جس کی سرحدیں ایک طرف دہلی اور دوآبہ کے زرخیز علاقے سے مل رہی تھیں، اور دوسری طرف طویل ریگستانی فاصلہ طے کرتے ہوئے اس کا رشتہ خلیج عرب سے جا ملتا تھا، دہلی سے قریب ہریانہ و راجستھان میں پھیلی ہوئی اقوام میں راجپوتوں کی طرح میو قوم ایک نہایت غیرت مند جنگجو، اور بہادر قوم تھی، ان کی مذہبی پختگی انھیں بزرگوں کی بدولت ہے جنھوں نے سیکڑوں سال مقیم رہ کر یہاں شمع ہدایت روشن کی، اور اس علاقے کی تاریخ میں عظیم سیاسی و مذہبی انقلاب پیدا کیا۔ تاریخی لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو صحرا اور ریگستان کی گود میں پلنے والے راجستھانی۔ جاٹ، میو اور راجپوت۔ ہندوستان کے سب سے زیادہ جفاکش اور سخت کوش لوگ رہے ہیں، غذا اور پانی کی تلاش میں ان کے قافلے اس خشک و بے آب و گیاہ سرزمین میں ادھر سے ادھر منتقل ہوتے رہنے کے عادی تھے، اسی باعث ان میں آرام طلبی و تن آسانی کا دور دور پتہ نہیں تھا جو دوآبہ کے سہولت پسند لوگوں میں پیدا ہو گئی تھیں، اس تاریخی و جغرافیائی پس منظر کا لازمی اور طبعی نتیجہ تھا کہ شمالی ہند میں جو اولین مبلغ اسلام آئے انھوں نے راجستھان اور ملحقہ علاقوں کو اپنی توجہات عالیہ کا مرکز بنا کر رشد و ہدایت کی تمام تر صلاحیتیں اور توانائیاں یہاں صرف فرمائیں۔[2]

---

[2] جنگ آزادی کا ایک ورق، روزنامہ دعوت دہلی مورخہ ۱۹ / ۲۰ اپریل ۱۹۷۱ء

یہی وہ سرزمین ہے جہاں حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ؒ (۱۱۱۴ھ۔
۱۱۷۶) کی دادی کے دادا جان شیخ قطب العالم ؒ کو ان کے پدر بزرگوار شیخ عبدالعزیز شکربار ؒ (م ۹۷۶)
نے سلوک و تربیت کے لئے بھیجا، یہاں ان کے خلیفۂ اعظم حضرت شیخ نجم الحق ؒ (م ۹۹۸) قصبہ جھنجھنو میں قیام
پذیر تھے، جو آج بھی میوات کے مشہور قصبہ جات میں ہے۔ اکبر اعظم (۱۵۴۲ - ۱۶۰۵) ان کے آگے سر عقیدت
خم کیا کرتا تھا، ان کی درسگاہ بڑی بارونق اور شاندار تھی، یہاں فصوص الحکم اور نقد النصوص اور اسی
قسم کی دوسری اہم کتابوں کا انتہائی تحقیق اور دیدہ وری سے درس دیا جاتا تھا، اکبر نے فتحپور سیکری
میں آپ کے لئے شاہی محل کے قریب عبادت خانہ بنوایا تاکہ خلوت میں آپ کے انفاس قدسیہ سے
فیضیاب ہو سکے، اور سہولت سے آپکی ملاقات اور مصاحبت سے شاد کام ہوتا ہے[1]۔

یہی وہ سرزمین ہے جہاں دارالعلوم دیوبند کے حقیقی بانی حاجی عابد حسین ؒ نے تربیت
پائی اور معرفت و ایقان کے مدارج عالیہ طے کئے۔ یہاں موضع سوندھ ضلع گوڑ گانوہ میں ان کے
مرشد قطب عالم میاں راج شاہ ؒ (۱۲۱۲ - ۱۳۰۹ھ) مقیم تھے وہ سراج الہند شاہ عبدالعزیز محدث
دہلوی ؒ (۱۷۴۶ - ۱۸۲۴) کے فیض یافتہ اور حضرت شاہ اسمٰعیل شہید ؒ (۱۷۷۹ - ۱۸۵۰) کے خلیفہ
و مجاز تھے[2]۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ دار و گیر کے بعد حاجی عابد حسین ؒ جب اپنے مرشد ؒ سے ملے تو حضرت
مرشد نے فرمایا: "عابد حسین کچھ کرنا چاہیے۔ اسلامیانِ ہند بے کس مپرسی، ایمان کی جان کنی اور مذہبی
تذبذب کے عالم میں ہیں وہ کسی بھی باہوش آدمی سے پوشیدہ نہیں اب اگر انکی صحیح رہنمائی اور دستگیری
نہیں کی گئی تو بس پھر ان کے ملی وجود کا خدا ہی حافظ ہے، اچھا استخارہ کرو، چالیس یوم کا چلہ کیا
گیا۔ اس دوران حاجی صاحب پر منکشف ہوا کہ "عوامی دینی مدرسہ قائم کیا جائے" اور اس طرح

---

[1] نزہۃ الخواطر (۴/ ۸۰)
[2] ملت راج شاہی (ص ۵، ۱۹۵، ۱۹۶)

مسلمانوں کی ہمت آفزئی، ان کی خدمت اور تربیت کی جائے، آپ کے مرشد میاں راج شاہ ؒ نے
فرمایا: میرا بھی مدت سے یہی خیال اور یہی احساس ہے[1] اس طرح دارالعلوم دیوبند کے ابتدائی تصور
کی داغ بیل بحیثیت ایک مدرسہ کے۔ سرزمین میوات میں پڑی۔

یہی وہ سرزمین ہے جس نے سرسید احمد خاں مؤسس مسلم یونیورسٹی علی گڈھ (۱۸۱۷ - ۱۸۹۸)
کی والدہ کی پرورش و نگرانی میں نمایاں کردار ادا کیا، سرسید مرحوم کے نانا آٹھ بھائی تھے، ان میں
سب سے بڑے اور بجھدار خواجہ نجیب الدین تھے، تمام بھائیوں کی اولاد کی پرورش و پرداخت انھیں
کے سپرد ہوئی[2] اور سرسید اپنی والدہ ماجدہ سے زیادہ متاثر اور پرتو پذیر تھے[3] خواجہ نجیب الدین
رسول شاہی گروہ کے، اپنے وقت میں سرخیل مولوی محمد حنیف کے خلیفہ و مجاز تھے، انھوں نے انکا
نام بھی بدل کر فدا حسین رکھ دیا تھا، یہ اپنی تربیت گاہ شہر الور کے جانب جنوب تکیہ جیلی شاہ میں
رخت اقامت ڈالے ہوئے تھے، وہیں اپنے بچوں کو اپنے زیر تربیت رکھا[4] الور میوات کا
مشہور تاریخی اور میوؤں کا اپنا بسایا ہوا شہر، صوفیائے میوات کا اہم مرکز اور علماء و فضلاء کا
مسکن اور اہل کاروں و ہنرمندوں کا ماوی، تھا۔

اسے میوات کہتے ہیں یہاں پر میو بستے ہیں — جو اپنی شانوں کے لفظوں میں خدا کے دیو بستے ہیں
انھوں نے غزنوی کے ساتھ طاقت آزمائی کی — سکوتِ شب کے پہرے میں خدا سے آشنائی کی
سکندر، پرتھوی جیسوں کو خاطر میں نہیں لائے — کبھی طبین سے ٹکرا لی، کبھی بابر سے ٹکرائے
شجاعت کے یہ متوالے، توانائی کے خوگر ہیں — یہ اپنوں اور پرایوں میں شناسائی کے خوگر ہیں
محبت اور رواداری ہے دستورِ حیات ان کا — پریم و آشتی کی جوت سے نورِ حیات انکا
"جیو اور ہمکو جینے دو" ہے پیغامِ حیات ان کا — مشقت اور محنت سے ہے پر جامِ حیات انکا

---

[1] راجشاہی کرن (مخطوطہ) اختصار کے ساتھ۔ [2] سیرت فریدیہ۔ [3] حیات جاوید ص ۱۸
و ۱۹ بحوالہ آثار الصنادید۔ [4] آثار الصنادید ص ۹۶ - ۹۰، تحفۃ الابرار ص ۳۲، ۳۳

یگانوں سے محبت ہے تو بے گانوں سے پیار انکو — جنون و بربریت سے ہمیشہ سے ہی عار انکو
پُر تُرد و عار مک اپرا سے بالکل دماغ انکا — اخوت کی مئے صافی سے مملو ہے ایاغ انکا[1]

یہ بڑی دلچسپ حکایتِ زندگی اور دلکش رودادِ حیات ہے، لیکن اصل موضوع تک پہنچنے کے لئے میوٌ قوم کا مختصر سا تاریخی و جغرافیائی پس منظر بیان کرنا ضروری ہے، اور ان کے قدیم مساکن کی نشاندہی۔

تاریخی پسِ منظر

"میوات" کا نام "میوٌ قوم" کی وجہ سے وجود میں آیا اس قوم کا ذکر میلانی کے نام سے تاریخی کتابوں میں جگہ جگہ ملتا ہے، اس قوم کے تاریخی حالات تاریخی اب لہجہ میں نہیں لکھے گئے گیبشر ولبانے اس قوم کو شجروں کی بنا پر راجپوتوں سے ملا دیا ہے۔ سر ایمش چندر دت کے بیان کے مطابق (۵۰۰ـ۵۰۰م) ایسا زمانہ گذرا ہے جس میں راجپوت قوم نے قدیم چھتریوں کی تباہی کے بعد اپنے آپ کو اس قابل بنایا کہ وہ ایک الگ قوم کی حیثیت سے وجود میں آگئے، اس لئے یہ روایت کہ "میوٌ" راجپوت قوم میں سے ہیں بے بنیاد ہے۔ میوٌ قوم کی پالوں اور گوتوں کی بنا پر یہ نتیجہ تو نکالا جا سکتا ہے کہ بعض راجپوت گروہ ان میوٌ قبائل کی اولاد ہوں جو شروع میں راجپوتانہ میں آکر آباد ہوئے۔

جیمس ٹاڈ نے اپنی کتاب "ٹاڈ راجستھان" میں میوٌ قوم کے متعلق بالکل ذکر نہیں کیا حالانکہ اس قوم کی تاریخ کے بغیر اس علاقے کی تاریخ ادھوری رہ جاتی ہے۔

میواڑ، جو اودے پور ریاست کا دوسرا نام ہے میوٌ قوم کی آبادی کی وجہ سے میواڑ کہلایا۔ H. Risely نے لکھا ہے کہ "میوٌ ایک انڈین آرین قوم ہے"۔ یہ ہندوستان میں شمال مغرب کی سرحد پار کرکے گروہوں کی شکل میں آئے اور ابتدا میں پنجاب میں رہے ـــ میوٌ قبیلے کا نام میوٌ تھا، آگے چل کر یہی قوم کا نام مشہور ہوگیا۔ اس قوم میں دوسری قوموں کے خون کی آمیزش نہیں۔ گویا میوٌ قوم نے تقریباً دو ہزار سال یا اس سے بھی زیادہ عرصہ تک اپنی انفرادیت کو قائم و برقرار رکھا۔[2]

---

[1] از خطبۂ استقبالیہ اردو کانفرنس تحریک میوات جوزہ ۱۰ اپریل ۱۹۶۳ء۔ [2] میوٌ قوم اور میوات ص ۱۱-۱۳

میدز یا میندز، جیسا کہ انکو مسلمان مورخوں نے لکھا ہے یقینی طور پر میندز دانی (قبائل) سے تعلق رکھتے ہیں جو اوکسس (oxus) کے جنوب میں دریائے میندرس (جیحون) کے نزدیک رہتے تھے، ان کا نام پنجاب میں چند کلاسیکل مورخین کے بیانات کے مطابق پہلی صدی عیسوی کے شروع کے بعد ہی پایا جاتا ہے اور کوئی مورخ ان کا ذکر پہلی صدی عیسوی سے پہلے نہیں کرتا، اس بنا پر میرا اندازہ ہے کہ وہ اپنے پڑوسی جٹی یا جاٹوں کے ساتھ آئے ہوں گے، جن کو وبا کی وجہ سے آکسس چھوڑ کر سندھ اور انڈیا آنا پڑا۔ میدز پنجاب میں ۴۰-۲۰ ق م کے قریب موجود تھے۔ گویا یہ اس بڑے قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں جو ہندوستان میں ۱۲۶ ق م کے لگ بھگ آئے اور انھوں نے اپنے صوبہ کا نام اندو سیتھین رکھا، میدز پنجاب کی تمام قوموں پر غالب تھے، اندو سیتھین فاتحین میں سے انھوں نے سب سے پہلے پنجاب فتح کیا۔

سیتھین نے اریا غالباً ۱۲۶ ق م کے قریب فتح کیا لیکن اندو سیتھین فتوحات ۲۹-۴۹ ق م کے لگ بھگ عمل میں آئیں، اس لئے اس وقت تک میدز جنوب کی طرف جاکر بالائے سندھ میں مضبوطی کے ساتھ جم گئے تھے اور اپنے دار الخلافہ کا نام من نگر (Man Nagar) رکھا، میوٌ وں کا بالائے سندھ پر قبضہ جاٹوں کی رضامندی سے نہیں ہو سکتا تھا اس لئے دونوں قوموں میں رقابتی جنگ شروع ہوگئی۔

مسلمان جب پہلی مرتبہ سندھ میں آئے تو میدز اور جاٹ ہی دو بڑی قومیں سندھ میں آباد تھیں گر میوٌ اولاً پنجاب میں آباد ہوئے تھے اور جاٹوں نے سندھ میں سکونت اختیار کی، گویا میدز قبائل پہلی صدی عیسوی میں سندھ کے حکمراں تھے، اور جاٹوں کے ساتھ ان کی رقابتی جنگ تھی جو اپنائیت کو ظاہر کرتی ہے۔

میدز قبائل کا ایک گروہ دوسرے قبائل کو سندھ میں چھوڑ کر راجپوتانہ میں غالباً دوسری صدی عیسوی میں داخل ہوگیا، شروع میں یہ میواڑ کے علاقے میں۔ جو مقابلتہً سرسبز تھا اور زرخیز بھی ـــ آکر آباد ہوگیا اور ان کی آبادی کی وجہ سے اس علاقے کا نام "میدپاٹ" ہوا

پھر بگڑ کر "میواڑ" ہو گیا، مید کی جگہ "میو" وجود میں آگیا اور ان کے نام کی وجہ سے علاقہ کا نام جہاں یہ قوم آباد ہوئی میوات ہو گیا۔[1]

عرب مؤرخین کے بیانات کے مطابق میو اور جاٹ حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے حام کی اولاد ہیں اور مغربی دانشور یافث کی اولاد بتاتے ہیں[2]۔ اور رشید الدین[3] مورخ نے لکھا ہے کہ یہ دونوں قومیں جنگ مہابھارت کے وقت سندھ میں موجود تھیں، جو ۳۰۰۰ ق م کے قریب تصور کی جاتی ہے

---

[1] اے کننگھم بحوالہ میو قوم اور میوات ص ۲۷ - [2] میو قوم اور میوات ص ۲۷

[3] رشید الدین فضل اللہ (۱۲۴۷ـ۱۳۱۵ء) چین میں اشاعت اسلام کے سلسلہ کا بہت بڑا محقق، عالم و فاضل طبیب، سیاستداں اور مورخ ہے۔ ان کا علمی کارنامہ ان کی ہمیشہ رہنے والی (زندۂ جاوید) تصنیف "جامع التواریخ" ہے، دولت شاہ کی روایت ہے کہ رشید الدین نے اپنی کتاب جامع التواریخ کو نماز فجر اور طلوع شمس کے درمیان تالیف کیا تھا، اس کتاب کی ترتیب یہ ہے: جزء اول: تاریخ مغول کے بارے میں۔ جزء ثانی: عام تاریخ، معلوم ہوتا ہے کہ رشید الدین بہت زبانوں سے واقف تھا: عربی، فارسی اور ترکی زبانوں کے علاوہ مغربی، چینی اور کشمیری زبانیں بھی جانتا تھا، اس ہفت زبانی کی بدولت اس کتاب کی تدوین میں بڑی سہولت ہوئی، تاریخ مغول کے موضوع پر یہ فارسی زبان میں بہترین جامع کتاب ہے اور علمائے تاریخ، خصوصاً مستشرقین کے نزدیک "جامع التواریخ" ان اہم اور ضروری کتابوں میں ہے کہ تاریخ ایشیا اور چین میں تاریخ اسلام کی بحث و تحقیق میں کوئی اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتے۔ جزء دوم کے شروع میں مقدمہ ہے جس میں روئے زمین پر نوع انسانی کے پھیلنے کا بیان ہے، پھر انبیاء کا ذکر آتا ہے، اس جزء کی قسم اول میں ملک فارس کے قبل اسلام کا بیان ہے اور قسم ثانی میں آنحضرت ﷺ، خلفاء راشدینؓ، خلفاء بنی امیہ و عباسیہ اور زوال بغداد کا ذکر آتا ہے۔ پھر ان حکومتوں کا ذکر جو ایران و افغانستان میں قائم ہوئیں: غزنوی، سلجوقی، خوارزم شاہی، آل بویہ، صفریہ (؟) ایک پھر اسماعیلیہ کا ذکر جو ادھر ادھر پھیلے ہوئے تھے۔ پھر سلجوقیوں کے ماسوا ترکوں کا ذکر، پھر چینیوں کا ذکر، پھر افرنج، ان کے بادشاہوں اور پوپ کا حال ہے، پھر ہند و گوتم بدھ اور اس کے مذہب کا ذکر ہے۔ (چین عرب کے تعلقات ص ۹۰،۹۷)

دراوڑی کے وقت آریاؤں کی نو آبادیاں دریائے گنگا کے کنارے ہستناپور اور دریائے جمنا کے کنارے اندرپرستھ (دہلی قدیم) تک پھیل چکی تھیں، جنوب مغرب میں متھرا سے لے کر دوارکا گجرات تک مشرق میں گنگا جمنا کے سنگم پریاگ تک پھیل رہی تھیں[1]۔ میو قوم کے چند خاندان جمنا عبور کر کے اپر دوآب کے مالک بن گئے اور ان علاقوں پر مسلمان فاتحین کے بعد بھی قابض رہے۔ علی گڈھ اور ایٹہ میں میو قوم کی آبادی تمام دوسری قوموں سے پرانی ہے۔

بارہویں صدی عیسوی کے آخر میں میو آبادی علی گڈھ، بلند شہر اور میرٹھ سے پرتھی راج کے حکم سے نکال کر ان کی جگہ راجپوت آباد کر دیئے گئے۔ میو بنئے ریو پورہ، چھتاری، گلاوٹھی اور میرٹھ جیسے قصبے اور شہر آباد کئے۔

حالات کی سنگینی کے باوجود میو آبادی یوپی کے اضلاع میں موجود رہی اور وقتاً فوقتاً میوات سے منتقل ہوتی رہی، مثلاً روہیلکھنڈ اور بریلی میں میو قوم ۶۲ - ۱۷۶۱ء کے قحط کے دوران میوات سے آئی۔ ۱۸۹۱ء کی مردم شماری کے مطابق میو قوم یو۔ پی کے ۲۹ اضلاع میں موجود تھی اور ان کی تعداد ۲۱۶۱۶ تھی۔ ان اعداد و شمار کی بنا پر ڈبلیو کرک (W.Creake) نے لکھا ہے:
"میو ایک مشہور قبیلہ ہے اگرچہ اس صوبہ میں ان کی تعداد اچھی خاصی ہے لیکن پھر بھی یہ لوگ یہاں اجنبی ہیں[2]"

۱۸۹۱ء کی مردم شماری کی روشنی میں اے کننگھم نے الور اور بھرت پور کی ریاستوں اور ضلع گوڑگانوہ میں تناسب کے لحاظ سے میو آبادی کو بہت اہمیت دی ہے۔ میو قوم ان علاقوں کے ایک تہائی زراعتی رقبہ پر قابض تھی۔ ۱۹۰۱ء کی مردم شماری کے مطابق میو قوم راجپوتانہ کی اٹھارہ ریاستوں میں سے تیرہ میں آباد تھی اور ان کی آبادی راجپوتانہ کی کل آبادی کا دو فیصد تھی، ریاست الور میں میو قوم زراعت پیشہ اقوام میں دگنی سے زیادہ تھی۔

ڈبلیو کرک اور اے کننگھم نے میو قوم کا سماجی درجہ امیروں اور دوسری زراعت پیشہ

---

[1] میو قوم اور میوات ص ۳۰ - [2] میو قوم اور میوات ص ۳۲۔

اقوام سے اونچا لکھا ہے مسلمانوں کے دورِ حکومت میں میو، میوات اور شمالی دوآب کے مالک تھے۔ ناصر الدین محمود اور غیاث الدین بلبن نے اس قوم کا قتلِ عام کیا، فیروز شاہ تغلق نے میوات کے حالات ٹھیک کرنے کے لئے فیروز پور جھرکہ میں ایک چھاؤنی ڈالی۔ جسے تاریخ میں حصار فیروزہ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے اس دور میں بہادر ناہر میواتی نے ۱۳۹۱ء میں دہلی پر قبضہ کیا، اور دہلی کے گرد و نواح میں لوٹ مار کی ۱۴۱۴ء سے ۱۴۴۴ء تک خاندان سادات کے بادشاہوں نے میوات پر بار بار حملے کئے

۱۴۵۰ء میں بہلول لودھی نے میوات پر حملہ کیا اور احمد خاں میواتی کو شکست دیکر تجارہ وغیرہ کے سات پرگنے واپس لے لئے اور تاتار خاں کو دیدیئے۔ بابر نے فتح پور سیکری کی لڑائی سے پہلے میوات میں لوٹ مار کرائی اور لوگوں کو بے گھر کیا تاکہ میو قوم لڑائی میں بابر کے خلاف پوری تیاری سے حصہ نہ لے سکے اور اس جنگ میں کامیاب ہونے کے بعد میوات کے انتظام کی طرف سب سے پہلے دھیان دیا۔ ہمایوں اور شیر شاہ کے زمانہ میں یہ علاقہ آزاد اور مطمئن رہا۔ سلیم شاہ سوری کے زمانے میں فیروز پور جھرکہ کے ارد گرد لڑائی ہوئی، اکبر نے میوات پر حملہ کر کے اسے فتح کیا، شاہجہاں نے میو قوم کی سرکوبی کے لئے کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا، اورنگ زیب نے میوات کے باغیوں کے خلاف اقدام اٹھائے۔

مرہٹوں کی لڑائی میں ۱۸۰۳ء میو قوم نے لارڈ لیک کی فوجوں کو بہت تنگ کیا۔ ۱۸۰۳ء میں انتقاماً ان پر ظلم کے پہاڑ توڑے گئے ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند کیا گیا۔ بلکہ صحیح معنوں میں آزادی و استقلال کی بھٹی کو تیز تر کر دیا جس سے انگریز بہادر کے چھکے چھوٹ گئے F. Tacker. لکھتے ہیں میوات کا علاقہ زرخیز نہیں ہے، اس قوم کے افراد کو اپنے ملک سے بہت زیادہ محبت ہے۔ اور وہ پکا ارادہ کئے ہوئے ہیں کہ اپنے ہی ملک میں رہیں گے یا مر جائیں گے۔ 'Smith' نے لکھا ہے "میو دلیر، جنگجو، بہادر اور محنتی ہیں، تمام زراعت پیشہ ہیں[1]۔ میو قوم نے شاہانِ دہلی کی حکومت کو میوات اور ابر دوآب میں تسلیم نہیں کیا

[1] میو قوم اور میوات ص ۱۲-۱۷

اس لئے میوات پر بار بار حملے ہوتے تھے (گزیٹر امپیریل) میو قوم تمام قوموں سے زیادہ آزادی کی دلدادہ رہی ہے (امید[1]) گاندھی جی نے کہا تھا "میو قوم ہندوستان کی ریڑھ کی ہڈی ہے اسے انڈین یونین چھوڑنے پر کوئی مجبور نہیں کر سکتا" (تقریر گاندھی جی گھاسیڑہ ضلع گوڑگانوہ ۱۹۴۷ء) اور "اگر ہندوستان میں میو قوم جیسا جذبۂ آزادی ہو تو چوبیس گھنٹے میں ملک آزاد کرا لوں[2]"۔

میو قوم کے قدیم مساکن (پرانے ٹھکانے)

میو قوم ۱۲۰ق م کے قریب وسط ایشیا سے آکر پنجاب اور بالائے سندھ میں حکمران ہو کر راجپوتانہ میں داخل ہو گئی، میو قوم انڈس اور تقریباً جمنا سے ملتے ہوئے علاقے میں آباد رہی ہے (لے۔ کننگھم، پٹنے)۔

میدز پنجاب کی تمام قوموں پر غالب تھے اور انڈو سیتھین فاتحین جیسے انھوں نے سب سے پہلے پنجاب فتح کیا سیتھین نے اور بیا غالباً ۱۲۰ق م کے قریب فتح کیا لیکن انڈو سیتھین فتوحات ۳۹-۲۶ ق م کے قریب عمل میں آئیں اس لئے اس وقت تک میدز جنوب کی طرف جا کر بالائے سندھ میں مضبوطی کے ساتھ جم گئے تھے، اور انھوں نے اپنے دارالخلافہ کا نام من نگرا Minnagara رکھا۔ میو کا بالائے سندھ پر قبضہ جاٹوں کی رضامندی سے نہیں ہو سکتا تھا، اس لئے دونوں قوموں میں رقابتی جنگ چھڑ گئی۔ مسلمان جب پہلی دفعہ سندھ میں آئے تو میو اور جاٹ ہی دو بڑی قومیں سندھ میں آباد تھیں، مگر میو پہلے پنجاب میں آباد ہوئے اور پھر سندھ میں۔ جاٹ شروع ہی میں سندھ میں آباد ہو گئے "اے کننگھم"[3]

یہ قوم بالائے سندھ میں حکمران رہی ہے، بالائے سندھ میں ارکھانا، سہوان

[1] میو قوم اور میوات۔ [2] تقریر جہانپارن ۱۹۴۳ء

[3] ، ، ص ۲۲

خیرپور کے صوبہ جات اور وہ حصہ جو سکھر کو کچھ گنڈوا سے جدا کرتا ہے، شامل تھے، ارکھا بہت زرخیز تھا، ان علاقوں پر کچھ عرصہ کے لئے سہی، میو قوم نے حکمرانی کے فرائض انجام دیئے[1]

میو قوم سمندر سے ملتان تک دریائے سندھ کے کنارے کنارے آباد تھی، دریائے سندھ اور قاصل کے درمیان انکی چراگاہیں اور آبادیاں تھیں[2] ۔ یہ لوگ ملتان کی سرحد سے سمندر تک دریا کے کنارے کنارے آباد ہیں دریا اور قاصل کے درمیان خشکی میں بہت چراگاہیں ہیں جہاں بہت سے گاؤں آباد ہیں وہیں "میدؔ" قوم جن کی تعداد بہت زیادہ ہے سردی اور گرمی کا موسم گزارتے ہیں[3] ۔

بدھ کا علاقہ ملتان کی سرحد تک ہے، جو سندھ میں داخل ہے، سندھ کے شہر بدھ مذہب کے پیروؤں کے ہیں، ان کو مید بھی کہتے ہیں، یہ طوران، مکران اور ملتان کے درمیان پھیلے ہوئے ہیں، اور منصورہ سے مغربی سندھ کی طرف زیادہ آباد ہیں، یہ اونٹ والے بھی کہے جاتے ہیں، دو کوہان والے قریہ اونٹ، جن کو خراسان اور فارس کے لوگ زیادہ پسند کرتے ہیں، اسی جگہ پیدا ہوتے ہیں[4]

قیقان جو ملک سندھ کے ان شہروں میں سے ایک ہے جو خراسان سے متصل ہیں[5] اس کے گرد و نواح میں میو قوم آباد تھی، چنانچہ عہد بنی امیہ کے ابتدائی دور میں مکران کی فتح کے بعد زیاد بن ابی سفیان نے راشد بن عمرو الجدید الازدی کو حاکم مکران مقرر کیا، وہ مکران آئے اور قیقان پر حملہ کیا اور کامیاب ہوئے، پھر میدوں سے جنگ کی اور اسی میں کام آئے[6]

عرب مورخوں کے حوالوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مکران، سندھ اور کاٹھیاواڑ کے ساحلوں پر رہنے والی ساری آبادی کو ـــــ جن کا پیشہ ہی بحری لوٹ مار اور قزاقی تھا ـــ مید کہا گیا ہے، بلاذری واضح طور پر لکھتا ہے کہ "میدوہ ہیں جو سمندروں میں ڈاکے ڈالتے رہتے ہیں۔

---

[1] میو قوم اور میوات ص ۱۳ ۔ [2] تاریخ سندھ ص ۲۱۹ ۔ [3] تاریخ سندھ ۲۳۲
[4] تاریخ سندھ ص ۲۳۲ ۔ [5] فتوح البلدان ترجمہ ج ۲ ص ۱۸۰ ۔ [6] فتوح البلدان ج ۲ ص ۱۸۰

. المید الذین یقطعوا البحر سندھ کے مید غالباً سندھ کے بحری ساحل کے میر بحر تھے۔ دیبل کی بندرگاہ میدوں کا مرکز تھی[1]

عباسی خلافت کے درمیانی دور تک سندھ میں اس قوم کی بود و باش کتب تاریخ میں مذکور ہے چنانچہ عہد عباسی میں سندھ کا گورنر عمران برمکی کسی مہم سے فارغ ہوا تو اسے "مید" لوگوں کی بغاوت کی خبر ملی، اسی وقت ان کے استیصال کے لئے پہنچ گیا۔ اور میدوں سے جنگ شروع کر دی، تین ہزار مید قتل ہوئے پھر اس نے ایک پل تیار کرایا اور اس کا نام "سکر المید" رکھا، اور اپنا لشکر دریائے الرور (ارور) یا الور کے پاس ٹھہرایا، بہت ممکن ہے کہ آج جس مقام کو سکھر کہتے ہیں، یہ وہی مقام ہو جس کو "سکر المید" کہا کرتے تھے، پل وغیرہ تو برباد ہو گئے اور نام تخفیف ہو کر "سکر" اور پھر "سکھر" ہو گیا[2]

مامون الرشید (۸۱۳ء-۸۳۳ء) کے دور میں سامرہ کے غلام فضل بن ماہان نے سندان پر قبضہ کر لیا اور خود مختارانہ آزادی سے حکومت کرنے لگا، اور ہوشیاری یہ کی کہ مامون کو ایک ہاتھی بطور نذرانہ پیش کر دیا، اور اپنی وفاداری کا یقین دلایا اور اس نے سندان میں عالیشان مسجد تیار کرائی، اور مامون عباسی کا خطبہ پڑھا، اس وفاداری کو دیکھتے ہوئے مامون نے بھی اسکی

---

[1] تاریخ ہند مترجم ص ۲۸۰-۲۳۹ ، لغت عربی میں ایسے لوگوں کو جو کشتی رانی اور کشتی چلانے کے فن میں طاق، اور سمندر کے احوال اور راستوں سے خوب آگاہ ہوں اور اچھی طرح واقف "میدؔ" کہتے ہیں سواحل سندھ پر ملتان سے علاقہ بحر فارس تک کثرت سے خانہ بدوش قومیں آباد تھیں، ان میں اکثر ملاح اور جہاز ران تھے مقامی حکومتوں کی کمزوری کے باعث بحری ڈاکو بن گئے، چھوٹی بڑی کشتیوں ـ بوارج ـ پر منڈلاتے پھرتے اور دریا میں اور ساحلی بستیوں میں لوٹ مار کرتے ـ مید کے لفظ میں ڈاکو کا مفہوم ہندوستان کا عطیہ ہے عربی لغت سے اس کا کوئی سروکار نہیں[1] ۔ عربی زبان میں دو حرف علت، قاعدے کے مطابق جمع نہیں ہوسکتے اور دو ساکن بھی، اس لئے میو کے واؤ کو دال سے بدلکر دال کو متحرک کر دیا۔ مَیْدْ ہو گیا

[1] فٹ نوٹ اردو ترجمہ فتوح البلدان ج ۲ ص ۱۸۰ [2] تاریخ سندھ ص ۱۸۲

خود مختاری تسلیم کرلی اس کا وارث محمد بن فضل اس کا لڑکا ہوا، وہ اولوالعزم حاکموں میں سے تھا، اس نے ستر کشتیاں مہیا کیں اور ایک فوج لے کر میدؔ قوم پر حملہ آور ہوا۔[1]

اہل سُرست[2] نے محمد ابن قاسمؒ کی بغیر جنگ اطاعت قبول کرلی تھی، سُرستؔ کے باشندے میدؔ ہیں اور سمندروں میں ڈاکے ڈالتے رہتے ہیں۔ آجکل (۲۵۰-۲۶۰) یہ لوگ اہل بصرہ سے برسر پیکار ہیں۔[3]

عمران برمکی نے اپنی فوج میں کچھ جاٹ بھرتی کرکے میدؔ قوم پر حملہ کردیا، جو شکست کے بعد ایک قلعہ میں محصور ہوگئے، اس قلعہ میں ایک تالاب تھا، اس کا پانی بہت شیریں تھا، اسی کو پیتے تھے، اور اپنی دیگر ضرورتوں کے لئے استعمال کرتے تھے، جب عمران کو یہ معلوم ہوا تو انجنیروں سے مشورہ کرکے ایک نہر کھدوائی اور اس تالاب سے (اندر گراؤنڈ) ملادی، اور اس میں کھاری پانی چھوڑ دیا جس سے تالاب کا پانی بھی کھاری ہوکر پینے کے قابل نہ رہا۔[4] اس کا تذکرہ فتوح البلدان (۲۳۶) میں بھی ہے مگر کچھ بدلا ہوا ہے۔[5]

ہباری خاندان کا مشہور فرمانروا — جس کی عرصہ تک سندھ میں حکومت رہی ہے عمرو بن عبداللہ ہباری ۳۰۳ھ میں تخت نشین ہوا، اس زمانے میں منصورہ کی حکومت نہ صرف بڑھ گئی تھی بلکہ وسعت اور سرسبزی وشادابی میں بھی کسی دوسری ریاست سے کم نہ تھی، اس بادشاہ سے زیادہ تر "میدؔ" لوگوں کی جنگ رہا کرتی تھی، یہ قدیم آرین قوم تھی جو وادیٔ سندھ میں آباد ہوگئی تھی، بڑی جنگجو اور وحشی تھی مسلمانوں سے پہلے اس کے حریف جاٹ تھے مگر بعد میں زیادہ تر انھیں سے برسرِ پرخاش رہا کرتی تھی۔[6]

قدیم جغرافیہ نویس ابن خردازبہ نے سندھ سے ہندوستان کا ساحلی راستہ

---

[1] تاریخ سندھ ص ۱۷۹-۱۸۰، [2] فتوح البلدان ترجمہ ج ۲ ص ۱۹۲، [3] تاریخ سندھ ص ۱۸۳-۱۸۲ بحوالہ الیعقوبی ۳۵۵/۲، [4] چچ نامہ مترجم ص ۲۲۰، [5] تاریخ سندھ ص ۲۰۶،۲۰۵

بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

ومن مهران الى اوتكين، وهي اوّل ارض الهند مسيرة اربعة ايام و في هذه الارض لصوص منها على فرسخين الميد (المسالك و الممالك ص ٦٢) اصطخری نے لکھا ہے:

والكفار في حدود بلاد السند انما هم البدة، وقوم يعرفون بالميد۔ والميد فهم على شطوط مهران من حد الملتان الى البحر ولهم في البرية التي بين مهران وتامهل مراع و مواطن كثيرة ولهم عدد كثير (المسالك والممالك ص۱۷۴)

اور مہران سے اوتکین، جو چار دن کی مسافت پر، سندھ سے ملی ہوئی مملکت ہند کا پہلا حصہ ہے اور یہاں چوروں کی آبادی ہے یہاں سے دو فرسخ پر میدؔ (میوؔ قوم) کا علاقہ ہے سندھی شہروں کے کافر بدھ ہیں اور ایک قوم مید کے نام سے مشہور وہاں ہے جو ملتان سے سمندر تک دریا کے کنارے کنارے آباد ہے، دریا اور تامہل کے درمیان خشکی میں ان کی بہت چراگاہیں اور ان لوگوں کے بہت سے گاؤں آباد ہیں اور یہ قوم بڑی مقدار میں یہاں ہے۔[1]

ایران وسندھ کے قدیم سیاسی روابط کی وجہ سے میوؔ قوم ایران میں بھی بحیثیت لشکر شاہی موجود تھی چنانچہ علامہ سید سلیمان ندویؒ فرماتے ہیں: سیاسی اعتبار سے یہ نہ بھولنا چاہئے کہ بلوچستان اور سندھ پر ایران کے شہنشاہ کا قبضہ رہا ہے، اس تعلق سے بعض جنگجو قبیلے فوج میں بھرتی ہوکر اور ایرانیوں کے ساتھ مل کر دشمن سے لڑتے جنہیں سندھ کے جاٹ، اور میدؔ قوم زیادہ ممتاز تھی، چنانچہ شروع اسلام میں جب ایرانیوں اور عربوں میں

---

[1] عرب وہند عہد رسالت میں۔

لڑائی ہوئی تو ایرانی فوج میں یہ جاٹ اور مید قوم کے لوگ شامل تھے جو ایران کے فتح ہونے کے بعد مسلمان ہوکر مسلمانوں کے دست و بازو بن گئے۔[1]

ہندوستان کی دوسری قوموں کی طرح عرب میں کبھی میو قوم کے افراد جا پہنچے اور وہیں آباد ہوگئے چنانچہ قاضی اطہر مبارک پوری نے لکھا ہے:

"ہندوستان کی قومیں اگرچہ عرب میں اپنا اقتدار براہ راست نہیں رکھتی تھیں، مگر مختلف وجوہ سے انکی حیثیت بلند تھی جس میں بڑا دخل ایرانیوں کے عرب پر قبضہ کو تھا ایرانی ایک طرف ہندوستان اور سندھ و بلوچستان کے راجوں، مہاراجوں اور یہاں کے عام لوگوں کو اپنے اثر واقتدار میں رکھتے تھے، اور دوسری طرف عربوں کے ساحلی علاقوں میں عراق سے لیکر یمن تک حاکمانہ طاقت رکھتے تھے، اس لئے ہندوستانیوں کو عرب کے ان حدود میں ایرانیوں کے توسط سے اقتدار نصیب ہوا... ہندوستان اور عرب کے قدیم ترین تجارتی تعلقات کے بعد ایران کے توسط سے اس حاکمانہ تعلق نے ان میں عرب سے مزید دلچسپی پیدا کی، اور یہاں کے لوگ ہندوستانی اشیار کی تجارت، عرب کے جہازوں اور کشتیوں میں ملازمت، اور عرب میں آباد ہوکر وہاں کی اقامت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے جس کے نتیجہ میں، عہد رسالت میں، عرب کے اندر ہندوستان کی مختلف قومیں اور جماعتیں رہنے لگیں، عرب ان کو اپنی زبان میں مختلف ناموں سے یاد کرتے تھے، چنانچہ عربوں نے اپنے ملک میں آباد ہندوستانیوں کو زُطّ، اساورہ، سیابجہ، احامرہ، مید (میو)، بیاسرہ، اور تکاکرہ (ٹھاکر) وغیرہ ناموں سے موسوم کیا۔[2]"

عرب میں ہندوستانیوں کے آباد ہونے کی دو نوعیتیں تھیں:-

(۱) جنگی قیدی جنھیں غلام بناکر عرب بھیجا گیا، وہ عرب کے قبائل کے ساتھ گھل مل کر

---

[1] مختصر تاریخ ہند ص ۳۰-۳۱، [2] عرب و ہند عہد رسالت میں ص ۱۴

رہنے لگے، گو یہ لوگ غلام تھے مگر ان کے عرب آقاؤں نے انھیں اس قدر آزادی کے مواقع مہیا کئے کہ یہ لوگ عرب کی آزادانہ فضا، اور مساویانہ ماحول میں رہنے لگے اور نئے تمدن و تہذیب سے کھل کر استفادہ کیا، اس گروہ میں علماء و فضلاء اور ادیب و شاعر بکثرت پیدا ہوئے اور نام پیدا کیا۔

(۲) وہ جو قحط و گرانی کے باعث ملک چھوڑنے پر مجبور ہوئے اور عرب میں آباد ہوگئے، ان میں جاٹ، میو اور سیابجہ کی کثرت تھی۔ خلافت راشدہ میں مید سیابجہ اور جاٹوں کی زیادہ آبادی عراق کے شہر کوفہ اور بصرہ میں تھی، اموی دور خلافت میں جب ان مقامات پر ان کی آبادی بہت بڑھ گئی اور ہند و عرب کے تعلقات میں وسعت و کثرت کی وجہ سے یہ لوگ ہندوستان سے زیادہ تعداد میں عرب جانے لگے تو ان کو شام کے ساحلی شہروں میں منتقل کردیا گیا۔[1]

یہ اس مغالطہ کی مستند تردید ہے کہ میو قوم عربی النسل ہے اور قبیلہ حضر موت سے اس کی نکاسی ہوئی، اس کے مورث اعلیٰ عبدالرحمٰن حضر موتی تھے جن کی سرکردگی میں یہ لوگ ہندوستان میں سلسلۂ اشاعت اسلام آئے اور یہیں کے ہو رہے، محمود غزنوی (۳۹۱/۱۰۳۵) جب ہندوستان آیا تو اس سے ان لوگوں کی ملاقات ہوئی اور انھوں نے اپنا تعارف کرایا، پھر کثرت استعمال سے حضر موتی موتی رہ گیا، اور یہی لفظ آگے چل کر میواتی ہوگیا، اور ان کی جائے سکونت کا نام "میوات" ہوگیا۔[2]

یہ قوم اپر سندھ میں حکمراں رہی ہے، اور مینا نگر (Mena Nagar) جو غالباً ٹھٹھ ہو سکتا ہے ان کا دارالخلافہ تھا، میوؤں کا اپر سندھ پر قبضہ جاٹوں کی رضامندی سے نہیں ہو سکتا تھا، اس لئے لڑائی کے بعد میو قوم کو یہ علاقے چھوڑ کر، اجمیر، میواڑ، جے پور، الور، بھرتپور، بیراٹھ، ماچاہیڑی

---

[1] خلافت بنو امیہ اور ہندوستان ص [2] "ترجمان میو" نامی ایک ماہنامہ ۱۹۳۶ء سے پہلے قرول باغ دہلی سے مولوی محمد سلیمان (مولوی فاضل) باجھوٹی ضلع الور کی زیر ادارت نکلتا تھا اس میں اس قسم کا مضمون نظر سے گذرا۔

متھرا، بیانہ، دوآبہ گنگ اور روہیل کھنڈ کی طرف جانا پڑا۔

اے کننگھم نے پلنے (Pliny) کے حوالے سے لکھا ہے کہ میو (Meos) انڈس اور جمنا کے درمیان

تقریباً جمنا سے ملتے ہوئے علاقے میں آباد تھے[1]

زمانہ قدیم میں میو قوم الور کی اروالی پہاڑی اور جمنا کے درمیان آباد رہی ہے۔ یہ علاقہ دو حصوں میں

تقسیم تھا: ایک حصہ متسیا (Matsya) کے نام سے پکارا جاتا تھا اور دوسرے حصہ کا نام سوراسینا

(Surasena) تھا۔

متسیا میں الور، جے پور، بھرتپور کا کچھ حصہ، بیراٹھ اور راجا پیٹری شامل تھے، سوراسینا

میں کاماں، متھرا، بیانہ، دوآبہ گنگ اور روہیلکھنڈ کے علاقے شامل تھے، اے کننگھم کے بیان کے مطابق

ان دونوں علاقوں میں راجپوتوں سے پہلے میو قوم آباد تھی۔

"راجپوتانہ کی قدیم ریاست میں علاقوں کی تقسیم اے کننگھم کے بیان کے مطابق حسب

ذیل تھی:-

(۱) مغربی راجپوتانہ: بیکانیر، مارواڑ، جیسلمیر، اجمیر، جے پور، شیخاواتی۔

(۲) مشرقی راجپوتانہ: الور، بھرتپور، دھول پور، گوڑگانوہ، متھرا، آگرہ، شمالی گوالیار

(۳) جنوبی راجپوتانہ: بوندی، کوٹہ، میواڑ، مالوہ، ٹونک[2]

سن ۱۹۰۱ء کی مردم شماری کے مطابق راجپوتانہ کی ان اٹھارہ ریاستوں میں سے تیرہ میں میو قوم آباد

تھی جس سے اس علاقہ میں انکی قدامت کا پتہ چلتا ہے ..... اور پلنے (Pliny) کے بیان سے، ان

کوائف کی روشنی میں یہ چیز بھی متحقق ہو جاتی ہے کہ تمام راجپوتانہ میو قوم کا مسکن رہا ہے، اسی لئے یہ علاقہ

میوات کہلاتا تھا۔ گویا محمود غزنوی (۱۰۰۲ ۔ ۱۰۳۰ء) کے حملوں سے پہلے گجرات کی شمالی سرحد سے

لیکر دہلی تک کا تمام علاقہ جس میں تمام راجپوتانہ شامل تھا۔ ملک میوات کہلاتا تھا، اور محمود غزنوی (۱۰۰۲-۱۰۳۰ء)

---

[1] میو قوم اور میوات ص ۲۸ ، [2] میو قوم اور میوات ص ۲۹

کے زمانے میں پردوآب کا علاقہ بھی میوات کا حصہ تھا کیونکہ یہاں میو قوم آباد تھی اور نئے شہر ابن قصبوں

کو آباد کر رہی تھی، میوات کی حدود تبدیل ہوتی رہی ہیں اور یہاں قبائل کی حکومت رہی ہے، چنانچہ بیٹسن (Hudson)

نے لکھا ہے:-

"متسیا اور سوراسینا میں باقاعدہ حکومتیں نہیں تھیں، ان علاقوں میں قبائل کی غیر منظم

حکومتیں تھیں جس کی حدود تبدیل ہوتی رہتی تھیں"[1]

بابر نے میوات کا علاقہ دو حصوں۔ صوبہ الور و تجارہ میں تقسیم کرکے دو حاکم مقرر کئے

اکبر نے اس علاقہ کو سرکار الور اور تجارہ میں تقسیم کرکے دونوں صوبے دہلی کے حصے بنا دیے۔

اٹھارویں صدی کے پہلے نصف میں میواتیوں کی حکومت کا جاٹوں نے مقابلہ کیا۔ کیونکہ جاٹ

اورنگزیب کے زمانے سے ہی ابھرنے شروع ہو گئے تھے۔ اور جنوبی میوات۔ بھرت پور، پر قبضہ کر لیا (آخر)

انگریزی حکومت کے ابتدائی زمانے میں میوات کی حدود حسب ذیل علاقوں کو شامل تھیں:

ریاست الور: رام گڑھ، بہادر پور، گوبند گڑھ، پیپل کھیڑہ، کشن گڑھ، اسمعیل پور، تجارہ۔

منڈاور تحصیلات۔

ریاست بھرتپور: گوپال گڑھ، پہاڑی، جرہیڑہ، کاماں، تحصیلیں اور بیانہ وغیرہ۔

صوبہ پنجاب: ضلع گوڑگانوہ کی فیروز پور جھرکہ، نوح، تاؤڑو، تحصیلیں تحصیلات

صوبہ یوپی: ضلع متھرا کا کچھ حصہ[2]

سن ۱۸۸۱ء کی مردم شماری کے مطابق میو قوم گوڑگانوہ ضلع کی کل آبادی کا چھٹا حصہ، الور، بھرتپور

کی کل آبادی کا آٹھواں اور سولھواں حصہ تھی: گوڑگانوہ (۱۱۳۶۹۳) الور (۹۷۰۰۰) بھرتپور (۴۷۴۹۲)۔

اے کننگھم نے گوڑگانوہ، الور، بھرتپور میں میو آبادی کے مندرجہ اعداد و شمار دیتے ہوئے لکھا ہے:

"تناسب آبادی کے لحاظ سے اس علاقہ میں میو قوم کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے، کیونکہ یہ

---

[1] میو قوم اور میوات ص ۳۰ ، [2] میو قوم اور میوات ص ۳۱

قوم ان علاقوں کے ایک تہائی قابل زراعت حصہ پر قابض ہے۔

میجر پاولٹ نے صرف ریاست الور کے متعلق لکھا ہے:

" ریاست الور میں میو قوم کی آبادی دوسری تمام قوموں سے زیادہ ہے، زراعت پیشہ اقوام میں میو قوم کی آبادی دگنی سے زیادہ ہے، ریاست الور کے تقریباً نصف حصہ پر میو قابض ہیں۔[1]"

سنہ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق ہریانہ میں میو قوم کی آبادی تقریباً دو لاکھ ہے، راجستھان میں تین لاکھ کے قریب ہے، اس لئے موجودہ میوات کی آبادی تقریباً پانچ لاکھ ہے، میوات سے باہر میو قوم یوپی کے اضلاع اور گوالیار، بھوپال اور مالوہ میں بھی آباد ہے۔[2]

اے کنگھم نے ۸۳-۱۸۸۲ء میں مشرقی راجپوتانہ کا جس میں الور، بھرت پور، دھول پور، متھرا، آگرہ، گوڑگانوہ اور شمالی گوالیار کا علاقہ شامل ہے۔ دورہ کرکے لکھا ہے: "یہ علاقہ راجپوتوں سے پہلے اور بعد میو قوم کے قبضہ میں رہا ہے، میو قوم کے آثار میں مقبرے اور مسجدیں ملتی ہیں، مسلمان میو اپنے قدیم آباؤ اجداد کی طرح شورش پسند رہے ہیں، میں نے الور کے علاقہ میں تجارہ، راج گڑھ، بارن نگر کے دار الحکومتوں کے علاوہ اندور، سرہٹہ اور کوٹلہ کے سرحدی قلعے بھی دیکھے ہیں، یہ مقامات میوات کے میوؤں کی تاریخ میں بہت مشہور تھے (آرکیولوجیکل سروے رپورٹ ۲۰)[3] چونکہ اس زمانے کی تاریخ نہیں ہے اس لئے ان کے حالات تفصیلی طور پر نہیں مل سکے ہیں۔

(میدہ) یا میو قوم سندھ چھوڑ کر جب راجپوتانہ میں آئی تو سب سے پہلے میواڑ کے علاقہ میں آباد ہوئی، اس ریاست کا نام اودے پور بھی ہے، میواڑ میں اودے پور، بانسواڑہ، ڈونگاپور اور پرتاب گڑھ شامل تھیں، میو قوم کی کلیسا پال نے جس میں چوہان پاہٹ میو بھی شامل ہیں۔ اس علاقہ میں جنم لیا اور

---

[1] میو قوم اور میوات ص ۹۲ ، [2] میو قوم اور میوات ص ۲۱ -

[3] میو قوم اور میوات ص ۵۶ -

یہاں میو قوم کے سرداروں نے، جو اپنی حکومتیں سندھ میں چھوڑ کر آئے تھے، حکومت کی، اس ریاست کی تاریخ کے متعلق چودھویں صدی عیسوی کے ابتدا تک کچھ پتہ نہیں چلتا ہے صرف چند سرداروں کے نام ملتے ہیں جن کا باقاعدہ سلسلہ نہیں۔ اودے پور کی بنیاد رانا اودے سنگھ نے ۱۵۵۹ء میں ڈالی — اجمیر کے میو راجہ کا نام مانک رائے ہے، یہ ۱۱۰۰ء کے قریب حکومت کرتا تھا، یہ راجہ کلیسا پال کے چوہان گوت سے تعلق رکھتا تھا جو میواڑ کے علاقہ میں تھے۔ جے پور آمبیر میں ۱۰۵۹ء کے لگ بھگ میو راجہ سساوت حکومت کرتا تھا جو ہرنگل پال سے تھا۔ بیانہ جیسا کہ ابھی گزرا سوراسینا میں شامل تھا، جہاں جادو میو آباد تھے، غالباً راجہ کنشک کے زمانے سے پہلے ہی یہاں آکر بس گئے تھے میو قوم کی پال چھرکلوت، ڈونگلوت، ڈمیروت اور دولوت کی ابتدا یہاں ہوئی اور کچھ آبادی یہاں سے جمنا عبور کرکے یوپی چلی گئی، اسلئے یہاں میو راجاؤں کا ہونا یقینی تھا جنکے حالات تاریکی میں ہیں۔ اس علاقہ میں میو قوم کی آبادی سب سے زیادہ تھی، اس قوم کی تاریخ قلعہ بیانہ اور اس کے گرد کھنڈرات سے وابستہ ہے۔

... قلعہ بیانہ کے چاروں طرف قوم میو آباد تھی، قلعہ کے کھنڈرات، گرے ہوئے محلات اور زمین دوز تہ خانے یہاں رہنے والی قوم اور اس کے سرداروں کی یاد دلاتے ہیں۔ گویا۔ آثار پدید است صنادید عجم را۔ راجپوت یہاں دسویں صدی عیسوی میں برسر اقتدار آنے شروع ہوئے مگر وہ اس قابل نہ تھے کہ مسلمان فاتحین کا مقابلہ کر سکتے۔ میو سرداروں نے ان لڑائیوں میں راجپوتوں کی مدد کی، اکتوبر ۱۰۱۸ء میں جب محمود غزنوی جمنا پار کرکے متھرا آیا تو اسی کو ٹکر لینی پڑی۔ کیونکہ راجپوت ابھی اس قابل نہ ہو سکے تھے کہ مسلمان فاتحین کا مقابلہ کر سکیں بجے پال ۱۰۴۳ء میں جادو راجپوت راجہ ہوا، اسی نے قلعہ کی مرمت کرائی اور اس کا نام بجے مندر گڑھ رکھ دیا۔ محمود غزنوی کے بعد اس علاقے پر غالباً ۱۱۱۱ء میں ابوبکر قندھاری نے حملہ کیا اور اس قلعہ کو فتح کر لیا۔ بجے پال کے بعد تہن پال نے میو قوم کی مدد سے حکومت کا کام سنبھالا اور اس کا نام تہن گڑھ رکھ دیا۔ جسے فرشتہ میں تھنگر لکھا ہے۔ میو قوم کی وجہ سے تہن گڑھ میو ریاست مشہور ہو گئی۔[1]

شہاب الدین غوری ۱۱۹۵ء میں دوبارہ ہندوستان آئے، غزنی سے روانہ ہو کر

---

[1] میو قوم اور میوات ص ۶۱

قلعہ جھنگر کہ بیانہ کی شہرت رکھتا تھا، فتح کیا، اور وہاں کی سرداری بہاء الدین طغرل خان کو عنایت فرمائی (فرشتہ) راجہ تہن پال شکست کھا کر بھاگ گیا مگر میو قوم اپنے ملک کے اس حصہ میں آباد رہی، اور اورنگ زیب کے زمانے تک مسلم سلاطین سے ٹکر لیتی رہی ۔۔۔ ہندوستان کی کوئی اور آرین قوم سوائے میو قوم کے تقریباً دو ہزار سال تک اپنے ابتدائی علاقوں میں آباد نہیں رہی ہے، لیکن قوم میو اب تک ان علاقوں میں آباد ہے [1]

میو قوم کی آبادی کا ایک حصہ دریائے جمنا عبور کر کے اپر دوآب میں داخل ہو گیا، اور صدیوں تک ان علاقوں پر ان کا قبضہ رہا، ایٹہ اور اپر دوآب کا علاقہ پہلے، اسلامی حملے کے بعد تک، ان کے قبضہ میں رہا، اس علاقے میں محمود غزنوی اور قطب الدین ایبک نے حملہ کر کے میواتیوں کو شکست دی، بندیل کھنڈ کے علاقے پر مختصر عرصہ کے لئے ان کا قبضہ رہا ۔۔۔ انکی زندہ جاوید یادگار یہاں کچھ گاؤں اور قصبہ جات ابھی تک آباد و پر رونق ہیں، چنانچہ ربوپورہ (Rabupura) تحصیل خورجہ ضلع بلند شہر میں ایک قصبہ ہے جسے ربو (Rabu) نامی میو نے گیارہویں صدی میں آباد کیا، یہاں سے میواتیوں کو جیسا اور راجپوت نے برٹش راج کے زمانے میں بارہویں صدی کے قریب نکال دیا۔ گزٹیئر ۲۲ ـ XXI گلاؤٹھی جو گلابو (Gulabu) میو نے آباد کیا یہاں میو کے اور بھی گاؤں ہیں ان میں چھڑاوک سب سے بڑا گاؤں ہے ۔ ۲۲۴ ـ XII پنڈراول راول (Rawal) میو نے بسائی، چھتاری، ضلع گڑھ گیارہویں صدی میں چھتر دھاری (Chhatar Dhari) میو نے آباد کی گزیٹیر ۱۹۰ ـ X ، ۱۹۰۱ء بندوبست رپورٹ میں میو قوم کی آبادی کو ان اضلاع میں سب سے قدیم بتلایا گیا ہے [2]

یہ ہے میو قوم کا مختصر سا تاریخی و جغرافیائی پس منظر ۔۔۔

میو قوم نے کب اسلام قبول کیا ۔؟

یہ سوال تفصیلی طور پر تو تشنہ جواب ہیں، جیسا کہ عنقریب آپ کو معلوم ہو جائے گا، البتہ

---

[1] میو قوم اور میوات ص ۶۱ ، [2] میو قوم اور میوات ص ۶۲ ۔

اب تک اس سلسلہ میں کسی نے اس کو موضوع بنا کر کچھ نہیں لکھا، تعجب ہے کہ ہندو پاک کے اہل قلم جب برصغیر ہندو پاک میں اشاعت اسلام پر بحث کرتے ہیں تو مالابار، سندھ، کشمیر، بنگال میں تو انھیں اسلامی آثار نظر آ جاتے ہیں، عرب تجار، محمد بن قاسم، اور کچھ صوفیہ ومشائخ کے ذریعہ ان ساحلی مقامات پر اسلام کا پیغام پہنچ جاتا ہے، مگر درمیانی حصہ وسط ہند ۔۔۔ ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے، اور جب ہندی اقوام کے قبول اسلام کا ذکر کرتے ہیں تو دو چار قوموں کے ذکر پر اکتفا کر لیتے ہیں، معلوم نہیں کیوں پوری ذمہ داری کے ساتھ دیدہ وری اور ژرف نگاہی سے کام نہیں لیتے، کسی ایک قدیم قوموں کا نام تک بھی ان تذکروں میں نہیں ملتا، میو قوم جیسی قدیم (ہند آرین) سکندر اعظم کا منہ توڑنے والی ہندوستان میں اشاعت اسلام کے سلسلہ میں شہید اول سید سالار مسعود غازی (۴۰۵ ـ ۴۲۴) کو گودوں میں کھلانے والی اور اس کے ساتھ شریک جہاد، سلسلہ عالیہ چشتیہ کی مساعی رشد و فلاح کی اولین جولانگاہ دار الخیر اجمیر اور اس کے ماحول میں آباد قوم کے ذکر اور اسکے اسلامی سوانح سے تقریباً سبھی تذکرے خاموش ہیں [1] ۔۔۔ مگر تاریخ کوئی الہامی شئے نہیں کہ اس پر اضافہ ناممکن ہو، ہمارے یہی واقعات زندگی کا ایک محفوظ ریکارڈ ہے، ہم ہی اس کے موجد، اس کے پاسبان، اور اس کی خوراک بہم پہنچانے والے ہیں، یہ جس طرح ہمارے مستقبل کی تفسیر بنکر حقائق کا انکشاف کرتی ہے، گاہے گاہے ہمیں بھی اس کی تفسیر بننا پڑتا ہے، کبھی یہ ہمارا دامن تھام کر ہمیں حقیقت کے قریب لاتی ہے تو کبھی ہمیں بھی اس کے لئے اپنا ذہن و فکر کے تانے بانے ۔۔۔ مضمحل اور سماج کی گرد آلود حقائق کی نقاب کشائی ۔۔۔ سے راستہ بنانا پڑتا ہے، اور اگر ہم ایسا نہ کریں تو تاریخ کا قافلہ رواں دواں ہونے کی بجائے حیرانی و سراسیمگی کے عالم میں قائم اور ساکت و جامد ہو کر رہ جائے یہ وہ مقام ہوتا ہے جہاں حقائق و واقعات کو فکر و قیاس کے ذریعہ پیوستہ کر کے تاریخ کے حوالہ کیا جاتا ہے، اس لئے میو قوم کے قبول اسلام سے متعلق جو واقعات اس وقت آپ کے سامنے آئیں گے، گو براہ راست اس قوم کی اسلام سے وابستگی و تعلق کی روداد ۔۔۔ منصوص طور پر ۔۔۔ نہیں ہوں گے، مگر انکی روداد حیات کے لئے نشان راہ بنکر اس کی ترتیب و تدوین میں معین و مددگار ضرور ثابت ہوں گے ۔

---

[1] اس سلسلہ میں دیکھئے آب کوثر ص ۵۲، ۲۱۹، ۲۴۲، یہ بڑی اہم متین اور سنجیدہ ماحول میں لکھی ہوئی کتاب ہے اور ملاحظہ ہو مخدوم جہانیاں جہاں گشت مطبوعہ ایجوکیشنل پریس پاکستان چوک کراچی۔ پروفیسر محمد ایوب قادری ص ۱ ـ ۶۲ (اگست ۱۹۶۳ء)

امپیریل گزیٹیر کے بیان کے مطابق میو قوم کے اسلام قبول کرنے کی تاریخ ۱۰۰۰ء یا اس کے کچھ بعد ہے،

مولوی میر محبوب علی میواتی قم دہلوی متوفی ۱۲۷۰ھ کے بیان سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے:

"میو قوم حضرت سپہ سالار مسعود غازی (۴۰۵ ش ۴۲۴ھ) کے دست حق پرست پر ایمان لائی۔ حدیث میں دو جماعتوں کی فضیلت وارد ہوئی ہے ایک اس جماعت کی جو ہندوستان میں غزوہ کرے گی دوسری وہ جماعت جو امام مہدی رضی اللہ عنہ کے ساتھ شریک غزوہ ہوگی۔ ہندوستان میں غزوہ کرنے والی حضرت مسعود غازی رحمۃ اللہ علیہ کی جماعت ہے۔ سید سالار مسعود غازیؒ کے غزوۂ ہند کے سبب اولین امیر قطب الدین حسنیؒ تھے، جو محمد ذوالنفس الزکیہؒ کی نسل سے ہیں اور قلعہ کرانا گھپور کے فاتح، آپکی قبر بھی اسی قلعہ میں زیارت گاہ خاص و عام بنی ہوئی ہے۔ آپکی اولاد اس علاقہ میں سادات قطبی کے نام سے مشہور ہے، ان میں بڑے بڑے اہل کمال پیدا ہوئے: سید علم اللہ نقشبندیؒ، سید ابو سعید قطبی جو حضرت شاہ ولی اللہؒ کے شاگرد و مرید۔ اور سید احمد بریلوی ش ۱۲۴۶ھ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے شاگرد و تربیت یافتہ، رحمہم اللہ۔"[۱]

تاریخ فرشتہ میں ہے: "اول جس شخص نے کہ ارباب اسلام سے ہندوستان میں قدم رکھا اور یہاں کے باشندوں سے جنگ کی مہلب بن ابی صفرہؓ تھے، یہ عرب کے امرائے کبار سے تھا اور غالباً ۴۴ھ (۶۶۴م) میں ہندوستان آیا، اور وہاں کے کفار سے جہاد کر کے دس بارہ ہزار ہندی اسیر کئے اور اس عرصہ میں بعض مردم ہندو نے رفتہ رفتہ خدا کی وحدانیت کا دل سے اقرار کر کے مسلمان ہوئے۔"[۲]

گر یہ بہت بعد کی بات ہے، اس سے پہلے میو قوم کے بہت سے افراد کچھ انفرادی طور پر اور کچھ اجتماعی حیثیت سے۔ لذت ایمانی سے سرشار ہو گئے تھے، جیسا کہ قاضی اطہر مبارکپوری کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے: جب اسلام کی آمد ہوئی تو عرب میں ہندوستان کی تقریباً چھ قومیں مختلف علاقوں میں آباد تھیں، زط (جاٹ)، سیابجۃ، مید (میو)، اساورۃ، احامرۃ اور بیاسرۃ وغیرہ کے نام عربی ادبیات اور تاریخ میں موجود ہیں، تقریباً یہ سب ہندوستانی تھے جو عرب کے مختلف علاقوں میں پائے جاتے تھے،

---

[۱] تاریخ الائمہ فی ذکر خلفاء الامۃ ص ۲۱۸، [۲] تاریخ فرشتہ ص ۴۰ بحوالہ میو قوم اور میوات ص ۶۵۔

بحرین، عمان، یمامۃ، قطیف، بحران، صحار، عدن، یمن اور مکہ و مدینہ زادھما اللہ شرفاً و کرامۃ وغیرہ میں عربوں کے ساتھ یہ لوگ بھی رہتے تھے، اور ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام اچھی طرح واقف تھے، اور ان کی ہیئت، شکل و صورت، تقالید و عادات اور نسل و رنگ کو پہچانتے تھے۔[۱]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت ملک عرب کے اطراف و جوانب میں غیر ملکیوں کی بہت زیادہ آبادی تھی، اور جب اسلام کی دعوت جزیرۃ العرب میں پھیلی، تو عربوں کی طرح وہاں آباد دوسری قوموں کو بھی اس سے واسطہ پڑا اور عربوں کی طرح عام طور پر وہ بھی مسلمان ہو گئیں۔[۲]

ان سوانح و کوائف کی روشنی میں کہ اسلام نے اپنی نورانی چاندنی پورے جزیرۃ العرب پر پھیلا دی، اور کوئی متنفس حجاز کی حدود میں خدا کے اس کرم بے پایاں سے محروم نہ رہا۔[۳] وہاں کی تمام آبادی اسلام کے نشاط آمیز ماحول، سکون بدور فضاء، اور گہوارۂ عاطفت میں آ گئی تو میو قوم کا وہ حصہ جو اس وقت عرب میں تھا۔۔۔ اور بکثرت انکی آبادی تھی جیسا کہ پچھلے صفحات میں گزرا۔۔۔ کس قاعدے اور ضابطے سے انکی ایمان سے محرومی کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے حقیقت یہ ہے کہ میو قوم اور جاٹ جس قدر بھی اس وقت جزیرۃ العرب میں تھے دولت ایمانی سے مشرف ہو گئے۔ البتہ بعض کتب تاریخ میں مرقوم ہے کہ عہد صدیقیؓ میں جب فتنۂ ارتداد نے سر اٹھایا، تو جاٹوں نے مرتدین کا ساتھ دیکر مسلمانوں سے مقابلہ کیا، مگر تاریخ میو قوم کے ذکر سے، یہاں، اس حد تک خاموش ہے کہ دور دور تک بھی اس کا تذکرہ نہیں، لیکن تاریخ نے جب میو قوم کی عرب میں موجودگی، اس کے مساکن، ٹھکانوں۔ کی نشاندہی اور پھر پورے عرب کے داخل ایمان ہونے کی روداد سنادی، تو اب اس کی خاموشی سے کیا حرج واقع ہوتا ہے، اس کا صاف مطلب ہے کہ میو قوم جس قدر اس وقت عرب میں تھی سب کی سب ایمان لے آئی، اور پھر پوری طرح اپنی اس ایمانی وابستگی اور مذہبی تعلق کو برقرار رکھا، جزافیۂ عالم پر ابھرنے والی دنیائے اسلام کی طرف میو قوم کا پہلا قافلہ تھا، پہلے یہ بدھ مت کے پیروکار تھے .... اور اب آغوش اسلام میں آ گئے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔

---

[۱] ہفت روزہ الجمعیۃ دہلی ۱۰ اپریل ۱۹۶۹ء ص ۱ کالم ۲۔ [۲] عرب و ہند عہد رسالت میں ص ۱۴، [۳] کتاب الفصل ص ۹۹ ج ۲

عرب و ہند کے درمیان قدیم ایام سے ایسے تجارتی روابط قائم ہو گئے تھے جنھوں نے دونوں علاقوں بلکہ تمام دنیا کی تاریخ پر گہرا اثر ڈالا جس کی تصدیق سے مورخین کو انکار نہیں، ہندوستان کی پیداوار اور دوسرے مال و اسباب کی اہلِ یورپ اور اہلِ مصر کو ہمیشہ سے ضرورت رہی ہے، عرب تاجر یہ مال جہازوں کے ذریعہ ہندوستانی بندرگاہوں سے یمن اور وہاں سے خشکی کے راستہ ملک شام پہنچاتے تھے جہاں یہ چیزیں پھر جہازوں میں لدتیں اور یورپ تک پہنچتیں۔

جب عرب نورِ اسلام کی روشنی سے منور ہوا تو عرب و ہند کے تعلقات منقطع نہ ہو گئے، مسلمان ملاحوں اور تاجروں نے اپنے پیشہ وروں کا کام برقرار رکھا، اور ان کی کشتیاں اور جہاز برابر عرب سے ہندوستان اور لنکا آتے جاتے رہے، جلد ہی ان کاروباری تعلقات کے ساتھ ساتھ سیاسی روابط بھی شروع ہو گئے جو شروع میں اس قدر خوشگوار نہ تھے۔ اسلامی عرب اور خطۂ ہند کا پہلا واسطہ جس کا تواریخ میں ذکر ہے آغازِ اسلام کے تھوڑے ہی عرصہ بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں ظہور پذیر ہوا، اور یہ واسطہ مخالفانہ تھا، مشہور مورخ طبری لکھتا ہے: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں حکم بن عمرو تغلبی اسلامی فوج لیکر مکران جا رہے تھے کہ راستے میں ایرانی فوج نے ان کا مقابلہ کیا، ایرانیوں نے اپنی مدد کے لئے سندھ کے راجا داہر سے فوج منگائی تھی جس میں زط و جاٹ اور میو قوم کے افراد تھے۔ جو عربوں کے خلاف صف آرا ہوئے، لیکن ایران و سندھ کی متحدہ فوجوں کو شکست ہوئی، جو مال غنیمت عربوں کے ہاتھ آیا اس میں ہندوستان کے ہاتھی بھی تھے۔ اسی زمانے میں بحرین کے عرب گورنر حضرت عمرو بن العاص ثقفی رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر کی اجازت کے بغیر عمان کے راستے ساحل ہند پر ایک لشکر بھیجا جو علاقہ بمبئی میں تھانہ اور بھروچ تک آیا۔[1]

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے چار سال بعد ۱۵ھ میں صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے انفاسِ قدسیہ سے ہندوستان فیض یاب ہونا شروع ہوا جبکہ امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عثمان بن ابی العاص ثقفی رضی اللہ عنہ کو بحرین کا حاکم مقرر فرمایا جنھوں نے ہندوستان پر فدائیانِ اسلام کے ذریعہ تین طرف سے فوج کشی کرائی، حضرت عثمان ابن ابی العاص ثقفی رضی اللہ عنہ نے بحرین و عمان کی تولیت کے ابتدائی عہد میں ہی اپنے بھائی حکم رضی اللہ عنہ کو بحرین بھیجا اور خود نے عمان پہنچکر مخلصین، رضاکار، فدائیانِ اسلام کی فوج تیار کی، اور اس کی قیادت اپنے بھائی حکم رضی اللہ عنہ کو دیکر ہندوستان بھیجا، اس مہم میں تھانہ (بمبئی) اور بھروچ (گجرات) دونوں ساحلی مقامات پر حکم بن ابی العاص

---

[1] آبِ کوثر ص ۳۱ - ۲۰۰

نے اپنی فوج لیکر حملہ کر دیا اور فتح پائی، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے دوسرے بھائی مغیرہ بن ابی العاص رضی اللہ عنہ کی زیر قیادت ایک رضاکارانہ بحری فوج دیبل کی طرف روانہ کی جہاں سے اسلامی لشکر مظفر و منصور واپس ہوا، دیبل اس وقت میو قوم کا جس قدر بھی وہ سندھ میں تھی، اہم مرکز تھا، اور اس کے آس پاس بھی اس قوم کی آبادیاں تھیں۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی فوج کشی محض توسیع مملکت کی خاطر تو ہوتی نہ تھی بلکہ اصل مقصد تھا اشاعت اسلام اگر اس سلسلہ میں کہیں کچھ گڑبڑ ہو جاتی تب کہیں جنگ کی نوبت آتی تھی، کامیابی عبارت ہے حصولِ مقصد سے، اس لشکر کا مظفر و منصور واپس ہونا صاف بتلا رہا ہے کہ انکی دعوتِ اسلام کی پذیرائی ہوئی، یہ اپنے منصوبے۔ اعلاءِ کلمۃ اللہ میں کامیاب و فائز المرام ہو کر لوٹے۔

جب یہ اسلامی لشکر ہندوستان سے واپس گیا تو حضرت عثمان ثقفی رضی اللہ عنہ نے امیر المومنین حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کو اسکی پوری تفصیل لکھکر بھیجدی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ چونکہ اس فوج کشی سے بے خبر تھے، اور اس سے پہلے بحری راستے سے اسلامی فوج کا واسطہ نہیں پڑا تھا اس لئے آپ نے عثمان ثقفی رضی اللہ عنہ کے اس اقدام کو ناپسند فرمایا اور تہدید آمیز خط لکھا کہ اگر اس خطرناک اور غیر منظم مہم میں مسلمانوں کا جانی نقصان ہوا تو تمہارے قبیلے سے ایک ایک کا بدلہ لوں گا۔[1]

عہدِ فاروقی میں سندھ پر پہلی مہم میں عثمان بن ابی العاص ثقفی رضی اللہ عنہ نے ۱۵ھ میں اپنے بھائی مغیرہ بن ابی العاص رضی اللہ عنہ کو دیبل کی جانب روانہ کیا جو کامیاب ہو کر واپس لوٹا۔[2]

گویا وفاتِ نبوی کے چار سال بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اسلام کی دولت لیکر ہندوستان تشریف لائے اس سرزمین نے بڑھ کر ان کا استقبال کیا، اور میو قوم اسلام کے آغوش میں آنی شروع ہو گئی، فرداً فرداً ہی سہی، اسلامی دنیا کی طرف میو قوم کا یہ دوسرا قافلہ تھا۔

ان مہمات کا تذکرہ مشہور مورخ اور جغرافیہ نویس علامہ بلاذری نے فتوح البلدان کے باب فتوح السند میں اس طرح کیا ہے:

وَلّٰی عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ   حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے عثمان بن ابی العاص ثقفی کو ۱۵ھ

عُثْمَانَ ابْنَ اَبِی الْعَاصِ الثَّقَفِیَّ الْبَحْرَیْنَ   میں بحرین و عمان کا ....

---

[1] عرب و ہند عہد رسالت میں ص ۱۹۳   [2] تاریخ ملت ج ۱۰ ۔ سلاطین ہند اول ص ۱۵

وعمان سنة خمس عشرة، فوجه أخاه الحكم إلى البحرين ومضى إلى عمان، فأقطع جيشًا إلى تانة (تھانہ بمبئی) فلما رجع الجيش كتب إلى عمر يعلمه ذلك، فكتب إليه عمر: يا أخا ثقيف حملت دودًا على عود، وإني أحلف بالله أن لو أصيبوا لأخذت من قومك مثلهم. ووجه الحكم إلى بروص (بھروچ) ووجه أخاه المغيرة بن أبي العاص إلى خور الديبل فلقي العدو فظفر به۔ (فتوح البلدان بلاذری طبع مصر ص ۴۲۰)

حاکم بنایا، عثمانؓ نے اپنے بھائی حاکمؓ کو بحرین بھیج دیا، اور خود نے عمان پہنچکر اسلام کے فداکاروں کا ایک لشکر تیار کرکے تھانہ بھیجدیا۔ لشکر جب کامیاب ہوکر واپس لوٹ آیا تو امیر المومنینؓ کو اسکی اطلاع لکھ بھیجی۔ حضرت عمرؓ نے انھیں سخت خط لکھا: اے ثقفی! تم نے کیڑے کو لکڑی پر چڑھا دیا ہے، خدا کی قسم اگر اس لشکر کو جانی نقصان ہوا تو اسی قدر تیری قوم سے قتل کرونگا۔ عثمانؓ نے حکمؓ کو بھروچ بھیجا اور اپنے چھوٹے بھائی مغیرہؓ کو دیبل (کراچی) بھیجا جو دشمن پر فتحیاب ہوکر کامران ہوا۔

تعجب ہے کہ عام مورخین خصوصاً ہند میں اشاعت اسلام کے مورخوں نے ہندستان میں مسلمانوں کی اس ابتدائی آمد اور یہاں کے تین مقامات پر انکے حملے اور انکی پذیرائی کا کوئی تذکرہ نہیں کیا، البتہ یاقوت حموی نے دیبل پر حضرت حکم ثقفیؓ کے حملہ کا ذکر کیا ہے: والديبل من ناحية السند مدينة على ساحل بحر الهند ..... وجه إليه عثمان بن أبي العاص أخاه الحكم ففتحها (معجم البلدان ص ۴۲۱ ذکر خور دیبل)[1]

ملت اسلامیہ ہند اور میو قوم خاص طور پر طائف اور اس کے قبیلے بنو ثقیف کا یہ احسان کبھی نہیں بھول سکتی کہ اس نے ہندستان۔ بالخصوص میو قوم کے قدیم مساکن کو۔ جہاں میو قوم پرانے دور میں بستی تھی، اپنی دینی اور روحانی توجہ کا مرکز بنا کر جب بھی اسے اقتدار ملا، اسکی طرف رخ کیا۔ عہد فاروقیؓ میں

[1] تفصیل عرب و ہند عہد رسالت میں ہے

عثمانؓ نے بحرین وعمان کی گورنری پاتے ہی اپنے دو بھائیوں حکمؓ اور مغیرہؓ کو یہاں اسلام کی برکت دیکر روانہ کیا، اور اموی دور حکومت میں حجاج نے عراق کی گورنری پاکر اپنے جواں سال بھتیجے اور داماد محمد بن قاسمؒ کو خلافت کے زیر اہتمام باقاعدہ اسلامی فوج کے ساتھ ہندوستان سندھ روانہ کیا، اور انھوں نے ہند وسندھ میں اسلام کی نشر واشاعت کے لئے راہیں ہموار کیں۔ فجزاهم الله عن جميع اهل الهند احسن الجزاء۔ یہ سب کچھ نتیجہ تھا دعائے نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا جو طائف شریف میں لہولہان ہوکر آپؐ نے بارگاہ رب العزت میں کی تھی: اللهم اهد قومي انهم لا يعلمون۔ اے اللہ میری قوم کو ہدایت سے نواز دے یہ ابھی جانتے نہیں۔ اور تشکیل تکمیل تھی آپؐ کی امید ورجاء کی جس کا آپ نے روح الامینؑ وملک الجبالؑ کی فرمائشوں کے جواب میں اظہار فرمایا تھا:

ارجوان يخرج الله عزوجل من اصلابهم من يعبد الله عزوجل وحده لا يشرك به شيئاً (بخاری ج ۱ ص ۴۵۸، ومسلم ونسائی[1])

مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ انکی اولاد سے کسی ایسے شخص کو پیدا کرے گا جو اللہ رب العزت کی عبادت کرے گا اور کسی کو اس کا شریک نہیں ٹھہرائیگا[2]

سنہ ۱۵ھ میں ہندوستان پر غیر منظم حملہ کے بعد عہد فاروقیؓ کی پھر کسی مہم کا تاریخ میں پتہ نہیں چلتا۔ عہد فاروقیؓ میں سندھ اور مکران کی حدود سے آگے براہ خشکی مجاہدین اسلام کے قدم نہ بڑھے۔ البتہ ایرانی فوج میں جو جاٹ اور میو شریک تھے ان کی ایک بڑی جماعت اسی دور (عہد فاروقی) میں مسلمان ہوگئی تھی جس کی تفصیل پیرزادہ پروفیسر محمد حنیف نے کچھ اس طرح پیش کی ہے:

”جب عربوں نے فارس پر حملہ کیا، انکی لگاتار فتوحات نے ملک ایران میں ایک زلزلہ پیدا کردیا تو یزدجرد۔ آخری شاہ ایران۔ دارالخلافہ چھوڑ کر اصفہان بھاگ گیا، اور راجپوتوں، جاٹوں کی فوج کو مسلمانوں سے لڑنے کے لئے اہواز کی طرف روانہ کیا، اس فوج میں جاٹ، اساورہ، سیابجہ، مید وغیرہ وہ اقوام بھرتی تھیں جو ملک فارس میں ہند سے جلاوطن ہوکر آگئی تھیں، جو ہندو قومیت اور ہندو مذہب کی بے اعتدالیوں سے

[1] حیاۃ الصحابہ ۲۰۳ ۔ [2] اردو ترجمہ مدارج النبوت ص ۹۹

بیزار ہو کر جلا وطنی پر مجبور ہوئی تھیں، اور اب پھر ناچار پارسی بادشاہوں کے ہاں فوجوں میں بھرتی تھے، ان کیلئے نامراد پارسی قوم و سلطنت کا زوال خود بڑا دلچسپ سوال تھا کیونکہ وہ بھی ہندو قومیت و مذہب کی طرح ان بہادروں کو گنوا کر خود عیش کرنا چاہتے تھے، کبھی ان بہادروں کو انکی بہادری کا وہ صلہ نہیں دیا گیا جس کے وہ مستحق تھے، انکو نہ اعلیٰ مناصب دیئے جاتے تھے نہ عام تہذیب و تمدن میں مساوات کا کوئی حق حاصل تھا، بہرحال جب انھوں نے پارسی بادشاہ کی نامردانہ فراری دیکھی، اور اپنی بابت یہ حکم پایا کہ "ہم تو بھاگتے ہیں تم جاکر عربوں سے لڑو،" تو انھوں نے اس مضحکہ خیز حکم کی وہی قدر کی، جو بہادروں کو کرنی چاہیئے چنانچہ وہ مسلمانوں سے لڑنے کی بجائے کلبانیہ نامی مقام پر جاکر ٹھہر گئے۔[1]

مسلمانوں نے دارالخلافہ فتح کرنے کے بعد ایران میں پھیلنا شروع کر دیا تھا، اور ان کا ایک دستہ عمارؓ، ایک فوجی جرنیل، کی ماتحتی میں انکی طرف بڑھا، یہ کلبانیہ سے اٹھکر ایک دوسرے مقام، رامہرمز میں خیمہ زن ہو گئے، اور یہاں ان کے ساتھ شاہ ایران کی ایک تازہ دم فوج بھی اصفہان سے آکر شامل ہو گئی، اس طرح اب گویا ان پر ایران کی قسمت کے فیصلے کا آخری انحصار تھا، عربوں کے قریب آجانے پر سارے لشکر کی ایک فوجی کونسل منعقد ہوئی اور ان کے کمانڈر نے کونسل کے پریزیڈنٹ کی حیثیت سے جو ایڈریس، خطبہ، دیا وہ انکے خیالات کا آئینہ دار ہے جسے ہم ایک نہایت معتبر عربی تاریخ "فتوح البلدان" سے لکھتے ہیں:-

"تمھیں خوب اچھی طرح معلوم ہے کہ میں نے تم سے اس فتحمند عربی قوم کی بابت کیا کہا تھا؟ میں نے تم سے پہلے ہی کہدیا تھا کہ یہ عرب انقلاب پسند ایران پر چھا جائیں گے، اور ان کے گھوڑے اپنی ٹاپوں سے دارالسلطنت فارس، اصطخر کے شاہی محلات کو روند ڈالیں گے، اب جو کچھ ظاہر ہوا وہ تم دیکھ رہے ہو، دیکھو اب وقت آگیا ہے کہ تم اپنی ہستیوں کی قدر کرنی سیکھو اور انکی جماعت میں داخل ہو جاؤ۔

[1] ان کے اس طرز عمل سے کم از کم یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ وہ ان تمدنی غلامیوں سے آزادی حاصل کرنے کے موقعے دیکھ رہے تھے جو مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی فتوحات، انکی نقل و حرکت، انکے عدل و انصاف، مساوات اور بہادرانہ قول و فعل کی شہرت سن سن کر وہ بجا خیال کرتے تھے کہ شاید اس طرح ہم عربوں میں ملکر اپنی اس نامبارک غلامی کو بآسانی توڑ پھوڑ کر پھینک سکتے ہیں، جو ہمیں باوجود شجاعت بھی غلام اور اجنبی ہی رکھتی ہے۔

ان کے مذہب کو قبول کرلو۔ یہ بات سب نے مان لی۔ پھر سپہ سالار نے شیرویہ کو دس آدمیوں کا ایک وفد لیکر عربوں کے کمانڈر ابوموسیٰ اشعریؓ کے پاس بھیجا، وہاں اس نے صلح و اتحاد کی شرائط پیش کیں، باہم معاہدہ طے ہو گیا۔[1]

"ہم نے متفقہ طور طے کر لیا ہے کہ ہم تم میں شامل ہو کر زندگی بسر کریں، اور تمہارا دین اختیار کرلیں، اس کے لئے ہماری شرائط حسب ذیل ہیں:

۱ تمہارے دوش بدوش ہم پارسیوں سے لڑیں گے

۲ اور اگر عربوں میں اختلاف ہو جائے تو ہم کسی پارٹی کا ساتھ نہ دیں گے، نہ کسی عرب سے لڑیں گے۔

۳ اور اگر عرب ہم سے لڑیں گے، تو ہم حفاظت خود اختیاری کو کام میں لائیں گے، ہر طرح اپنی خود مختاری قائم رکھیں گے، ایسی حالت میں ہمارا اور آپ کا معیار، حق پرستی، ہوگا، ہر ایک مظلوم کی اعانت مدنظر رکھے گا، پھر آپ کو چاہیئے کہ آپ ہماری اعانت و مدد کریں۔

۴ جہاں ہم چاہیں، رہ سکتے ہیں اور جن افراد کے ساتھ ہم مناسب خیال کریں، جو آپ میں سے ہی ہونگے، رشتۂ اخوت و برادری استوار کریں۔

۵ اور تمہارے ساتھ رہیں گے، اور ہر طرح آزادی قائم رکھیں گے

۶ نیز ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے شایان شان اعزازی برتاؤ کا وعدہ کرو

جب یہ تمام شرائط تمہارا پریزیڈنٹ منظور کرے گا اس وقت یہ عہدنامہ مکمل ہو کر نافذ العمل ہوگا۔[2]

[1] انا قد اجبنا الدخول معكم في دينكم على ان نقاتل عدوكم من العجم وعلى انه ان وقع بينكم اختلاف لم نقاتل بعضكم من بعض وعلى ان قاتلنا العرب منعتمونا منهم واعنتمونا عليهم وعلى ان ننزل بحيث شئنا من البلدان ونكون فيمن شئنا منكم، وعلى ان نلحق بشرف العطاء (فتوح البلدان مطبوعہ جرمن) [2] آل محمد ص [illegible]

یہ فوج اصل میں جاٹ اور میوؤں کی تھی جیسا کہ سید سلیمان ندویؒ کے حوالے سے آپ پہلے پڑھ آئے ہیں: "جب ایرانیوں اور عربوں سے لڑائی ہوئی تو ایرانی فوج میں یہ جاٹ اور مید قوم کے لوگ شامل تھے جو ایران کے فتح ہو جانے کے بعد مسلمان ہو کر مسلمانوں کے دست و بازو بن گئے"[1] راجپوت قوم چوتھی صدی میں بھی اس قابل نہ تھے کہ اپنا دفاع کر سکیں چہ جائیکہ دوسرے ملک میں جا کر فوجی خدمات انجام دیں۔
بہرحال میو قوم کا یہ پہلا قافلہ تھا جو عواطف و جذبات کی ہم آہنگی اور پورے شعور کے ساتھ داخل اسلام ہوا۔

جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا دور خلافت آیا تو آپ نے ہندوستان کی طرف توجہ فرمائی، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی محتاط روش کی روشنی میں عراق کے حاکم عبداللہ بن عامر کریزؓ کے ذریعہ حضرت حکیم جبلہ عبدیؓ کو ہندوستان کے سرحدی مقامات کے سیاسی اور ملکی حالات اور جہاد کے امکانات معلوم کرنے کے لئے یہاں بھیجا، مگر یہاں کے حالات جہاد کیلئے مناسب نہ تھے اس لئے مزید کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔

جب حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو سریر خلافت سپرد کیا گیا تو آپ نے سنہ ۳۰ھ کی ابتداء میں حارث بن مرہ عبدیؓ کو اجازت دی کہ وہ متطوعین اور رضاکاروں کی ایک جماعت لیکر ہندوستان کا رخ کریں[2]۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد سنہ ۴۴ھ میں مہلبؓ ابن ابی صفرہؓ نے ہندوستان کا رخ کیا اور بنوں پر فوج کشی کی[3]۔ بنوں اور اہواز و قیقان میں مقابلے ہوئے۔ یہاں کے باغی موجودہ سندھ میں آکر پناہ گزیں ہوئے، بنوں، یا بنہ، اہواز، قیقان، قدیم تاریخ میں سندھ ہی کے شہر تھے، پتہ نہیں اب کن ناموں سے پکارے جاتے ہیں، اور کہاں واقع ہیں[4]؟ حضرت مہلبؓ نے انکا تعاقب کیا، دریائے سندھ

---

[1] مختصر تاریخ ہند ص ۲۱، ۳۰۔ [2] عرب و ہند عہد رسالت میں، ص ۹۹ [3] فتوح البلدان فتح سندھ
[4] اس زمانے میں سندھ کی سرحد میں موجودہ مغربی پنجاب کا بڑا حصہ اور بلوچستان اور مکران کے مشرقی علاقے بھی شامل تھے اور انتظامی سہولت کیلئے کل مملکت چار صوبوں میں منقسم تھی (۱) سیوستان، (۲) برہمن آباد، (۳) اچھ (۴) ملتان دار السلطنت (موجودہ روہڑی یا سکھر کے قریب) الور تھا (حاشیہ آب کوثر ص ۲۲)

کو عبور کر کے ملتان تک فتح کیا، اسی لئے بہت سی مستند تاریخوں نے ہندوستان کا مسلمان فاتح اول حضرت مہلب ابن ابی صفرہ کو قرار دیا ہے[1]۔ ملتان اور اسکے ارد گرد اس وقت میو قوم کی آبادیاں تھیں، جیسا کہ ابھی آپ پڑھ چکے ہیں یہاں مقیم میو قوم کے افراد کے سامنے اسلامی لشکر مختصر ہونے کے باوجود فتحیاب ہوا تو وہ اس سے متاثر ہوئے، صحابہ کرامؓ اور تابعین عظامؒ کے اس گروہ کے ذریعہ محاسن اسلام ان کے تئیں ظاہر و باہر ہو چکے تھے، ان کوائف کی روشنی میں غور کرنا چاہئے کہ اسلام جیسے سدا بہار مذہب کی برکتوں سے کسطرح اور کیونکر محرومی ممکن ہے!؟ میو قوم ابتداء ہی سے دین و مذہب کی، فکر و عقیدہ کی حد تک، بڑی دلدادہ رہی ہے، یہ وارفتگی و شیفتگی ملتان کے میو باشندوں میں بدرجہ اتم موجود تھی، چنانچہ یہاں جسقدر بھی میو قوم آباد تھی اس کی اکثریت اسلام کے زیر سایہ آگئی۔

لنکا سے گذرنے والے جہازوں کو لوٹنے والی قوم مید (میو) ہی تھی۔ انھیں جہازوں کے مسافرین کی فریاد پر حجاج کی رگ مذہبیت جوش میں آئی، اور اپنے بھتیجے محمد بن قاسمؒ کو یہاں بھیجا، لوٹ اور غارتگری کوئی اچھے کام نہیں۔ جب کوئی بہادر قوم اور اولوالعزم جماعت تعلیم و ثقافت کی عمومی پرچھائیں سے محروم ہو اور اس کی ان فطری صلاحیتوں کا صحیح مصرف نہ ہو تو لوٹ مار اور غارتگری انھیں صلاحیتوں کا غلط مصرف بن جاتا ہے۔ بزم آرائی کے لب و لہجہ میں کہہ سکتے ہیں کہ وہ شجاعت و مردانگی کے بہادرانہ عزائم کا بے ساختہ و بے تابانہ اظہار اور حکومت وقت کی نااہلی کے خلاف ایک صدائے احتجاج ہے اس سب کے باوجود اگر یہ عزائم عمدہ کام کے سبب محرک بن جائیں تو انکی برائی اعمال خیر کے ڈھیر میں دب جاتی ہے۔

عربی اور اسلامی فوج کے حوصلے باہمی منافرت اور قبائلی عصبیت کے باعث پست ہو گئے تھے، بنو امیہ و بنو ہاشم کی لڑائیوں نے جن کے بہت بڑے مظاہرے جنگ جمل و صفین میں دیکھ کر چشم فلک خونبار ہو چکی تھی، اسلامی لشکر کے رخ زیبا پر قبائلی عصبیت کا داغ لگا دیا تھا، ارادوں میں اضمحلال

---

[1] اسلام کا نظام اراضی ص ۱۹۹ بحوالہ تاریخ فرشتہ، فتوح البلدان، زینی دحلان

پیدا کرکے مستقبل کو غیر یقینی سا بنا دیا تھا، انفرادی اور شخصی توانائیاں گو ختم نہ ہوئی تھیں، مگر اندیشۂ سود و زیاں اور فکر امروز و فردا سے وہ بری طرح متاثر ہو چکی تھیں، اجتماعی شعور پر جب گروہی عصبیت کے پردے پڑ جائیں اور فکر و نظر کے سرچشموں پر جماعتی بہرہ داریوں نصیحت و خیر خواہی کی جگہ نفرت و انتقام لے لے تو اجتماعی شجاعت و مردانگی، جذبۂ ایثار و جاں سپاری اور جرأت و ہمت متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی، ضرور ان قویٰ میں ضعف و فتور آجاتا ہے۔

الغرض عربی فوج متحد المقصد نہ رہی تھی، اس کے سپاہیوں میں یکجہتی مفقود اور ہم آہنگی عنقا تھی، ایسے وقت میں قبائلی عصبیت کی دھوم میں یہ چھیڑ خانی شروع ہوئی، اس سے عربی فوج کی غیرت جوش میں آئی اور وہ اپنی ماضی قریب کی باہمی لڑائیوں کو بھول کر دشمن پر حملہ کرنے کو آمادہ ہو گئی، اور آمادگی اس درجہ بیداری کا پیش خیمہ ثابت ہوئی کہ عرصۂ دراز تک عربی و اسلامی فوج کی فتحمندیوں کا بازار گرم رہا، اب جو ہتھیار بند ہوئے تو صدیوں تک الحمدللہ ہتھیار کھولنے کی نوبت نہ آئی، اور اسلامی فوج ظفر موج کی شان و شوکت رعب و داب، اور اس کی ساکھ دوبارہ قائم ہو گئی، پس اس چھیڑ خانی کا گویا اچھا پہلو تھا" اس نے حجاج کی رگ حمیت کو جھنجھوڑا، اور اس نے عربی بگڑی فوج کو خستگی و درماندگی کی حالت سے نکال کر ایک عالمگیر فاتح فوج میں تبدیل کر دیا، اور اس نے پھر مسلمانوں میں ولولۂ جہاد کو نہایت کامیابی سے زندہ کیا اور مسلمانوں کو دوبارہ ایک منظم و منتظم قوم بنا دیا[1]

یہ عجیب اتفاق تھا کہ محمد بن قاسم سندھ میں آکر جس وادی سے بھی گذرا، اور جس طرف کا بھی رُخ کیا، اسی قوم کا سب سے پہلے سامنا ہوا، اور اسی کا سب سے سیدھا مقابلہ، گویا اس نے اولاً عرب فوج کی غیرت و حمیت کو چیلنج کرکے اس میں حرارت پیدا کی، اس کا خون گرمایا، اور جب وہ تیار ہو گئی، تو اس کی جھینپ دور کرنے کے لئے سینہ تان کر اس کے سامنے آگئی، اور جب عربی فوج جوش جہاد سے پوری طرح بھرپور اور جمعیت و یکجہتی کے جذبہ سے معمور ہو گئی تو یہ قوم عرب فوج کیلئے معین ہو گئی، کچھ ایمان لاکر اور کچھ معاہدہ کرکے

---

[1] محمد بن قاسم کی عبارت فن حرب ص ۶۵

بہر حال محمد بن قاسمؒ جب ۹۳ھ میں یہاں سندھ میں آیا تو اس سے میوؔ قوم نے جنگ بھی کی، مگر بہت جلد وہ اس کی فتحمند قسمت کو بھانپ کر اس کے حلیف و مددگار بن گئے، کچھ اسلام قبول کرکے اس کے ساتھی ہوگئے، اور کچھ اپنے قدیم مذہب، بدھ مت، پر قائم رہ کر اس کی حمایت و نصرت پر کمربستہ ہو گئے۔ ابھی پوری قوم اسلام کے زیر سایہ نہ آسکی تھی، مگر یہ نیا حادثہ، محمد بن قاسمؒ کا مختصر سے لشکر کے ساتھ، ہندوستان جیسے وسیع و عریض ملک پر حملہ کرنا، ان کے لئے موجب فکر بن گیا، کیونکہ وہ براہ راست اس کی زد میں آتے تھے، ایک مسلمان فاتح سے اُن کا یہ سیدھا مقابلہ تھا، اس سے پہلے وہ اس قسم کے حوادث سے دوچار نہ ہوئے تھے۔

محمد بن قاسمؒ کے بلند اخلاق، حسن معاملہ، جرأت و ہمت اور اس کی نیک کرداری و جنگی حکمت عملی نے اس قوم کو مذہب اسلام کے قریب لانے میں مددگار ثابت ہوئی، اس نے اس علاقے میں اپنے ب ۔ ر ۔ م وین کی خاطر روانہ کئے اور حجاج کی اس نصیحت پر پوری طرح عمل کیا "ہر ایک کو کلمۂ اسلام کی دعوت دو، جو کوئی اسلام سے مشرف ہو جائے اس کی تربیت کرو"[1]

تبلیغ اسلام اور محمد بن قاسمؒ

محمد بن قاسمؒ نے قیام حکومت کے ساتھ ساتھ تبلیغ اسلام کے فرائض بڑی تندہی، جانفشانی اور ہمت و حوصلہ کے ساتھ بأحسن وجوہ انجام دیئے۔ تربیتی ادارے اور مساجد و مدارس قائم کئے، محمد بن قاسمؒ کے لئے حجاج کی واضح ہدایات تھیں کہ تبلیغ اسلام پر پوری توجہ دی جائے[2] اور

---

[1] چچ نامہ ص ۱۳۶ ۔ [2] پروفیسر محمد حبیب (علیگ) نے ایک جگہ لکھا ہے " اموی حکومت کی نسبت باقی امور میں خواہ ہماری رائے کیا ہو لیکن یہ ماننا پڑتا ہے کہ اسلام کی توسیع میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بعد کسی نے اتنا حصہ نہیں لیا جتنا (اموی) خلیفہ ولید بن عبدالملک اور حجاج بن یوسف ثقفی نے ۔۔۔ حجاج ایک ظالم اور جابر شخص تھا جس کے سیاہ کارنامے کی یاد اسلامی ذہن پر ایک ہیبت ناک خواب کی طرح مسلط ہے لیکن اگر حجاج سے لوگ سخت متنفر تھے تو اس کی تابعداری بھی بے چون و چرا کرتے تھے، جب ولید نے، جو اموی خلفاء میں سب سے زیادہ جری تھا، حجاج کو خراسان کا گورنر بنایا تو بلاد مشرق میں اسلام کی دوسری بڑی توسیع کا آغاز ہوا، خلیفۂ ثانی، فاروق اعظمؓ، ایرانیوں کو دائرۂ اسلام میں لائے تھے، اب حجاج کی بدولت ترک و تاتار حکومت اسلامی کے زیر نگیں آئے (حاشیہ آب کوثر ص ۲۲ ۔ ۲۱ بحوالہ اسلامک (باقی ص ۶۴ پر)

اس کا خاطر خواہ اثر بھی ہوا۔ دیبل کی فتح ۹۳ھ کے بعد وہاں چار ہزار مسلمانوں کی ایک کالونی آباد کی اور ایک مسجد تعمیر کی: وَاخْتَطَّ مُحَمَّدٌ لِلْمُسْلِمِيْنَ بِهَا، وَبَنٰى مَسْجِدًا وَّاَنْزَلَهَا اَرْبَعَةَ آلَافٍ[1] دیبل میں مسلمانوں کی آبادکاری، مسجد بنائی اور چار ہزار مسلمانوں کی وہاں ایک نگری بسائی۔

دیبل کے بعض اعیان و اکابر بھی مشرف باسلام ہوئے۔ چچ نامے میں دو حضرات قبلہ بن مہراج اور مولائے دیبلی کے نام ملتے ہیں۔ قبلہ بڑا عاقل، ادیب اور منشی تھا، اسلام لانے کے بعد دیبل کی حکومت اس کے سپرد کر دی گئی، چچ نامہ کے الفاظ یہ ہیں:-

او مردے عاقل و داہی بود، ادیب ہندو
نویسندہ ماہر و نیکو داں بود، محمد بن قاسم بروے اسلام
عرض کرد۔ و قبلہ را بعزِ اسلام مشرف گردانید، و بہ شہادت
مقر گشت، و دیوانے کہ بہ دیبل نصب کردہ بود او را
بوے سپرد و حمید بن وداع النجدی بہ ایشاں شحنہ
فرمود، حوالت آں ولایت کلی و جزئی بر سبیل ادارت
بوے مفوض فرمود۔[2]

وہ زیرک و فہیم، ادیب و منشی اور ماہر خطاط
تھا، محمد بن قاسم نے اسے بر اسلام پیش کرکے
اسے دولتِ اسلام سے مشرف کیا، اس نے اقرار
شہادت کیا، دیبل میں جو حکومت قائم کی تھی وہ
اس کے سپرد کی اور حمید بن وداع نجدی کو اس کا
کوتوال مقرر فرمایا اور اسے نواح کی ولایت کے جملہ
امور، کلی و جزئی، کا انھیں مختار کل اور مالک بنا دیا۔

محمد بن قاسمؒ ۹۳ھ میں ساحل سندھ پر اترے تو ان سے ملتے ہی سندھ کے حلقہ بگوش اسلام ہونے والوں میں ایک شخص مولائے اسلام تھے جنکو تاریخ میں مولائے اسلامی، مولائے دیبل اور مولائے اسلام دیبلی کے مختلف ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے۔

جب محمد بن قاسمؒ نے داہر کے دارالسلطنت اروڑ یا الور کو اپنے ماتحت کر لیا اور یہاں کے باشندے اس کے مطیع و فرمانبردار بن گئے تو رواج بن اسد کو جو احنف بن قیس کے نواسوں میں تھا،

(بقیہ حاشیہ، ص۶۳) کاہچر جنوری ۱۹۹۱ء ص ۸۳، ۸۴) — برصغیر ہندو پاک میں باضابطہ اسلام کی توسیع و اشاعت کا کام محمد بن قاسمؒ کے ذریعہ عمل میں آیا، یہ بھی حجاج کے کارناموں اعمال میں ہے جو کہ اموی خلیفہ ولید بن عبدالملک کے زریں کارناموں میں شمار ہوگا۔ [1] فتوح البلدان اردو ترجمہ ج ۲ ص ۴۲۵۔ [2] چچ نامہ ص ۱۳۶۔

الور کی گورنری سپرد کی، اور شرعی معاملات، دارالقضاء کے امور، اور منصب خطابت صدر الامام الاجل العالم برہان الملۃ والدین، سیف السنۃ، نجم الشریعۃ موسیٰ بن یعقوب بن طائی بن محمد بن شیبان بن عثمان الثقفی کے سپرد فرمائے، اور حکم دیا کہ رعایا کی دلجوئی لازم سمجھیں، امر بالمعروف نہی عن المنکر سے سستی نہ کریں، پھر ہر دو حضرات کو رعایا کے ساتھ مروت اور نرمی کی تاکید کی اور یہاں کی خود مختاری بھی عنایت فرمائی[1] اور وہاں مسجد تعمیر کی۔

۹۹ھ میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ جب خلیفہ ہوئے تو انھوں نے راجگان ہند کو خطوط لکھے، جن میں انھیں اسلام لانے کی دعوت دی گئی اور اسلام کی خوبیوں سے شناسا کیا گیا تھا، ان میں سے بعض نے اسلام قبول کر لیا[2]

آپ نے عمرو بن مسلم باہلی کو سندھ کا گورنر مقرر کرکے بھیجا، اور تمام ہندو راجاؤں کے نام حسب ذیل مضمون کے خطوط بھیجے "تم اسلام قبول کر لو، بت پرستی کی تاریکی سے نکل آؤ، اگر تم مسلمان ہو جاؤگے تو ہم تم کو تمہاری ریاست پر بدستور قائم رکھیں گے، تمہاری خطائیں معاف کر دیں گے تمہارے ساتھ سب مسلمانوں کے مانند سلوک کریں گے اور اپنا بھائی سمجھیں گے"[3]

جب یہ خطوط رؤسائے ہند کے پاس پہنچے تو سب سے پہلے جے سیہ ابن داہر نے اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کیا، اس کے بعد باقی راجاؤں نے بھی، جو عموماً اس کے رشتہ دار تھے اسلام قبول کر لیا سب نے اپنے پرانے ناموں کی جگہ عربی نام رکھ لئے[4] ان راجوں مہاراجوں میں میو قوم کے افراد بھی تھے، اگر تاریخ انکا نام محفوظ کر لیتی تو انکی نشاندہی سہل ہو جاتی اور پھر جیسا راجا ویسی پرجا، جو میو اس وقت گدی نشین نہ تھے وہ اپنے بڑوں کو دیکھ کر دولتِ اسلام سے بہرہ ور ہو گئے۔

۱۲۰ھ ابو عبداللہ محمد بن المنصور کے عہد خلافت میں اراولی پہاڑ فتح کیا گیا (تاریخ الخلفاء)[5]

---

[1] چچ نامہ ص ۲۲۵ ۔ [2] فتوح البلدان ص ۴۴۳ ۔ [3] اسلام کا نظام اراضی ص ۲۱۹، ۲۱۸
[4] تاریخ تراب ص ۲۸

جو میو قوم کا مسکن تھا اور اب بھی ہے، تاریخ طبری میں مذکور ہے کہ مسلم فاتحین کے ہاتھوں ہند میں دریائے سندھ اور گنگا تک کا علاقہ فتح کیا گیا، اس پورے علاقے میں میو قوم کی آبادی تھی، اس حملہ کے اثرات سے میو قوم کس طرح محفوظ رہ سکتی تھی؟ متاثر ہوئی، اور مبلغین اسلام نے اس دور میں اشاعتِ دین و مذہب میں پوری تندہی سے کام شروع کر دیا۔

اس کے بعد ۳۹۲ھ تک میوات پر جہاں میو آباد ہیں، کوئی اسلامی حملہ نہیں ہوا انفرادی طور پر قبولِ اسلام کی جو ابتدا عہدِ رسالت میں ہو گئی تھی بظاہر اس درمیانی عرصہ میں اس میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوا، مگر اندرونی طور پر وسعت ضرور ہوئی ہوگی، مسلمانوں کی ابتدائی تاریخ شاہد ہے کہ خیر سے مستفید ہو کر خاموش بیٹھے رہنا ان کے بس میں نہ تھا دوسروں تک اس خیر کا پہنچانا وہ اپنا فریضۂ زندگی سمجھتے تھے، اور اس کی ادائیگی میں کسی قسم کی کوتاہی کے روادار نہ تھے، اور نہ انھیں اس کے انجام دیئے بغیر سکون ملتا تھا، اس لئے یقینی طور پر میو قوم کے قدیم الاسلام افراد نے بھی اپنے غیر مسلم بھائیوں کو اسلام کی دعوت دی اور وہ ایمان و اسلام کے قریب ہوئے، اس کے لذت آشنا اور پھر اس کے والہ و شیدا ہو گئے۔

میو قوم تیرہ پالوں (بڑے قبائل) اور باون گوتوں (چھوٹے قبائل) پر مشتمل ہے، اب تک اس قوم کے جتنے افراد اسلام کے سایۂ عاطفت میں آئے تھے، وہ اگرچہ پوری قوم کے اعتبار سے انفرادی حیثیت رکھتے تھے، ورنہ فی نفسہٖ جتھے کے جتھے تھے اور جماعت کی جماعت ایمان لائی تھی، مگر چونکہ پوری قوم ایک جگہ آباد نہ تھی جو ایک کو دوسرے کی خبر ہو جاتی، اس لئے وہ پوری جماعت قوم کی نمائندہ نہ تھی، پوری قوم میں بحیثیت ایک قوم اسلام کے چرچے چوتھی ہجری کے اواخر اور پانچویں صدی ہجری کی ابتدا میں ہونے لگے تھے جیسا کہ راجپوتانہ گزیٹیر میں لکھا ہے میو قوم نے ۱۰۰۲ء سے اسلام قبول کرنا شروع کیا، اور اس کارِ خیر کی ابتدا سید سالار مسعود غازیؒ نے کی۔ مگر یہ بیان صحیح نہیں کہ میو قوم نے ۱۰۰۲ء سے سید سالار مسعود غازیؒ کے ذریعہ اسلام قبول کرنا شروع کیا۔ اس لئے کہ اسی سال تو وہ پیدا ہوئے تھے، کیا پیدا ہوتے ہی دعوت و تبلیغ کا کام شروع کر دیا تھا!

واقعہ یہ ہے کہ محمود غزنویؒ کے ہمراہ جو بزرگانِ دین و علم آئے تھے، انھوں نے اپنے کام

دعوت و ارشاد کی ابتدا اسلام میں کی، اور سب سے پہلے اسی قوم کو دعوت دی، انھیں مبلغوں میں ایک شیخ ابو شکور سالمی تھے، جو ابو محمد حسینیؒ کی فرمائش پر جو محمود غزنویؒ کے ہمراہ ہندوستان تشریف لائے تھے[1] انھوں نے میو قوم کو اسلام کی دعوت دی، اور پھر ان کے درمیان علم دین کی اشاعت کی خاطر رونق افروز ہوئے، یہ بزرگ چوتھی اور پانچویں صدی ہجری کے ہیں۔ انکی ایک کتاب بھی مسائل کلام سے متعلق مشہور ہے "تمہید المتہدی" یا "التمہید فی بیان التوحید" یہ کتاب ۱۳۴۰ھ میں قاہرہ سے چھپ چکی ہے[2]

سید سالار مسعود غازیؒ ۴۲۴ھ میں شہید ہو گئے اس لئے یہ ممکن نہیں کہ میوات جیسے دشوار گزار علاقہ کو فتح کر کے یہاں اشاعتِ اسلام کا کام مکمل کر لیا ہو، البتہ جو کام پہلے بزرگانِ دین نے شروع کر رکھا تھا، اس میں آپؒ نے اضافہ کیا، اور آپ کے حسن اخلاق اور آپکی سند روحانی صورت سے یہ قوم اس قدر متاثر ہوئی کہ پال کی پال آغوشِ اسلام میں آنی شروع ہو گئی، اس دور میں آگرہ، بیانہ اور متھرا سے لیکر ناگور و اجمیر تک مغرب میں اور دوآبہ رو ہیل کھنڈ تک، ریواڑی و نارنول تک میوات کی حدود پھیلی ہوئی تھیں جیسا کہ جغرافیہ میوات بعہد شہاب الدین غوری سے ظاہر ہوتا ہے۔

مرآتِ مسعودی، جو سالار شہیدؒ کی مکمل و مستند سوانح ہے اس میں سالار شہیدؒ کی میوات میں آمد کا کہیں تذکرہ نہیں[3] حالانکہ میوات سے آپ کا بڑا گہرا تعلق ہے جس کی مقامی روایت بھی مؤید ہے اور حیاتِ مسعودی میں اس کے واضح اشارات ہیں۔ مقامی روایت یہ ہے کہ: سالار مسعود غازیؒ کے جھنڈے کی سلامی کا رواج ۱۹۴۰ء تک میوات میں تھا جھنڈا چوپال میں گاڑ دیا جاتا تھا، عورتیں اور بچے نذر و نیاز چڑھاتے تھے، مجاور لوگ، جو جھنڈا لے کر آتے تھے تیسرے دن روانہ ہوتے تھے، وداع سے پہلے جنگی کمالات کا مظاہرہ ہوتا تھا۔

---

[1] تاریخ مشائخ چشت۔ [2] کشف الظنون (۱/۴۰۲) یہ عقائد کی کتاب ہے، اس کا قلمی نسخہ مدینہ منورہ کی شیخ الاسلام لائبریری اور ہمدرد نگر نئی دہلی کی لائبریری میں ہے مخطوطہ ۱۰۲۴ھ

[3] البتہ جائے پیدائش آپ کی اجمیر لکھی ہے، جو اس وقت میوات کا شہر مرکزی تھا۔

اور حیات مسعودی میں ہے:-

"ابوریحان البیرونی اور فتح نامہ (ترجمہ سر ہنری الیٹ ۱/۲۰۸) سے معلوم ہوتا ہے کہ جب محمد بن قاسم ثقفی رحمۃ اللہ علیہ سندھ سے قنوج فتح کرنے کے ارادے سے چلے، تو اودے پور تک پہنچے، مگر خلیفۂ بغداد نے (صحیح دمشق) انھیں واپس بلا لیا، اب اودے پور اجمیر کتنی دور رہ گیا تھا جو مسلمانوں کو وہاں پہنچنے میں دقت ہوتی، ایک بات اور قابل غور ہے مورخ حسن نظامی اپنی کتاب تاج المآثر میں جو اب کمیاب ہے، اور بارہویں صدی عیسوی میں تصنیف ہوئی (ترجمہ انگریزی مسٹر ہنری الیٹ ۲/۲۲۶، ۲۱۵ پر) لکھتے ہیں، کہ قطب الدین ایبک (۶۰۲ھ) کے اجمیر فتح کرنے کے بعد مذہب اسلام یہاں دوبارہ جاری ہوا۔ لفظ دوبارہ قابل غور ہے یہ عبارت اس وجہ سے مبہم ضرور ہے کہ قطب الدین نے اجمیر پر دو حملے کئے، اور ممکن ہے کہ "دوبارہ" سے مراد دوسرے کے نتائج ہوں مگر پوری عبارت پڑھنے کے بعد ہماری ناچیز رائے میں یہ مطلب بھی نکل سکتا ہے کہ قطب الدین ایبک کے پہلے حملے سے قبل بھی اجمیر میں مسلمان موجود تھے، اس سے قبل شہاب الدین محمد بن ہشام (صحیح سام) غوری کی فوجیں آئیں تو بجز محمودی فوجوں کے اور مسلمان کون ہو سکتے تھے، مغرب شمال میں ملتان اور پنجاب پر محمودی حملے کا نتیجہ ہوا کہ شمالی اور مغربی ہند میں جگہ جگہ مسلمانوں کی بستیاں قائم ہو گئی تھیں، اور ادھر اجمیر کے قریب ناردین یا نارائن پور پر بھی محمود کا حملہ ہوا، بقول ڈاکٹر ناظم صدیقی کے "یہ مقام ریاست الور میں ہے" ڈاکٹر صاحب موصوف کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ جب ہم نے ریاست الور کا نقشہ دیکھا تو ہم کو محض ایک مقام نارائن پور ہی نہیں ملا بلکہ اس کے جنوب مشرق میں تھانہ غازی کے نام سے اور ریواڑی کے اطراف، بلکہ تجارہ سے متصل شاہراہ عام کے قریب میں ہم کو ایک مقام سالار پور بھی ملا، نرائن پور سے اجمیر سو سوا سو میل ہوگا۔ العتبی نے (صفحہ ۲۶۲ ترجمہ انگریزی الیٹ) پر لکھا ہے کہ نردین پور یا نارائن پور فتح کرنے کے بعد محمود نے اپنے ملازم اور افسر یہاں چھوڑے، تعجب نہیں کہ تھانہ غازی انھیں حضرات کی یادگار ہو،

ان سب واقعات سے ہماری رائے میں یہ نتیجہ غلط نہ ہوگا کہ جب چاروں طرف سے اجمیر کے ملحقات مسلمانوں سے گھرے ہوئے ہوتے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ محمود کی نظر اجمیر پر نہ پڑی ہو اور وہاں مسلمان موجود ہوں۔ عہ یہی خیال سر ہنری الیٹ جیسے قابل مورخ مرآۃ مسعودی کی بنا پر اپنے نوٹ میں ظاہر کیا ہے، کہ محمود کے زمانے میں غالباً اجمیر میں مسلمان موجود تھے۔[1]

انڈین اینٹی کویری (۸/۲۰۹) پر مسٹر ولیم مو نے ریاست کی میو قوم کی بابت جس پر حال ہی میں ۱۹۳۲ء میں بغاوت کا الزام لگایا گیا، ایک مقامی روایت لکھی ہے وہ کہتے ہیں کہ ان لوگوں میں سالار مسعود غازی کا جھنڈا رہتا ہے، اور وہ محمد غوری (صحیح محمود غزنوی) کے بھانجے یا بھتیجے تھے، ان کا مزار بہرائچ میں ہے، انھوں نے یہاں ۹۸۹ قلعے فتح کئے، اور جو لوگ "مید" قسم کے ان کے زمانے میں مسلمان ہوئے وہ میو کہلائے اور یہ کہ یہ لوگ پہلے سالار مسعود کے جھنڈے کو پوجتے تھے مگر اب مولویوں کے وعظ سے یہ بات کم ہو گئی ہے، کیا تعجب ہے کہ اس مقامی روایت میں اس قدر سچائی ہو کہ بھنڈہ سے گذرتے وقت نرائن پور، تھانہ غازی، سالار پور وغیرہ کی طرف سالار موصوف کا دھاوا ہوا ہو، اور انھوں نے ان اطراف میں تبلیغ اسلام کے سلسلہ میں کافی وقت صرف کر کے کامیابی حاصل کی ہو، ان کے اس طریقے سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب انکو ایک جگہ تبلیغ میں کامیابی ہو جاتی تھی تو وہ آگے بڑھ جاتے تھے۔[2]

عہ یہ روضۂ متبرکہ حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم آواز آمد کہ: اے معین الدین حسن! تو معین دین مائی ولایت ہندوستان بتو حوالہ شد، برو و در مقام اجمیر اقامت نمائی کہ کفر دراں سرزمین بسیار است از رفتن تو دراں ملک اسلام قوی خواہد شد، و در دین کمالی رونق خواہی یافت (مونس الارواح ص ۳۰) حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اطہر سے آواز دی: اے معین الدین حسن تو ہمارے دین کا معین ہے، ولایت ہندوستان تیرے حوالے، جا اور اجمیر میں قیام کر کہ اس سرزمین پر کفر ابھی بہت ہے، تیرے وہاں جانے سے اسلام مضبوط ہوگا، اور دین اسلام کو رونق میسر ہوگی، گویا اسلام تو وہاں پہنچ چکا مگر کفر ابھی باقی ہے، لوگ پوری طرح اسلام کے سایۂ عاطفت میں نہیں آ رہے تھے، یہ تیرے وہاں جانے اور اسلامی تعلیمات کی نشر و اشاعت سے اسلام پوری طرح برگ و بار لائیگا۔ اجمیر اور اس کے اردگرد میو قوم آباد تھی، جب خواجہ خواجگان رح کو بھیجا گیا اور اسلام کی روشنی اچھی طرح پھیل چکی تھی مگر اس کو مستحکم کیا جا رہا تھا۔

[1]، [2] حیات مسعودی ص ۶۳-۶۴، ۹۳، ۹۴۔

اجمیر کے سلسلہ میں یہ روایت بھی دلچسپی سے خالی نہیں:

"اجانام راجہ اجلاد بھورا چوہان سے تھا، جو غزنی تک قابض ملک تھا، اس کا آباد کیا ہوا شہر ہے ..... اول دیوار جو ملک ہند میں پہاڑ پر بنائی گئی یہی دیوار ہے جو بالائے پہاڑ اجمیر ہے اور جس کا نام گڑھ بیٹلی ہے، اور تارا گڑھ بھی اسی کو کہتے ہیں، اور پہلا حوض جو ہندوستان کی زمین پر کھدوایا گیا پشکر ہے جو کہ اجمیر سے چار کوس ہے، اہل ہنود اس کو پوجتے ہیں، اور جو ہنود کہ قیامت کے قائل ہیں کہتے ہیں کہ قیامت اسی حوض سے پیدا ہوگی۔"[1]

ذرہ ذرہ پہاڑ بن جاتا ہے اور قطرہ قطرہ دریا، دھیرے دھیرے اسلام قبول کرتے میو قوم کو کافی عرصہ ہوگیا تھا، اب وقت آگیا کہ پوری قوم اسلام کے سایۂ رحمت و رأفت میں آجائے، کچھ فضا پہلے سے بن چکی تھی اور کچھ اب بننے والی تھی، اس سلسلہ میں منشی محمد مخدوم تھانوی تحصیلدار قصبہ تجارہ ریاست الور راجستھان بحوالہ مولوی محبوب علی لکھتے ہیں:-

"سلطان محمود غزنویؒ کی خلافت میں جب سپہ سالار سید مسعود غازیؒ عازم غزا ہوئے یعنی بعد سنہ ۴۲۴ھ کے ہندوستان آکر سنت سنیہ جدامجد کی پیروی فرما ہوئے، علاقہ میوات تسخیر فرمایا ہوا اور انوار دین محمدی صلی اللہ علیہ وسلم عیاں، راجپوت قوم سکنائے میوات خیل خیل مسلمان، اور بیعت اسلام قبول کرکے صاحب ایمان ہوئے ان میں سے اکثر ہم رکاب سپہ سالار صاحبؒ کے بہرائچ میں جاکر درجۂ شہادت پایا، اور جو شرف اسلام پاکر بیمار رہے ان کو لقب "میو" ہاتھ آیا۔ پانچ پال مفصلۂ ذیل اس وقت کے مسلمان ہیں اور وہ سب از نسل تومران: ڈڈوال، لنڈاوت، رتاوت، بالوت، پاہٹ، اور واضح ہو کہ اہل میوات گروہ کو پال کہتے ہیں اور ہر گروہ کے نام سے سوائے اسم پال مخاطب ہوتے ہیں یعنی گروہ والے معروف اسم پال ہوتے ہیں۔ اور تفریق پالوں کی آئی وقوع میں ان کے بزرگوں کے ناموں سے۔ چنانچہ ڈڈوال پال کا جدامجد ڈمرو نامی تومر، اور اس کے نام سے وہ پال ڈیروال مشتہر ہے بالاکثرت استعمال سے یہ ضرور کہ پال ڈمروال کا نام ڈیروال مشہور، موضع ملب حال پرگنہ نوح اس پال کا

[1] مناقب الحبیب مترجم ص ۴۰۔

اصل باس ہے۔ وہیں سے پال ڈیروال کی نکاس ہے اور لاڈو تومر کی اولاد پال لنڈاوت ہے موضع نیانہ متعلقہ پرگنہ کشن گڑھ انکی قدیمی جائے سکونت ہے، وہاں سے اٹھ کر وہ باگھوڑہ میں آئے۔ اس لئے وہ باگھوڑیہ کہلائے اور اولاد رتو کا پال رتاوت نام اور موضع ساہوری کہ جو اب پرگنہ الور میں ہے انکی سکونت کا مقام، اور پال بالوت اپنے جدامجد بالو کے نام سے نامزد، اور سیل کوہ پرگنہ نوح سے وہ برآمد اور کھلسا کی اولاد باسم پاہٹ موسوم ہے، مرزاپور متصل ہرسولی پرگنہ کشن گڑھ سے برآمدگی ان کی از روئے تاریخ دریافت مفہوم، اور وہ ان کے پہاڑ کے اس جانب اعنی ایسا روئے غرب بسکت۔ اس سبب سے نام پاہٹ اس پال کو شہرت ہے۔"[1]

اس قوم کا کچھ حصہ اسکے بعد آغوش اسلام میں آیا چنانچہ منشی محمد مخدوم صاحب موصوف ہی رقمطراز ہیں:-

"میراں سید حسین خنگ سوار کے دور میں، جن کا مزار اجمیر شریف میں ہے، اکثر میو مسلمان ہوئے۔ پال ہائے مفصلہ ذیل میوان اسی وقت کے مسلمان: دہنگل، سینگل، چرکلوت، ڈمروت، پونلوت، دولوت، نیائی، چنانچہ پال دہنگل کا مورث اعلیٰ ہر پال کی چھوٹا ہے اولاد راجہ نل سے جاگوں نے اسے سراہا ہے، اسکے چار پسر تھے، وہ باہم شریک حال یکدگر کے جیسی دہنگل ان سب میں بڑا تھا، پہلے وہ دین دار ہوا پھر ہر ایک چھوٹا بھائی اسکا پیروکار ہوا، ان چاروں کی اولاد ایک ہی پال قرار پائی، باسم دہنگل انکے زینت اشتہار پائی، رائے سینا سے وہ نکلے اور گھاسیڑہ آکر رہے، اس واسطے گھاسیڑیان کا لقب ہوا اور گوت اصلی دہنگل رہا اور اسی طرح سینگل نامی بزرگ کی اولاد بھی سینگل پال ہے۔ موضع پاٹن قدیم انکی سکونت کا محال ہے، مابقی پانچ پال یعنی چرکلوت، ڈمروت، پونگلوت، دولوت نائی باہم جنس ہیں، اور چرکلوت کوٹ کے اور ڈمروت بیوان کے اور نائی بیرنگ کے، اور دولوت سیکری، اور پونگلوت نیانہ کے قدیمی رہنے والے، وہاں سے اٹھ کر انھوں نے دیگر دیہات

[1] مرقع الور ص ۱۰-۹ ۔ مصنف کو مغالطہ ہوا ورنہ پاہٹ پال اور کلیسا کی پال دو الگ الگ پال ہیں۔ میو قوم اور میوات ص ۳۶، ۳۷، تاریخ میو چھتری ص ۲۵

میں رخت اقامت ڈالی، اور جس طرح دوسری پالیں اپنے بزرگوں کے ناموں سے معروف و مشہور ہیں، اسی طرح یہ پانچوں پال بھی اپنے اپنے بزرگوں کے نام سے نامزد۔

میراں صاحبؒ نے میؤوں کے ہمراہ یہاں کے غیر مسلموں سے غزوہ کیا، اس لڑائی میں بڑا کشت وخون ہوا ہے، اس زمانے کے مزارات سے یہ نواح نمونۂ دشت کربلا ہے، اور میں اکثر شہیداں مثل حکیم شہید (۴۲۱ھ)، غالب شہید (۴۲۲ھ)، مظفر شہید (۴۲۳ھ) وغیرہ اس غزا کے شہید، اور انکے تصرفات باطنی کے آج تک ہندو اور مسلمان مرید۔ قصبہ بوازی قطب الدین ایبک کا بسایا ہوا ہے، اور نشان آبادی اس بستی نے اسی سے نقش ظہور پایا ہے، ورنہ پہلے وہ مقام ویران تھا، ہاں قریب اس کے وہ دھند گڑھ آباد تھا، جو سید ابراہیمؒ بارہ ہزاری استاد سید سالار کی غزا سے مستاصل، اور اب نام ونشان بھی اس کا جہنم واصل۔ دھند گڑھ میں سید ابراہیم بارہ ہزاری کی معرکہ آرائی جنگ اس سمت کے کافروں کے ساتھ ہوئی، یہ سنہ ۴۲۰ھ اور سنہ ۴۲۳ھ کے مابین کا واقعہ ہے[1]

یہ میو قوم کے قبول اسلام کے مراحل تھے، گویا پوری قوم کو ایمان واسلام کی راہ طے کرنے میں پوری چار صدیاں گذر گئیں، مگر اب اس طرح ایمان واسلام سے لگن اور دلچسپی ہوئی کہ پھر کوئی میو قوم کا فرد اسلام سے باہر نہیں رہا، اب جب پوری قوم اسلام کے ظل عاطفت میں آگئی تو اب اس دولت بے بہا اور اس گنجینۂ لازوال کی حفاظت ونگرانی کی ضرورت تھی، یہ اللہ رب العزت نے اپنی سنت کے مطابق اس طرح پوری فرمائی کہ بزرگان دین ومشائخ قدیم اور علماء کرامؒ کی توجہ اس طرف مبذول فرمادی، ایسے اسباب فراہم کردیئے کہ یہاں قدیم دور سے ہی بزرگان دینؒ اولیاء کرامؒ اور صوفیائے عظامؒ کی آمد ورفت اور بود وباش کا سلسلہ جاری ہے، جو اس قوم کی اسلام کے ساتھ وابستگی وتعلق کو استوار ومضبوط بناتے رہے۔ فرحمهم الله تعالیٰ وجزاهم احسن الجزاء

---

[1] مرقع الور ص ۱۳، ۱۴

میوات کے مراکزِ رشد وفلاح

(۱) مدارس

پچھلے صفحات میں میو قوم کے اسلام سے بحث کی گئی، جہاں تفصیل سے اس قوم کی اسلام وایمان کے ساتھ وابستگی وتعلق کو مستند طریقہ پر بیان کیا گیا ہے، یہاں ہم یہ بتانے کی کوشش کریں گے کہ میو قوم اور میوات میں اسلام کی ضیاء بار کرنیں کس کس راستے سے پہنچیں، اور اس روشنی۔ نورِ اسلام وایمان۔ کو یہاں کیسے محفوظ رکھا گیا، اس کی دیکھ ریکھ اور نگرانی میں کیا کیا ذرائع استعمال ہوئے؟ اور ہمارے بزرگوں اور پرکھوں نے دولتِ ایمان کو ہم تک کیسے پہنچایا؟

ہندوستان میں اسلام کی نشر واشاعت، اور اس کے تحفظ وبقاء کی مساعی کو اگر مختصر طور پر کہنا چاہیں تو دو لفظوں میں کہہ سکتے ہیں۔ مدرسہ وخانقاہ

اسلام تلوار سے نہیں پھیلا۔ یہ ایک مسلّمہ تاریخی حقیقت ہے، یہ مذہب اپنی نشر و اشاعت میں کسی حکومت، کسی فوج اور کسی اقتدار کا مرہونِ منّت نہیں ہوا، اس کی تعلیمات اس کے آداب واخلاق، اس کا اسلوبِ حیات وطرزِ زندگی اور اس کی روح نے اسے چار دانگ عالم میں شائع وذائع کیا ہے اور یہ تمام امور یا مدرسوں سے متعلق ہیں یا خانقاہوں سے۔

آج مدارس وخانقاہوں کے متعلق جو کچھ کہا جارہا ہے اور کہنے والے غیر نہیں اپنے ہیں، تو حیرت بھی ہوتی ہے اور افسوس بھی۔ اسلام کی بقاء وتحفظ کے سلسلے میں خانقاہی خدمات کو۔ خصوصاً ہندوستان میں۔ نظر انداز کرنا ستم ظریفی ہے — مدارس وخانقاہوں کے سلسلے کو اگر ہندوستان کی اسلامی تاریخ سے علیحدہ کردیا جائے

تو اوراقِ تاریخ سادہ نظر آئیں گے، یہ تو اسلامی تعلیمات کے وہ پاور ہاؤس ہیں
جن کی کارکردگی ہمیشہ مسلسل جاری وساری رہی یہاں سے ایمان ویقین کے ابر گوہر بار
اٹھے اور اطرافِ عالم کو سیراب کیا، علم ویقین کی بادِ سحر چلی جو بحر وبر کو شاد کام کرتی چلی
گئی۔ اپنی روشن تاریخ اور تابناک ماضی سے اس قدر بے خبری ولاعلمی کسی زندہ قوم کا
شعار نہیں۔ کوئی مستقل قوم اور ملّت اپنے ماضی سے بے نیاز ہو کر مستقبل کو نہیں سنوار
سکتی۔ ماضی، استقبال کی تفسیر ہوتی ہے، یہ ایک اجالا ہے، روشنی ہے، اس کی راہ نمائی
میں مستقبل کی تعمیر جس عمدہ طریقہ پر ہوتی ہے، وہ کسی اور طرح ممکن نہیں۔

خانقاہی ماحول سے توحش نئی دنیا کی دین ہے۔ صاحبِ اقتدار قوم کی ہر دور میں
قدر ومنزلت کی گئی ہے، اس کے افکار وآراء کو نمونہ کے طور پر اپنایا گیا ہے مگر محکوم
قوم کے مذاہب میں اس کے طرزِ فکر کو مذہبی حیثیت سے کبھی نہیں اپنایا گیا، اور نہ اس
بااختیار قوم نے کسی پر دباؤ ڈالا کہ ہماری ہر چیز میں پیروی کرو، امنِ عامہ اور رفاہی
کاموں کے متعلق کچھ ضابطے بنائے اور مذہبی حیثیت سے انھیں آزاد چھوڑ دیا گیا، قدیم
مذہب پر جمے رہو یا نیا مذہب اختیار کرو۔

مگر یورپین اقوام جب اقتدار کی مالک ہوئیں تو انھوں نے اس بین الاقوامی
ضابطے کے خلاف جبر وطاقت کے بل پر ہر ادا کو ماتحت اقوام کے لیے لازمی قرار دیا، اپنی مذہبی
روایات، ادبی وسماجی حکایات اور تہذیبی وکلچرل افکار کو باقاعدہ مدون کرکے اپنے
بائی لاز میں شامل کیا، جس کی خلاف ورزی کو قانوناً واخلاقاً جرم تصور کیا گیا۔ یہود و
نصاریٰ نے مذہب کے ساتھ جو تمسخر انگیز اور سفاکانہ رویہ اختیار کیا ہے، اس سے
قرآن کریم بھی خاموش نہ رہ سکا اور ویسے ان کی مذہبی وسماجی تاریخ سے ان کے عبادت
خانوں کی جو شکل سامنے آتی ہے اور ان کی نیکی وپارسائی اور عفو وبخشش کا جو نظام بنایا
گیا ہے اس پر حیرت ہوتی ہے۔ ذرا سی عقل والا بھی اس کی غیر فطری تشکیل کو فوراً

محسوس کرلے گا۔

کلیسائی نظام میں، یورپ کی موجودہ نشأۃ ثانیہ سے پیشتر، بڑی عجیب وغریب
پابندیاں تھیں، فکر وتحقیق پر سخت پہرہ تھا، اجتہاد وجہ اضطہاد — مذہب کے باعث
ستم کا شکار ہوتا۔ تھا، وہاں مذہب نے انسانی افکار وخیالات پر ہر طرح کی پابندی
لگا رکھی تھی، جب نشأۃ ثانیہ یورپ کو میسر ہوئی اور کچھ باغی ذہن پیدا ہوئے تو انھوں
نے نہایت بے باکانہ طور پر کلیسائی کیا پورے مذہبی نظام کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ مسلم
نوجوانوں نے جب مذہب کے خلاف بغاوت کرنی چاہی تو انھوں نے بھی وہی رویہ اختیا
کیا اور خانقاہوں کو اپنی کھوکھلی تنقید کا ہدف بنایا یہ طرزِ فکر نہ پہلے صحیح تھا اور نہ آج —
خانقاہوں کو کلیسا پر قیاس کرنا بہت بڑی بھول ہے۔ اور اس طرح تنقید آزاد فکر
کی نہیں غلامانہ ذہنیت اور احساس کمتری کی دلیل ہے۔ اسلام نے انسان کو کسی بھی
کی ترقی سے نہیں روکا اور نہ فکر وتحقیق کو موردِ الزام ٹھہرایا، بلکہ اسے ہر طرح آزاد
بخشی صرف ایک شرط کے ساتھ کہ خداوند قدوس کی نافرمانی نہ ہو اور انسان
ایذا رسانی۔

ہندوستان کا مزاج تصوف وطریقت کے خمیر سے بنا ہے، یہاں زہد وتقویٰ
کے جو نوع بنوع طرق تھے وہ حیرت ناک بھی تھے اور تعجب خیز بھی، اس رجحان او
اس طریق کار کی پذیرائی یہاں کے گوشہ گوشہ میں پنہاں تھی۔ یہ ایک قسم کی سلامتی
طبع تھی، قبول حق کی استعداد میں اس اندازِ فکر ونظر نے اچھی خاصی جلا پیدا کردی
یہاں محنتوں اور ریاضتوں کا ایک عظیم سلسلہ تھا، طرح طرح کے مجاہدے تھے نفسا
خواہشات وآلودگی سے دل ودماغ کی صفائی، قلب ونظر کی تطہیر، اعمال وافعا
کی بازپرس، خدا کے سامنے جواب دہی اور مکافاتِ عمل جیسی ٹھیٹ اسلامی اصطلا
یہاں دوسرے ناموں سے موسوم تھیں۔

جب یہاں اسلام آیا تو اس کے قبول کرنے میں گو یک گونہ جھجک تو ضرور ہوئی، کہ اجنبی مذہب ہے دوسری دنیا سے درآمد ہوا ہے، مگر تھوڑے غور و فکر اور تاسّل کے بعد اسلام کی یہاں پذیرائی ہونی شروع ہوئی۔ اور اس طرح کہ پھر اسلام یہاں کا مقامی مذہب بن گیا۔ اور اجنبیت اس کے قبول کرنے میں کسی قسم کا روڑا نہ بن سکی۔

یہاں اسلام کے داخلے پر کسی قسم کی پابندی نہ تھی، اسلام کے ابتدائی دور میں جبکہ وہ جزیرۃ العرب سے باہر نکلنے کے لیے پر تول رہا تھا، ہندوستان میں اس کی نفحاتِ طیبات (بوئے دلآویز) کے جھونکے آنے شروع ہو گئے تھے۔ محمد بن قاسمؒ (۹۲ھ) سے اسی یا ستر سال پیشتر ۱۵ھ یا ۲۳ھ حسبِ بیانات مورخین، نواحِ سندھ کے بعض شہروں میں ایمان و اسلام کے چرچے شروع ہو گئے تھے۔

یہ واقعہ دیبل کا ہے جو سندھ کی اس دور میں مشہور بندرگاہ تھی، یہ شہر میدوں کا تھا جیسا کہ چچ نامہ کے مندرجہ اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے:

"دیبل بندرگاہ میدوں کا مرکز تھا (ص ۴۲۷)

داہر نے حجاج کے خط اور پیغام کو پڑھ کر جواب دیا تھا:

"یہ لوگ قذاق ہیں، ان سے زیادہ کوئی طاقتور نہیں، اور وہ ہماری اطاعت ہی نہیں کرتے۔ (حالانکہ)

میدوں کا دیبل بھی داہر بن چچ کی بادشاہت کی حدود میں تھا (ص ۱۲۱)

"سندھ کے مید غالباً سندھ کے بحری ساحل کے میر بحر تھے (۴۲۸)

اس آبادی میں ایمان کی بہار صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے عہد مبارک میں ہی آ گئی تھی، صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت حضرت مغیرہ بن ابی العاص ثقفیؓ کی زیرِ قیادت یہاں رضاکارانہ طور پر (حکومتِ وقت سے بے خبری میں) آئی اور اس

قوم کو اسلام کا شیدائی و فدا کار بنا یا۔

عہدِ نبویؐ میں میو قوم کا کچھ حصہ حجاز میں مقیم تھا جو تجارت و ملازمت کے سلسلے میں براہِ راست یا ایران کے راستے وہاں پہنچا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ والہٖ واصحابہٖ وسلم کی حیاتِ طیبہ ہی میں یہ لوگ اسلام کے زیرِ سایہ آ چکے تھے، ان کی آبادی حجاز کے دوسرے شہروں کے علاوہ مکہ مکرمہ اور طائف شریف کے درمیان وادی الفدی میں بھی تھی۔[1] اور حضرت مغیرہؓ طائف شریف کے باشندے تھے، اس لیے قرینِ قیاس

---

(۱) جاٹ اور میو۔ حسبِ روایات مورخین۔ عرب کے مختلف حصوں میں آباد تھے، عربی ادبیات میں بھی اس کا تذکرہ ہے اور کتبِ تاریخ میں بھی۔ مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ اور طائف شریف وغیرہ ہر جگہ ان کی منتشر آبادیاں موجود تھیں ــــ ہر قوم کے کچھ ایسے امتیازی اوصاف و خصائل ہوتے ہیں جن کے ذریعے وہ دوسری قوموں سے بآسانی ممتاز ہو سکتی ہے، اور وہ خصائل کسی بھی قوم کو دوسری قوم میں گھلنے ملنے نہیں دیتے۔ میو قوم کی کچھ ایسی ہی روایات ہیں جن کی بدولت یہ ہر جگہ شناخت کی جا سکتی ہے۔ میو قوم کا عمومی ذریعہ معاش یا کاشتکاری ہے یا اگر کچھ اور کام کی طرف رخ کیا تو فوجی ملازمت۔ کاشتکار کے پاس دو بیل ہونے ضروری ہیں۔ ریتیلے علاقوں میں ایک اونٹ سے بھی وہی کام لیا جا سکتا ہے جو دو بیلوں سے انجام پاتا ہے، گائے، بھینس اور بکری حسبِ حیثیت۔ لازمی سی سمجھی جاتی تھی، اور زمین، جس کا سینہ چیر کر گندم، جو، سرسوں، جوار، باجرہ، ارد، مونگ، ارہر، مسور، مکئی وغیرہ کی کاشت کرتا ہے۔ سرسوں اور گندم کے لیے زمین پر بڑی محنت کرنی پڑتی ہے، دس دس بیس بیس دفعہ کھیت جوتا جاتا ہے، ہل چلانے والا بہت سویرے اٹھنے کا عادی ہوتا ہے، وہ دو بجے یا تین بجے رات میں ضرور اٹھ بیٹھتا ہے، بیلوں کو کھلا پلا کر بہت جلد کھیت میں پہنچ جاتا ہے، صبح سات آٹھ بجے اس کی بیوی یا اگر کوئی بچہ ہو تو وہ اس کے لیے کھیت پر ناشتہ لے جاتا ہے، ناشتہ میں عموماً دلیہ، دودھ، لسّی اور روٹی ہوتی ہے، پھر

(باقی حاشیہ ص۷۸ پر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ)

دوپہر کو بیلوں کے لیے بھی چارہ اور ہالی کے لیے کھانا پہنچایا جاتا ہے ـــــ اور ان کا رہن سہن یہ ہے: کچی دیوار اور پولوں کا چھپر۔ یا پھر کچا کوٹھا (کمرہ) اور اس کے اوپر اٹریا جسے میڑھی کہتے ہیں، باورچی خانہ جسے یہاں اوساری کہتے ہیں پانی کے مٹکے وغیرہ رکھنے کی جگہ جسے پلینڈی کہتے ہیں، یہ چیزیں ان کی خاص طرح کی ہوتی ہیں جو کسی بھی قوم سے میل نہیں کھاتیں۔ اور گھروں میں جو قلعی۔ سفیدی۔ کرتے ہیں اس کی بھی یہاں مخصوص شکل ہے، پورے مکان میں سفیدی ہوگی مگر نیچے کے حصہ میں اور چھت سے متصل، دروازوں کے پاس جنگلوں کے اردگرد سرخ مٹی سے۔ جسے یہاں باتی کہتے ہیں۔ باڈر بناتے ہیں جس کے بیرونی کنارے عموماً پھولدار ہوتے ہیں۔ غلّہ کے لیے بھی ایک مکان ہوتا ہے اس کی دیوار ڈیڑھ دو انچ موٹی ہوتی ہے، اس میں سرکنڈے ڈال دیتے ہیں تاکہ دیوار پھٹنے نہ پائے، اس کی دو شکلیں ہوتی ہیں، اگر گول ہے تو اسے کٹھلا کہتے ہیں اور مربع کو کوٹھی۔ اس کی دیواروں پر نقش ونگار جو بنائے جاتے ہیں وہ چینی کتابت سے بہت مشابہ ہوتے ہیں۔ آرین نسل کی تمام قومیں اور راجپوت ہاتھ پیروں میں کڑا پہنتی ہیں۔ مگر اس طرح کہ ان میں باہم اشتباہ نہیں ہوتا، آسانی سے ہر قوم کے کڑے پہچانے جا سکتے ہیں ـــ ہزاروں سال کسی قوم کا کسی ایک ہی ڈگر پر چلنا بظاہر ناممکن دکھائی دیتا ہے، مگر ایسا نہیں، یہ ممکن ہے اور علاقہ میوات اور اس سے متصل جٹیانت میں اس کے زندہ ثبوت موجود ہیں، میوات میں ایک دو گاؤں جاٹوں کے ہیں بالکل وسط میوات میں، سینکڑوں سال سے وہاں رہ رہے ہیں مگر ان کی بود و باش، بول چال اور دوسرے معاشرتی طریقے وہی ہیں جو جٹیانت کے جاٹوں کے ہیں، اسی طرح جٹیانت میں مقیم میو اپنا رہن سہن نہ بدل سکے، اس سے اندازہ ہوا کہ ایک ڈگر پر چلنا بظاہر کسی قدر مشکل نظر آتا ہے مگر ناممکن نہیں۔ اس پس منظر میں سنئے ۱۹۵۰ء کے قریب میوات کے کچھ علما تبلیغی جماعت کے ہمراہ حجاز مقدس پہنچے، مولوی محمد حسن خاں صاحب مہتمم مدرسہ اسلامیہ درگاہ حضرت شاہ چوکھا، مولوی محمد اسحاق صاحب استاد حدیث و نائب صدر مدرسہ معین الاسلام قصبہ نوح ضلع گوڑگانوہ[1]، مولوی شہاب الدین نابر پوری۔ تینوں ثقہ،

[1] حال صدر مدرس جامعہ رحیمیہ درگاہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی۔

یہ ہے کہ میو قوم کے انھیں افراد نے حضرت مغیرہؓ کو یہاں آنے کی دعوت دی اور ان کے ہمراہ رضاکارانہ طور پر یہاں آکر اپنے ہم قوم افراد کو اسلام کی عظمت و اہمیت سے روشناس کرایا، اس کے محاسن و محامد ان کے ذہن نشین کیے، اس طرح گویا تبلیغی نقل و حرکت میو قوم کی بہت پرانی خصوصیت ہے۔

یہ پوری آبادی اسلام نہ لائی تھی بلکہ کچھ حصّہ ایمان لایا اور کچھ حصہ اپنے پرانے مذہب (بدھ مت) پر ہی قائم رہا۔ یہی لوگ تھے جنھوں نے عرب مہاجروں کی کشتیاں لوٹی تھیں۔ جن کے انتقام کے لیے حجاج بن یوسف (۴۰ھ = ۹۰ھ / ۶۶۰ء = ۷۱۴ء) نے محمد بن القاسم الثقفی (۶۲ھ-۹۸ھ / ۶۸۱ء-۷۱۶ء) کو بھیجا، انھوں نے ادھر اُدھر کے کچھ حصّے فتح کرنے کے بعد جب دیبل کا رخ کیا تو ان لوگوں نے

معتمد اور سمجھ بوجھ کے آدمی ہیں یہ روایت کرتے ہیں کہ وہ وادی الہدیٰ۔ مابین مکہ معظمہ و طائف شریف۔ گشت کرتے ہوئے پہنچے وہاں جنگل میں دیکھا کہ ایک عورت سر پر ناشتہ وغیرہ کچھ لے جا رہی ہے انھیں ایسا لگا گویا یہ میو قوم کی لڑکی ہے۔ پیروں اور ہاتھوں میں وہی میو قوم کے کڑے، اور وہ لباس جو میوات میں رائج ہے، انھوں نے اس کا اس طرح پیچھا کیا کہ اسے معلوم نہ ہو سکے اور انھیں اس کی منزل معلوم ہو جائے، وہ جنگل میں ایک جگہ جا کر رکی۔ وہاں ایک شخص ہل چلا رہا تھا، اس کے پہنچتے ہی اس نے بیلوں کو ٹھہرنے دستانے کے لیے وقفہ دی، اور جو کچھ یہ عورت لائی تھی اسے تناول کرنا شروع کیا۔ یہ لوگ اس کے پاس گئے اس سے گفتگو کی، اور اسے اپنی دعوت پیش کی، اس نے عربی مزاج کے مطابق ان کی دعوت کی اور اس کے قبول ہونے پر جماعت کی دعوت قبول کی۔ اس کے گھر جب گئے تو میوات کا سا گھر معلوم ہوا۔ یہ حضرات جب واپس آئے تو انھوں نے بیان کیا کہ عرب میں بھی بالکل میو جیسی معاشرت ہے۔ اس واقعہ کے ٹھیک اٹھائیس سال بعد جب راقم نے سنہ ۱۹۷۸ء میں اس موضوع پر کام شروع کیا تو بات کھل کر سامنے آگئی۔ (مؤلف)

وہ تمام قیدی ان کے حوالے کر دیے جو کشتیوں سے قید کیے تھے۔

محمد بن قاسم نے اولاً سندھ کے، اس وقت دارالسلطنت اروڑ یا الرور کے ماحول کو اپنے زیرنگیں لانا مناسب سمجھا اور ضروری بھی، پھر آخر میں اروڑ فتح کیا، یہ اس دور کا بڑا اہم سندھی شہر تھا! دیبل[1] میں محمد بن قاسم نے باقاعدہ ایک مسجد تعمیر کرائی اور چار ہزار مبلغ مسلمان وہاں

---

[1] دیبل یا دیول کا نام جس کے معنی سمندر کے میں یہ بتلاتا ہے کہ سمندر کے کنارے پر اس طرح واقع ہوگا کہ ہر جہازراں کی اس پر نظر پڑتی ہوگی۔ اور یہ اغلب ہے کہ جس بلند حصۂ ساحل پر اب منوڑا کا قلعہ واقع ہے اسی جگہ وہ مشہور مندر ہوگا جس کے نام سے دیبل بندرگاہ مشہور ہوئی اور مندر کی طرف سے اس پر حملہ کیا گیا۔ جو وجوہات اس امر کی مانع ہیں کہ ٹھٹھہ دیبل نہیں ہو سکتا بلکہ کراچی زیادہ قرین قیاس ہے۔ ان میں سے چند ذیل میں بیان کی جاتی ہیں۔ سراندیپ سے جو جہاز آتے تھے وہ طوفان میں ساحل دیبل پر پناہ لیتے تھے، اس لیے یہ مقام خشکی پر سمندر سے پچاس میل اور دریا سے سو میل دور نہیں ہو سکتا بحری قزاق جو جہازوں پر حملہ کرتے تھے وہ دیبل میں رہتے تھے اور ٹنگامارا قوم کے تھے، یہ ٹنگامارا قوم ساحل سمندر پر کراچی سے لاہوری بندرگاہ تک رہتی تھی۔ بلاذری خلیج دیبل کا ذکر کرتا ہے، اور خلیج فارس سے فوج جہازوں پر بھیجی گئی وہ دیبل میں آکر اتری تھی۔ ابن حوقل کہتا ہے، دیبل ایک بڑی بندرگاہ ہے جو ساحل سمندر پر واقع ہے اور بڑی تجارت گاہ ہے۔ اور مہران کے مغرب میں واقع ہے۔ اور اس جگہ بڑے بڑے درخت کسی قسم کے نہیں سب جگہ بنجر ہے۔ اور صرف تجارت گاہ ہونے سے مشہور ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ زرخیز و شاداب ٹھٹھہ دیبل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ کراچی دیبل کے مقام پر واقع ہے۔ اور یہ امر کہ دیبل منصورہ سے چھ منزل پر واقع ہے اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ٹھٹھہ دیبل کی جگہ نہیں بلکہ کراچی ہے اور منصورہ موجودہ حیدرآباد کی جگہ تھا۔ مراصد الاطلاع میں لکھا ہے کہ دیبل مشہور شہر ہے سمندر کے کنارے پر، اور اس مقام پر ملتان اور لاہور کے دریا سمندر میں گرتے ہیں۔ ان بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ دیبل سمندر کے کنارے پر واقع تھا۔ اور اغلب یہی ہے کراچی دیبل کے مقام پر واقع ہے۔ تاریخ ہندوستان بحوالہ امتحان الالباب لکافۃ الاطبار ص ۸۹۔

لا کر ایک مستقل کالونی آباد کی، یہ چار ہزار مسلمان گو مجاہد تھے مگر حقیقت میں یہ مبلغ تھے جو ان اطراف میں نومسلم قوموں کی ذہنی اور قلبی تعمیر، اور ان کی تشکیل سیرت کی خاطر یہاں بسائے گئے۔ اسلام ابھی یہاں (سندھ میں) اشاعت پذیر ہو رہا تھا، اور کافی پھیل چکا تھا مختلف طبقات پر اس کے مختلف اثرات مرتب ہو رہے تھے، ضرورت تھی کہ ان نومسلموں کو مذہب و دین سے متعلق قدیم تصورات سے ہٹا کر اسلام کے تصور مذہب سے شناسا کیا جاتا۔ اسی احساس ضرورت کا نتیجہ تھا کہ محمد بن قاسمؒ نے الور میں، اپنے زیر اثر آتے ہی، مدرسہ اور دارالقضار قائم کیے۔ یہ میو قوم کے کچھ ہی افراد ہی۔ کا پہلا دینی مدرسہ تھا۔

اس مدرسہ کو میوؤں کا مدرسہ اس لیے کہا گیا ہے کہ نواح سندھ میں عموماً اس وقت یہی قوم ایمان کے زیر سایہ آئی تھی، الور (راجستھان) اسی سندھ کے الرور۔ اروڑ۔ یا الور کی یاد کے طور پر آباد کیا تھا، دیکھیے: راجستھان اردو سمپوزیم منعقدہ جودھ پور ۱۹۷۶ء)

چچ نامہ ص ۲۲۵ میں اس مدرسہ اور دارالقضار کی تفصیل اس طرح ہے:

"جب محمد ابن قاسمؒ نے داہر کے دارالسلطنت اروڑ یا الور کو اپنے ماتحت کر لیا، اور سب لوگ اس کے مطیع و فرماں بردار بن گئے تو رواح بن اسد کو جو احنف بن قیس کے نواسوں میں سے تھا۔ الور کی گورنری سپرد کی، اور شرعی معاملات، اسلامی تعلیمات کا درس، دارالقضار کے امور اور خطابت وغیرہ کے لیے صدر الامام، العالم الاجل، برہان الملۃ والدین، سیف السنۃ، نجم الشریعۃ موسیٰ بن یعقوب بن طائی بن محمد شیبان بن عثمان الثقفیؒ کو منتخب و مقرر فرمایا اور حکم دیا کہ "رعایا کی دلجوئی لازم سمجھیں، امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں سستی نہ کریں۔ اور پھر ہر دو حضرات کو رعایا کے ساتھ مروت اور نرمی کے برتاؤ کی تاکید کی۔ اور انھیں یہاں کی خود مختاری بھی دی۔"

موسیٰ بن یعقوب کا خاندان علمی و فقہی حیثیت سے ہند میں مقیم خاندانوں میں بلند

مقام پر فائز تھا' اس کی اولاد کو ہر دور میں عزت و احترام کا مستحق سمجھا جاتا تھا' یہ حضرت عثمان بن ابی العاص الثقفی رض کا خاندان ہے جن کے جوشِ اشاعتِ اسلام کے صدقے میں ہندوستان میں اسلام کو پھلنے پھولنے کا موقعہ میسر آیا۔ ہندوستان اور بالخصوص میو قوم اور میوات کے اس محسن خاندان کا یہ علمی و دینی وقار شمس الدین التمش م ۶۳۳) کے عہد تک بھی موجود تھا' اس کے بعد تاریخ اس خانوادہ کے تذکرہ سے خاموش ہے۔

کمال الدین اسماعیل بن علی بن محمد ثقفی رح ایک بہت بڑے اور جید عالم۔ اسی خاندان کے ایک اہم فرد تھے اور ۶۱۳ھ میں الور شہر (سندھ) کے عہدۂ قضاء پر فائز تھے' چچ نامہ' عربی زبان میں ان ہی کے بزرگوں میں سے کسی کی تصنیف تھی' جسے بعد میں ابن علی کوفی نے فارسی میں منتقل کیا۔ (۱)

محمد بن قاسم رح ۹۳ھ میں ساحلِ سندھ پر اترے' ان سے ملاقات کرتے ہی سندھ کے بعض لوگ حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے' منجملہ ان کے ایک مولائے اسلام تھے' جن کو تاریخ میں مولائے اسلامی' "مولائے دیبلی" اور "مولائے اسلام دیبلی" کے مختلف ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے' یہ محمد بن قاسم رح کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے' نہایت زیرک و فہیم تھے' پہلے سے پڑھے لکھے' اور داہر کے دفتر سے متعلق معلوم ہوتے تھے' اسلامی تعلیم بھی انھوں نے بہت جلد حاصل کر لی' جس کے باعث محمد بن قاسم کے معتمد بن گئے (۲)

مدرسہ الور (سندھ) میو قوم کا اولین اصلاحی مرکز' تعلیمی سرچشمہ اور روحانی تربیت گاہ تھا' محمد بن قاسم کا یوں تو سارا ہندوستان مرہونِ منت ہے' مگر میو قوم خاص طور پر آپ کی احسان مند و منت پذیر ہے۔

---

(۱) "تاریخ سندھ ص ۳۵۶)

(۲) چچ نامہ ص ۱۲۷' ۱۲۰ بحوالہ فقہاء ہند ج اول ص ۶۳' ۶۵۔

سمت ۷۰۰ بکرمی مطابق ۹۵ھ اجمیر میں دولہا رائے تخت نشین ہوا' اس زمانے میں خلیفۂ اموی ولید بن عبدالملک نے اپنے مصاحب روشن علی کو سفیر بنا کر راجہ کے پاس بھیجا تھا' اتفاق سے اجمیر میں کسی گوجر عورت کی دہی آپ نے انگلی سے چکھ لی' اس زمانے میں چھوت چھات کا بہت زور تھا' اور کسی غیر قوم کا چھو لینا بہت سخت جرم تھا چنانچہ اس کی پاداش میں۔ سفارت کے اصولوں کے خلاف۔ روشن علی کی انگشتِ شہادت جس سے دہی چھوا تھا راجہ نے کٹوا لی' اس واقعہ کی خلیفہ کو جب اطلاع ہوئی تو بہت برہم ہوا' اور کچھ سوار اس نے انتقام کے لیے روانہ کیے جنھوں نے آ کر تارا گڑھ پہ قبضہ کر لیا' اور اجمیر میں پہلی دفعہ اذان کی آواز بلند اور ناقوس کی صدا بند ہوئی[۱]

یہ روایت اگرچہ کسی قدیم تاریخی کتاب میں نہیں ملتی مگر خواجۂ اجمیر کی سوانح حیات میں اس کا تذکرہ بامعنی ہے کچھ نہ کچھ حیثیت تو اس کی ماننی پڑتی ہے' اس سے اس دور کے ماحول میں جاری و ساری جذبات کا پتہ چلتا ہے' ایک کتاب کا نام ہے "تاریخِ تراب" اس میں مشرق و مغرب کی معاصرانہ تقابلی تاریخ پیش کی گئی' اس کے دو کالم ہیں' ایک میں مشرقی سوانح اور دوسرے میں مغربی حوادث' اس میں ایک روایت ہے کہ عبدالملک کے دور میں حجاج بن یوسف نے اجمیر فتح کیا' حالانکہ حجاج کا ہندوستان آنا کسی مستند تاریخ سے ثابت نہیں ہوتا اور اسی دور میں سلسلۂ جبل ارولی پر بھی اسلامی حملہ ہوا اور اسے فتح کر لیا۔ عربی میں اسے جبل ارید کہا گیا ہے۔ یہ ابن جریر طبری کی تاریخی روایت ہے اس کے ماننے میں کیا تامل ہو سکتا ہے' علامہ سیوطی رح کی تاریخ الخلفاء ۔۔۔۔ سے بھی کچھ ایسے اشارات ملتے ہیں کہ "خلافت عباسیہ کے ابتدائی عہد میں علاقہ میوات (موجودہ) اسلامی فوجوں کی جولانگاہ بنا' اس کا مطلب یہ ہوا کہ اودیہ کی

---

[۱] مکمل و مفصل سوانح عمری خواجہ معین الدین چشتی رح ص ۵۷-۵۸۔

روایت کو سرسری طور پر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ خلافت راشدہ کے دور میں جب اسلام چاروں طرف پھیل رہا تھا تو اگر اس نسیم جان نواز کا کوئی ہلکا سا جھونکا ادھر میوات کی طرف بھی متوجہ ہو گیا تو تعجب کی کونسی بات ہے۔ عہدِ فاروقیؓ سے تو باقاعدہ میوات کا اسلامی مرکز مکہ معظمہ و مدینہ منورہ سے رشتہ قائم ہو چکا تھا۔ دیکھیے مقدمہ' میو قوم کا اسلام۔

اس کے بعد سلطان محمود غزنویؒ کے ورود ہند تک کے درمیانی وقفہ میں کسی اہم واقعہ کی اطلاع کتبِ تاریخ و تذکرہ سے معلوم نہیں ہوتی۔ اتنی لمبی مدت ہندوستان نورِ اسلام کی ضیاء پاشیوں سے یکسر محروم رہا ہو سمجھ میں نہیں آتا۔ صوفیائے ابرارؒ کی کوئی جماعت ضرور یہاں بھارت کی فضاؤں میں مصروفِ عمل ہو گی جس تک تاریخ کے ہاتھ نہ پہنچ سکے۔ محمود غزنویؒ کے یہاں فتح ممالک و توسیع حکومت کے ساتھ ساتھ اشاعتِ اسلام کا جذبہ بھی کارفرما تھا۔ یہ چیز اس کے لشکر کے ہمراہ علماء و مشائخ کی کثرت، سلطان کی خود بنفس نفیس اہل اللہ سے خلوت میں ملاقات اور فتح و نصرت کی درخواست' لشکر میں علمی مذاکرے وغیرہ جیسے امور سے واضح ہوتی ہے' اس کی فوج میں بڑے جیّد اہلِ علم تھے۔ منجملہ ان کے ایک شیخ ابو شکور سالمیؒ تھے' جنھیں ابو محمد چشتیؒ کی فرمائش پر سلطانؒ نے اس قوم کی تعلیم کی خاطر یہاں چھوڑا۔ شیخ ابو شکور سالمیؒ نے اس قوم میں اسلامی تعلیمات کی نشر و اشاعت کی۔ تاریخ میں ان کے تذکرہ کے ساتھ ساتھ ان کی اہم خدمات اور دینی و تعلیمی اصلاحات کا تو تذکرہ ملتا ہے' مگر ان کی جائے قیام اور ان کے مدرسہ کا پتہ نہیں چلتا۔ ایسا لگتا ہے کہ ان کا مدرسہ سفری تھا۔ اس زمانے میں میو قوم اپنے مستقر کے سلسلے میں۔ اور کچھ سیاسی' زیادہ تر معاشی اسباب کی وجہ سے کسی خاص مقام پر ٹھہری نہ ہو گی۔ یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ موجودہ میوات تو قدیم زمانے سے یہیں ہے' اگرچہ غزنوی دورِ حکومت کے بعد اس میں کچھ تبدیلی

پیدا ہوئی مگر ایسی نہیں جس سے میوات کا مرکز متاثر ہو۔ اس لیے شیخ ابو شکور سالمیؒ کی تعلیمات زیادہ تر ان جماعتوں کا مقدر بنیں جو اپنے مرکز پر آ نہ پائی تھیں' یا کسی خاص وجہ سے مرکز سے الگ ہو کر ادھر ادھر پھر رہی تھیں۔ اور اس طرح کے تغیرات اس قدر اہم قوم میں ناگزیر سے ہیں۔

بہر حال عہدِ غزنوی میں یہ قوم علم و تعلیم سے آشنا ہو چکی تھی۔ دعوت و تبلیغ کے سلسلے میں بنیادی باتیں جو عموماً پیش نظر رہتی ہیں وہ عقائد و نظریات کی تشریح ہے۔ شیخ ابو شکور سالمیؒ کی باقیاتِ صالحات میں آج جو چیز ہمیں دستیاب ہے وہ ان کی کتاب "التمہید فی بیان التوحید" ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے میو قوم کے ان قبائل میں تعلیمی خدمات انجام دیں جو عہدِ غزنوی میں سید سالار مسعود غازی علیہ الرحمۃ اور ان سے پہلے دوسرے صوفیائے کرام و علماء عظام کے مساعی سے اسلام کے زیر سایہ آئے تھے۔ یہ دوسرا مدرسہ تھا جو میو قوم کی صلاح و فلاح کی خاطر خواجہ ابو محمد چشتیؒ کی فرمائش پر سلطان محمود غزنویؒ نے شیخ ابو شکور سالمی کی زیر نگرانی جاری فرمایا۔

یہ دونوں مدرسے گو بہت اہم تھے مگر مرکزی حیثیت انھیں حاصل نہ ہو سکی یہ چیز اللہ تعالیٰ نے دار الخیر اجمیر کے لیے مقدر کر رکھی تھی جسے سلطان الہند خواجہ خواجگاں شیخ معین الدین چشتی قدس سرہٗ کا مسکن و ماویٰ بننے کا شرف حاصل کرنا تھا۔ چنانچہ آپ جب ہندوستان تشریف لائے تو گویا آپ اور آپ کی نسبت سے اجمیر ہدایت و روشنی کے نظامِ فلکی کا مرکز ثقل بن گیا۔

اجمیر میو قوم کا سب سے بڑا مرکز صلاح و فلاح تھا' میوؤں نے اپنا مرکز کیا بنایا گویا پورے ملک کا دینی سینٹر بن گیا اجمیر میں میوؤں نے خواجہ صاحبؒ سے پہلے حکومت بھی کی اور خواجہ صاحبؒ کی بارگاہ کی جاروب کشی کو بھی اپنے لیے باعثِ

سعادت سمجھا۔ مگر اس مدرسہ نے مدرسہ سے زیادہ خانقاہی فرائض انجام دیے۔

چوتھا مدرسۂ ناگور تھا جسے سلطان التارکین صوفی حمید الدین ناگوریؒ اور آپ کے فاضل اخلاف ؒ نے جاری فرمایا۔ اور ہر طرح اس کی دیکھ ریکھ کی۔ عرصۂ دراز تک اسے قائم و باقی رکھا۔ یہ اپنے دور میں ہندوستان کا سب سے بڑا مدرسہ تھا، اور ساتھ ساتھ خانقاہ بھی۔ یہاں سے عالم و فاضل کی سند کے ساتھ سلوک و تصوف کی اجازت بھی ملتی تھی۔ اس مدرسہ نے آٹھویں صدی میں مفتی داؤد اور مفتی رکن الدین جیسے یگانۂ روزگار فاضل پیدا کیے جن کی زندۂ جاوید یادگار ان کی کتاب "فتاویٰ حمادیہ" ہے۔ اور عہد اکبری میں ملا مبارک اور اس کے دو بیٹے ابوالفیض فیضی، ابوالفضل علامی اسی مدرسہ کے ابتدائی تلمیذ تھے۔

عہدِ خلجی و عہدِ تغلق میں کچھ اور مدارس کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً قصبہ بیانہ ضلع بھرتپور میں قاضی عبداللہ بیانویؒ کا مدرسہ تھا چنانچہ صاحب نزہۃ الخواطر نے لکھا ہے "قاضی عبداللہ بیانہ کے قاضی بھی تھے اور اپنا مدرسہ بھی چلاتے تھے اور خود درس دیا کرتے تھے"[1] عہدۂ قضا کے فرائض منصبی کے ساتھ باضابطہ مدرسہ چلانا کارے دارد ہے، مدرس کچھ اور بھی ضرور ہوں گے مگر ان کا تذکرہ نہیں ملتا۔

قاضی مغیث الدین بیانویؒ جو علاء الدین خلجی کے قاضی القضاۃ تھے وہ اسی قصبہ کے باشندے تھے، ان کی تعلیم کہاں ہوئی؟ صراحت سے اس کا کہیں تذکرہ نہ مل سکا۔ مگر یہ تو ماننا پڑے گا کہ ان کی ابتدائی تعلیم کا بندوبست ان کے قصبہ میں ہی ہوگا۔ چھوٹے سے بچے کو اقامتی درسگاہ میں تو داخل نہیں کیا جاسکتا۔ وہ مدرسہ بہت بعد کا ہے جس کے متعلق مذکور ہے:

"منجملہ دیگر مدارس کے بیانہ کا ایک مدرسہ قابل ذکر ہے جس کو مولوی قاضی

(۱) نزہۃ الخواطر ۲/۷

رفیع الدین نے قاضیوں کی مسجد سے متصل قائم کیا تھا، مدرسہ کی عمارت پر جو کتبہ ہے اس سے مدرسہ کا سالِ بنا ۸۷۷ھ معلوم ہوتا ہے[1]۔

بیانہ

"بیانہ کسی زمانے میں بہت بڑا شہر تھا، خوبصورت عمارتیں، پُررونق بازار، نادر مسجدیں اور ایک قلعہ تھنگر اس کی زینت تھا جسے شہاب الدین غوریؒ نے فتح کیا[2]، یہاں ایک سنگی قلعہ ہے جس میں بے شمار بلند مکانات اور تہ خانے ہیں آج تک لوگوں کو اس قلعہ میں جنگی آلات اور تانبے کے برتن دستیاب ہوتے ہیں، شہر میں ایک بلند مینار بھی ہے، آم بے حد خوش ذائقہ پیدا ہوتے ہیں اور اس کے پھل (دانے) ایک سیر سے بھی زیادہ ہوتے ہیں، شکر بہت مفید اور صاف تیار کی جاتی ہے، بیانہ میں ایک کنواں ہے، اس کنویں کے پانی میں ایک سیر یا کم و بیش شکر ملا کر اس کی ٹکیاں بناتے ہیں اور اور انھیں کندورہ کہتے ہیں اور دور دور تک بطور تحفہ لے جاتے ہیں، نیل بھی بیانہ میں بہت اچھا پیدا ہوتا ہے۔ ایک روپیہ کو دس بارہ سیر تک فروخت ہوتا ہے، یہاں کی حنا (مہندی) مشہور ہے اور یہاں کی سرزمین بے شمار بزرگوں کا مدفن ہے[3]

بیانہ مشہور شہر ہے، تہن گڑھ کے پاس واقع ہے اور بھرتپور و آگرہ کے راستے میں پڑتا ہے۔ اس شہر کا ذکر ہندوستان کی ہر کلاسیکل تاریخی کتاب میں ملتا ہے۔ یہ جادو نسل میو چھتریوں کا بہت بڑا مرکز تھا، جن کی حکمرانی آگرہ، متھرا، بھرتپور، تہن گڑھ، الور، کرولی، سبھل گڑھ اور ریواڑی تک تھی اس شہر سے میو قوم کی تقریباً ۲۵ گوتوں اور پالوں کا نسبی تعلق ہے۔

تاریخ فرشتہ کے مطابق اسے مالچند جادو نے آباد کیا، اسی مالچند کے نام سے

(۱) اسلامی درسگاہیں صـ۷ (۲) ہندوستان اسلامی عہد میں صـ۴۳
(۳) آئین اکبری صـ۴۲۳

مالوہ نامزد ہوا۔ جب سکندر لودھی نے اس پر حملہ کیا اس وقت یہ قصبہ بہت بارونق تھا بابر نے بیانہ کو ہندوستان کے نہایت مشہور قلعوں میں لکھا ہے یہ بڑا مبارک شہر ہے، اس نے سپہ سالار سید مسعود غازی علیہ الرحمۃ (۴۰۵ش ۴۲۳ھ) کے قدم چومے، اور شہاب الدین غوری نے جب ہندوستان پر دوبارہ حملہ کیا تو اسے خوش آمدید کہا۔ ابن بطوطہ نے اس کے بازاروں اور اس کی مسجدوں کی تعریف کی ہے، شہاب الدینؒ کی فتح کے وقت یہ مسلم حکمرانوں کے قبضہ میں رہا، مغل عہد کے بعد جاٹوں کے قبضہ میں چلا گیا۔۔۔ وقائع راجپوتانہ میں ہے کہ ۱۱۹۵ء سے ۱۲۴۵ء تک پرتھوی راج چوہان دہلی اور اجمیر کے زبردست راجہ کا عہد ہوا ہے۔ بیانہ میں اس کی سسرال تھی۔ بابر کے حملے کے وقت بیانہ پر ملک نظام خاں بن محمود خاں حکمراں تھا، بابر نے اسے تہدید آمیز لہجہ میں ایک رباعی لکھ کر بھیجی تھی:۔

با ترک ستیزہ مکن اے میرِ بیانہ	چالاکی و مردانگی ترک عیان است
گر زود نیائی و نصیحت نہ کنی گوش	آں را کہ عیان است چہ حاجت بہ بیان است[1]

نارنول ناگوری مدرسے اور خانقاہ سے کچھ اور خانقاہیں اور مدارس بھی وجود میں آئے۔ منجملہ ان کے مدرسہ نارنول ہے۔ جو اولاً شیخ محمد ترکؒ نارنولی اور قاضی شمس الدین شیبانیؒ جد امجد علامہ احمد مجد شیبانیؒ وغیرہ نے قائم فرمایا مگر اس کی ترقی یافتہ صورت بعد میں ہوئی۔ اس مدرسہ نے عرصۂ دراز تک میوات کی فضاؤں میں علم و عرفان کی قندیلیں روشن کیں، رشد و ہدایت کے مینار تعمیر کیے اور تعلیم و تربیت کے ذریعہ میوات کو سنوارا۔" نارنول جو مسجدوں اور مدرسوں کا شہر تھا، اور بندگی حضرت نظام الدین نارنولی قدس سرہٗ کا مسکن[2]۔" شیر شاہ نے ایک مدرسہ

(۱) تاریخ میو چھتری ص۱۵۶ (۲) ہندوستان اسلامی عہد میں ص۳۰

نارنول میں قائم کیا تھا۔ یہ جگہ اب ریاست پٹیالہ میں ہے۔ مقام 'باول' جو حصار اور جے پور کے درمیان ایک اسٹیشن ہے، وہاں سے پچھم تیس میل دور واقع ہے۔ مدرسہ کی عمارت بڑی اور شاندار تھی، شیر شاہ کے دادا ابراہیم سور کی قبر یہیں واقع ہے ایک کتبہ مدرسہ کی عمارت پر اب تک (۹۲۷ھ) لگا ہوا ہے اس سے تاریخ تعمیر ۹۲۷ھ ظاہر ہوتی ہے۔ مدرسہ اور مقبرہ کے مصارف تعمیری ایک لاکھ روپے سے زیادہ تھے، یہ مدرسہ شیر شاہ سوری نے اپنے عہد حکومت سے پہلے، دادا کے انتقال کے وقت بطور کار خیر بنوایا تھا[1]۔ گویا خواجۂ بزرگ سلطان الہندؒ م ۶۳۳ھ کے زمانے سے میو قوم اور میوات میں جو علمی چرچے شروع ہوئے تھے وہ روز افزوں تھے۔ میوات اسلام کے زیر سایہ آنے کے بعد، اہل علم و دین سے کسی دور میں بھی خالی نہ رہا، ہر دور اور ہر عہد میں اہل فضل و کمال نے اس غیور و بہادر قوم کو اپنے تعلیمی نظام و اصلاحی عزم و حوصلہ کا میدانِ عمل بنایا۔ قاضی احمد مجد شیبانیؒ جو امام محمدؒ صاحب امام اعظمؒ کی اولاد میں سے ہیں گو نارنول ہی میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی، علم و کمال وہیں حاصل کیا مگر اپنی عمر عزیز کے ستر سال خواجۂ بزرگ کے مدرسہ و خانقاہِ اجمیر شریف کی خدمت و جاروب کشی میں بسر کیے۔

ایک صاحب علم و فضل جب کہیں جلوہ افروز ہو، اور اس کے چاروں طرف آبادی ہو ویرانے نہ ہوں تو خیال کیا جا سکتا ہے کہ ستر سال قاضی احمد مجدؒ نے کس طرح گذارے ہوں گے، علماء و مشائخ خلقِ خدا کو اپنی توجہ کا مرکز بناتے ہیں، انسان جو اشرف المخلوقات ہے اس کے شئون و کوائف سے کس طرح پہلوتہی کی جا سکتی ہے اور خدمتِ خلق کے اس اہم شعبہ کو کیوں کر نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔؟؟

(۱) اثریات ہند بحوالہ اسلامی درسگاہیں ص۳۰

نارنول کا محل وقوع میوات سے بہت قریب ہے سنہ ۱۹۴۷ء سے پہلے اس کے مشرقی جانب میو قوم کے کئی گاؤں آباد تھے مگر اب ذرا فاصلہ پر ہیں۔ تاہم اب بھی ضروریاتِ زندگی اور خرید و فروخت کے لیے میو نارنول آتے رہتے ہیں نارنول کے قریب دھرسوں[1] ایک منڈی ہے جہاں اچھی نسل کے بیل مناسب قیمت پر مل جاتے ہیں۔

یہ مدرسہ بہت پھلا پھولا۔ پانی پت کے شیخ محمد اعلیٰؒ اسی مدرسہ و خانقاہ کے فیض یافتہ تھے جو اپنے دور کے بلند مرتبہ عارف باللہ اور جید عالم دین تھے اور پھر اسی مدرسہ کے پروردہ تھے حضرت خواجہ عبدالوارث عرف شاہ چوکھا قدس سرہٗ جو میوات میں آسودۂ خواب ہیں۔ آپ کی یہاں اتنی پذیرائی ہوئی کہ ایک مستقل گاؤں آپ کی خدمت اور آپ کے مشن کی نگرانی کی خاطر یہاں آپ ہی کے نام پر آباد ہے۔ شاہ چوکھاؒ۔ سنہ ۱۹۴۷ء تک یہ بہت اچھی طرح آباد تھا مگر پڑھے لکھے افراد پاکستان ہجرت کر گئے اب یہاں مولانا محمد حسن خاں گنگواہی کی زیر نگرانی اسلامی مدرسہ شاہ چوکھا قدس سرہٗ کے کام۔ تبلیغ و تعلیم دین۔ کے تکمیلی فرائض انجام دینے میں مصروف ہے۔ مولوی صاحب بہت اچھے منتظم اور باسلیقہ آدمی ہیں، خود اعتمادی و سنجیدگی ان کے طبعی جوہر ہیں۔ اپنے وقار و تمکنت کی عمدگی سے نگہداشت کرتے ہیں۔

مشائخ چشت کی خانقاہیں صرف تزکیۂ باطن ہی کے مراکز نہ تھیں بلکہ وہ ساتھ ساتھ تعلیم گاہیں بھی تھیں۔ بعض کتب سیر میں لکھا ہے، شیخ محمد موسیٰ قدس سرہٗ پلہ، نوح خواجہ نصیر الدین چراغ دہلیؒ کے خلیفہ تھے۔ خواجہ صاحبؒ بہت جید عالم اور

---

[1] دھرسوں میں ایک اہم خانقاہ ہے جو مدرسہ اور خانقاہ دونوں حیثیت کی حامل ہے اور الحمد للہ اب بھی اس کی عمارت بدستور استوار ہے مسلم آبادی نہ ہونے کی وجہ سے گو وہ اپنا فرض منصبی ادا نہیں کر پا رہی ہے مگر اس کا فیض بدستور جاری و ساری ہے۔ یہ شیخ حمزہ قدس سرہٗ کی خانقاہ اور مدرسہ ہے۔

سلجھے ہوئے مدرس تھے۔ جن کا اعتراف آپ کے مرشد سلطان المشائخ نے جا بجا کیا ہے۔ فوائد الفواد کے ان تمام مقامات پر، جہاں خواجہ چراغؒ کی سلطان جیؒ کے ہاں حاضری کا ذکر ہے، یہ چیز دیکھی جا سکتی ہے۔ اور آپ کی تصنیفات بھی اس کی منھ بولتی شہادت ہیں۔ آپ کے متعلقین اس نعمت سے کیوں کر الگ رہ سکتے ہیں۔ بہر حال اولاً شیخ محمد موسیٰؒ نے مدرسہ ہی قائم فرمایا، اور ابتدائی دنوں میں آپ نے اپنی موجودہ قیام گاہ سے الگ موضع پلہ کی مسجد میں درس دیا۔ جب موجودہ خانقاہ کی تعمیر شروع ہوئی اور کچھ کمرے تیار ہو گئے تو مدرسہ بھی درگاہ میں آ گیا۔ پھر یہاں مدرسہ و خانقاہ دونوں سلسلے فیض رسانی میں مصروف ہو گئے۔ خانقاہ شیخ محمد موسیٰؒ سے کچھ اور خانقاہیں بھی وجود میں آئیں۔ منجملہ ان کے ایک خانقاہ مراد باس والوں کی آپ کی خانقاہ سے باہر متصلاً بجانب جنوب واقع ہے۔ البتہ مدرسہ نے متعدی ہو کر کسی نئے مدرسہ کو جنم نہیں دیا۔ اس کی بجائے وہ خود ہی ذہول و غفلت کی باد صرصر کے جھونکوں سے نبرد آزمائی کرتا رہا۔

یہاں اسلامی علوم کی تعلیم بھی دی جاتی تھی اور اخلاق و آداب کی تربیت بھی، دل و دماغ دونوں کی جلا مقصود تھی، شیخ موسیٰؒ کی وفات کے بعد بھی عرصہ دراز تک آپ کی خانقاہ نے دوہری خدمات انجام دیں۔ تعلیم کا بھی بندوبست کیا جاتا تھا اور تربیت و سلوک کی راہیں بھی ہموار کی جاتی تھیں۔

کب تک یہ سلسلہ جاری رہا اس کے متعلق کوئی یقینی بات کہنا مشکل ہے۔ یہاں کے شیخ زادے جو سجادہ نشین بھی تھے پاکستان چلے گئے۔ ممکن ہے وہ اس سلسلے میں کچھ معلومات فراہم کر دیں مگر ان کی قیام گاہ، ٹھکانے۔ نامعلوم۔ پھر وہاں تک رسائی؟؟

سنہ ۱۹۵۵ء میں میوات کے بعض بہی خواہوں نے یہاں، قومی حکومت کی دی ہوئی مراعات کے تحت، تربیتی مرکز یا مدرسۃ البنات قائم کرنا چاہا مگر دینی شعور و جذبہ

رکھنے والے حضرات اس تجویز سے بہت پریشان ہوئے' ان کا خیال تھا' اور صحیح تھا' کہ خانقاہ اور مدرسہ کی عمارت کو اسی مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہیے جس کے لیے بنانے والوں نے اسے بنایا ہے۔

انھیں دنوں تحصیل نوح کے پہلے سب ڈویژنل آفیسر سردار گور درشن سنگھ ایک سکھ تھے' پنجاب کے باشندے' جہاں پر خانقاہوں میں مدرسے عام طور پر قائم و جاری ہیں' وہ درگاہ شیخ موسیٰؒ میں ایک دن سیر و تفریح کرتے ہوئے آپہنچے۔ انھیں درگاہ دیکھ کر پنجاب کی خانقاہیں یاد آگئیں اور غیر ارادی طور پر ان کی زبان پر اسلامی مدارس کا تذکرہ آگیا' پھر اس کے اشارے پر کچھ دین دار اصحاب نے یہاں دینی مدرسہ کا اجراء فرمایا۔ مدرسہ معین الاسلام قصبہ نوح کے اس وقت کے صدر مدرس مولانا نیاز محمد کو اس کا اعزازی مہتمم بنایا گیا۔ انھوں نے یہ عہدہ بقول خود اس لیے قبول کیا کہ موضع پلہ میں وہ مدرسہ معین الاسلام نوح کی شاخ کھولنا چاہتے تھے اسی باعث یہاں حضرت مولانا محمد یوسفؒ تشریف فرما ہوئے۔ اعزازی مہتمم کا کام تھا مدرسہ کی سرسری نگرانی اور بس۔ فراہمی مالیات' طلبہ کا داخلہ' مدرسہ کا حساب کتاب سب کچھ مدرسوں کے ذمہ تھا۔ اور مدرسہ کی شکل مکتب جیسی تھی۔ قرآن کریم حفظ و ناظرہ اور ابتدائی اردو دینیات۔ درس نظامی کا اجراء ہو پایا تھا۔ ۱۹۶۲ء میں کچھ ایسے طلبہ کا داخلہ کیا گیا' جو شرح جامی پڑھتے تھے اور ایک مدرس کا اضافہ' جو ان کتب کا انھیں درس دے سکے' یہ تھے مولوی عبدالرشید ابن مولانا عبداللہ بابپوریؒ' اتفاق کی بات کہ انھیں ایام میں حضرت مولانا عبداللہؒ کی وفات ہو گئی اور مولوی عبدالرشید کو مجبوراً اور بظاہر قبل از وقت اپنے والد مرحوم کے کاموں میں دلچسپی لینی پڑی اور وہ گھر ٹھہر گئے وہ طالب علم جنھیں شرح جامی پڑھنی تھی نو دو گیارہ ہو گئے۔ راقم کو مولوی عبدالرشید کی جگہ کام کرنا پڑا شرح جامی کے اولین طالب علم تو چلے گئے کچھ اور

ان کی جگہ آگئے۔ انھیں دنوں مدرسہ حافظ الاسلام قصبہ فیروزپور جھرکہ کے صدر مدرس مولانا عبدالستارؒ اپنے خادم خاص اور عزیز ترین شاگرد پر کسی وجہ سے ناراض ہو گئے اور مدرسہ سے نکال دیا' یہ طالب علم پڑھنے میں غبی مگر پڑھنے کا شوقین تھا۔ راقم کے پاس آیا۔ راقم نے اس کے حالات کی نزاکت کے تحت داخل مدرسہ کر لیا۔ وہ شرح جامی کا طالب علم تھا اپنے ساتھ ایک اور طالب علم لے آیا' ایک دو پہلے سے موجود تھے' یوں ایک جماعت بن گئی۔ مجھے احساس تھا کہ ان دونوں استاد و شاگرد کا فیصلہ محض جذباتی ہے' اس میں واقعیت کی پرچھائیں بھی نہ تھی۔ مولانا مجھ پر بہت خفا ہوئے۔ ادھر ہمارے اعزازی مہتمم ان کے شاگرد تھے' عرق انفعال میں غرق ہو کر تمام بوجھ میرے اوپر ڈال دیا اور اپنے استاد کے روبرو اپنی صفائی پیش کر کے بری الذمہ ہو گئے۔

میرے آں موصوف سے ۱۹۴۸ء میں تعلقات استوار ہوئے' جو زندگی کی بعض جہات میں ہم رنگی و یکسانیت کی بدولت بڑھتے چلے گئے۔ مولاناؒ راقم سے بہت خفا ہوئے مگر میں نے مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر غور کر کے یہی طے کیا کہ فی الحال مولانا کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ میں درس و تدریس میں منہمک ہو گیا۔ سال کے آخر میں اس طالب علم سے ان کے شفیق استاد کے نام خط لکھوایا اور پھر سمجھا کر ان کی خدمت میں بھیج دیا اور ساتھ ساتھ یہ ہدایت بھی کر دی کہ سراپا تقصیر بن کر جاؤ اور اکسیر بن کر واپس آؤ۔ الحمدللہ یہ طالب علم فائز المرام ہو کر واپس لوٹا۔ یہ تھی مدرسہ درگاہ شیخ موسیٰ کی نشاۃ ثانیہ مگر کچھ ناگفتنی کوائف کے باعث یہ نشاۃ ثانیہ دیرپا ثابت نہ ہوئی اور مدرسہ درگاہ شیخ موسیٰ پلہ اب پھر ایک مکتب کی صورت میں ہے' اس کی مالیات اور اس کا کتب خانہ اعزازی مہتمم کے تقلم خود بیجا تصرف کا شکار ہو کر درگاہ شیخ محمد موسیٰ قدس سرہٗ کی چار دیواری سے باہر پہنچ گیا۔

عہد اکبری۔ مغل دور (۱۵۴۲ء-۱۶۰۵ء) ۔ میں میوات کے چار مدرسے بہت مشہور

ہوئے۔ جہاں درسِ کتاب بھی ہوتا تھا اور شغلِ باطنی بھی۔ اس لیے یہ مدرسے بھی تھے اور خانقاہیں بھی؛

(۱) مدرسہ شاہ نجم الحق (م ۹۹۸) جو قصبہ سہنہ ضلع گوڑگانوہ میں تھا۔

قصبہ سہنہ میوات کا قدیم اور تاریخی قصبہ۔ سلسلہ کوہ اراولی (جبل اربد) کے دامن میں واقع ہے، گوڑگانوہ سے جانبِ جنوب پندرہ میل کے فاصلے پر۔ یہاں کسی دور میں خان جادو میوؤں کی حکمرانی تھی، پہلے زمانے میں یہ اچھا خاصا ثقافتی اور تہذیبی مرکز معلوم ہوتا ہے۔ یہاں پر نوگزہ پیرؒ کا مزار ہے، اور شاہ ولایتؒ کی مسجد، خانقاہ اور آرام گاہ بھی۔ اس کی عمارت کا طرزِ تعمیر عہدِ تغلق جیسا ہے، جس کے نمونے تیموری دور میں بھی ملتے ہیں۔ ایک اور قدیم مسجد بارہ کھبا والی کہلاتی ہے۔ اس کا سالِ تعمیر ۱۳۸۱ء ہے اور مسجد شاہ نجم الحقؒ جو ۱۳۸۱ء کی تعمیر ہے اس کی دیواروں پر قرآن کریم کی مختلف صورتیں کندہ ہیں۔ اس کے چاروں طرف بڑی عمدہ قسم کی بارہ دری بنی ہوئی ہے، جو مدرسہ کے لیے بنائی گئی۔ یہاں مدرسہ بھی تھا اور خانقاہ بھی۔ دونوں کی نگرانی حضرت شاہ نجم الحق قدس سرہٗ کے ذمہ تھی۔ وہ اپنے دور کے بڑے فاضل، علّامہ، دیدہ ور، نکتہ سنج مدرس اور بلند مرتبت و مشفق شیخِ طریقت تھے۔ ان کے یہاں فصوص الحکم اور نقد النصوص جیسی اہم کتب کا درس دیا جاتا تھا[1] اس مدرسہ و خانقاہ کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی دادی جانؒ کے دادا محترم شیخ قطب العالمؒ کی یہ تربیت گاہ ہے۔

یہ قصبہ آج بھی میوات کا اہم تجارتی و سیاحتی مرکز ہے، یہاں گرم پانی کا چشمہ ہے جو جلدی بیماریوں میں اکسیر کا کام دیتا ہے۔ ریواڑی، پلول اور دہلی و الور کی طرف

[1] نزہتہ الخواطر ص ۳۰۷۔

جانے والی بسوں کا ممتاز سنگم ہے، سینکڑوں بسیں اور ہزاروں ٹرک صبح و شام یہاں سے گزرتے رہتے ہیں۔ پہاڑ میں بڑی اچھی تفریح گاہ ہے، پہاڑ میں مٹی جاکر گھاس لگائی گئی ہے، اور گرم چشمے کا پانی پائپ لائنوں کے ذریعہ اوپر لے جاکر پہاڑ میں نئے طرز کے حمام بنائے گئے ہیں، جہاں سیاح آکر ٹھہرتے ہیں۔ ایمرجنسی دور میں یہ سیاسی قید خانہ بھی بن جاتا ہے۔ ایک مقامی روایت کے مطابق شاہ جہاں مغل شہنشاہ بھی یہیں نظر بند ہوئے تھے۔

یہاں کی فضا معتدل، خوشگوار اور ماحول بڑا پُر بہار ہے۔ اس کے چاروں طرف میو قوم کے دیہات ہیں۔ منجملہ ان کے ایک مشہور گاؤں رائے سینہ ہے، جو جھنگل پال کا پابھہ (مرکز و منبع) ہے اس کی تاریخ بڑی عجیب و غریب ہے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے متعلق بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ میو قوم اور میوات کے دیگر افراد نے سب سے زیادہ انگریز کو تنگ کیا۔ میاں مستان شاہ مداری جنگ آزادی کا سب سے پہلا سپاہی اور جرنیل ہے، یہ میوات کا باشندہ اور مولوی احمد اللہ وغیرہ کا استاد جنگ ہے۔ موضع رائے سینہ میں انگریزوں کو قید کیا، قتل کیا اور ان کے سر چوپال کے صحن میں دفن کیے۔ چنانچہ جب کبھی یہاں انگریز آتے تھے تو سر ننگا کرکے سلام کرتے تھے۔ انگریزوں کی تقدیر نے جب پلٹا کھایا اور انھیں مغل سلطنت کا تاج و تخت میسر ہوا تو انتقامی کارروائی میں موضع مذکور کی زمین نیلام کردی گئی۔ مورخہ ۲۰ر فروری ۱۸۶۲ء یہ گاؤں بحق سرکار ضبط کرکے تیرہ سو روپے میں گوکل سنگھ کو دے دیا گیا۔[1]

۱۹۴۷ء میں یہ گاؤں محض اس لیے پاکستان "جنگبار" جب یہاں ہم بے زمین

[1] ریونیو ریکارڈ گوڑگانوہ

دجا بٹاد ہیں تو یہاں ٹھہر کر کیا کریں گے" افسوس کہ پاکستان میں بھی ان لوگوں کو اس طرح زمین نہ مل سکی جیسے دوسروں کو ملی تھی۔ پاکستان میں انگریز بہادر یہاں سے جانے کے بعد بھی مدتوں براجمان رہا۔ یہ اسلامی دنیا کی بدبختی تھی کہ ایک مستقل ملت، ایک مکمل دین کے پیروکار ہو کر ایسی قوم کی پیروی کریں جن کے پاس الہامی کتب صحیح صورت میں نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی مغضوب قوم۔ اور مسلمان ان کا اتباع کریں۔ اُف توبہ حق تعالیٰ اس طرح کی بلا سے امت مسلمہ کو محفوظ و مامون رکھے۔

(۲) اکبری دور کا دوسرا مشہور مدرسہ حضرت بندگی خواجہ نظام الدین نارنولیؒ کا تھا۔ اپنی تعلیمی خدمات اور تربیتی فیوضات کے باعث جس نے سلطان المشائخ کے دور کی یاد تازہ کر دی تھی۔

(۳) مدرسہ ناگور۔ جہاں صوفی حمید الدین ناگوریؒ کے باقیات صالحات۔ اولاد امجاد اور خلفاء، مدرسہ و خانقاہ دونوں کا نظام سنبھالے ہوئے تھے۔

(۴) مدرسۂ شیخ مبارک محدث الوریؒ، جہاں شیخ مبارکؒ اور آپ کے بھائی مخدوم کمال چشتیؒ اور دوسرے اہل فضل و کمال الور اور اس کے ماحول کو اپنے انفاس قدسیہ سے شادکام و بامراد بنا رہے تھے۔

الور سندھ کے الور کی یاد میں چھتریوں کا بسایا ہوا دہلی اور جے پور کے درمیان بالکل وسط میں واقع ہے۔ پہاڑوں کے دامن میں تقریباً ہموار میدان میں آباد یہ شہر کافی قدیم اور تاریخی ہے، اب وہ راجستھان کا اہم فیکٹری ایریا ہے ۱۹۴۷ء سے پہلے وہ راجپوتانہ کی ایک خوشحال ریاست کا صدر مقام تھا، عہد مغلیہ میں یہ شہر علماء و مشائخ کا گہوارہ تھا۔ یہاں بڑے بڑے محدثین و فقہا اور بلند مرتبت مشائخ نے عرصہ دراز تک اہل میوات پر علم و عرفان اور احسان و سلوک کی بارش کی ہے شیخ حمزہ دھرسولؒ کے شاگرد، بندگی حضرت نظامؒ کے مرید سید علیم الدینؒ،

مخدوم شیخ کمال الدین چشتیؒ فاروقی م ۱۰۱۷ھ۔ سید انور شاہ اسمٰعیلؒ انگارہ شاہؒ جیسے صاحبان فضل و کمال افاضہ و افادہ میں مصروف عمل تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مساعی کو قبول فرمائیں اور مشکور بھی کہ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ

زمانۂ قدیم میں میو قوم الور کے ارولی پہاڑی سلسلے اور جمنا کے درمیان آباد رہی ہے، یہ علاقہ دو حصوں میں تقسیم تھا، ایک حصہ متسیا کے نام سے پکارا جاتا تھا اور دوسرے حصہ کا نام سوراسینا تھا — متسیا میں الور، جے پور، بھرتپور کا کچھ حصہ، بیراٹھ اور راجا ہیڑی شامل تھے۔ سوراسینا میں کاماں، متھرا، بیانہ، دوآبہ گنگ اور روہیل کھنڈ کے علاقے تھے[1]

الور میں مشرقی جانب ترا ہے سے الور کی طرف ایک جگہ ایک بورڈ ہے جس پر لکھا ہے۔ متسیا فیکٹری ایریا MATSIA FACTORY AREA گویا تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے۔ جس طرح یہاں تاریخ نے اپنے مادی عمل کی تکرار کی ہے، روحانی علمی ور دینی کردار و عمل کی جلوہ ریزیاں بھی اس کی دسترس میں ہیں اگر مسلمان اور خصوصاً میو قوم اپنے ماضی کی صالح اور مذہبی روایات کا پر بند کرلے۔

مرزا ہندال بن بابر کے زمانے میں یہاں محمد امین خاں فوجدار تھا، محلہ ڈھکپوری میں اس کی رہائش تھی مسجد واقع محلہ ڈھکپوری اس کی تعمیر ہے، تاریخ بنار،

زمان حکومت بہ ہندال مرزا	درایام دولت ہمایون غازی
کہ بیت خدا را بنا کرد مولیٰ	محمد امین۔ خدا زوست راضی
ز نہ صد فزوں بود و پنج تاریخ ۹۰۵	ز قاسم محمد شد ایں کارسازی[2]

---

[1] میو قوم اور میوات ص ۲۹-۲۸،

[2] مرقع الور ص ۴۴

جامع مسجد شہر الور جسے ترسوں خاں نے بنوایا اس کی تاریخ حسب ذیل ہے

بتوفیق خداوند موفق — شدہ ترسوں محمد خان عادل
بنائے مسجد جامع در الور — نہادہ شد بسوئے خیر مائل
چوں دل میخواست تاریخ بنایش — خرد گفتا کہ این خیر المنازل[1]

تاریخ مسجد محلہ حسن کی۔

از بہر قرب طاعت حق مسجد لطیف — برپا نمود بانی او در چنیں مکاں
تاریخ سال او چوں طلب کرد از خرد — گفتا بنائے مسجد نیکو حسین خاں[2]

یہ تذکرہ اسلامی عہد کا ہے۔ الور میں جب ہندو راجپوت ریاست قائم ہوئی تو راجپوت حکمراں بھی اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے' چنانچہ مہاراجہ بنے سنگھ کو اہلِ کمال کا بہت شوق ہوا اور مردانِ پُر ہنر کا ازبس ذوق ہوا۔ براں ایسے ایسے آدمی جمع کیے جو ہندوستان میں نایاب تھے اور اپنا جواب نہ رکھتے تھے گویا لاجواب تھے۔ چنانچہ علماء سے مولانا فضل حق خیرآبادی کہ آفتاب ہند مشہور اور ان کے شاگرد مولوی نور الحسن کاندھلوی[؟] نور علی نور جو علوم میں کامل اور رشاد و دریائے معانی تھے خاص کر علم منطق میں لاثانی تھے' اور اہلِ کاروں میں منشی امو جان و مرزا اسفند یار بیگ کہ دونوں آزمودہ کار تھے ' اور اپنے وقت کے وحید عصر و فرید روزگار تھے' ایسے ہی خوش نویس آغا صاحب جو درگاہ مخدوم۔ کمال چشتی۔ میں مدفون کہ تاریخ وفات ان کی محتوی بدیں مضمون ا۔

روحِ آغا چوں سوئے فردوس رفت — قدسیاں گفتند او را مرحبا
انپئے تعظیم و تاریخ وفات — گفت رضواں۔ میرزا آغا بیا

---

[1] مرقع الور ص ۵۵
[2] 〃 〃 ص ۶۵

اور ان کے شاگرد میاں رحیم اللہ صاحب کہ جن کے خط نستعلیق ایسے چہرہ افروز کہ کتبہائے یاقوت خانی اس کے سامنے مشقِ نوآموز اور حکماء سے مثل حکیم وزیر علی اکبرآبادی جو بڑے درجہ کے طبیب تھے اور علاج ان کے مثل معجزات عجیب و غریب تھے[1] اور جب ۱۲۹۳ھ میں میاں نور شاہ درویش نے وفات پائی تو اہالی الور نے اس کے فراق میں رو رو کر جان گنوائی۔ توپ خانہ کے قریب اس کی تدفین عمل میں آئی۔ مہاراجہ صاحب بہادر نے مقبرہ بنوا کر یہ قطعہ تاریخ اس پر کندہ کرایا

چوں بنا شد قطب عالم را مزار — آنکہ تاباں نور او چوں مہر و ماہ
گفت سالِ تاریخش چنیں — واقف اسرار یزداں نور شاہ[2]

عہد عالمگیری۔ ۱۷۰۷ – ۱۶۵۸ء میں محمد عبدالرحیم علی خاں نے بحکم شاہی مسجد بازار تعمیر کرائی جس کا سال تعمیر مندرجہ ذیل قطعہ سے ظاہر ہے ؛

بحکم شہنشاہ اورنگ زیبؒ — بنا شد عجب مسجد ارتفاع
شد از اہتمام محمد رحیمؒ — کہ بد سید سرور ابن شجاع
چوں ہاشم ز بہرش تواریخ جست — نمودار گردید خیر البقاع[3]

یہ الور راجستھان کا ماضی تھا' اس کا حال بھی ایسا ہی ہونا چاہئے۔ مگر اس قدر سرسبز و شاداب نہیں' اب یہاں آدمی کے کام آنے والی چیزیں بنتی ہیں آدمی نہیں بنتے اور عمومی انداز میں اس کی فکر بھی نہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ کروٹ کروٹ رحمت فرمائے راحت و آرام حضرت مولانا ابراہیم رحمہ اللہ کو اور فردوس بریں میں اعلیٰ مقام کرانو تے

---

[1] مرقع الور ص ۴۶، ۴۵
[2] 〃 〃 ص ۱۶۹
[3] تذکرۃ القبور مخطوط

سنہ ۱۹۴۷ء کے فوراً بعد یہاں مزار مولانا رکن الدین پر مدرسہ اشرف العلوم کی اساس رکھی اور اپنی سیاسی جد و جہد، سماجی دوڑ دھوپ اور اجڑے ہوئے میوؤں کی آبادکاری کی تگ و دو کے جھمیلوں میں بھی کسی نہ کسی طرح چلایا۔ ان کی وفات سنہ ۱۹۷ء کے بعد ان کے تمام کاموں میں رفیقِ کار اور شریکِ عمل حافظ جمال الدین کیماتیہ اس مدرسہ کے نگراں اور مہتمم قرار پائے۔ اور انھوں نے اپنے حسنِ عمل اور انتھک کوششوں سے مدرسہ کی عمارت کو اچھی شکل دے دی۔ تعلیم کی طرف بھی وہ خاصے متوجہ نظر آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے ذریعہ الور کے خزاں رسیدہ چمنستان علم و عرفان کو پُر بہار بنائیں۔

قصبہ بہادر پور سادات

یہ الور سے کسی دور میں، زیادہ شہرت رکھتا تھا خواجہ سید محمد گیسو درازؒ جب دلی سے دکن تشریف لے جا رہے تھے تو دہلی سے چل کر اولین اور پہلی قیام گاہ قصبہ بہادر پور تھا، اس کی قدیم تاریخ نہ معلوم ہو سکی مگر اس کے پرانے کھنڈرات، اس کی جامع مسجد، عہد تغلق کی یادگار، شکستہ مقابر اس کی تاریخی اہمیت کے شاہد ہیں۔ سید جمالؒ کا مزار ایک پہاڑی پر ہے بڑی پُر فضا اور اچھی جگہ ہے، مسجد ہے اور پرانی ہے۔ سید جمالؒ نے اس میں اپنا مدرسہ چلایا اور خانقاہی فرائض بھی انجام دئے۔ مسجد میں کوئی سہ دری اور دالان نہیں البتہ مسجد سے باہر جنوب کی طرف کچھ مکانات ہیں جو مسجد کے عہد کے معلوم ہوتے ہیں۔ نویں صدی میں یہ خانقاہی مدرسہ آباد و پُر رونق تھا۔

بہادر پور سادات۔ الور سے شمالی مشرقی جانب واقع ہے۔ دس بارہ میل دور چکانی کا چوراہا ہے اس سے مشرقی سمت تین چار میل اول پہاڑی۔ سید جمال الدین کی آرام گاہ اور پھر بہادر پور آتا ہے۔ جہاں شیخ نعمت اللہ بہادر پوری آرام فرما ہیں۔ آپ سید عبد الرسول عرف رسول شاہ کے مرشد اور سلسلہ سہروردیہ کے بزرگ ہیں۔ رسول شاہی سلسلہ یہیں سے نکلا ہے۔

قصبہ کوٹ قاسم

پہلے یہ ریاست جے پور میں تھا اب الور میں ہے۔ یہ بہادر شاہ ظفر۔ آخری مغل بادشاہ۔ کی نجی ملکیت تھا۔ سنہ ۱۸۵۷ء میں جب بادشاہ پر سربراہ ہند اور جنگ آزادی کی سرپرستی کے جرم میں گرفتار و جلا وطن کر کے مقدمہ چلایا گیا تو یہ جائداد مہاراجہ جے پور نے مغل شہنشاہوں سے اپنے قدیمی روابط کے باعث خرید لی تھی۔ یہاں اگرچہ پرانی اور تاریخی مساجد ہیں مگر ان مسجدوں سے متصل مدرسہ کے لیے کوئی مکان نہیں۔ میاں لاڈخاں قدس سرہٗ کے متعلقین میں اچھے خاصے اہل علم و دانشور تھے، انھیں کے خلیفہ تھے شاہ غلام نبی فیروزپوری جنھوں نے فیروزپور جھرکہ میں علم کی قندیلیں روشن کیں۔ میاں لاڈخاں سلسلۂ ابو العلائی کے میوات میں بانی اور نقشبندیت کے اہم ستون تھے۔ کوٹ قاسم میں ان کی خانقاہ بڑی اہم تھی۔

قصبہ تجارہ

یہ قصبہ میوات کے قدیم ترین قصبات میں ہے۔ سنہ ۱۹۴۷ء میں یہاں کی مسلم آبادی پاکستان ہجرت کر گئی، اب اس قصبہ میں یا قدیم ہندو باشندے ہیں یا پاکستان سے آئے ہوئے پنجابی۔ یہاں اب مسجدیں نوحہ کناں ہیں کہ نمازی نہ رہے۔ اور۔۔۔ صدائے شہر خموشاں ہیں کہ غازی نہ رہے۔ اب اس کے قدیم کوائف اور پرانی تاریخ کیسے معلوم ہو؟ بہرحال جو کچھ بن پڑا وہ یہ ہے:۔ "یہ ایک قدیم شہر ہے، جنرل اے کننگھم کو سنہ ۱۸۶۶ء میں موضع سریٹہ قصبہ تجارہ کے نواحی گاؤں میں کھدائی کرتے وقت ستھین دور کے سکّے ملے تھے جن کا زمانہ پہلی صدی عیسوی ہے، سریٹہ میں ایک قدیم دور کی تاریخی مسجد بھی ہے جو شکستہ حالت میں ہے اور سید حسین میراں جی کا مزار بھی ہے جو سید شمس الدین سبزواری کی نسل سے ہیں آپ بعہد سلطان التمش ہندوستان میں وارد ہوئے اور آپ کی نسل نے پوری میوات میں چاروں طرف آباد ہو کر ہدایت و روشنی کے چراغ چلائے سنہ ۱۹۴۷ء کے قریب

غازی غضنفر علی عرف غازی گڈن کے مزار سے متصل کھیتوں میں ایک کتبہ ملا تھا، جو برہمی رسم الخط میں تھا، جو تیسری صدی عیسوی میں رائج تھا، یہ کتبہ اسی وقت اوور پہنچا دیا گیا تھا — رکن عالم شہیدؒ، بھکن شہیدؒ، غالب شہیدؒ، جو حضرت سید سالار مسعود غازی شہید ۴۲۳ھ کے رفقار جہاد ہیں، ان کے مزارات شہر کے شمال میں واقع ہیں، ان کے کتبات میں ۴۲۳ھ لکھا ہے[1] یہ آثار و نشانات اس کی قدامت کو ظاہر کرتے ہیں۔

اسلامی دور میں تجارہ کو عروج تیمور ۷۷۱ ھ ۸۰۷ کے بعد حاصل ہوا۔ جس طرح دہلی کے اردگرد بادشاہوں نے بستیاں آباد کی ہیں اسی طرح تجارہ کے آس پاس بھی بادشاہوں کی آباد کی ہوئی بستیاں موجود ہیں، جو اس کی سیاسی اہمیت کو واضح کرتی ہیں۔ سید خضر خاں (۱۴۱۴ — ۱۴۲۱) نے خضر پور گوتولی آباد کیا، سید مبارک شاہ (۱۴۲۱ — ۱۴۳۴) نے سید پور مبارک بسایا۔ علاء الدین عالم شاہ نے شہر سے متصل علاؤ پور آباد کیا، جس کو ۱۸۰۳ء میں مرہٹوں نے غارت کر دیا۔ سلطان سلیم شاہ (۱۵۴۵ — ۱۵۵۳ء) نے سلیم پور آباد کیا۔ مرزا ہندال بن بابر نے محلات تعمیر کرائے، اور ایک مسجد بھی۔ جس کا کتبہ ۹۳۶ھ کا ہے۔ اس دور میں خانزادوں کو بھی عروج حاصل ہوا تھا اگر خانزادو

(۱) انھیں میں سے ایک بزرگ ہیں سید ابراہیم بارہ ہزاری جو سالار مسعود غازی کے استاد جنگ ہیں اور ریواڑی میں ان کا مزار ہے لوح مزار پر لکھا ہے ھیہات ۴۲۳ھ۔ ریواڑی کے قریب ایک جگہ تھی دھندگرہ وہاں ایک غزوہ میں شریک غازی خلعت شہادت سے نوازے گئے منجملہ ان کے سید حمیدؒ تھے جو مجروح حالت میں کوٹ قاسم پہنچ گئے اور وہیں ایک ندی میں ان کی روح پرواز کر گئی اور اسی جگہ وہ مدفون ہیں۔ کہتے ہیں انھیں میں سے ایک بزرگ تھے سید ضمیر الدینؒ پاٹوڈی۔
واللہ اعلم بالصواب۔

کوئی علیحدہ قوم تسلیم کی جائے۔ ملّو اقبال خاں نے دہلی جا کر تیمور کا مقابلہ کیا تھا۔ آخری تغلق بادشاہ ابوبکر شاہ نے کوٹلہ ناہر (آدی پور شادی پور) کے قلعہ میں پناہ لی تھی وہاں [illegible]ھ کا کتبہ موجود ہے۔ اس طرح ڈیڑھ سو سال تک اس شہر کو بڑا عروج حاصل رہا۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے تاریخ داؤدی۔

"تجارہ کے محلوں کے نام اس کی متنوع تمدنی زندگی اور اس کی عظمت کی نشاندہی کرتے ہیں؛ دارو کوٹوں کا محلہ، دارو یعنی بارود۔ کمن گروں (کمان گروں) کا محلہ، خانزادہ واڑہ میں سلبندیوں کی مسجد، جو دراصل اسلحہ بندوں کی ہے۔ کاغذی واڑہ۔ قاضی واڑہ۔ ملّاں واڑہ، توپ خانہ کی مسجد، حویلی زرخیاں"

"لال مسجد، تعمیر مرزا ہندال جامع مسجد دہلی کا نقش اولین ہے، اس کے سامنے حمام ہے جو ماوراء النہر طرز کی عمارت ہے۔ گنبد کلاں تاتار خانی شمالی ہند کا ضخیم ترین — بہت بڑا گنبد ہے، مقبرہ شیر شاہ واقع سہسرام سے مشابہ اور اس سے بھی بڑا ہے۔ میوات میں ہونے کی وجہ سے اس کی اہمیت واضح نہیں ہو رہی ہے[1]

مندرجہ ذیل کتبات بھی اس شہر کی تہذیبی و ثقافتی سرگرمیوں کے آئینہ دار ہیں جو آج تک دستیاب ہیں۔

مسجد تحصیل والی کا کتبہ ہے۔ خیر بقاع ۹۸۲ھ

مسجد حکیم جی والی (حکیم سید کرم حسین م ۱۳۷۲ھ / ۱۹۵۲ء) کا کتبہ ہے

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ

بدور شہ اکبر دین پناہ ۔ بنا گشت ایں مسجدے خوب تر
چوں بنیاں مبارک نہاد الیاس ۔ دہد از جہاں حق اورا اجر

۱؎ مکتوب پروفیسر سید محمد سلیم تجاروی بنام مؤلف

بگفتا خرد سال تاریخ او　　کہ سال الف بود ماہِ صفر
۱۲۰۲ھ

حکیم صاحب مرحوم نے اس مسجد کے پاس حجرہ تعمیر ایا تو اس پر یہ تاریخ کندہ کرائی۔

بنا کردہ عماد الدین حجرہ　　چراغ باب اسلام است ساتش
۱۳۰۳ھ

تجارہ کے جنگل میں زمین کھود کر لوبان نکالا جاتا ہے، جو بہت عمدہ قسم کا ہوتا ہے۔ لوبان زمین میں براہ راست نہیں ہوتا۔ بلکہ ایک درخت کے لعاب۔ مد۔ یا اس کے پانی سے بنتا ہے۔ تجارہ کے جنگل میں زمین کی تہہ کے اندر لوبان کی موجودگی سے ظاہر ہوتا ہے کہ یا تو یہاں لوبان کی بہت بڑی منڈی تھی، وہ کسی ناگہانی مصیبت کی شکار ہوئی اور وہ ذخیرۂ لوبان جوں کا توں زمین میں رہ گیا، اور گردشِ ایام نے زمین ' داو نچا کر دیا' یا یہاں لوبان کے درختوں کا بہت اہم جنگل تھا اس میں آگ لگ گئی اور لوبان پیوندِ زمین ہو گیا۔ تجارہ اور سندھ کے درمیان کوئی دریا نہیں، کوئی سمندر نہیں، ممکن ہے کہ یہاں سے لوبان براہ سندھ عرب پہنچ کر دنیا کی منڈیوں میں جاتا ہو، بہر حال اس شہر کی قدامت، تاریخی اہمیت اور اس کی تہذیبی و ثقافتی عظمت مندرجہ بالا شواہد سے ظاہر ہے۔

یہاں پر سب سے پرانا مدرسہ جہاں تاریخ نے ہمیں پہنچایا جہانگیر کے زمانے میں تھا، اس کے تفصیلی سوانح معلوم نہ ہو سکے البتہ اس قدر معلوم ہے کہ اس مدرسہ کے ایک استاد مولانا ابوالخیر عثمانی تھے۔ چنانچہ میاں لاڈو خاں کوٹ قاسم کے حالات میں ہے" آپ نے قصبہ تجارہ میں مولانا ابوالخیر سے نحو اور فقہ کا استفادہ کیا[1] ایک جگہ لکھا ہے" ایک روز آپ بیٹھے ہوئے تھے یکایک دل میں علم ظاہری حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا، اس کی تکمیل

---

[1] اذکار احرار جدید ص ۲۹۳

کے لیے تجارہ میں شیخ ابوالبرکاتؒ کی خدمت میں آئے، جو خواجہ محمد شعیب م ۱۱۵۵ھ (بانی خانقاہ شعیبیہ تجارہ) کے اجداد میں سے تھے ان سے پڑھنا شروع کیا۔[1]

شاہ محمد شعیب ؒ (۱۱۴۸ھ ۱۲۱۱) نے ۱۱۵۵ھ میں شاہ غلام نبی فیروز پوری سے بیعت کی اور اس کے بعد قصبہ تجارہ کے محلہ قاضی واڑہ میں ایک خانقاہ تعمیر کرائی جو بعد میں "خانقاہ شعیبیہ" کے نام سے مشہور ہوئی۔ اب بھی اس پر جلی حرفوں میں یہ نام لکھا ہوا ہے اس سے متعلق ایک بہت قیمتی اور عمدہ کتب خانہ تھا کتب خانے عموماً مدرسوں میں ہوتے ہیں۔ شاہ محمد شعیبؒ اچھے عالم دین تھے فارسی علم و ادب کا شستہ ذوق رکھتے تھے گو کہیں صراحتاً مذکور نہیں مگر دس بارہ ہزار کتابیں جس کتب خانہ کی زینت ہوں ضرور وہاں مدرسہ بھی ہوگا اور شاہ محمد شعیب اس مدرسہ کے مہتمم، صدر مدرس اور نگراں ہونگے۔ خانقاہ شعیبیہ میں جہاں خلوت خانے بنے ہوئے ہیں وہیں درسگاہیں بھی "صورۃً" نظر آتی ہیں۔ یہ گیارھویں اور بارھویں صدی کا قصہ ہے۔ ان کے مرشد شاہ غلام نبی قدس سرہٗ بھی جید عالم دین تھے، اس زمانے میں تجارہ کے ثقافتی و تہذیبی کوائف بھی اس کی تائید میں ہیں کہ یہاں اسلامی علوم و فنون کی باقاعدہ درس گاہ تھی۔ یہ سلسلۂ فیض و ارشاد ۱۹۴۷ء تک مصروفِ کار رہا۔ حافظ مجید الدین م ۱۹۴۶ء کی وفات سے یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔

۱۹۱۵ء میں حکیم سید کرم حسینؒ کی کوششوں سے تجارہ میں "اسلامیہ اسکول" کا اجراء ہوا جس میں درجہ چہارم تک تعلیم تھی مگر اردو فارسی میں طلبہ کی اس قدر استعداد بن جاتی تھی کہ وہ اونچی جماعتوں میں جا کر آسانی سے اردو فارسی لے لیتے تھے غرض ۱۹۴۷ء تک قصبہ تجارہ بڑا اچھا علمی و ثقافتی مرکز تھا۔

---

[1] مرقع میوات ص ۲۹۳

مدرسہ پلول

دلّی اور آگرہ مغل عہد کے مشہور شہر ہیں۔ آگرہ روڈ ان دونوں کے درمیان ہمزۂ حاصل کا کام دیتی ہے' پلول اسی روڈ پر آباد ہے' یہ قصبہ بہت پرانا ہے ایک روایت ہے کہ مہابھارت میں جو اپیلو کا ذکر ہے وہ یہی پلول ہے۔ بکرماجیت کے زمانے میں یہ بہت بارونق تھا (امپیریل گزیٹیر آف انڈیا ۲۰/۲۴۲) تاریخی طور پر سب سے پہلے اس کا ذکر طبقات ناصری میں آیا ہے جس سے اندازہ ہوا کہ خاندانِ غلامان کے دور میں یہ قصبہ کسی امیر کی جاگیر تھا۔ آئینِ اکبری میں پلول کا تفصیلی حال درج ہے یہاں ایک قلعہ تھا جس کے آثار اب تک موجود ہیں...... مرآۃ السلاطین میں پلول کا ذکر جگہ جگہ موجود ہے۔ یہاں ایک گھمسان کی لڑائی ہوئی جس میں سادات بارہہ کا خاتمہ ہو گیا۔ محمد شاہ ایک لاکھ کا لشکر لے کر پلول پہنچا' دوسری طرف حسین علی بادشاہ گر کی فوج بھی اتنی ہی تھی' اس کے علاوہ جنگی ہاتھی اور توپ خانے بھی تھے' یہ لڑائی پلول سے چند میل دور حسن پور کے قریب ہوئی' اس میں اتنے آدمی مارے گئے کہ یہ جگہ اب بھی "لکھ مری" کہلاتی ہے۔ اس لڑائی میں پلول کے جن لوگوں نے بہادری دکھائی اس تاریخ میں ان کے نام بھی دئے ہیں۔

ہندوستان کی پہلی جنگِ آزادی سے پہلے پلول نواب مرتضیٰ خاں کی جاگیر تھا۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ ان کے فرزند یہیں پیدا ہوئے یہاں کی جامع مسجد اتنی پرانی ہے کہ دلّی کی کوئی عمارت اس عہد کی نہیں البتہ مہرولی کی مسجد قوۃ الاسلام اس کے ساتھ بنی ہے۔ اس مسجد میں ممبر کے پاس ایک کتبہ بہت اہم ہے۔ یہ خط نسخ میں سنگ خارا پر ہے۔ اس میں قطب الدین ایبک کا نام درج ہے۔ مسجد کے ستون ایک ڈال کے پتھر کے ہیں جن پر نقش و نگار ہیں۔ پورا دالان چھوٹے چھوٹے مربعوں پر تقسیم ہے جن پر لگن کی شکل کے چپٹے گنبد بنے ہوئے ہیں' پوری چھت ان ہی گنبدوں سے بنی ہے۔ اس کے سوانح اپی گرافیکا انڈو مسلیکا ۱۹۱۳ء میں چھپے ہیں۔ قصبہ کی عیدگاہ بھی اسی

زمانہ کی ہے' یہاں قبلہ کی دیوار میں شمس الدین التمش کا کتبہ نصب ہے۔ سڑک کے کنارے ایک خوبصورت مقبرہ ہے جو پورا سنگ سرخ کا بنا ہوا ہے چاروں طرف جالیاں ہیں دروازہ کی پیشانی پر ایک کتبہ ہے جس میں سیّد چراغاں کہ ساکن مدینہ بنت ہے۔۔۔ کہتے ہیں کہ یہاں سڑک کے کنارے ایک درویش رہتے تھے۔ اس وقت دلّی کا لال قلعہ تعمیر ہو رہا تھا۔ آگرہ سے سنگِ سرخ سے لدی ہوئی گاڑیاں یہاں سے گزرتی تھیں ہر گاڑیبان ایک ایک پتھر اس درویش کو دیتا تھا۔ انھیں سے یہ مقبرہ تیار ہوا ہے۔ قصبہ کے بیچ میں ایک وسیع سرائے ہے جو تمام سنگ خارا کی بنی ہے اس کی چھتیں لداؤ کی ہیں اس کے دونوں دروازوں پر گنبد ہیں۔ یہ شیر شاہ کے عہد کی ہے۔ اس زمانے میں اس سڑک پر جگہ جگہ سرائیں اور منارۂ کوس بنے ہوئے تھے چنانچہ ایک منارۂ کوس بستی سے ملا ہوا اب بھی موجود ہے آبادی سے ہٹ کر مشرق کی طرف ایک پرانی مسجد ہے جس کو بی بیوں کی مسجد کہتے ہیں۔ عمارت تغلق طرز کی ہے یہ جگہ حاجی پورہ کہلاتی ہے۔ یہاں دور تک آبادی کے آثار نظر آتے ہیں۔ محکمۂ آثارِ قدیمہ کی نظر میں یہ مقام کھدائی کے لائق ہے۔ آبادی کے قریب کھیتوں میں اور بھی کئی مقبرے ہیں جن کا حال معلوم نہیں۔ پلول کے محلہ جلیل کلاں میں ایک صاحب پیر مظہر علی تھے ان کے دکان کی بنیاد میں ایک دفینہ برآمد ہوا جس میں تانبے کے سکّے تھے' ان پر انسانی تصویریں ہیں۔ یونانی وضع کے معلوم ہوتے ہیں' تحقیق سے کشن خاندان کے خیال کیے جاتے ہیں پلول کے حکیم عباس نے ان میں کے دو سکّے دلّی کے عجائب خانہ میں محفوظ کرا دیے ہیں(۱) بظاہر یہاں مدرسہ کے نام سے کوئی جگہ مشہور نہیں مگر اس قدر قدیم اسلامی بستی میں مدرسہ نہ ہونا تعجب خیز ہے شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے خاندان کی شاخ یہاں ۱۹۴۷ء تک آباد تھی علمی خاندان تھا ضرور ان کا مدرسہ ہوگا جہاں وہ اپنے بچوں کو تعلیم دیتے تھے اور پھر سادات بھی یہاں آباد تھے۔

(۱) ماہنامہ جامعہ نئی دہلی جولائی ۱۹۶۳ء

فیروز پور جھرکہ

۷۵۵ھ میں فیروز شاہ بادشاہ نے اس قصبہ کو بہ بنا آبادی جو اب بنام نہاد ڈھونڈ کلاں و خورد آبادی حال سے جانب شمال واقع ہے، آباد کیا۔ تاریخ میں "حصار فیروزہ" کے نام سے بھی اس کا تذکرہ آتا ہے۔ شیر شاہ سوری کے عہد میں یہ خواص خاں کا دار الخلافہ تھا، یہاں سلیم شاہ سوری کی فوج کو شکست ہوئی، بابر نے فیروز پور کے جھرنے کے قریب رات کو آرام کیا۔ سنگرام سا اسی مقام پر حسن خاں میواتی سے مل کر بابر سے لڑنے گیا۔ عرصہ قریب دو سو سال کے ہوا ہے کہ خاندان خان مسیح انصاری صوبہ عظیم آباد نے ایک پختہ قلعہ بجانب متصل آبادی سابقہ بنوا کر سکنائے آبادی سابقہ کو اجازت سکونت کی دی۔ چنانچہ عموماً لوگ اس قلعہ میں سکونت پذیر ہو گئے۔ اس باعث سے وہ آبادی بے رونق ہو کر اکثر مکانات ویران ہو گئے اس وجہ سے اب آبادی کہ جس قدر دو حصہ جدا جدا ہو کر ایک بنام ڈھونڈ خورد دوم بنام ڈھونڈ کلاں مشہور ہے۔ اور آبادی قلعہ بنام فیروز پور بنامزد عملداری نواب احمد بخش صاحب میں نواب موصوف نے بیرون قلعہ بجانب شرق و جنوب اور آبادی جدیدہ بنوادی وہ بھی بنام فیروز پور مشہور ہے اور معہ قلعہ ایک ہی آبادی سمجھی جاتی ہے اور چونکہ اندر سرحد اس قصبہ کے جانب غرب ایک پہاڑ واقع ہے اس میں سے پانی خود بخود بارہ مہینے جھرتا رہتا ہے اس واسطے لفظ "جھرکہ" فیروز پور کے نام میں شامل ہے۔ یہی نام کاغذات سرکاری میں لکھا جاتا ہے۔ قصبہ روز آبادی سے برابر آباد ہے ویران نہیں ہوا[۱]

یہاں پر اسلامی مدارس و مکاتب کا سلسلہ بہت پرانا ہے۔ چنانچہ ایک حافظ صاحب یہاں قرآن کریم کی حفظ و ناظرہ تعلیم دیتے تھے اور فارسی کی بھی تعلیم عام تھی۔ حافظ صاحب کا جب وصال ہوا تو ان کے کسی معتقد نے ان کی تاریخ وفات لکھی

---

۱ رجسٹر ریکارڈ محافظ خانہ گوڑگانوہ

جو لوح مزار پر کندہ ہے یہ ہے

رفت چوں شیخ حافظ از عالم — گریہ کردند مرداں بے حد
در جہاں مثل او بسے کم بود — بو قوت و بدانش و بخرد
چہ دہم شرح خلق آں بزرگ — حافظ بود، خلقش بروں آید
عدد سال وفاتش سحر بگوشش — چنیں گفت ہاتف کہ حافظ بلی بد

ایک اور فارسی کے معلم تھے۔ ان کی وفات پر ان کے شاگرد نے مندرجہ ذیل[۱۲۰۶ھ] قطعہ کہا ہے:

چوں رفت عبد القوی از دار فانی — گراں شد مرداں را زندگانی
چوں وجہی جست تاریخ وفاتش — خرد گفتا۔ بداغ حیف۔ وا ئی

ایک اور کتبہ۔ کار طیلخاں بہادر بن شیخ محمد آصف ۲۰ر محرم الحرام سنہ ۱۱۲۹ھ

یہ کتبہ جنگل سے حاصل کیا گیا ہے طیلخاں کا لفظ کچھ نامانوس اور اجنبی محسوس ہوا خدا بھلا کرے حکیم سید ظل الرحمٰن تجاروی صدر شعبہ علم الادویہ اجمل خاں طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا کہ انھوں نے اس لفظ کی تصحیح بھی فرمادی اور اس کے کوائف ضروری سے بھی پردہ اٹھادیا۔ اصل میں یہ لفظ کار طیلخاں نہیں کار طلب خاں ہے۔ نواب کار طلب خاں کے بزرگ حاجی الحرمین ملک حسین انصاری گیارھویں صدی ہجری میں مع اپنے صاحبزادہ بندگی خلیل مدینہ منورہ سے ہندوستان آئے تھے، دہلی میں مسجد حسل میں ان کا قیام رہا۔ یہ دونوں حضرات بہت متشرع اور عالم علوم معنوی تھے۔ بندگی شیخ خلیل کے دہلی میں تین صاحبزادے پیدا ہوئے۔ اخوند میر، محمد عاد، محمد زکریا۔ یہ تینوں بھائی قاضی شرعی سے بیعت اور ان سے بے حد قلبی تعلق رکھتے تھے، قاضی شرعی کے ہمراہ انھوں نے بھی میوات پہنچ کر جھر اوٹ میں سکونت اختیار کی پہاڑ کے دامن میں جہاں قاضی شرعی کا مزار ہے اس کے پائیں ایک چبوترے پر ان تینوں کی قبریں ہیں۔ اخوند میر کے پوتے عبد الصمد (ابن نظام) کے دو بیٹے تھے۔ بڑے مخدوم طاہر، جو مرد باصفا اور

صاحب باطن تھے' یہ جھراوٹ سے فیروزپور منتقل ہوگئے۔ برخوردار خاں انھیں کے احفاد میں ہیں۔ عبدالصمد کے دوسرے بیٹے محمد زین نے ساکرس میں سکونت اختیار کی۔ محمد عاد کے صاحبزادہ ابو محمد ہمراہ مخدوم طاہر فیروزپور جھرکہ میں آباد ہوگئے۔ وہاں انھوں نے بڑی ریاست پیدا کی۔ صدر جہاں ان کے پوتے تھے' صدر جہاں کے پوتے دیوان مسکین اور دیوان مسکین کے صاحبزادے دیوان آصف نے غیر معمولی اثر و اقتدار حاصل کیا' دیوان آصف کے فرزند ارجمند تھے غلام مصطفیٰ عرف نواب کارطلب خاں۔ ان کی وفات ۲۰ محرم الحرام ۱۱۲۹ھ کو ہوئی ان کے صاحبزادے علی اصغر خاں عرف نواب خاں زماں خاں بہادر بہ منصب ہفت ہزاری و خدمت داروغگی توپ خانہ فرخ سیر تا عہد محمد شاہ صوبہ ملتان اور صوبہ عظیم آباد میں سالہا سال رہے۔ فیروزپور جھرکہ کا پختہ قلعہ نواب خان زمان خان کا تعمیر کردہ ہے۔[1]

۱۸۰۳ء میں احمد بخش نامی ایک سرکاری ملازم مہاراجہ الور راجہ بختاور سنگھ اور لارڈ لیک کی نظر عنایت سے نواب احمد بخش بن گیا اور فیروزپور جھرکہ' پونا ہانہ' بچھور' ساکرس وغیرہ اس کی ریاست میں شامل ہوگئے۔ فیروزپور جھرکہ اس کا پایۂ تخت بنا۔ نواب صاحب نے ۱۸۲۳ء میں شہر کی موجودہ جامع مسجد تعمیر کرائی۔

شیخ المشائخ میاں لادخاں کوٹ قاسم ۱۰۹۲ھ کے ایک اہم خلیفہ زبدۃ الاولیاء شاہ غلام نبی قدس سرہٗ تھے۔ (۱۱۵۷ھ ۱۷۴۴ء) وہ بہت بڑے بزرگ تو تھے ہی جلیل القدر عالم بھی تھے اور مصنف بھی۔ چنانچہ ان کا ایک منظوم رسالہ "پندنامہ" حکیم سید ظل الرحمٰن تجارہ ہاؤس علی گڑھ کے کتب خانہ میں ہے اور مخطوطہ ہے۔ وہ فیروزپور جھرکہ کے مکین تھے۔ یہیں انھوں نے سلوک و تربیت کا بھی نظم کیا اور تعلیم و تعلم کا بھی۔ اندرون قلعہ پختہ

---

(۱) حیات کرم حسین ص ۴۳-۴۲

ایک مسجد ہے پیرجی والی وہ آپ کے تدریسی عزائم اور تبلیغی حوصلوں کی جولان گاہ بنی۔ اور قصبہ فیروزپور میں سلسلۂ ابوالعلائی نقشبندی نے علم و عرفان' اخلاق و آداب اور سلوک و تربیت کے دریا بہائے' شاہ نوراللہ بن شاہ غلام نبیؒ' قاضی سیف اللہؒ خلیفہ قاضی تقیؒ' شاہ محمد حنیفؒ وغیرہ نے عرصہ دراز تک اس قصبہ میں رونق افروز ہوکر اس کے ماحول میں اسلامی تہذیب و ایمانی ثقافت کی نورانی لہریں پھیلائیں۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے کچھ مجاہد بھی میوات میں رونق افروز ہوئے' یہ لوگ سرحد کی اس جماعت میں سے تھے جو "جماعت مجاہدین" کے نام سے مشہور تھی' مولانا نور علیؒ' مولانا محمد مریدؒ' حضور کیسیؒ والے' ڈاکٹر نذر محمد بادشاہ پوری' بھوزری والے میاں صاحبؒ[1] مولوی محمد مریدؒ نے قصبہ فیروزپور جھرکہ میں سکونت اختیار کرلی اور جامع مسجد کے خطیب و امام بن گئے۔ ۱۳۰۱ھ مطابق ۱۸۸۳ء میں انھوں نے جامع مسجد میں ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی اور اس کا نام "مدرسہ حافظ الاسلام" رکھا۔ بیسویں صدی عیسوی کے ابتدائی زمانے میں ان کے بلند اقبال فرزند ارجمند حضرت مولانا محمد حسنؒ

---

(۱) تاریخ میو چھتری صفحہ ۳۹۲ مولوی عبدالشکور مرحوم نے بھوزری والے میاں صاحبؒ کو مولانا ابوالحسنؒ افغانیؒ کا نام دیا ہے۔ لکھا ہے کہ وہ بڑے زبردست عالم تھے سیاح تھے اور مناظر بھی۔ مگر ان کے طور طریق جائے رہائش وغیرہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کوئی زبردست انقلابی آدمی تھے مگر بظاہر نہیں کہ علوم سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ ماسٹر رحمت خاں شہید ۱۹۶۸ء کہا کرتے تھے کہ یہ جنرل بخت خاں تھے جو جنگِ آزادی اول میں آزاد ہند فوج کے کمانڈر ان چیف تھے' جیالے' بہادر اور بڑی سمجھ بوجھ کے مالک تھے۔ بہادر شاہ ظفر کی ہمایوں کے مقبرہ سے گرفتاری کے بعد جنرل بخت خاں کچھ بد دل ہوکر ایسے گم ہوئے کہ تاریخ ان کا سراغ لگانے سے قاصر ہے۔ کیا عجب ہے کہ ماسٹر رحمت خاںؒ کی بات درست ہو۔

۱۹۴۴ء) اور حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ اور مولانا عبد المجید صاحبؒ ریواڑی نے جامع مسجد کے جنوب میں مدرسہ کی عمارت تعمیر کرائی۔ زندگی بھر حضرت مولانا محمد حسن نے یہاں تشنگانِ علوم وفنون کو سیراب کیا، ان کی وفات کے بعد ان کے داماد قاری مشتاق احمد اس مدرسہ کے سربراہ ہوئے۔ موجودہ دور میں میوات کا یہ سب سے قدیم مدرسہ ہے۔ اس نے بڑے بڑے انقلاب دیکھے ہیں بلکہ انھیں اپنے سرسے گزارا ہے۔ سب سے پہلا انقلاب اس میں اس وقت آیا جب اس مدرسہ کے مدرس مولانا حبیب اللہ صاحب ساکرس انتظامیہ کی عصبیت سے تنگ آکر علیحدہ ہوئے اور مولانا عبدالمجید صاحبؒ ریواڑی اور دیگر اکابر کی رائے سے موضع کامیدڑہ میں اسلامی مدرسہ کی بنیاد ڈالی ۱۳۵۵ھ۔

دوسرا انقلاب ۱۹۴۷ء میں پیش آیا جب شہر کی کل آبادی پاکستان ہجرت کر گئی۔ مدرسہ کے مہتمم مولانا مشتاقؒ اور ان کا پورا عملہ مدرسہ کے کتب خانہ سمیت یہاں سے ہجرت کر گیا۔ جو مولانا محمد حسن قدس سرہٗ کا سرمایۂ حیات اور میوات کا انمول کتب خانہ تھا۔ یہ مدرسہ پھر بے یار و مددگار ہو گیا۔

حضرت مولانا عبدالسبحان قدس سرہٗ جو میوات میں علوم دینیہ و معارف اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ کے بانی و سرخیل تھے۔ جن کے دل و دماغ پر ہر وقت یہ فکر مسلط رہتی تھی کہ میو قوم کا ہر فرد علوم دینیہ سے بہرہ ور ہو، دینی ادراک قوم کا اجتماعی شعور بن جائے، نئی نسل ماضی کی صالح روایات کی امین، مذہبی آوارگی سے محفوظ اور ذہنی بےراہ روی سے مامون رہے اس کے لیے انھوں نے ساری عمر جد و جہد کی، انھیں کے ایک ہونہار شاگرد حضرت مولانا عبدالستارؒ ۲۰ر نومبر ۱۹۸۳ء کے ذریعہ حق تعالیٰ نے یہ مدرسہ پھر جاری کرایا۔ اس کے بعد بھی انقلابات نے اپنا سایہ اس مدرسہ سے اٹھایا نہیں بلکہ انقلاب کا پہیہ برابر گھومتا رہا۔ مگر مولوی صاحب برابر کام کرتے رہے۔ مولانا صاحبؒ بڑے اچھے اور کامیاب مدرس تھے

زندگی کی اہم قدروں میں احتیاط و اعتدال کے قائل تھے، توازنِ طبع کے خوگر افراد عموماً صحت و تندرستی سے ہمکنار رہتے ہیں مولانا صاحبؒ تقریباً تیس پینتیس سال سے صحت و توانائی کے ایک ڈگر پر چلتے رہے آخر عمر میں درد گردہ کی شکایت ہو گئی تھی اس کے آپریشن بھی کرائے، تیس چالیس سال مسلسل تعلیمی خدمات میں مصروف رہ کر اپنے مولا سے جا ملے رحمۃ اللہ تعالیٰ اور نواب طیلخاں بہادر کے قبرستان متصل عیدگاہ قصبہ سے جانب شمال عیدگاہ کے احاطے میں آپ کی آخری آرام گاہ بنی۔ اللہ تعالیٰ ان کے پس ماندگان کو صبر جمیل اور ان کے اراکین مدرسہ کو سکون و تسلی، خلوص و للہیت، عزم محکم اور فکر سلیم و نظر مستقیم عطا فرمائے۔

نواب احمد بخش کے صاحبزادے نواب شمس الدین احمد خاں کو بسلسلۂ قتل فریزر ۱۸۳۵ء میں پھانسی دے دی گئی یوں یہ مختصر سی مسلم ریاست بہت تھوڑے عرصہ میں داستانِ ماضی بن گئی۔ مگر اردو علم و ادب کے سلسلے میں نواب احمد بخش خاں کے خاندان نے نمایاں خدمات انجام دیں۔ نواب علاء الدین خاں علائیؔ، نواب سراج الدین خاں سائلؔ وغیرہ اس خانوادہ علمی کی معروف و مشہور ہستیاں تھیں جنھیں اردو ادب کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ حضرت داغؔ دہلوی کا بھی فیروزپور جھرکہ سے بہت قریبی رشتہ ہے۔ اسلیے کہا جا سکتا ہے کہ مدرسۂ فیروزپور جھرکہ کی فیض پاشی میوات کی حدود سے نکل کر دور دور پہنچ چکی ہے۔

یہ میوات کے تاریخی مدرسے تھے جنھوں نے سرزمین میوات کو عرصہ دراز تک اسلامی علوم وفنون سے سیراب و شاد کام کیا۔ اس وقت میوات میں کچھ تو یہی تاریخی مدارس علمی خدمات انجام دے رہے ہیں اور کچھ کا پچھلے عرصہ پچاس سال میں اجرا ہوا ہے اس لیے ہم آخر میں ان کی فہرست دیتے ہیں اور معلوم کوائف بھی۔

مدرسہ کاشف العلوم مسجد بنگلہ والی بستی حضرت نظام الدین اولیاءؒ نئی دہلی

خلجی و تغلق کی دلی میں جب سلطان جیؒ کو وحشت محسوس ہوئی تو ایک دن حوضِ رانی کے کنارے بیٹھ کر دعا کی: الٰہی خلوت و یکسوئی۔ حکم ہوا: غیاث پور جاؤ۔ آپ اس سے ناآشنا تھے مگر آپ کے ایک دوست کی وہاں آمد و رفت تھی آپ فوراً ان کے گھر پہنچے اور اپنے دوست کو معلوم کیا۔ ان کے گھر میں سے جواب آیا کہ وہ غیاث پور گئے ہیں۔ آپ ان کے بتائے ہوئے نشانات کے ذریعہ غیاث پور پہنچے' اور اپنی قیام گاہ کے لیے اسے پسند فرمایا۔ پھر آپ اس بستی میں ایسے گھل مل گئے کہ پوری بستی آپکے محبوبی اوصاف و ملکوتی خصائل کی جلوہ گاہ بن گئی۔ غیاث پور کا نام ذہنوں سے اوجھل ہو گیا۔ اب یہ نام تاریخ کے اوراق کی زینت ہے یا دلّی کے کاغذاتِ مال میں محفوظ۔ آپ کی فرودگاہ بننے کے باعث اس کا مشہور و متعارف نام "بستی حضرت نظام الدین اولیاء" ہے۔ یا پھر سلطان جی کی بارگاہ۔ یہاں آپ نے مسلک چشت کی ایسی بنسری بجائی کہ پورا ملک' غیر منقسم' اس کا والہ و شیدا بن گیا۔ یہی وہ بارگاہ ہے جہاں حاضر ہو کر امیر خسروؒ نے صدا لگائی:

توآں شاہے کہ برایوانِ قصرت	کبوتر گر نشیند باز گردد
غریبے مستمندے بر در آمد	بیاید اندروں یا باز گردد

جس کے جواب میں سلطان جیؒ نے فرمایا:

بیاید اندروں مردِ حقیقت	کہ با ما یک نفس ہمراز گردد
اگر ابلہ بود بود آں مرد ناداں	ازاں راہے کہ آمد باز گردد

یہیں مرزا اسد اللہ خاں غالب اپنی فکری وسعت و پہنائی' رفعتِ تخیل و بلندیِ نظر اور شعری لطافت و نزاکت کے ساتھ ایک گوشہ میں محوِ استراحت ہے۔

اس نگری میں ایک رئیس تھے' مرزا الٰہی بخش۔ بہادر شاہ ظفرؒ آخری مغل شہنشاہ کے سمدھی' مولانا محمد اسمٰعیل کاندھلویؒ والد ماجد مولانا محمد الیاسؒ۔ ان کے بچوں کو پڑھاتے تھے' یہاں مرزا جی کا بنگلہ بھی تھا اور رہائش گاہ بھی۔ مولاناؒ کے مکتب کے لیے ایک مسجد بنا دی جو احاطۂ بنگلہ میں ہونے کی وجہ سے بنگلہ والی مسجد کہلائی' یہی مسجد بعد میں "مدرسہ کاشف العلوم" کی بنیاد بنی جو مولاناؒ کے تعلیمی جذبات و عواطف کا مضطربانہ اظہار' ان کے خلوص و للٰہیت اور دردِ دلّی کا آئینہ اور تربیتی سوانح و کوائف کی دلکش تصویر ہے۔ اور چودھویں صدی کی بین الاقوامی دینی و مذہبی تحریک "تبلیغ" کی اساسِ اولین۔ یہیں سے ہدایت و نور کے وہ چشمے پھوٹے جنھوں نے افریقہ کے ویران و بنجر جنگلوں کو سیراب کیا' یورپ و امریکہ کے خدا بیزار اور خشک ماحول میں آوازِ اذان کے بھرے' رسیلے اور دلنواز نغمے چھیڑے اور اسلامی دنیا کو اس کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا۔ اس مدرسہ کی مولانا محمد اسمٰعیلؒ نے بنیاد رکھی' آپ کے خلف اکبر مولانا محمدؒ نے اسے خونِ جگر و سوز دروں سے سینچا اور چھوٹے فرزند ارجمند مولانا محمد الیاسؒ نے اسے پروان چڑھایا۔ اور آپ کے پوتے مولانا محمد یوسفؒ نے اسے بین الاقوامی درسگاہ بنا دیا۔ مولانا محمد یوسفؒ کے انتقال کے بعد آپ کے زندگی بھر کے رفیق اور ساتھی مولانا محمد انعام الحسن اس عالمی دانش کدہ کے سرپرست و نگراں ہیں اور اپنی نزاکت فکر و نظر و لطافتِ مزاج کے باوجود اس عالمی اور عوامی مدرسہ و تربیت گاہ کی اہم ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہیں رب العزت اس مدرسہ پر فکرِ سلیم کا چھتر سایہ اس کے طلبہ میں جادۂ مستقیم کا شوق' سعیِ مسلسل کا ذوق اور جہدِ پیہم و محبت فاتحِ عالم کی طلب و جستجو پیدا فرمائے۔

ع :۔ ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

اس مدرسہ کی اساس و بنیاد بھی میوؔ قوم کے چند افراد تھے اور اس کی اولین فیض یافتہ بھی یہی قوم تھی۔

اس مدرسہ نے تعلیمی خدمات بھی انجام دیں اور خانقاہی فرائض بھی۔ یہاں ابن عربیؒ و شیخ سرہندیؒ کی فکر بوقلموں بھی کارفرما رہی اور غزالیؒ و رومیؒ کی نظر دلنواز و روح افزا بھی سایہ فگن۔

۱۸۵۷ء اسلامی ہند کے لیے بڑا جانگسل، ہمت شکن اور صدمات سے لبریز تھا ہزار سالہ تہذیب و تمدن کے چہچہاتے پھول پژمردہ، باہمی میل ملاپ کے شجر پُر بہار کے پتے مضمحل اور یک جہتی و اتحاد کی چادر تار تار ہو رہی تھی تباہی بغداد ۶۵۶ھ کے بعد اسلامی دنیا پر یہ سب سے بڑے بلا کے بے درماں نازل ہوئی تھی، مسافرِ اسلام جس نے گنگا و جمنا کے کنارے وضو کر کے متھرا و کاشی کے جنگلوں کو نیاز آگیں سجدہ بنا دیا تھا، ایلورا اجنتا کی بھیانک غاروں کے دہانوں پر ریاضت و عبادت کی محرابیں تعمیر کی تھیں اور اَللّٰہُ اَکْبَرُ کے پُر وقار ترانوں کے مینارے بلند کیے تھے۔ وہ واپسی کے لیے پر تول رہا تھا۔ بہادر شاہ ظفر اپنی تمام توانائیوں کے باوجود۔ بخت نارسی سے، شطرنج کا ایک مہرہ تھا جسے اس کے اعزہ اپنی خواہش کے مطابق استعمال کر رہے تھے، مرزا الٰہی بخش جو بظاہر سلیم الفطرت تھا، شومئی قسمت سے، غیروں کے نرغے میں آچکا تھا۔ دنیا جانتی ہے کہ اس کے ذریعہ اسلامی ہند کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکی گئی، میرا خیال ہے کہ غیر شعوری طور پر ان سے یہ حرکت سرزد ہوئی ورنہ ان کا بنگلہ عالمی تحریک اصلاح کا مرکز نہ بن سکتا تھا، بظاہر ان کا جرم غیر معمولی تھا۔ ملک و ملت سے غداری۔ مگر ان کے قائم کردہ مدرسہ کے فیوض و آثار بھی غیر محدود و لامتناہی ہیں۔ خدائے کریم کی کرم گستری۔ ملک کے غدار اعظم کے بچوں کا مکتب

ایک بین الاقوامی دینی و ایمانی تحریک کا مرکز ثقل بن گیا، جہاں عوام و خواص غضب و عتاب کے گجروں اور لعن طعن کی مالاؤں کے بجائے عقیدت و ارادت کے پھول اور محبت و اشتیاق کے مورچھل لے کر استفادہ و استفاضہ کی غرض سے حاضر ہوتے ہیں۔

خدائے غفور و رحیم کی شانِ کریمی و ذرہ نوازی کہ اسلامی ہند میں جسم ملت کی جاں بلب ہچکیوں میں غیر ملائم و نامناسب برتاؤ کو ملت کی نشأۃ ثانیہ کا ذریعہ بنا دیا۔

وُلِدَ الْهُدٰی فَالْكَائِنَاتُ ضِيَاءٌ   وَفَمُ الزَّمَانِ تَبَسُّمٌ وَثَنَاءٌ

تبلیغی نقل و حرکت مسلمانوں کی طبقاتی کشمکش، فروعی اختلافات اور مسلک کے تباین و تضاد کی موجودگی میں صلاح و فلاح کی ایک نہایت مفید تحریک ہے۔ کاش کہ مسلم قوم یہ گر سمجھ پائے۔

بہرحال مدرسہ کاشف العلوم میوؔ قوم کی نشأۃ ثانیہ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے حق تعالیٰ اسے نظر بد سے بچائے اور دلفریب مغالطوں کی پرچھائیوں سے دور رکھے۔

وَيَرْحَمُ اللّٰهُ عَبْدًا قَالَ: آمِيْنَا

مولوی عبدالرحمٰن خاں شاکر دہلویؒ

ابن مولانا عبدالسبحان میواتیؒ۔ پیدائش ۱۹۲۵ء مدرسہ تجوید القرآن دہلی میں قاری محمد سلیمان کی خدمت میں قرآن کریم حفظ کیا۔ مدرسہ سبحانیہ میں مختصر المعانی تک تعلیم حاصل کی۔ ازاں بعد مدرسہ امینیہ دہلی سے سند فراغت حاصل کی۔ بلا کے ذہین اور انتہائی فہیم تھے۔ ذہن بالغ، فکر رسا، رائے پختہ و سنجیدہ اور دماغ سلجھا ہوا۔ اعلیٰ بہترین معلم و مدرس، اردو و فارسی کے ماہر، اردو کے نغز گو شاعر۔ وفات دسمبر ۱۹۸۲ء مہندیوئیں دفن ہوئے۔

مدرسہ معین الاسلام قصبہ نوح ضلع گوڑگانوہ

قصبہ نوح میوات کے اہم قصبات میں شمار ہوتا ہے۔ یہاں پر دو ہائی اسکول، ایک ڈگری کالج اور دو اسلامی مدرسے ہیں۔ اس کی موجودہ آبادی تقریباً چھٹی صدی ہجری کی ہے۔ پہلے یہاں کے باسی موضع نرہر میں آباد تھے جو موجودہ آبادی سے جانب غرب کوہ ارولی کے دامن میں واقع ہے، نئی آبادی میں جامع مسجد کی جگہ ایک ٹیلہ تھا، وہاں ایک سانڈ نے آکر زمین کھودنی شروع کی، ناخن کو میواتی زبان میں "نوں" کہتے ہیں، لوگوں نے اس حرکت سے یہ فال نکالی کہ یہ یہاں آبادی چاہتا ہے اور پھر نرہر کے باشندے یہاں آباد ہونے شروع ہوئے، میو قوم کے قبیلہ دھینگل کی شاخ گوالدہ نے پہلے پہل یہاں رختِ اقامت ڈالا۔ بعد میں اور لوگ آتے گئے، شیخ، سید، مغل، پٹھان، قریشی، ورما، شرما سبھی طرح کے لوگ آباد ہو گئے۔ تحریک سید احمد شہید، شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی مجوزہ فلاحی ریاست اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کی "حزب اللہ" کی تشکیلی جدوجہد میں یہاں کے باشندوں نے بھرپور حصہ لیا اور اس پاداش میں اپنی موروثی جائداد سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں بھی یہاں کے باشندے کسی سے پیچھے نہ رہے۔ مدرسہ معین الاسلام کے سامنے ایک گنج شہیداں ہے جہاں اس جنگِ آزادی کے غازیوں کو دار پر چڑھایا گیا اور پھر یہیں انھیں سپرد خاک کر دیا گیا۔ فرحمہم اللہ۔

۱۳۴۳ھ مطابق ۱۹۲۴ء میں مولانا محمد الیاس قدس سرہٗ کی مساعی اور ترغیب پر "مدرسہ معین الاسلام" کی بنیاد رکھی گئی۔ حضرت جیؒ نے اس کے قیام کے بعد فرمایا: اس طرح کے آٹھ دس مدارس اور کھول دیے جائیں جن میں تفسیر و حدیث و فقہ اور جملہ علوم و فنون کی تعلیم پوری پوری ہو، اور یہاں کے فارغ طلبہ ایک خاص استعداد اور اسلامی جذبہ اپنے اندر لیے ہوئے ہوں۔ حضرت جیؒ کے ان جذبات اور نوح کی

مرکزیت کے پیش نظر ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم (۱۹۶۹) نے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، علی میاں، کو ۱۹۴۲ء میں ایک خط لکھا تھا۔۔۔۔ رخصت ہوتے وقت جو گفتگو میوات میں ایک مرکز کے قیام کے متعلق ہوئی تھی اس کا سلسلہ جاری رہا۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب اور مولوی احتشام الحسنؒ صاحب سے گفتگو ہوئی پھر اتوار کے دن قریشی صاحب اور ملک وزیر علی صاحب کے ہمراہ نظام الدین حاضر ہوا اور مفصل گفتگو کے بعد یہ طے پایا کہ اگر آپ آسکیں تو یہ کام اللہ کا نام لے کر شروع کر ہی دیا جائے بس بسم اللہ کیجیے، ضروری یہ ہے کہ آپ چند روز کے لیے تشریف لے آئیں اور ہم چند لوگ میوات چل کر بعض مقامات دیکھ لیں اور فیصلہ کریں کہ مرکز کہاں ہو۔ اس کے بعد کارروائی شروع کر دی جائے۔ قریشی صاحب نے۔ دہلی کے ایک بڑے تاجر اور مولانا محمد الیاسؒ کے معتقد و خادم۔ دو سال کے جملہ مصارف اٹھانے کا وعدہ فرمایا ہے۔۔۔۔ اولین فرصت میں اس باب میں کچھ کر ڈالیے۔ اس نیک کام کو انجام دینے کی سعادت آپ ہی سے مخصوص معلوم ہوتی ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کو اپنے وسیع تعلیمی تجربے اور مختلف ممالک کے طویل قیام کی بنا پر شدت سے اس ضرورت کا احساس تھا کہ کسی ایسے مقام پر جہاں کسی درجہ میں تعلیم و تربیت کا کام ہو چکا ہو اور لوگوں میں بات ماننے کی صلاحیت پیدا ہو گئی ہو ایسے نمونے کی ایک اسلامی بستی کی ضرورت ہے، جہاں عقائد و عبادات کے ساتھ اخلاق و معاملات کی اسلامی خصوصیات اور اسلام کی تعلیمات کا زندہ اور چلتا پھرتا نمونہ دیکھا جا سکتا ہو، جہاں اس طرزِ زندگی کی بنیاد پڑے جو ان حدود سے نکل کر ملک کے دوسرے حصوں تک وسیع اور عام کیا جا سکے۔ اس کے لیے ڈاکٹر موصوف کی نظرِ انتخاب قصبہ نوح ضلع گوڑگانوہ میوات پر پڑی جہاں وہ مولانا محمد الیاسؒ اور ان کے تبلیغی و اصلاحی دعوت کے کارکنوں کے ساتھ بار بار جا چکے تھے اور وہاں تبلیغی جدوجہد کے اثرات کا انھوں نے بچشم خود مشاہدہ کیا

تھا۔[1] ملک صاحب۔ قریشی صاحب کے رفیق و شفیق اور مشہور کنٹر کٹر۔ بھی قریشی صاحب کے ساتھ پورا پورا تعاون فرماتے۔ افسوس کہ حضرت جیؒ کے وصال ۱۹۴۴ء کے باعث ڈاکٹر مرحوم کی یہ اہم تجویز عملی جامہ نہ پہن سکی۔ البتہ مدرسہ شروع ہی سے اہم دینی و علمی خدمات انجام دینے میں مصروف ہے، میوات کی موجودہ نسل کو اس سے فیض بہت پہنچا ہے۔ تبلیغی نقل و حرکت کے دینی و مذہبی پاور ہاؤس کا یہ اولین ٹرانسفارم ہے۔ جہاں سے ایمانی حرارت، یقینی برودت، اور سلامتی طبع کی سپلائی ہوتی ہے اگرچہ اس کے بعض تاروں نے کام چھوڑ دیا ہے مگر بحیثیت مجموعی، حسب استطاعت مصروف عمل ہے۔ اس کے انتظام و انصرام اور تعلیم و تربیت کے مختلف شعبوں سے مندرجہ ذیل اہل علم و فضل وابستہ رہے ا

مولانا مفتی عبدالکریمؒ گمتھلوی		مولانا امیر احمدؒ کاندھلہ	
مفتی محمد شفیعؒ	انیٹھ	مولانا عبدالغفورؒ	کھر کھڑی الو
مولانا محمد دینؒ	گنگوہ	مولانا محمد یونسؒ	گھاسیڑہ
مولانا رفیق احمدؒ	رام پور	مولانا منیر الدینؒ	نوح
مولانا وارث علیؒ	سنبھل	منشی بشیر احمد صاحب	نوح
مولانا محمد سلیمان	باجوٹ الور	مولانا محمد صدیق	اٹاوڑ
مولانا نور محمد	" "	مولانا محمد اسحٰق	اٹاوڑ نوح
مولانا محمد اسحٰقؒ	بڑکا نوح	مولانا نیاز محمد	رانیکا
مولانا محمد اشرف	سنگار	حافظ محمد عیسیٰ	میر پور چندینی
منشی نصر اللہ نوح		حافظ محمد صدیق	۱۹۲۲ - ۱۹۷۵

(۱) تعمیر حیات دہلی لکھنو ۱۰ نومبر ۱۹۷۵ء

مدرسہ اشرف الامداد کا بینڈہ — ۱۳۵۴ھ / ۱۹۳۵ء میں مدرسہ حافظ الاسلام فروز پور جھرکہ کے ایک مدرس نے، مدرسہ کی فضا ناساز گار ہونے کی وجہ سے، اور مولانا محمد الیاسؒ کے فرمانے نیز کچھ دوسرے دین دار بزرگوں (مولوی عبدالمجید ریواڑی وغیرہ) کے تعاون سے قائم کیا۔ مولوی محمد ایوب جیسے محنتی، امین و پاکباز مدرس میسر ہوئے جنھوں نے اکتیس سال میں مدرسہ کو مدرسہ بنایا۔ ان دو مدرسوں نے موجودہ میوات میں بڑا کام کیا۔

مدرسہ زینت العلوم گووند گڈھ۔ الور — مولوی سراج الدین گنگوہ متوفی ۱۳۷۰ھ نے ۱۳۶۰ھ میں قائم کیا۔

مدرسہ اسلامیہ دارالعلوم قصبہ نگینہ — مولوی حفیظ الدین مداپوریؒ نے ۱۳۶۶ھ میں بنیاد رکھی۔

مدرسہ ضیاء العلوم۔ ہاتھیہ کا۔ ضلع متھرا — میاں جی نجب خاں و میاں جی صاحب نے ۱۳۷۰ھ میں جاری کیا۔

مدرسہ دارالعلوم محمدیہ میل کھیڑہ ضلع بھرتپور — ۱۳۸۴ھ میں مولوی محمد قاسم نبیرہ میاں جی موسیٰ گھاسیڑہ (ابن مولوی ایوب) نے اس کی اساس رکھی۔ اور اب بھی وہ اس کے اہتمام اور سرپرستی کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ وہ خوش گفتار عالم اور باوقار مہتمم ہیں۔ ضروریات کا شعور رکھتے ہیں۔ گو جدید تعلیم سے آراستہ نہیں مگر نئے ماحول سے واقف ہیں۔ استاذ محنتی، مخلص اور با استعداد رکھتے ہیں جو تعلیم و تربیت کے زیر و بم سے باخبر ہوتے ہیں۔ اس وقت میوات کے سب مدرسوں سے بظاہر ممتاز اور عروج و ارتقا میں فوقیت رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نظر بد سے محفوظ رکھے۔

مدرسہ دارالعلوم عیدیہ متقین — بانی مولانا عبداللہ مالپوریؒ

مدرسہ کاشف العلوم کاماں۔ بھرتپور مولوی محمد الیاس چھرالی اور مولوی عبدالشکور وغیرہ نے ۱۳۸۶ھ میں قائم کیا

مدرسہ رحیمیہ قصبہ پہاڑی۔ بھرتپور مولوی محمد رحیم شاہ دامت برکاتہم۔ تلمیذ خاص حضرت مولانا عبدالسبحان نے جاری کیا آپ اس قصبہ کے پرانے باشندے ہیں۔ آج کل دہلی میں "مدرسہ دعائیہ" چلا رہے ہیں۔ اور ترجمۂ قرآن اور وعظ وارشاد سے بھی دینی و علمی خدمات کر رہے ہیں۔ آپ ایک دردمند واعظ، باشعور مقرر اور شیریں بیان خطیب ہیں۔

مدرسہ اسلامیہ رسولیہ۔ نگر۔ بھرتپور مولوی رسول خاں۔ تلمیذ حضرت مولانا عبدالسبحان نے قائم کیا۔ بہت وسیع اور شاندار مسجد تعمیر کرائی۔ مدرسہ کی عمارت تعمیری مراحل میں ہے۔ محل وقوع بہت عمدہ ہے۔ نگر کے مین چوراہے پر واقع ہے۔

مدرسہ اسلامیہ مبارکپور۔ الور۔ مدرسہ اسلامیہ رام گڑھ۔ الور۔ مدرسہ تجوید القرآن کاماں قائم شدہ ۱۳۳۵ھ۔ مدرسہ اسلامیہ دارالعلوم عبدیہ متھین۔ مدرسہ انوار العلوم روپنور۔ گوڑگانوہ ۱۳۹۰ھ۔ مدرسہ اسلامیہ سنگار وغیرہ۔

یہ تمام مدارس بحمد اللہ دینی وعلمی خدمات میں مصروف ہیں اللہ تعالیٰ ان میں استحکام پیدا کر کے میو قوم اور میوات کے لیے دونوں جہاں کی صلاح وفلاح کا ذریعہ بنائے۔

مدرسہ اسلامیہ دارالعلوم شکراوہ یہ میوات میں سلفی حضرات کا مرکزی مدرسہ ہے۔ مولوی عبدالشکور مرحوم ۱۹۶۱ء مؤلف تاریخ میو چھتری اس کے مہتمم رہے ہیں اس میں اعلیٰ تعلیم کا بھی سلفی نقطۂ نظر سے انتظام ہے۔

یہ تمام مدارس عموماً ابتدائی اور ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ تکمیلی مراحل میں اہل میوات جن مدارس سے مستفیض ہوئے، اور ابھی تک وہ سلسلہ جاری ہے، وہ حسب ذیل ہیں۔

دارالعلوم دیوبند برّاعظم ایشیاء کا سب سے بڑا دینی وعلمی مرکز، ۱۸۵۷ء کی ہولناک تباہی کے بعد اسلامیانِ ہند کی مذہبی وروحانی پناہ گاہ۔ بانی۔ حضرت حاجی محمد عابدؒ خلیفۂ خاص میاں راج شاہ۔ سنہ تاسیس ۱۲۸۳ھ۔

مظاہر علوم سہارنپور ہندوستان کا مشہور مذہبی وروحانی ادارہ۔ بانی؛ مولانا مظہر نانوتوی ۱۲۸۵ھ۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ قدیم وجدید علوم ومعارف کا نئے انداز کا مرکز۔ مسلم طبقاتی خلیج کو پاٹنے کا طالب و ساعی۔ عربی تحریر وانشا کا خصوصی مرکز۔ بانی: مولانا محمد علی مونگیریؒ۔ جدامجد مولانا سید فضل اللہ جیلانیؒ شارح الادب المفرد وغیرہ۔

مدرسہ مفتاح العلوم جلال آباد قائم کردہ مولانا مسیح اللہ خاں خلیفہ ومجاز حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہٗ۔

مدرسہ امینیہ دہلی دہلی مرحوم کی آبرو اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے مدرسہ کا نقش ثانی بانی، مولانا امین الدینؒ ۱۳۱۶ھ۔

مدرسہ عبدالرب دہلی مولانا عبدالربؒ ۱۳۰۵ھ نے اپنی اکلوتی بیٹی آسیہ بیگم کی یاد میں قائم کیا ۱۳۰۰ھ۔

مدرسہ عالیہ فتحپوری دہلی قائم شدہ ۱۲۹۰ھ۔ مسجد فتحپوری شاہجہاں کے عہد ۱۰۶۰ھ مطابق ۱۶۵۰ء میں شاہجہاں کی اہلیہ فتحپوری بیگم نے بنوائی۔ حسب دستور مسجد کے ساتھ مدرسہ کی عمارت بھی بنوائی مگر مدرسہ کا تذکرہ تواریخ میں نہیں ملتا۔

مدرسہ حسین بخش دہلی

جناب حسین بخش پنجابی نے یہ مسجد و مدرسہ ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۱ء میں تعمیر کرایا۔ مسجد کے پیش طاق پر لکھا ہے: دارالہدیٰ والوعظ ۱۲۶۸ھ الوقف لا یملک (۱)

مدرسہ زینت العلوم المعروف بہ مدرسہ سبحانیہ دہلی

تیرھویں صدی کی پہلی چوتھائی میں حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ کی ترغیب ودعا سے مکتب کی صورت میں قائم ہوا" اور مولانا محمود احمد حسن پوریؒ بحیثیت مدرس رائے پور سے مقرر ہو کر تشریف لائے۔ مگر وہ بہت جلد واپس چلے گئے اور تعلیمی کام کچھ سست پڑ گیا ۱۳۳۶ھ میں غالباً حضرت مولانا محمد کاندھلوی نے اپنے عزیز ترین شاگرد مولانا عبدالسبحانؒ کو یہاں کے لیے مقرر فرمایا، جو ابھی اپنی تعلیم پوری نہ کر سکے تھے، صبح کے وقت آپ فضلائے دہلی سے علوم عربیہ پڑھتے اور شام کو اپنا مدرسہ چلاتے، درسی کتب کی خریداری میں آپ کی اہلیہ نے اپنے زیورات بیچ کر آپ کا ہاتھ بٹایا۔ مدرسہ کا نام "زینت العلوم" تھا مگر آپ نے مدرسہ میں اس قدر محنت فرمائی اور شفقت ومحبت کے ایسے نمونے قائم کیے کہ مدرسہ عبارت بن گیا آپ کی ذاتِ قدسی صفات سے مدرسہ اور آپ لازم و ملزوم ہو گئے۔ مدرسہ کا تصور آپ کے بغیر ہو نہیں سکتا۔ اسی لیے اس کا نام (مدرسہ سبحانیہ) مشہور ہوا۔ اے زاہد ظاہر بیں، از قرب چہ می پرسی۔ او در من و من در وے چوں بو بگلاب اندر۔

مدرسہ تجوید القرآن نیا بانس گنج دہلی

تجوید وقرأت اور حفظ قرآن کا دہلی میں بے نظیر مرکز۔ بانی:۔ مولانا قاری محمد سلیمان (رمالب)

مدرسہ دعائیہ بارہ ٹوٹی دہلی

بانی: مولانا محمد رحیم شاہ تلمیذ خاص حضرت مولانا عبدالسبحان قدس سرہٗ ہیں۔ یہ مدارس میں اس لیے انکے تفصیلی تعارف کی ضرورت نہیں۔

مراکزِ رُشد و فلاح

(۲)

خانقاہیں

میوات اور میو قوم کے منابع رشد — ہدایت کے سرچشموں — کا ایک گوشہ تھا، یعنی مدارس اسلامیہ — مراکز رشد و فلاح کا دوسرا گوشہ تھا "خانقاہیں"

اب ہم میوات کی قدیم وجدید تمام خانقاہوں کا اجمالی تذکرہ پیش کرتے ہیں:۔ وَاللہُ ھُوَ الْمُوَفِّقْ۔

خانقاہ — معرب ہے، خانہ اور گاہ کا — خانہ کے معنی گھر، اور گاہ جگہ کو کہتے ہیں۔ اصطلاح میں درویشوں اور عبادت گذاروں کا ٹھکانہ — خانقاہ کے مفہوم ومطلب اور اس کے مقاصد نے اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا ہے اور ان کے فہم وخرد کو اس طرح جام کیا ہے کہ وہ اس لفظ سے اس قدر چونکتے ہیں کہ سانپ کے اچانک ظاہر ہونے پر بھی نہیں چونکتے۔ ان کے نزدیک "یہاں انسان کے قوائے عملیہ کو بیجس بنا کر اس کے دل ودماغ کو ویدک دھرم کی بھول بھلیوں میں الجھا کر اسلامی تعلیمات سے بیگانہ محض کر دیا جاتا ہے، پھر وہ اسلام کو اس کی فطری سادگی کے پس منظر میں دیکھنے کا عادی نہیں رہتا وہ سراپا تکلف وتصنع بن جاتا ہے، اور اسلام

کو جس قدر خانقاہوں نے نقصان پہنچایا ہے اتنا کسی اور نے نہیں“۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ خانقاہوں سے اس قدر برگشتگی کیوں ہے ؟

احسان و سلوک کی مدارج و معترف زبان تصوف و طریقت پر کیوں طعنہ زن ہے ۔ حد یہ ہے کہ اقبال جیسے باشعور و صاحب دل نے بھی پیام ابلیس کو اس کے شاگردوں کے نام بایں عنوان ظاہر کیا ہے ع

پختہ تر کر دو مزاج خانقاہی میں اسے

کیا واقعی تصوف و طریقت احسان و سلوک سے الگ کوئی چیز ہے؟ دراصل یہ ایک بہت بڑا مغالطہ ہے یا فریب نفس ــــ بعنوان دیگر اسے ”اسلامی زندگی سے فرار“ بھی کہا جا سکتا ہے ۔ تصوف کی راہ سے انسان کو ملکوتی صفات سے متصف کیا جاتا ہے جہاں من مانی کارروائی کا گذر نہیں ۔

آدمی جب پابندیوں سے آزاد ہونا چاہتا ہے تو وہ ان پابندیوں کو ہی نہیں بلکہ یہ جس شجر طوبیٰ کی شاخیں ہیں اسی کے جڑ سے اکھاڑنے میں لگ جاتا ہے ــــ تصوف و سلوک سے الگ رہ کر کسی نے کوئی اہم دینی کارنامہ انجام دیا ہو ۔ تاریخ و تذکرہ کی کتب ایسی شخصیت کے ذکر سے یکسر خالی ہیں ۔

اگر صوفیاء کے گروہ میں سے کسی ایک یا چند افراد سے کوئی ایسی حرکت سرزد ہوئی جو اسلامی تعلیمات سے ٹکراتی ہے تو اس کا یہ مفہوم بالکل نہیں کہ خانقاہی نظام سراسر خلافِ اسلام ہے ۔ جب مسلم قوم یا گروہ کی حرکات سے اسلام متاثر نہیں ہوتا تو ایک یا چند صوفیوں کے خلاف شرع اعمال سے تصوف و سلوک کے چشمۂ صافی کو کیوں گدلا کیا جاتا ہے ۔ ؟؟

کچھ لوگوں کا یہ انداز بیان کہ ــــ ”ہندوستان میں اسلامی حکومت ایک دن بھی نہ رہی البتہ مسلمانوں کی حکومت ضرور رہی ہے“ ــــ اس گروہ

کے زبان و قلم تصوف و سلوک کو افیون کہتے ہیں ۔ یہ بھی کوئی تک ہے کہ مذہب اور اس کے پیروکار تو الگ الگ دو شئے ہیں مگر تصوف و صوفیا شئے واحد ہے یہاں دوئی نہیں پائی جاتی ۔

تصوف و طریقت کے تمام سلسلے احسان ہی کی مختلف النوع جلوہ نمائی ہے ، تصوف کے قدیم سے قدیم اور جدید سے جدید ماخذ و مصادر اگر کھنگالے جائیں تو بات کھل کر سامنے آ سکتی ہے ۔ متن و شرح میں جو فرق ہوتا ہے ، یا انسانی طبائع میں جو اختلاف پایا جاتا ہے یا فضا اور ماحول جیسے ایک دوسرے کے گاہ بگاہ ہم آہنگ نہیں ہوتے بالکل اسی طرح احسان و سلوک کا معاملہ ہے جس طرح ائمہ مجتہدین کو مسکوت عنہا مسائل کے سلسلہ میں قیاس و اجتہاد درست اور روا ہے اسی طرح تصوف و طریقت کے مشہور خانوادوں کے سربراہوں کو تربیت و تزکیہ کے مسائل قرآن و حدیث سے استنباط کرنے میں آخر کیا قباحت ہے ۔ ؟

آدمی کے ظاہری رخ یا اعمال جوارح کے سنوارنے کے لئے تو قرآن و سنت سے مسائل مستنبط کرنے جائز ۔ مگر تصوف و طریقت کے سلسلہ میں غیر جائز و ناروا ؟ یہ اصل میں نتیجہ ہے کوتاہ بینی و کم اندیشی کا ۔ یا کج فہمی و بدفکری کا ــــ قرآن و حدیث اصل سرچشمۂ حیات ہیں فقہ انھیں سرچشموں کی قابل عمل تفسیر و تشریح اور تصوف و طریقت ان کی روح ہے ، عبد و معبود کے رشتہ کی استواری ، بھائی بھائی اور عزیزوں کے تعلق میں نبھاؤ ، بڑوں کے سوا خ رشتہ داروں کے ساتھ اچھا برتاؤ ، حاکم و محکوم کے ربط و ضبط اور انسان کو آدمیت کی راہوں میں رواں دواں بنانے میں خانقاہوں کا کردار تاریخی طور پر بہت اہم اور نہایت عظیم ہے ، اسلامی زندگی کی تر و تازگی ، نشو و نما ، فضاؤں میں

معرفت والیقان کے روح پرور ونشاط افروز جھونکے ، زمین پر امن وسلامتی کی خوشگوار ہوائیں ، آدم علیہ السلام کی ذریت میں باوجود اجنبیت وبیگانگی ، ملکی و نسلی فرق ، زبان اور لب ولہجہ کے اختلاف وتباین اور مذہب وملت کی تعصب آمیز ونفرت انگیز دیوار حائل ہونے کے رواداری ، محبت واتحاد کا جو ماحول پایا جاتا ہے اس کے بناؤ سنگار میں خانقاہوں کے عمل کو بہت دخل ہے - اس قدر کہ اگر اسے درمیان سے نکال دیا جائے - جیسا کہ کچھ کور باطن اس کی سعی کرتے ہیں مگر کامیاب نہیں ہوتے ، تو واقعہ یہ ہے کہ اس کارخانہ کی روح سی نکل جائے گی جیسے بجلی کے کنکشن کٹنے سے عموماً مشاہدہ ہوتا رہتا ہے

خانقہ ؟ ہندوستان میں مرکز اسلام ہے — مدرسہ سرچشمۂ علم دہری کا نام ہے
نشر احکام خدا دنیا میں ان کا کام ہے — ابتدا تابندہ ہے ، تابندہ تر انجام ہے
یہ انھیں کا فیض ہے یہ آنکھ کا تارا ابنی
کرشن وگوتم کی دھرتی دین کا گہوارا بنی
رام ولچھمن کے نگر میں حق کا کام آساں نہ تھا — جام وحدت سے ہو کوئی شادکام آساں نہ تھا
اہل دیں سے برہمن ہو ہمکلام آساں نہ تھا — آ ہوئے آوارہ آئے زیر دام آساں نہ تھا
یہ مہم جب سر ہوئی تو خانقاہوں سے ہوئی
اہل علم ودیں کی پاکیزہ نگاہوں سے ہوئی
کارگر ہو جائیں فوراً ایسی تدبیریں تھیں — جو سہولت سے بدل جائیں وہ تقدیریں تھیں یہ
نعیم وارثی یہاں آسان تکبیریں نہ تھیں — جرم حق گوئی میں جب مرنا تھا زنجیریں تھیں یہ
صوفیا نے ہند کو تسخیر ایماں کردیا
بھارتی تقدیر کو تقدیر ایماں کردیا

خانقاہوں کی بنیاد کب اور کیسے پڑی —؟ اگر ان کے کردار کے مرکزی

نقطہ پر غور وفکر کیا جائے تو مسجد نبوی - علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام - کا صفہ اسلام کی پہلی خانقاہ ہے جہاں خود صاحب وحی ورسالت حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم اپنے اصحابؓ کی تربیت وتزکیہ فرماتے نظر آتے ہیں - یعلمہم الکتاب ویزکیہم

عہد رسالت میں صرف صفہ خانقاہ تھا - خلفاء راشدینؓ کے دور میں پوری حرم مدنی خانقاہ بن گئی - جہاں آدمی کو آدمیت کے اصول ، اخلاق و انسانیت کے گر سکھلائے جاتے تھے ، شرافت وتہذیب کے خطوط نمایاں اور دین ومذہب کے علائم وآثار — مسائل وعملی تشکیل — واضح کئے جاتے تھے۔ بعد میں خانقاہوں میں یہی سب کچھ ہوتا تھا -

اوّل اوّل جو خانقاہ بنی وہ ملک شام کے ایک شہر میں جس کا نام رملہ ہے تیار ہوئی اور اس کو ایک عیسائی امیر نے بنوایا تھا اور سبب اس کا یہ تھا کہ وہ امیر شکار کو گیا تھا ، راستے میں دو درویشوں کو دیکھا کہ جمع ہوئے ، اور ایک نے دوسرے کو گلے لگایا اور وہ وہیں بیٹھ گئے ، جو کچھ کھانے کے لئے پاس تھا وہ دونوں نے نکالا اور کھایا اور چلدیئے - اس امیر کو انکی الفت اور معاملہ پسند ہوا ، ان میں سے ایک کو بلاکر دریافت کیا کہ وہ دوسرا شخص کون تھا ؟ اور تم سے اس سے کیا واسطہ تھا ؟ اور اب وہ کہاں کو گیا ؟ جواب دیا کہ مجھے کچھ حال معلوم نہیں -

امیر نے متعجب ہوکر کہا کہ پھر یہ کیسی الفت تھی کہ تم نے اس کا باہم برتاؤ کیا —؟ درویش نے کہا کہ یہ ہمارا طریق ہے - امیر نے کہا : تمہارے لئے کوئی مکان ہے کہ وہاں جمع ہوتے ہو ؟ جواب دیا کہ ایسا کوئی مکان نہیں - امیر نے کہا : میں تمہارے لئے ایک مکان تیار کراتا ہوں وہاں جمع ہوا کرو اور رملہ

ہیں خانقاہ نوادی[1]۔

ممکن ہے کہ یہی اس کی وجہ تسمیہ بھی ہو عجم میں مسلمان کو خان کہتے ہیں اور قاہ گاہ کا معرب ہے یعنی مسلمان کا گھر۔ اور یہ نام اسی امیر نے رکھ دیا ہو، واللہ اعلم بالصواب۔

غالباً اسی وجہ سے کچھ لوگ خانقاہی نظام کو کلیسائی نظام سے وابستہ قرار دیتے ہیں حالانکہ ایسا بالکل نہیں وہاں ایک آدمی سیکڑوں گناہگاروں کے کفارے بطور خود ادا کر دیتا ہے اور یہاں مرید کو باقاعدہ محنت و ریاضت کے ذریعہ شریعت مقدس کا پابند بنایا جاتا ہے اور اس سے اس قدر محنت کرائی جاتی ہے کہ اعمال شرعیہ کی ادائیگی اس کا مزاج بن جاتا ہے۔

اور کچھ لوگوں نے تصوف کو ہندوانہ اعمال و اوراد کا پابند سمجھ کر ملتِ اسلامیہ کو اس سے برگشتہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان لوگوں کے یہاں اسلام کے قد موزوں پر صرف سادگی کا وہی لباس چست آسکتا ہے جو اسلام کے ابتدائی عہد میں تھا۔ اگر ان کا یہ نظریہ قبول کر لیا جائے تو فرزندان توحید کے اسلامی افکار و خیالات اور اس سلسلہ میں ان کی جد و جہد ان کے اہم کارنامے، ان کے مختہدات و مجاہدات اور ان کے ایثار و قربانی کی لازوال داستانوں کے بہت بڑے ذخیرے کو دریا برد کرنا پڑے گا اور تاریخ و تذکرہ کی کتب نذر آتش کرنی پڑیں گی، ایک طرف یہ کرنا ہوگا دوسری طرف تاریخی کردار و عمل کے ایک بہت عظیم خلا سے دوچار ہوں گے جو حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت و ختم المرسلینی کے لئے ایک چیلنج ہوگا۔ کس قدر صعوبتوں کا سامنا کر کے اس سادگی تک پہنچا ہوگا۔؟ اور پھر اس کی کیا ذمہ داری ہے کہ وہ سادگی پھر لازوال ہوگی۔؟ یہ گردش ایام کو روکنے کی

[1] تذکرۃ السلوک ۲۰۰

غیر معقول اور غیر فطری کوشش ہے انتہائی غیر مفید۔

ہندوانہ ریاضت و مجاہدوں اور صوفیانہ عمل کے درمیان ایک بہت بڑا فرق ہے۔ صوفیانہ اوراد و اعمال حقیقی عبد بننے کی سعی محمود ہے اور ہندوانہ ریاضت کا مقصد ہے الٰہ بننا، معبود بن جانا۔ کس قدر افسوسناک ہے یہ موازنہ و مقابلہ ـــــ پناہ خدا

میوات کی سب سے پہلی خانقاہ اور میو قوم کی اولین روحانی اور عمومی تربیت گاہ دار الخیر اجمیر ہے۔

دار الخیر۔ اجمیر

اجمیر شریف چاروں سے پہاڑیوں سے گھرا ہوا ہے، ایک جانب پرانی ریاست کشن گڑھ ہے، دوسری جانب جے پور کا علاقہ، تیسری آڈر مارواڑ ہے یعنی جودھ پور اور چوتھی سمت میواڑ۔ اودے پور۔ ہے کہتے ہیں کہ اس کی تاریخ پرانی نہیں، اُسے راجہ اجا نے بسایا تھا، اجا نام راجہ اور میر میواتی زبان میں پہاڑ کو کہتے ہیں، اسے سنہ ۱۱۰۰م میں آباد کیا گیا اور چھتریوں نے کل پینتالیس سال اس پر حکومت کی پھر چوہانوں نے اسے اپنی قلمرو میں لے لیا، سنہ ۱۱۹۲ء میں اسے معز الدین محمد سام غوری نے فتح کیا تھا جسے شہاب الدین غوری کے نام سے عام طور پر دیا جاتی، سنہ ۱۱۹۲م سے سنہ ۱۴۴۱م تک یہ دہلی سلطنت کا ایک حصہ رہا، سنہ ۱۱۴۳م میں یہ مانڈو (مالوہ) کے خلجی سلاطین نے اپنی حکومت میں شامل کر لیا، سنہ ۱۵۳۱ تک یہاں ان کا عمل دخل رہا، سنہ ۱۵۳۳ میں مارواڑ کے راجاؤں کا اس پر تسلط ہو گیا جو سنہ ۱۵۴۹ تک قائم رہا، سنہ ۱۵۵۰ میں اسے مغلوں نے فتح کیا، اور عہد محمد شاہ تک یہ مغلوں کی حکومت کا اہم صوبہ رہا۔

پھر ۱۴۲۰ء سے مارواڑ کے امرا نے یہاں خود مختاری سے حکومت کی ، اس کے بعد کبھی مرہٹوں کے زیر انتظام آیا اور کبھی راجپوتوں کے ، ۱۸۱۸ء میں انگریزوں نے اسے برطانوی سلطنت میں شامل کر لیا - اور پھر بعد میں ایک نیم خود مختار ریاست کی حیثیت دے دی -

کسی دور میں یہ ایک اہم تجارتی مرکز تھا ، گجرات و مالوہ جانے والے تجارتی قافلوں کا یہ مرکز وصل تھا شمس الدین التمش کے دور میں اجمیر شریف کو خصوصی اہمیت تھی ، ملک احمد خاں نامی ایک سردار کو یہاں کا قلعہ دار بنایا خواجۂ خواجگان خواجہ بزرگ نے اسی زمانے میں یہاں اپنی خانقاہ بنائی ، حضرت رحمۃ اللہ علیہ اولاً دولت بلغ کے قریب اناساگر کی گھاٹی میں قیام پذیر ہوئے تھے پھر اندرکوٹ کے نزدیک جہاں اب درگاہ شریف ہے ، عمر کا بقیہ حصہ بسر فرمایا جس حجرہ میں آپ کا وصال ہوا مزار اسی میں ہے ، مختلف اوقات میں متفرق فرمانرواؤں نے درگاہ شریف میں عمارتوں کا اضافہ کیا -

التمش کا پوتا علاء الدین مسعود شاہ جب تخت نشین ہوا تو اجمیر مع دادُ اور ناگور کا علاقہ ملک عزالدین بلبن کے سپرد کیا گیا ، قلعۂ اجمیر پہاڑی پر واقع تھا جسے تاراگڑھ کہتے ہیں - یہ پہاڑ سمندر سے تین ہزار اور اجمیر سے ایک ہزار فٹ بلند ہے ، یہاں کہتے ہیں سید حسین مشہدی خنگ سوار کا مزار ہے ، ان کے متعلق یہ روایت ہے کہ یہ شہاب الدین غوری کے رسالدار تھے اور فتح اجمیر کے بعد یہاں کے قلعہ دار بنائے گئے تھے ، یہاں دشمنوں نے مار کر آپ کو شہید کر دیا انھیں قلعہ ہی میں دفن کر دیا گیا ، شہنشاہ جلال الدین اکبر کے ایک امیر جبار خاں نے اس کی درگاہ بنوادی اور باقی عمارتیں مرہٹوں کے زمانے میں مہاراجہ سیندھیا نے بنوائیں ، مرہٹہ راجہ گمان جی راؤ نے یہاں کئی عمارتوں کا اضافہ کیا اور ایک

پورا گاؤں اس درگاہ کے لئے وقف کر دیا دو گاؤں مغلوں نے معافی میں دیئے ، اس طرح تاراگڑھ کی درگاہ بن گئی -

آثار قدیمہ کے نقطۂ نظر سے سب سے زیادہ اہم عمارت "ڈھائی دن کا جھونپڑا" ہے جو در اصل ایک قدیم درسگاہ تھی جسے بعد میں مسجد میں تبدیل کر دیا گیا ہے[1]

سلطنت دہلی اور شاہان مغلیہ کے درمیانی عرصہ میں تقریباً نوے سال تک اجمیر شاہانِ مالوہ کے زیر حکومت رہا ، ان کی طرف سے یہاں ملو خاں حاکم اجمیر تھا ، اس کے نام سے شہر میں ایک محلہ ملو سرائے اب بھی ہے ، اسی کے دور میں ۱۴۵۵ء کے قریب حضرت خواجہ صاحب رح کا مقبرہ پہلی بار تعمیر ہوا[2]

---

[1] اردو دائرۃ المعارف ج ۱ ، ص ۱۰۱۱

[2] مضمون ڈاکٹر نثار احمد فاروقی - ماہنامہ منادی ، نئی دہلی

نوٹ :- راجہ اجا چھتری تھا نہ کہ راجپوت جیسا کہ اردو دائرۃ المعارف ج ۱ ص ۱۰۱۱ میں لکھا ہے -

قصبۂ ناگور

کہتے ہیں کہ اس قصبہ کے بانی ناگا راجپوت تھے جن کی قومی نسبت سے اس کا نام ناگور پڑ گیا ..... پرتھوی راج کے دور میں یہ قصبہ اس کے بھائی رائے جیسل خورد کے زیر حکم تھا جو اس قدر ظالم اور جابر تھا کہ رات کے وقت بھیروں کے استھان میں روزانہ ایک مسلمان بند کروا دیتا تھا اور صبح مورت پر اس کو بھینٹ چڑھانے کے بعد کھانا کھاتا تھا۔ مگر اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ سلطان شہاب الدین غوری کے حملے سے تین چار سال پیشتر مع اپنے دیوان اور بارہ ہزار درباریوں کے حضرت قاضی حمید الدینؒ کے ہاتھ پر مشرف باسلام ہو گیا۔ مصنف افادات حمیدی نے یہ واقعہ اس طرح لکھا ہے کہ:

"۵۶۰ھ یا ۵۶۱ھ میں جب قاضی صاحبؒ ناگور تشریف لائے تو ایک ضعیفہ تیلن کے گھر فروکش ہوئے، اس روز وہ نہایت رنجیدہ اور غمگین تھی۔ جب قاضی صاحبؒ نے اس سے کھانا پکا دینے کو کہا تو اس نے انکار کر دیا، اور اپنے رنج و غم کی یہ وجہ بتلائی کہ یہاں کا حاکم جیسل نہایت ظالم و جابر ہے روزانہ ایک مسلمان کو بھیروں کے بھینٹ چڑھا کر کھانا کھاتا ہے چنانچہ کل میرے اکلوتے بیٹے کی باری ہے جس کو آج رات بھیروں کے استھان میں بند کر دیا جائے گا اور صبح کے وقت مورت پر بھینٹ چڑھا دیا جائیگا قاضی صاحب نے یہ سنکر ضعیفہ کو تسلی دی اور اس کے لڑکے کے عوض بھیروں استھان میں خود بند ہو جانے کا وعدہ فرمایا۔ آپ کے فرمانے سے ضعیفہ کو قدرے اطمینان ہوا اور اس نے آپ کو کھانا پکا کر کھلایا۔ مغرب

کا وقت ہو گیا، آپ نے نماز مغرب علانیہ ادا کرنی چاہی، ضعیفہ نے آپ کو منع کیا اور کہا کہ اگر آپ ایسا کریں گے تو قتل کر دیئے جائیں گے، مگر آپ نے اس کی پرواہ نہ کی اور نماز مغرب علانیہ ادا فرمائی۔ رات کو جب راجہ جیسل کے سپاہی ضعیفہ کے لڑکے کو لینے آئے تو آپ ان کے ہمراہ تشریف لے گئے اور بھیروں استھان میں جا کر بند ہو گئے جہاں رات بھر آپ معبود برحق کی عبادت میں مصروف رہے۔ صبح کے وقت جب جیسل کے سپاہیوں نے آ کر بھیروں کی مورت پر بھینٹ کے لئے آپ کو باہر نکالا تو مورت کو غائب پایا البتہ مورت کو گھسیٹ کر لیجانے کی ایک لکیر پڑی ہوئی تھی۔ راجہ کے سپاہی قاضی صاحب کو قتل کرنے کے بجائے اس مورت کی تلاش میں لگ گئے اور دیکھا کہ وہ پتھر کی مورت قلعہ ناگور کی برج کے نیچے پڑی ہے تمام شہر میں اس واقعہ کی خبر پھیل گئی، راجہ مورت کی اس تحقیر پر بڑا شرمندہ ہوا۔ قاضی صاحب اس اثنا میں ضعیفہ کے گھر تشریف لے آئے تھے، راجہ کی فوج اور شہر کے آدمیوں نے آپ کا محاصرہ کر کے سنگ باری شروع کر دی۔

کہتے ہیں کہ آپ پر اس قدر پتھر برسائے گئے کہ بعد میں ان سے ایک مسجد تعمیر ہو گئی جو محلہ خرادیان میں واقع ہے، آپ بدستور یاد حق میں مصروف رہے اور آپ کو کوئی گزند نہیں پہنچا۔ راجہ اس واقعہ سے اور بھی متاثر ہوا اور سمجھ گیا کہ آپ خاصان خدا میں سے ہیں۔ پھر وہ مع اپنے دیوان اور بارہ ہزار درباریوں کے حاضر خدمت ہو کر مشرف باسلام ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ آپ نے اس راجہ کا نام سلطان زیرک اور دیوان کا نام خواجہ لعل رکھا۔

قصبہ کھاٹو میں پرتھوی راج کی بڑی رانی رہا کرتی تھی اس لئے یہاں بھی مسلم کشی کا وہی عالم تھا جو ناگور اور دیگر مقامات میں تھا۔ غرض کہ مسلمانوں پر

عرصۂ حیات تنگ تھا - تڑپنے کے سوا اور چارہ کار ہی کیا تھا - وہ نہایت عاجزی کے ساتھ رات دن قادر مطلق کی بارگاہ میں اس ظلم و جور سے چھٹکارا پانے کے لئے دعائیں کیا کرتے تھے آخر ان بے کسوں کی دعا قبول ہوئی اور ان کی گلو خلاصی کے لئے صوفیاء کرام کا ایک گروہ شہاب الدین محمد غوریؒ کے حملوں سے پہلے سنہ ۳۰۳ھ کے قریب ہندوستان میں وارد ہوا جس میں سید روشن علیؒ وغیرہ اجمیر میں، سید محمد طاہر مشہدیؒ کھاٹو میں، سید انس مشہدیؒ ڈیڈوانے میں اور حضرت سید حمید الدین ریحانیؒ ناگور شریف میں پہنچے، ان کے قدوم میمنت لزوم سے اسلام کا پرچم قدرے بلند ہوا - یہ حضرات خفیہ اور علانیہ طور پر تبلیغ اسلام فرماتے تھے اس کے بعد سنہ ۳۰۶ھ میں خاصانِ خدا کا دوسرا گروہ حضرت خواجۂ خواجگان خواجہ معین الدین حسن چشتیؒ کی قیادت میں داخل ہندوستان ہوا جس کی تبلیغی سرگرمیوں نے ظلمت کدۂ ہند کو نور اسلام سے جگمگا دیا -

درحقیقت ہندوستان میں اشاعت اسلام کا باعث مجاہدین اسلام کی شجاعت و ایثار ہی نہیں تھا بلکہ اس کا بڑا سبب صوفیاء کرام اور اولیاء عظام کی روحانیت بھی تھی جن کی خاموش اور موثر رشد و ہدایت نے اسلام ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پھیلا دیا - ہر وہ شہر جو اپنے پیچھے ایک تاریخی پس منظر رکھتا ہے اولیاء عظامؒ کی خانقاہوں کے لئے بھی مشہور ہے، جن کی عظمت و عقیدت کا سکہ آج تک لاکھوں انسانوں کے دلوں پر بیٹھا ہوا ہے جس کا اظہار ان کے سالانہ عرسوں میں دور دراز سے شرکت کی خاطر آنے والوں سے ہوتا ہے .... اس باب میں ناگور کا مقام بہت بلند ہے اور ہندوستان میں اجمیر شریف کے بعد اسی کا نمبر ہے، ناگور کے مشہور ترین اولیاء کرام میں:

حضرت صوفی سلطان التارکین خواجہ حمید الدین ناگوری

حضرت فرید الدین چاک پراں - نبیرۂ حضرت سلطان التارکین -

حضرت خواجہ مخدوم حسین ناگوری . . . . کے

اسماء گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں - ان بزرگوں کی بدولت راجستھان میں سلسلۂ چشتیہ کو بڑا فروغ میسر آیا - سلطان التارکین صوفی حمید الدین حضرت خواجۂ خواجگان خواجہ معین الدین حسن چشتی اجمیریؒ کے خلفائے عظام میں سے ہیں -

ناگور شریف بڑا متبرک مقام ہے، یہاں بڑے بڑے صوفیائے کرامؒ اور اولیاء عظامؒ کے مزارات ہیں جنھوں نے اس علاقہ میں خفیہ اور علانیہ طور پر ابتدائی دور میں تبلیغ اسلام کی آج اس کے تصور سے بھی کپکپی آتی ہے - میو قوم اور میوات کی تاریخ میں ناگور شریف کی بڑی اہمیت ہے اب یہ میوات سے کچھ فاصلے پر واقع ہے ورنہ اسلامی عہد میں یہ قصبہ میوات کے مراکز رشد و فلاح میں سب سے قدیم اور زمانے کے نرم و گرم چشیدہ تھا -

ناگور میں حمید نام کے سات بزرگ ہوئے ہیں جنھیں "ہفت حمید" بھی کہتے ہیں ان کے اسماء گرامی اور مختصر کوائف جو معلوم ہو سکے حسب ذیل ہیں:-

(۱) . <u>حمید الدین ریحانی</u>:- آپ جلیل القدر بزرگ ہیں - کہتے ہیں کہ آپ غازی معز الدین سام المشہور شہاب الدین غوری کے حملوں سے قبل سنہ ۳۸۶ھ میں ناگور تشریف لائے، اور حالات ناسازگار ہونے کے باعث خفیہ طور پر تبلیغ اسلام فرمائی، سنسکرت زبان بھی آپ اچھی طرح جانتے تھے اس لئے ہندو مسلمان دونوں آپ کو اپنا پیشوا مانتے تھے، چنانچہ انتقال کے بعد آپ کے جنازہ اٹھانے کی بابت ہندو مسلمانوں میں جھگڑا ہوا، ہر فریق آپ کی تجہیز و تکفین اپنے طریقہ پر کرنا چاہتا تھا،

اکثریت کی بنا پر اس جھگڑے میں ہندو غالب آئے اور آپ کی نعش کی ارتھی بنا کر ماہی دروازے کی طرف چلے مگر راستے میں نعش غائب ہوگئی۔ جب ہندو نے پتہ چلایا تو معلوم ہوا کہ نعش مبارک مسلمانوں کے مجمع میں موجود ہے۔ ہندوؤں نے دوبارہ آپکی نعش کو اٹھانا چاہا مگر نہ اٹھی، اس کے بعد مسلمانوں نے آپ کی تجہیز و تکفین بطریقہ اسلام انجام دی، ہندوؤں نے بھی آپ کی ارتھی کے پھول لے جاکر نو چھتریوں میں دفن کئے، اس روز سے آج تک کسی ہندو کی ارتھی ماہی دروازے سے نہیں نکلتی۔

(۲) <u>حمید الدین مغربی</u> :- آپ بڑے صاحب کرامت بزرگ گذرے ہیں آپ کا مزار حضرت سلطان التارکین صوفی حمید الدین کی درگاہ کے احاطہ کی پشت پر ہے۔

(۳) حمید الدین خوئیؒ
(۴) حمید الدین عصاؒ
(۵) حمید الدین خاصہؒ

} ان سب بزرگوں کے مزارات ماہی دروازے کے باہر احاطۂ سہروردیاں میں متصل مزار حضرت مولانا ظہیر الدینؒ واقع ہیں

(۶) <u>قاضی حمید الدین</u> :- آپ کا اسم گرامی محمد بن عطا ہے، ہندوستان کے قدیم مشائخ میں سے ہیں، علوم ظاہری و باطنی میں کامل تھے، خواجہ قطب الدین بختیار قدس سرہٗ کے مصاحبین میں سے تھے، اگرچہ آپ کو سلسلہ سہروردیہ سے بھی نسبت ہے، آپ شہاب الدین سہروردی کے مرید اور خلیفہ تھے، سماع سے والہانہ ذوق رکھتے تھے آپ کے حضور علماء وقت کا مجمع رہتا تھا۔ بہت سی تصانیف کے مالک ہیں، آپ کا انداز بیان عشق و مستی سے بھرپور ہے:-

آپ کی مشہور تصنیف طوالع شموس ہے۔ اس میں اسمائے ربانی کی شرح بیان کی گئی ہے، مطالب نہایت بلند اور انداز بیان نہایت مؤثر ہے آپ جامع علوم شریعت، طریقت اور حقیقت تھے، آپ کے مزاج میں ظرافت اور شوخی بھی تھی ایک دن قاضی حمید الدینؒ، شیخ برہان الدینؒ، مشہور زمانہ قاضی کبیرؒ اور دوسرے دوست گھوڑوں پر سوار ہو کر جا رہے تھے قاضی صاحب جس گھوڑے پر سوار تھے وہ بہت ہی چھوٹا تھا، دوسرے گھوڑوں کی برابری نہیں کر سکتا تھا، قاضی کبیر نے آپ سے کہا: "آپ کا گھوڑا بہت ہی چھوٹا ہے"۔ آپ نے فرمایا "لیکن کبیر (بڑے) سے بہتر ہے۔ آپ کو شیخ فرید الدین گنج شکر سے بڑی محبت تھی[۱] آپ کا انتقال دہلی میں ہوا مزار مبارک خواجہ قطب الدین بختیار قدس سرہٗ کے پائیں ایک اونچے چبوترے پر واقع ہے، پرتھوی راج کے بھائی راجہ مبسل کے اسلام کا قصہ آپ ہی کے ساتھ پیش آیا تھا[۲]

<u>مہرولی</u> یہ دراصل مِہرَولی ہے۔ یعنی اہل اللہ کی عنایت و کرم، اور دلّی کی سب سے قدیم آبادی۔ کہتے ہیں کہ یہ شہر قبل مسیح سے آباد ہے، ایک معتبر آدمی نے ایک دفعہ بیان کیا کہ قبل مسیحؑ کی کسی عمارت کے گرے پڑے مسالے کو جب انجینئرنگ کے جدید معیار پر جانچا گیا اور لیبارٹری میں اسے پرکھا گیا تو

---

[۱] اخبار الاخیار اردو ترجمہ ص ۷۷ [۲] باقی تفصیل اخبار الاخیار، ذکر قاضی حمید الدین ناگوری مترجم بریاں ص ۵۴ پر ملاحظہ ہو۔

انجینیر صاحب کا بیان ہے کہ موجودہ سیمنٹ میں جو طاقت ہے اس سے سیکڑوں گنا زیادہ تو اس مسالے میں ۱۰ ہزار سال گذر جانے کے بعد ہے[1] اس سے بھی اس آبادی کی قدامت کا سراغ لگتا ہے۔

عیدگاہ کے شمال میں قلعہ کی دیوار کے نیچے پہاڑ کے نشیبی حصہ میں بھیم کی چھتنگی ہے جو اتنی بڑی چٹان ہے کہ اگر اسے توڑا جائے تو کئی ٹرک لے جا سکتے ہیں۔ یہاں سب سے قدیم علاقہ قطب صاحب کے اردگرد کا ہے، جو پرانی دلّی یعنی شاہجہاں آباد سے گیارہ میل کے فاصلہ پر شمال میں واقع ہے، ہندو راجاؤں کے آخری دور حکومت میں پرتھوی راج عرف رائے پتھورا کے دارالسلطنت اور لال کوٹ کے نام سے مشہور تھا سنہ ۵۸۹ھ ۱۱۹۳م میں سلطان شہاب الدین غوری نے رائے پتھورا کو شکست دیکر اس کو ہندوستانی مقبوضات کا مرکز قرار دیا، اس کے بعد قطب الدین ایبک اور اس کے جانشینوں کا دارالسلطنت رہا۔ لال کوٹ سے پہلے یہاں کی آبادی اندرپت کہلاتی تھی، اور اسے اندر دیوتا کا استھان سمجھا جاتا تھا، اننگ پال کا پرانا قلعہ بھی اندرپت میں شامل تھا۔ بعد میں اننگ پال تنور دوم نے سمت ۱۱۰۹ مطابق سنہ ۱۰۵۲م میں لال کوٹ بسایا۔ لوہے کی لاٹھ پر بھی یہی تاریخ درج ہے[2]۔

یہ مقام کیا ہے گنجینۂ علم و عرفاں، منبع رشد و ہدایت، مرکز فضل و کمال اور انصاف دوست، آدمیت نواز، اسلامی حکومت کے عہد وسطی کا مظہر جاہ و جلال ہے، اس کے چپہ چپہ اور ذرہ ذرہ پر اللہ کے پیارے، سلوک و تصوف کے راج دلارے اور آسمان علم و عرفاں کے درخشندہ ماہ پارے محو استراحت

[1] روایت قاضی سجاد حسین صاحب، پرنسپل مدرسہ عالیہ۔ فتحپوری، دہلی۔
[2] حاشیہ منتخب التواریخ اردو ص

ہیں۔ اس کے جنگل، صحرا، پہاڑ، کوچے، گلیاں، محلے اور اس کی پوری فضا پر نور کی سی چادر پھیلی ہوئی ہے۔ یہاں سکون ہے، طمانیت ہے، یہیں سلطان الہندؒ کے جانشینؒ کی آخری آرام گاہ، ہندوستان میں علم حدیث کے وسیع پیمانے پر درس و تعلیم اور نشر و اشاعت کے مرکز ثقل شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کا مسکن چمنستان شعر و ادب کے بلبل شیریں ادا شیخ جمالیؒ اور ان کے مرشد کا مستقر اور آخری دور میں شیخ الہند قدس سرہٗ کے مایۂ ناز شاگرد مفتی اعظم ہندؒ اور ان کے زندگی بھر کے ساتھی اردو نگر کے راج پر مکھ سحبان الہندؒ نے اپنا آخری ٹھکانا اسی مہرولی کی نگری کو بنایا رحمہم اللہ۔

یہ قطب الہند قطب الاقطاب کی گذرگاہ، سیرگاہ، اور تربیت گاہ ہے۔

آپ دہلی میں اولاً سنہ ۵۹۰ھ میں تشریف لائے۔ اس کے بعد سنہ ۶۱۱ھ میں بعہد سلطان شمس الدین التمش دہلی کے قصبہ کیلوکھڑی میں اقامت گزیں ہوئے اور وہاں کے عوام و خواص کی صلاح و فلاح میں ہمہ تن مصروف ہو گئے، پھر سلطان التمش کی نیازمندانہ درخواست پر مہرولی میں رونق افروز ہوئے۔ اس دور میں یہی مقام دارالسلطنت تھا۔ اور پھر اس خطۂ ارض کو اس قدر محبت و اخلاص سے نوازا کہ یہاں پریم و آشتی کا جل برسنے لگا سلوک و معرفت کی تسلی بخش ہوائیں چلنے لگیں، یقین و طمانیت کی پُرعافیت گھٹا اور بادل سے چھا گئے، اور یہ اندرپت "مہرولی" بن گیا۔ یہاں سے یہ ابر کرم اٹھ کر کہاں کہاں برسا؟ اس کی گوہر بار پھواریں کہاں کہاں تک پہنچیں؟ یہ صرف خدائے وحدہٗ لاشریک کے علم میں ہے۔ تاریخ نے صرف یہ یاد رکھا ہے کہ پنجاب کے پاک پٹن میں ایمان و عرفاں کے اس بے کراں دریا کی ایک لہر پہنچی جس نے

پورے ملک کو سیراب و شاد کام کیا۔

دارالخیر اجمیر میوات کے جنوب میں واقع ہے اور مہرولی شمال میں، ان عظیم المرتبت مرشد اور عزیز القدر مسترشد کے باہمی تعلقات کو ذہن میں استوار کیجئے اور پھر ان کی منابع رشد و فلاح کے محل وقوع پر غور کیجئے سارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔

اس درگاہ میں جن امرائے سلطنت نے اپنے دور اقتدار میں مختلف تعمیرات نیازمندی کی بناء پر کرائیں، ان میں فیروز شاہ تغلق {۷۵۲ھ / ۱۳۵۱ء} {۹۴۷ھ / ۱۵۴۰ء} شیر شاہ سوری {۹۴۷ھ ۔ ۹۵۲ھ / ۱۵۴۰ء ۔ ۱۵۴۵ء} اسلام شاہ سوری {۹۵۲ھ ۔ ۹۶۰ھ / ۱۵۴۵ء ۔ ۱۵۵۳ء} شہنشاہ فرخ سیر {۱۱۲۴ھ / ۱۷۱۲ء} شاہ عالم {۱۱۷۳ھ / ۱۷۵۹ء} اور بہادر شاہ ظفر {۱۲۵۳ھ ۔ ۱۲۷۴ھ / ۱۸۳۷ء ۔ ۱۸۵۷ء} کے نام قابل ذکر ہیں۔

یہ مہرولی ہے، یہاں جمالی جیسے قادر الکلام شاعر بھی سرنگوں ہیں اور جلال پادشاہی و طمطراق سلطنت کے جام بلوریں بھی واژگوں۔ دلی ہندوستان کا دل ہے اور مہرولی دلی کا دل ہے۔ یہ عجائب و غرائب کا نگر ہے، یہاں بابا سماء الدین سمنانی کا مدرسہ و خانقاہ ہے اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی آخری آرامگاہ۔ مسجد قوۃ الاسلام کا مئذنہ قطب مینار بھی ہے۔ اور بھول بھلیاں۔ یعنی ادہم خاں۔ جلال الدین اکبر کے دودھ شریک بھائی کا مزار بھی۔ پھول والوں کی سیر، پنکھوں کا جلوس۔ چھڑیوں کا میلہ۔ جو دور پیشین یعنی مغل شہنشاہیت کے آخری دور کے بڑے دلکش، دلچسپ اور دلربا مناظر پیش کرتے ہیں۔ اسی لئے دلی والوں کے لئے اس دھرتی میں کشش ہے وہ ہندو مسلمان، ہر ایک، ہر مذہب کے اہل و ایک ساتھ یہاں آتے ہیں۔ اِں ہاں یہاں حوض شمسی بھی تو ہے اور مسجد اولیاء بھی۔ اور بھی بہت کچھ ہے جس کے لئے

چشم بصیرت درکار ہے اور یہاں بصارت بھی مضمحل ہے کسی اہل دل سے پوچھ لینا۔ انشاء اللہ وہ آپ کو بہت ساری ایسی باتیں بتلا دے گا جو ہمیں معلوم ہی نہیں۔

آگرہ یہاں سیدنا ابوالعلاء نقشبندی کی خانقاہ ہے جن سے سلسلۂ علائی جاری ہوا جس کے بہت سے مشائخ فیروز پور جھرکہ، تجارہ وغیرہ میں ہوئے ہیں۔

اس کی آبادی بہت قدیم ہے، اس شہر کے قدیم قلعہ کا حوالہ ایک قصیدے میں ملتا ہے جو مسعود بن سعد بن سلمان شاعر (م ۵۱۵ھ۔ ۱۱۲۱م یا ۵۲۶ھ/۱۱۳۱م) نے غزنوی شہزادے سیف الدولہ محمود بن ابراہیم کی مدح میں لکھا تھا۔

اس شہر کے حکمران راجپوت تھے۔ جس راجہ سے غزنوی شہزادے نے قلعہ چھینا اس کا نام مسعود شاعر نے جے پال لکھا ہے۔

پھر سکندر لودی (۸۹۴ تا ۹۲۳ھ / ۱۴۸۹ تا ۱۵۱۷ء) نے شہر آگرہ سنہ ۹۱۱ھ / ۱۵۰۵ء میں از سر نو تعمیر کرا کے اسے سلطنت ہند کا دارالسلطنت بنایا (ایلیٹ ۵: ۹۹)

اس شہر نے بہت جلد اہمیت حاصل کر لی اور دنیائے اسلام کے بہت سے حصوں سے ارباب علم و فضل یہاں آ کر جمع ہونے لگے۔ چونکہ یہ جنوب میں گوالیار و مالوہ غرب میں راجپوتانہ شمال مغرب میں دہلی و پنجاب اور جانب شرق وادئ گنگا وغیرہ کا اہم سنگم تھا اس لئے وہ جنگی اور تجارتی لحاظ سے بھی اہم مرکز بن گیا۔ ابراہیم لودی۔ (۹۲۳ تا ۹۳۲) کا دارالخلافہ بھی یہی شہر رہا بابر نے جب اسے شکست دی تو بابر نے بھی اسے اپنا مستقر حکومت

بنایا۔ پھر اکبر نے ۹۶۵ میں اسے اپنا دارالسلطنت قرار دیا اور اس کا نام اکبر آباد رکھا گیا[1]

جھمراوٹ موضع جھمراوٹ قصبہ پنگواں کے پچھم میں واقع پہاڑ کے مغربی جانب بڑکلی سے پونا ہانہ کو جانے والی سڑک کے پاس خان پور گھاٹی سے جنوب کی طرف واقع ہے۔ اولاً آبادی اکٹھی تھی مگر آج کل وہ مختلف باسوں میں بٹی ہوئی ہے۔ عموماً لوگوں نے اپنے اپنے کھیتوں پر رہائش اختیار کر لی ہے۔ کچھ دنوں نواب فیض اللہ خاں آف ہتھین کی نگرانی میں رہا ــــ ۱۸۴۴ء کے ریونیو ریکارڈ سے: خانزادوں کا بیان ہے کہ ہم اصلی باشندے جھمراوٹ کے ہیں۔ جب میو یہاں آباد ہو گئے تو ہم بسنی خانزادہ چلے گئے۔ اس کے بالکل برعکس میوؤں کا بیان ہے ــــ اور قرین قیاس ہے ــــ: یہاں ہمیشہ سے ہم آباد ہیں، خانزادے یہاں کبھی آباد نہیں ہوئے[2]

یہاں قاضی شرعی اور شیخ منور رحمہما اللہ کی خانقاہیں تھیں، وہ یہاں کے مقدم بھی تھے اور قاضی شرعی بھی ــــ گویا یہاں مقامی دارالقضاء تھا۔ اور یہاں کے معلم الصبیان بھی، نیز ان کے دلوں کو یاد الٰہی و ذکر خداوندی سے آباد کرنے کی خاطر مربی و شیخ طریقت بھی۔

قاضی شرعی سے تعلق کے باعث یہاں ایک انصاری خاندان بھی مدینہ منورہ سے آکر آباد ہو گیا تھا جس کے کچھ افراد فیروز پور جھرکہ چلے گئے تھے

[1] اردو انسائیکلوپیڈیا ج ۱ ص ۱۹۰/۱۰۹

[2] شجرہ موضع جھمراوٹ ریکارڈ آفس گوڑگانوہ۔

وہاں انھوں نے اچھی خاصی حیثیت بنالی۔ عہد محمد شاہی کے مشہور نواب کار طلب خاں اور ان کے صاحبزادے نواب خان زماں خاں اسی خاندان کے افراد تھے، فیروز پور جھرکہ میں پختہ قلعہ نواب خاں زماں خاں ہی نے بنوایا تھا۔[1]

موضع جھمراوٹ کے مشرق میں قصبہ پنگواں ہے جو نہایت آباد اور بارونق قصبہ ہے۔ اس میں سادات کے بھی کچھ خاندان تھے اور کچھ شیوخ خاندان میں بھی اہل علم و صاحب سجادہ بزرگ گذرے ہیں چنانچہ اس کے جنگل میں چاروں طرف مزارات پختہ ہیں، گنبد دار۔ ان میں کتنے ہی تھے مگر وہ دھن دولت کے لالچیوں نے نکال لئے۔ یہاں راجو قتال کی خانقاہ تھی جن کی نگاہ کیمیا اثر سے عرصہ تک یہ سرزمین بقعۂ نور بنی رہی۔ قصبہ کی اکثر آبادی نقل مکانی کر کے ۱۹۴۷ء میں پاکستان ہجرت کر گئی انھیں یہاں کے اور کوائف بھی ضرور معلوم رہوں گے، مگر ان تک رسائی کارے دارد ہے۔

قصبہ نگینہ یہاں پر نور اللہ شاہ جیلانی کی خانقاہ تھی جو ساتویں صدی ہجری کے مشہور بزرگ ہیں یہ قصبہ تقریباً سات سو سال پیشتر آباد ہوا جیسا کہ ۱۸۴۴ء کے بندوبست سے ظاہر ہوتا ہے۔ صورت واقعہ یہ ہوئی کہ تقریباً ۱۱۴۴ء میں آسی و جابی پسران سرجن موضع سریٹہ ضلع الور سے موضع کریہڑہ میں آئے اس وقت نگینہ آباد نہیں ہوا تھا، ویران جنگل تھا، آسی و جاسی نے یہ جگہ ویران سمجھکر یہاں آبادی اختیار کی۔" موجودہ آبادی کے درمیان اس وقت ایک تالاب تھا، اس کے چاروں طرف ببول کے درخت تھے،

[1] دیکھئے ذکر فیروز پور جھرکہ

جنگلی جانور یہاں پانی پینے آتے تھے، موتی کی طرح صاف شفاف پانی، گرمی کے دنوں میں پانی کم ہوجاتا تھا، مگر اس وقت اس کی خوبصورتی اور بڑھ جاتی تھی، وہ تھوڑا سا پانی تالاب کے پیندے میں نگینہ کی طرح چمکتا تھا۔ آبسی جو جا بسی نے جب یہاں رہنا شروع کیا تو تالاب کی یہی کیفیت تھی۔ اسی سے متاثر ہوکر انھوں نے اس نئی آبادی کا نام نگینہ رکھا[1]

اس قصبہ کے آباد کرنے میں تقریباً سب ہی قوموں نے حصہ لیا ہے۔ یہ بڑی دلکش فضا میں واقع ہے اس کے ایک طرف کوہ اردلی کا سلسلہ ہے اور ایک طرف آبریز کا علاقہ ہے۔

آج کل یہ فیروز پور جھرکہ کی تحصیل میں ہے، بہت آسودہ، خوشحال اور خوش مذاق ہیں اس کے باشندے۔ اس میں ہائر سیکنڈری اسکول بھی ہے۔ اور اب تو 'میوات کالج' بھی، اسلامی مدرسہ بھی ہے اور بہت سی مسجدیں۔ ۱۹۴۷ء میں یہاں کا پڑھا لکھا طبقہ پاکستان چلا گیا۔

شاہ نور اللہ کا مزار آبادی کے مغرب میں واقع ہے، انکی گیارہویں بہت مشہور ہے، ان کا وصال کب ہوا۔ اس کا کوئی صحیح جواب نہیں اور ان کے دوسرے کوائف بھی غیر معلوم ہیں بس اس بستی میں ان کا قیام متحقق ہے۔ بستی کے مغربی جانب تقریباً ایک کلومیٹر دور ایک خانقاہ۔ بھولا شاہ رح کے تکیہ کے نام سے موسوم ہے وہاں مسجد بھی ہے اور بہت عمدہ پانی کا کنواں بھی اور خانقاہ بھی۔ ان کا زمانہ معلوم نہ ہوسکا البتہ عمارتوں کا طرز عہد تغلق و عہد تیمور کے درمیانی دور کا سا محسوس ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

---

[1] روایت حکیم پنڈت کاشی ناتھ عرف بچاری والد ماسٹر مدن موہن قصبہ نگینہ ۱۹۷۳ء

الور سے دہلی روڈ پر ایک جگہ ہے بڑکلی (Barkali) وہ اس علاقہ کا بہت بڑا بس اسٹاپ ہے۔ یہاں سے چار راستے چاروں طرف جاتے ہیں؛ مغرب میں نگینہ ایک میل، مشرق میں بنگولا ہوڈل وغیرہ شمال میں دہلی ساٹھ میل۔ جنوب میں فیروز پور جھرکہ گیارہ میل۔

سانٹھاواڑی | یہ بستی کسی دور میں بہت بڑی آبادی تھی، اس کا محل وقوع بالکل پہاڑ کے دامن میں ہے، پہاڑ میں بہت سی مسجدیں اور پختہ مزارات تھے جو قدامت اور عدم نگہداشت کے باعث پیوند زمین ہوگئے، راج شاہی سلسلہ کی بھی یہاں ایک خانقاہ تھی جو خواجہ ولی محمد قدس سرہ متوفی ۱۹۳۱ء نبیرۂ قطب عالم میاں راج شاہ قدس سرہٗ کے انفاس قدسیہ سے آباد و پر رونق تھی۔ اکثر آبادی نقل مکانی کرکے ۱۹۴۷ء میں پاکستان ہجرت کرگئی۔ مگر ویرانی کے قدم یہاں جمنے نہیں پائے۔ آج بھی باقاعدہ اچھی خاصی آبادی ہے۔

سرکاری دستاویزات کی روشنی میں اس کی قدیم تاریخ اس طرح ہے:۔

"پہلے یہ رقبہ بقبضہ پٹھانوں کے تھا۔ وہ بباعث ناداری فرار ہوکر معلوم نہیں کہاں چلے گئے، عرصہ تخمیناً چار سو برس۔ جس کی مدت پر سولہ پشت گذر چکی ہیں۔ ہوا ہے کہ مسمی صاحب خاں مورث ہم مالکان قوم خانزادہ نے موضع اندور علاقہ راج الور سے آکر اس رقبہ پر باجازت حاکم وقت جس کا نام ہمکو یاد نہیں بلا ادائے نذرانہ قبضہ مالکانہ کیا، مگر اس وقت ہم مورثان کے کوئی پیمانہ ملکیت قائم نہیں ہوا تھا حسب استطاعت خود یا جس قدر اراضی جس نے کاشت کرلی اس کا وہی مالک متصور ہوا ... پھر مختلف زمانوں میں یہاں کے باشندے کچھ اور لوگوں کو یہاں لے آئے اور انھیں بالاتفاق یہاں کا بسوہ دار بنایا۔ مثلاً لالیا حجام

کو مانڈی کھیڑہ سے لاکر آباد کیا اور خدمت موتراشی کے عوض اسے کسی قدر
اراضی، جو پیمائش حال کے بموجب اٹھارہ بیگہ سے کچھ زیادہ ہے، برائے کاشت
دیدی، امام بخش فقیر موضع تیتر کا علاقہ الور سے اور مسمیان رام بخش وہر دیو نواب
احمد بخش کے عہد میں مانڈی کھیڑہ سے آکر یہاں آباد ہوئے [1]

آبادی سے متصل پہاڑ میں ایک اور بزرگ کا مزار ہے جنھیں ولشاذ؟
کہتے ہیں، اور بھی اہل اللہ یہاں گذرے ہیں جن کے متعلق معلومات کسی طرح
بھی فراہم نہ ہو سکی، میوؤں کی آبادی کو پانچ سو سال کا عرصہ ہوا ہے اس سے پیشتر
یہاں پٹھانوں کا جو دور گذرا ہے اس دور کے کھنڈرات بھی کہیں کہیں دکھائی دیتے
ہیں۔ ایک مسجد بہت قدیم ہے اور بحمد اللہ آباد ہے۔

موجودہ نسل سے پہلی جو نسل تھی اسمیں ایک مولوی کریم بخش صاحب بھی
سوڑا کا تحصیل نوح کے باشندے تھے۔ یہاں ان کی رشتہ داری تھی اکثر آنا
جانا ہوتا رہتا تھا۔ انھیں اولاً یہیں علم دین کا چسکہ لگا تھا اور حصول علم کی خاطر
ملک کے مختلف حصوں میں پھرے تھے، فراغت کے بعد بہت کم عرصہ وہ گھر پر
مقیم رہ پائے، اکثر علمی سفر کئے اور اصلاحی دورے کئے۔ بعد میں نواب
ٹونک کے یہاں وہ اتالیق بنکر رہے اور عمر کا اکثر حصہ وہیں بسر کیا اسی لئے
اہل میوات ان سے متعارف نہ ہو سکے۔

مانڈی کھیڑہ | دلی الور روڈ پر دلی سے ساٹھ پینسٹھ میل جنوب میں واقع
ہے، بہت سندر اور من موہن ہے۔ یہاں پر راج شاہی سلسلہ کے

[1] ریکارڈ آفس فنانشل کمشنر گڑگانوہ۔

لوگوں نے عرصہ تک تصوف وسلوک کی قندیل کو فروزاں رکھا ہے بستی کے شمال
مغرب میں صوفی اسمٰعیلؒ اور ان کے مرشد مولانا عبداللہ شاہؒ کی خانقاہ تھی سنہ ۱۹۴۷ء
میں پوری آبادی نقل مکانی کرکے پاکستان چلی گئی۔ بڑے بہادر اور جیالے تھے یہاں کے
باشندے، انگریزی دور حکومت میں ان کی غیر معمولی وفاداری کے صلہ میں انھیں نوازا
گیا، اور باقاعدہ ایک مینار بنایا گیا جن پر ان کے نام کندہ کرائے لب سڑک گاؤں
کے پاس۔ الور کو جاتے ہوئے سڑک کے دائیں جانب دکھائی دیتا ہے۔

اس کی تاریخ زیادہ پرانی نہیں چنانچہ خود یہاں کے باشندوں کا بیان
ہے کہ "پہلے بھی عہد سلطنت تیمور سے اس گاؤں کے مالک بزرگان مورث ہم
مالکان تھے، سو برس تک ان کا رقبہ مالکانہ رہ کر کسی سبب سے ویران ہو گئے،
سمت ۱۳۹۱ میں بعہد سلطنت ہمایوں شاہ بادشاہ جس کو انیس پشت گذری
ہیں۔ مسمی نظام خاں مورث اعلیٰ ہم مالکان اپنا موروثی حق سمجھکر باجازت عامل وقت
جس کا نام ہمکو معلوم نہیں، بلا ادائے نذرانہ و بلا حصول سند ملکیت اس رقبہ پر مالکانہ قابض
ہوا دو پشت تک عملدرآمد بطور زمینداری خالص رہا بعد میں باہم اولاد مورث نے
بسبب نا اتفاقی بنظر سہولت وصولی جمع کے مطابق تقسیم کرلیا [1]

کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ گاؤں دراصل میوؤں کا تھا۔ راستہ میں ہونیکی
وجہ سے رہ گذر کی حیثیت تھی اس کی۔ ایک دفعہ ایک مسافر۔ پراگندہ خاطر،
پراگندہ رو، شکستہ سر و پا، ملنگ رفو۔ یہاں سے گذرا، شام ہو رہی تھی، میوؤں
نے حسب عادت اس سے کہا: بھائی اب شام ہو رہی ہے کہاں کا ارادہ
ہے۔ کہنے لگا کوئی ارادہ نہیں اور نہ کوئی منزل مقصود۔ ویسے ہی ہوا کی موج پر
پھر رہا ہوں۔ میوؤں نے اس کی خاطر مدارات کی اور اسے شب بسری پر مجبور کیا،
مگر وہ نامعلوم جذبہ کے تحت یہاں سے جانے سے معذور ہو گیا اور مجبور بھی۔ یہیں

[1] ریکارڈ آفس گڑگانوہ۔

بود و باش اختیار کرلی اور اپنے اعزہ و اقارب کو بھی بلا لایا - اب اس کی آبادی پھیلنے لگی، اور بستی کے قدیم میو باشندے سکڑنے لگے، مہمان بنا کر رکھا تھا اس لئے کچھ کہہ بھی نہ سکے - ہوتے ہوتے اس کے اعزہ و اقربا نے پوری بستی کو بھر دیا پھر میوؤں نے اپنی وفاشعاری کی روایات کے مطابق پوری بستی انھیں کے لئے چھوڑ دی اور خود مانڈی کھیڑہ[1] کے جنوب مشرق کے جنگل میں جا بسے اور اس آبادی کا نام رانیکا (Ranika) مشہور ہوگیا[ع]-

---

ع روایت حافظ نور محمد، سابق پردھان گرام پنچایت موضع رانیکا-

[1] تفصیلی حاشیہ :- یہ قصبہ خانزادوں کا ہے اور شاید پوری میوات میں خانزادوں کا سب سے بڑا گاؤں ہے - بڑے صاحب حیثیت تھے یہاں کے باشندے ہمارے بعض قومی مورخین انھیں میو قوم کی جادو پال کی ایک شاخ بتلاتے ہیں مگر خانزادے اس پر مصر ہیں کہ ہم علیحدہ قوم ہیں - سوال یہ ہے کہ اگر علیحدہ قوم ہے تو اس کی نکاس کہاں سے ہے، اور خان اس میں کہاں سے آیا؟ - مرقع میوات میں منشی شرف الدین نے اس سلسلہ میں کافی کد و کاوش کی ہے مگر اس میں تاریخ نگاری نہیں تاریخ سازی کی گئی ہے جس سے ایسے مسائل حل نہیں ہوتے -

اولاً تو لفظ "خانزادہ" ہی محل نظر ہے - خطاب تو صرف "خان" یا "خانخانان" یا "خان جہاں" وغیرہ جیسے ہوتے تھے پھر خان کا لڑکا بھی خان ہی ہونا چاہیئے، اگر خانزادہ بچے خان کو بچپن میں کہہ دیا جائے تو بڑا ہو کر وہ خان ہی ہوگا خانزادہ کیوں ہوگا -؟ اگر بہادر ناہر کو ان کا مورث اعلیٰ قرار دیا جائے جیسا کہ ان کا دعویٰ ہے، تو بہادر ناہر کے ساتھ خان کہیں نہیں آتا - تاریخ کی کسی بھی کتاب میں ان کے نام کے ساتھ خان نہیں، اس سے ظاہر کہ "خانزادہ" کوئی خطاب نہیں اس کی دو صورتیں سمجھ میں آتی ہیں کہ یا تو یہ خانہ زادے سے ماخوذ ہے جیسا کہ تاریخی روایات اس کی تائید کرتی ہیں (میو قوم اور میوات ص ۴۰۶، ۴۰۴ و مرقع الور ص ۱۷) یا میوؤں کی پال "خان جادو"

قصبہ سنگار | میوات کا مشہور اور سب سے بڑا گاؤں، پونا ہانہ سے ہوڈل جانے والی سڑک پر چار میل جانب شرق واقع ہے، کسی دور میں بہت آسودہ اور خوشحال تھا، ذیلدار سہراب خاں، چودھری مہتاب صاحب اچھے صاحب ذوق اور شستہ مزاج لوگ تھے، ۱۹۴۷ء میں پاکستان ہجرت کر گئے -

---

بقیہ حاشیہ گذشتہ صفحہ :- سے اس کی نکاس ہے جیسا کہ میوات کی معاشرتی تاریخ سے اس کی حمایت ہوتی ہے - میو قوم کسی بھی دوسری قوم میں لڑکی نہیں دیتے اور نہ کسی قوم کی لڑکی لیتے ہیں آس پاس کی قوموں سے تعلقات نہایت استوار مگر رشتے ناطے کی حد تک نہیں۔

جلال الدین اکبر نے جب راجپوتوں سے لڑکی لینی شروع کی اور یہ محض ایک سیاسی مصلحت تھی تو شمالی راجپوتانہ اور دہلی کے درمیان میو قوم آباد تھی ہی اکبر نے ان رشتوں سے جو اطمینان کرنا چاہا وہ اسے حاصل نہ ہوسکا، اس نے میوؤں سے بھی اس سلسلہ میں گفتگو کی مگر میو قوم نے اجتماعی طور پر اس سے انکار کر دیا - اکبر کے ہرکارے نشۂ اقتدار میں میو قوم کی ایک لڑکی کو پکڑ لائے - قوم کو جب اس کا پتہ چلا تو عام پنچایت ہوئی - چودھری باہر ساکن کوٹ نے پنچایت کے سامنے عہد کیا کہ میں اپنی قوم کی لڑکی کو شاہی محل سے واپس لاؤں گا - یہ عہد کر کے وہ اپنے رشتہ داروں کے پاس پہنچا جو پاہٹ پال سے متعلق اور ضلع بھرتپور میں کہیں قیام پذیر تھے ان سے انھوں نے گوہ لی، جو مکانات بلند پر کمندیں ڈالنے میں کام دیتی ہے، اور شہر کا رخ کیا - گوہ کے ذریعہ قدیم قلعہ کی دیوار پھاند لی، دل میں سوچا: چونکہ نئی نئی آئی ہے اس کے مکان میں آج ضرور چراغاں ہوگا - چنانچہ وہ ایک روشن کمرے کی طرف بڑھا مگر جوں ہی اس نے وہاں قدم رکھا اس کمرہ کا چراغ گل ہوگیا، اب اسے فکر ہوئی کس طرح لڑکی کو یہاں سے نکالے - پھر اس کے دل میں آیا کہ وہ چونکہ دیہات سے آئی ہے اس لئے اس کے قدم بہ نسبت دیگر بیگمات کے سخت

"تقریباً سات سو سال پہلے ایک شخص اورک نامی یہاں آکر آباد ہوا جو موجودہ آبادی کا مورث اعلیٰ ہے۔ سنگار نام کا یہیں ایک کھیڑہ تھا، وہی نام اورک نے اپنی رہائش کے لئے مقرر کیا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہاں ٹنڈال نامی چشمہ کے میدان میں کرشن مہاراج نے سنگار کیا تھا، اس لئے سنگار نام مشہور ہوا۔

بقیہ حاشیہ گذشتہ صفحہ :- ہوں گے۔ چنانچہ جب اس نے قدم ٹٹولنے شروع کئے سخت قدم پر ہاتھ پڑا تو اس نے اسے زور سے دبایا وہ لڑکی وہی تھی جسے لینے چودھری باہر محل میں آیا تھا۔ وہ اٹھ بیٹھی اور زبان پہچان کر اور اپنا نام اس کے منہ سے سنکر اس کے ساتھ چل پڑی۔ اس نے پہلے اسے قلعہ سے باہر کیا اور پھر خود باہر آیا۔ مگر۔ گوہ۔ جو اس کا زینہ بنی تھی اس کی واپسی کی بولی بھول گیا اور وہ وہیں چپکی رہی۔ صبح قلعہ کے باشندوں نے یہ گوہ بھی دیکھی اور میو لڑکی کی گمشدگی بھی ان کے نوٹس میں آئی، یہی گوہ جو میو لڑکی کی گلو خلاصی کا باعث ہوئی وہی اس لڑکی کو آزاد کرانے والے کی زحمت اور گرفتاری کا سبب بنکر اسے شہادت گاہ تک لے گئی۔ ہوا یہ کہ جب "گوہ" کی شناخت کرائی گئی تو اس کے مالک پکڑے گئے۔ انھوں نے اپنی برأت ظاہر کی اور پھر چودھری بہار خاں گرفتار ہوئے اور قصبہ پلول میں اسے پھانسی لگی۔ آٹھ یوم تک اس کی لاش سولی پر لٹکی رہی۔ کسی کی ہمت نہیں پڑتی تھی کہ چودھری بہار خاں کی لاش کو ہاتھ لگائے، چودھری صاحب کے گاؤں کے بنیا پلول میں رہتے تھے، آٹھ دن کے بعد انھوں نے سولی پر سے لاش کو اتارا اور موضع کوٹ میں انھیں دفن کیا۔

ادھر یہ ہو رہا تھا اور چودھری باہر خاں کی گرفتاری کے بعد اس کی رستگاری کی تجویزیں زیر غور تھیں اس سلسلہ میں چھپر کلوت پال کے سربراہ شاہ چوکھا کے مزار پر جمع ہوتے تھے

یہ بستی پہلے دور میں بھی خاصان خدا کا مرکز بنی رہی اور ماضی قریب میں بھی۔ زمانے کا تعین ذرا دشوار ہے۔ باقی مزارات دیکھنے سے قدامت ظاہر ہو جاتی ہے۔ چھوٹی مسجد کے پاس شاہنواز کا مزار ہے۔ تالاب کے پاس شاہ جمالؒ کی آرام گاہ اور دھولے کنوئیں کے پاس احمد شاہؒ مدفون ہیں، رحمہم اللہ۔ یہ سب اپنے اپنے دور میں اس بستی کے لئے ہدایت در وشنی کے

بقیہ حاشیہ گذشتہ صفحہ :- شاید اسی سے متاثر ہو کر مصنف تذکرۃ الفقراء نے شاہ چوکھا کو چھپر کلوت ظاہر کیا ہے۔ جو خلاف واقعہ ہے۔

حسن خاں میواتی کا چچا زاد بھائی جمال خاں سرکاری ملازمت کرتا تھا۔ وجیہہ و شکیل آدمی تھا جو خاں جادو۔ پال سے تھا۔ اکبر جب اپنے منصوبہ۔ میو قوم سے ڈولا لینے میں ناکام ہو گیا تو جمال خاں، جو سرکاری ملازم تھا، اسے اس پر آمادہ کیا کہ وہ اپنی لڑکی حرم میں دیدے۔ شاہی ملازم تو تھے ہی حکم سلطانی کو کیسے رد کر سکتے تھے، وعدہ کر لیا اور لڑکی حرم شاہی میں داخل کر دی۔ چودھری بہار خاں کو پھانسی دی جا چکی تھی جمال خاں کا قصہ جب میوات والوں کو معلوم ہوا تو وہ بہت خفا ہوئے کہ ادھر تو ہمارے چودھری کو شہید کر دیا گیا اور یہ اسی قاتل کو لڑکی دے کر داماد بناتا ہے۔ پورے علاقہ کی پنچایت ہوئی اور جمال خاں اور اس کے حمایتیوں کو ذات باہر کر دیا۔ رشتے ناطے، ملنا جلنا، اور ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا سب جرم قرار دیا گیا۔ شہروں کے اور پڑھے لکھے لوگ عموماً ناخواندہ افراد کو گری نظر سے دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں، میوات میں علمی اشاعت کچھ کم تھی بہت کم لکھے پڑھے آدمی تھے، جمال خاں جیسے افراد پہلے بھی عوام سے ملتے تھے اس قومی بائیکاٹ کے بعد دونوں طرف سے ملنے کی پابندی اور بڑھ گئی۔ یہ خلیج بڑھتے بڑھتے اس قدر وسیع ہو گئی کہ جریدۂ عالم پر ایک نئی قوم وجود میں آ گئی۔ گویا خانزادے اصل میں خان جادو گوت سے تعلق رکھتے ہیں مگر تمدن میں

مینار تھے۔ ایک بزرگ اور تھے سید نور علیہ الرحمۃ۔

آخری دور میں یہاں سلسلۂ راج شاہی کے ایک فرد میاں جی عبد اللہ رح متوفی ۱۹۵۵ء رونق افروز تھے ان کی خانقاہ چھوٹی مسجد میں تھی۔ ان کے قیام کے باعث اب چھوٹی مسجد۔ میاں صاحب والی مسجد۔ کہلاتی ہے۔

یہاں ایک عالیشان جامع مسجد بھی ہے اور "مدرسہ اسلامیہ" بھی، جسے حاجی عبد الرحمٰن رح نے قائم کیا تھا پہلے وہ آبادی کے اندر تھا، اب اس کی عمارت لب سڑک بن گئی ہے۔

قصبہ دھوج
ضلع فرید آباد

قصبہ دھوج کا تحصیل بلب گڈھ ضلع فرید آباد کے بڑے اور اہم قصبات میں شمار ہوتا ہے بلب گڈھ سے سہنہ جانیوالی سڑک پر تقریباً درمیان میں پہاڑ کے دامن میں واقع ہے سر سبز و شاداب اور دہلی سے قرب کے باعث اچھا خاصا متمدن ہے۔

یہاں کے بزرگان دین کے حالات جب میں نے لکھنے چاہے تو محترم بابو شادی خاں ساکن دھوج کو اس سلسلہ میں خط لکھا۔ انھوں نے اچھا خاصا تفصیلی تذکرہ لکھدیا۔ مزید کچھ معلومات نہ ہونے کے باعث وہی تذکرہ یہاں پیش ہے۔

بقیہ حاشیہ گذشتہ صفحہ:۔ تھوڑی ترمیم کرکے ایک نئی قوم کے مالک بن گئے یہ طے شدہ ہے کہ یا تو یہ خاں جادو گوت سے متعلق ہیں ورنہ پھر انکی اصل مبہم و مشتبہ ہے پٹھان نہیں اور غوری، خلجی، سید، سوری مغل کسی بھی اور قوم سے ان کا تعلق نہیں۔ بہادر ہیں، جیالے ہیں مگر راجپوت نسل سے تاریخ ان کا جوڑ نہیں ملاتی معلوم نہیں کیوں یہ ایسا کرتے ہیں۔ ذاتی جوہر و کردار کے بعد کیا ضرورت ہے کہ تاریخی جودھاؤں کی اولاد بننے کی سعی غیر محمود کی جائے۔ حدیث میں ایسے شخص پر لعنت بھیجی گئی ہے جو نسب نامے میں کتر بیونت کرے۔ ایسی حرکتوں سے شریف آدمیوں کو بچنا چاہیئے۔ صاحب کردار افراد کو قومی پشتارے کی ضرورت نہیں ہوا کرتی۔

موضع سروہی، دھوج، پالی، اور ٹھینٹھر میں تکیئے ہیں جن کے نام کافی زرعی زمین اور جائداد شاہی وقت سے چلی آرہی ہے۔ یہ جن بزرگوں کی قیام گاہیں تھیں ان کے حالات اس طرح سنتے آئے ہیں:۔

کچھ مسلمانوں کا ایک دستہ عربی النسل گھوڑوں پر سوار آیا۔ یہ لوگ قصبہ دھوج کے پہاڑ کے دامن میں ایک ریت کے ٹیلے پر مقیم ہو گئے، عصر کے وقت اچانک بادل اٹھا۔ فصل ربیع کی کٹائی ہو رہی تھی، لوگ تاڑ گئے کہ ژالہ باری ہوگی، جنگل میں کام کرنے والے پناہ لینے آبادی کی طرف بھاگے، بارش اور ژالہ باری بہت زور سے ہوئی، جب بارش اور اولوں کا سلسلہ تھم گیا تو لوگوں نے کہا:۔ ان اجنبی اور مسافر سواروں کی بھی خبر لینی چاہیئے۔ چنانچہ وہ جنگل میں اس طرف گئے اور یہ دیکھکر حیران رہ گئے کہ اس ٹیلے پر بارش اور ژالہ باری بالکل نہیں ہوئی، پورا قافلہ گھوڑوں سمیت خیریت سے ہے۔ قافلے والے بڑے سکون کے ساتھ وہاں مقیم تھے، کسی قسم کا خوف وہراس ان پر نہ تھا، یہ دیکھکر لوگ ان کے معتقد ہو گئے۔

جب راجہ گوپال کو جس کا قلعہ سروہی کے پہاڑ سے متصل موضع کوٹ کے پہاڑ پر ہے مسلمانوں نے زیر کرلیا۔ راجہ مع لشکر اس جنگ میں کام آگیا۔ راجہ کی لڑکی موضع سیکری (بلب گڈھ) بیاہی تھی۔ وہ اپنے گھر والوں کی خبر لینے آئی، اس نے دیکھا کہ اس کا ایک ماہ کا بھائی اس کی اور اپنی والدہ کے پاس زندہ ہے جو مقتول ہو چکی تھی، اس لڑکی کی گود میں ایک لڑکی بعمر ایک ماہ تھی، اس کو اپنی ماں کے پاس بٹھاکر بھائی کو باہر لے آئی پہرہ داروں کو اس کا علم نہ ہوا، سیکری جاکر یہ بچہ بیمار ہوگیا۔ اس عرصہ میں موضع سروہی میں بزرگوں اور اولیا اللہ رح کی آمد کا چرچا ہو گیا تھا۔ یہ بزرگ وہی حضرات تھے جو عربی النسل گھوڑوں پر سوار دھوج کے جنگل میں آکر مقیم ہو گئے تھے، مگر اب وہ صرف سات تھے، جب یہ بیمار بچہ انھوں نے دیکھا تو اسکو

لے لیا اور اپنے پاس رکھ لیا۔ اس بچہ کی نسل سے ہم چوراسی والے ہیں جو بلیسانہ، سروہیا، منگریا اور کانگا کہلاتے ہیں کیونکہ یہ چار آدمیوں کی اولاد سے ہیں۔

ان بزرگان دین اور اولیا اللہ رحمہم میں سے بڑے کا تکیہ اور جائداد دھوج میں اس جگہ پر ہے جہاں وہ شروع میں آکر ٹھہرے تھے، چار حضرات کا تکیہ اور مقام موضع سروہی میں ہے اور ایک موضع تینتھر (Tenthen) میں ہے اور ایک موضع پالی (Pali) میں ہے، ان کے تکیے اور جائدادیں ہیں۔ یہ شاہ کابل کے نام سے مشہور ہیں، اور ان سے بڑی بڑی کرامتوں کا ظہور ہوتا ہے۔

مذکورہ راجہ گوپال تنور (Tanwar) تھے، اور یہ غالباً وہی ہیں جنکا مقابلہ شہاب الدین غوری سے ہوا یعنی چھٹی صدی کے آخری سالوں میں۔ انکی راجدھانی تودکی تھی مگر موضع کوٹ کے پہاڑ پر بھی ایک قلعہ بنا لیا۔ گویا دھوج کی موجودہ آبادی تقریباً چھٹی صدی کی ابتدائی سالوں کی ہے۔

۱۸۵۷ء کے بعد انگریزی حکومت کے ابتدائی دور میں ایک مولوی صاحب قصبہ دھوج کے کنکر والے تالاب کی پال پر بیٹھے دیکھے گئے، گاؤں والے ان سے ملے اور ان کی خیر و عافیت پوچھی گفتگو کے دوران ہی انھوں نے اس جگہ کو اپنا مسکن پسند کیا، جہاں اب وہ مدفون ہیں۔ اس کو مولوی صاحب کا احاطہ کہتے ہیں، جب ان سے ان کا حال پوچھتے تھے تو بجائے کچھ بتلانے کے روتے تھے، ایک بار چند آدمی انھیں دہلی لے گئے، جب لال قلعہ اور جامع مسجد پر نظر پڑی تو اس قدر روئے کہ بے حال ہو گئے، سنبھال سنبھال کر بڑی مشکل سے دھوج واپس لائے جب طبیعت سنبھل گئی تو لوگوں نے اس کا سبب پوچھا تو سسکیاں لیتے ہوئے صرف اس قدر کہہ پائے کہ "کبھی یہ سب کچھ اپنا تھا،" اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں (۱) یا تو وہ شاہی خاندان کے فرد تھے (۲) یا یہ کہ

کبھی یہ سب کچھ مسلمانوں کا تھا جس کے چھن جانے کے قلق و اضطراب کا یہ بیتابانہ اظہار تھا۔ یہ صاحب جید عالم، متقی اور بڑے باوضع تھے، کم گو اور خلوت پسند تھے مگر عوام کے خلا ملا سے دل تنگ نہ تھے چنانچہ لوگوں کا بہت بڑا مجمع ان کے پاس ہر وقت جمع رہتا تھا، پنج وقتہ نماز اپنے ٹھکانے پر ہی با جماعت ادا کرتے البتہ جمعہ کی نماز پڑھنے بستی میں آتے تھے، بہت آدمی ان سے فیض یاب ہوئے۔

موضع عالم پور میں۔ جو قصبۂ دھوج کے قریب ہے۔ ایک بنگالی صوفی آئے، صوم و صلوٰۃ کے بڑے پابند نیک اور بزرگ تھے مگر اپنا حال کسی کو نہیں بتاتے تھے۔ ان کے ہاتھ کی لگائی ہوئی بیری کا درخت اب تک ان کے نام سے مشہور ہے اس درخت کے نیچے ان کی آخری آرامگاہ ہے فرحمہ اللہ تعالیٰ۔

تقسیم ملک کے بعد موضع کھوری جمال پور میں ایک مولوی صاحب آئے جو عربی، فارسی اور اردو کے علاوہ انگریزی کے بھی بڑے ماہر تھے، روزانہ انگریزی اخبار پڑھتے تھے، نئے نئے ڈیزائن کے قیمتی سے قیمتی کپڑے رکھتے تھے، ٹوپی، قمیص، کرتا، شلوار، پاجامہ، جاکیٹ، جوتے وغیرہ ہر ایک درجنوں کی تعداد میں ان کے پاس ہر وقت رہتیں، کپڑوں کو روزانہ دھوپ دکھایا کرتے۔ ہفتہ میں ایک دن پورا کپڑا صاف کرنے میں لگا دیتے، بستی کے تمام کنوؤں کو غیر طاہر بتلاتے، دھوج کے نئے بند پر کپڑا دھوتے وضو اس قدر احتیاط سے کرتے کہ گھنٹوں اس میں صرف کر ڈالتے، کم کسی سے بات کرتے پہلے سے دعوت دیئے بغیر کسی کا کھانا نہیں کھاتے، جلالی مزاج تھا، امامت کے فرائض خود انجام دیتے لہجہ و قرأت اچھی تھی۔ میری ایک چھوٹی بچی کا انتقال ہوا، کفن میں سے دو گز کپڑا بچ گیا میں نے اس کو رکھ لیا۔ دوسرے دن میں یہ کپڑا کسی غریب کو دینے کی خاطر گھر سے باہر نکلا۔ بازار میں مولوی صاحب موصوف مل گئے، سلام مسنون کے بعد میں نے وہ کپڑا بطور ہدیہ آپکی خدمت میں پیش

گیا۔ کہنے لگے: "کفن کا بچا ہوا کپڑا غریب کا حق ہے، میں کیوں لوں؟" میں یہ سُنکر حیرت میں پڑ گیا۔

ایک دن مولوی صاحب کہیں باہر جانے کے ارادے سے بلّب گڑھ ریلوے اسٹیشن پر گئے، مسافر خانے میں ایک بینچ پر بیٹھ گئے۔ ریلوے ملازمین نے خیال کیا کہ یہ مسافر کئی گھنٹوں سے کیوں بیٹھا ہے، قریب جاکر دیکھا تو یہاں مولانا کا صرف جسم تھا، رُوح پتہ نہیں کب عالم بالا کو پرواز کر چکی تھی، تلاشی لینے پر ان کی جیب سے دھوج ہسپتال کی پرچی نکلی، دھوج خبر کی گئی، یہاں کے لوگ مولوی صاحب کو پہچان کر لے آئے اور کھوری جمال پور میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ فرحمہ اللہ تعالیٰ

مولوی صاحبؒ کا معمول تھا کہ آدھی رات کو پہاڑ پر جاتے تھے، اور فجر سے قبل واپس آتے تھے، ایک دن ایک آدمی ان کا حال معلوم کرنے ان کے پیچھے ہو لیا، آہٹ سنکر اس آدمی کو اس طرح گھور کر دیکھا کہ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور بمشکل واپس آیا۔

قصبہ دھوج کے غرب میں پہاڑ پر شاہ شتابؒ کے نام کا ایک مزار ہے اس کی چھوٹی چھوٹی چار دیواری ہے۔ غربی دیوار کچھ بڑی ہے جس میں چراغ رکھنے کی جگہیں بنی ہوئی ہیں۔ کبھی کبھی عام دنوں میں اور خاص طور پر جمعرات کے دن یہاں چراغاں ہوتا ہے، تعجب یہ ہے کہ کسی طرف کی ہوا چلے، خواہ آندھی آئے چراغ نہیں بجھتے، جب تک ان میں تیل رہتا ہے جلتے ہی رہتے ہیں۔ سُنا یہ ہے کہ یہ مقام شاہ شتاب رحمہ اللہ کے دورے کی جگہ ہے ورنہ ان کی اصلی قبر کجلی بن میں ہے جو جنگل میں ایک مقام کا نام ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس جگہ آپ عبادت الٰہی کرتے ہوں واللہ اعلم۔

قصبہ بلّب گڈھ اس قصبہ کی آبادی اگرچہ کافی قدیم ہے مگر پہلے یہ ایک گاؤں

تھا اور چھوٹی سی ریاست کی راجدھانی، اس کے راجہ بڑے ملنسار اور روادار تھے چنانچہ راجہ ناہر سنگھ نے اپنے قلعہ کے اندر سنگ مرمر کی مسجد بنوائی اور اپنے پارک کے نزدیک عیدگاہ اور بس۔ اور اب تو وہ قصبہ کی حدود سے پار ہو کر شہریت کا چولا اوڑھ چکا ہے، میلوں میں پھیلا ہوا، سیکڑوں مختلف النوع فیکٹریوں کا مرکز ہے۔ دھلی سے آگرہ جانے والی شاہراہ عام پر تقریباً بائیس میل جنوب میں واقع ہے۔

یہاں کسی دور میں بڑی اہم اور باثر خانقاہیں اور تربیتی مراکز تھے، یہ چوائی سے ملا ہوا علاقہ ہے۔ ۱۹۴۷ء میں یہاں کی کل آبادی نقل مکانی کر کے پاکستان چلی گئی مگر مسجد و عیدگاہ کو کسی قسم کا کوئی نقصان نہیں پہنچا، مقامی ہندوؤں نے انکی حفاظت و پاسبانی کی جو انکی شرافت کی لازوال دلیل ہے۔ پنجاب سے آئے ہوئے رفیوجی ان کے محلات و مکانات میں مقیم ہو گئے، اور ان مقامات کی شکل و صورت بدل کر ویسی بنالی جیسی انھوں نے چاہی۔ اب یہاں کی خانقاہوں کا پتہ لگانا کار دارد ہے البتہ ان بزرگوں کے مدفن پختہ قبروں کی شکل میں جہاں تہاں موجود ہیں اور آج تک ان سے ایسی ایسی کرامتوں کا ظہور ہو رہا ہے کہ نئے دور کے سیاح حیران و سرگرداں ہیں۔

حاجی اعظم شاہؒ منجملہ ان کے ایک حاجی اعظم شاہ ہیں۔ تھانہ بلب گڑھ کے قریب مشرق میں بازار کو جانے والی سڑک کے دائیں جانب آپکی قبر ہے، اس جگہ گورنمنٹ نے ایک بہت بڑی بلڈنگ کی تعمیر شروع کی۔ یہ قبر دیوار میں آگئی جب بنیادیں کھودتے کھودتے اس جگہ پہنچے تو زمین ہل گئی، مزدور اور حاضرین حیران و پریشان اور خوف زدہ ہو گئے اس حصے کو چھوڑ دیا گیا اور باقی حصے پر تعمیری

کام شروع کر دیا، ایک لیڈر کنور گوردت سنگھ کے کہنے پر قبر مذکور کو دیوار کے بیچ میں لے کر دیوار تعمیر کر دی گئی۔ جب یہ بلڈنگ تقریباً نصف بلندی تک تعمیر ہو گئی تو ایک غیبی آواز نے خبردار کیا کہ "جان کی خیر چاہتے ہو تو جلدی بھاگ جاؤ"، راج مزدور اور اوورسیر ابھی بھاگے ہی تھے کہ ساری بلڈنگ دھڑام سے گر گئی، ماہرین تعمیرات اور افسران نے مشورہ کر کے کنور گوردت سنگھ کے دباؤ ڈالنے پر پھر کام شروع کیا گیا۔ اب کی دفعہ تعمیر پر لینٹر بھی پڑ چکا تھا کہ غیبی آواز نے گرجدار لہجے میں پھر تنبیہ کیا، سارے لوگ بھاگ گئے اور لینٹر اس طرح اکھاڑ کر پھینک دیا گیا گویا اس پر بم پڑا ہے۔

یہ بلڈنگ اب تک منہدم حالت میں پڑی ہے، کچھ بے سمجھ مسلمانوں نے افسران سے کہا کہ اس قبر کو دوسری جگہ بدل دو۔ چنانچہ یہاں سے الگ قلعہ کے پاس دوسری قبر کھودی اور پرانی قبر توڑ کر میت کو نکالا گیا جو کفن سمیت اس حالت میں ملی گویا کہ وہ آج ہی دفن ہوئی ہے۔

اس قبر کی تبدیلی کا حال مجھے معلوم نہ تھا، ایک دن اتفاقاً میں ادھر جا نکلا، دیکھا کہ ایک سفید اور بالکل نئی قبر بنی ہوئی ہے اور ایک بزرگ وہاں نماز پڑھ رہے ہیں، میں انتظار میں بیٹھ گیا، جب وہ نماز سے فارغ ہوئے تو میں نے سلام کیا اور جستجو کے انداز میں اس قبر کے متعلق اس سے پوچھا۔ وہ ایک بنگالی بزرگ ہیں، جو اردو ذرا تکلف سے بولتے ہیں۔ اس کی گفتگو کا خلاصہ یہ ہے:۔ کہ وہ اپنے علاقے سے بغرض حاضری و زیارت خواجہ معین الدین چشتیؒ اجمیر گئے، جب رات میں سوئے تو خواب دکھائی دیا، گویا کوئی حکم دے رہا ہے کہ یہاں سے فوراً قصبہ بلب گڈھ چلے جاؤ، وہاں ایک ولی اللہ بڑی بے آرامی میں ہیں۔ چنانچہ پوچھتے پوچھتے میں جمعہ کے روز بلب گڈھ آیا، اور جامع مسجد میں جمعہ ادا کر کے تھوڑی دیر لیٹ گیا تو خواب میں پھر وہی حکم ہوا کہ تم آرام کرنے لگے، چنانچہ میں اٹھا مسلمانوں

سے پوچھ تاچھ کی مگر نہ تو کوئی میری بات سمجھا اور نہ میں نے کسی کی بات سمجھی، باہر نکلا، چوراہے پر ایک طرف فٹ پاتھ پر کمبل بچھا کر بیٹھ گیا، راہ گیر مجھے تکتے تھے اور نکل جاتے تھے۔ ایک ہندو نے پوچھا: میاں یہاں کیوں بیٹھے ہو؟؟۔ میں نے کہا، بھائی جاؤ اپنا کام کرو۔ مگر جب انھوں نے بہت اصرار کیا تو میں نے اپنا سارا حال کہہ سنایا اس ہندو نے اس جگہ کی نشاندہی کی اور پورا ماجرا کہہ سنایا۔ اس قبر کے چاروں طرف گندگی پڑی ہوئی تھی، یہاں کے ہندو شہریوں نے میری مدد کی۔ اس شہر میں مسلمان شہری نہیں، باہر کے لوگ سودا سلف اور نماز جمعہ کی خاطر یہاں آتے رہتے ہیں: اور پھاوڑا، پرات، جھاڑو، لوٹا، بالٹی غرض جملہ ضروری سامان فراہم کیا اور ایک چارپائی، ایک چھولداری (چھوٹا خیمہ) اور بستر وغیرہ بھی مہیا کئے اور کھانے پینے کا انتظام کیا، میں نے اس جگہ کی صفائی شروع کر دی۔

میں نے دیکھا کہ اس بنگالی بزرگ نے صفائی کر کے، اینٹیں اور پتھر لگا لگا کر قبلہ رخ بہت بڑی جگہ گھیر لی ہے نہ تو اسے گورنمنٹ کارپوریشن منع کرتی ہے اور نہ ہی کوئی اور رکاوٹ ڈالتا ہے یہ بزرگ ابھی تک یہیں مقیم ہیں، افسوس کوئی مسلمان ادھر توجہ نہیں دیتا۔

سید نصیر الدینؒ | سید نصیر الدین عرف بھورے شاہؒ، آپ کی آخری آرامگاہ راجہ بلو کے محل کے شمال میں جو اس وقت تحصیل کی بلڈنگ ہے، قلعہ کے باہر ہے چاروں طرف پانی بھرا رہتا ہے۔

قصبہ کی موجودہ آبادی سے باہر مغربی جانب موضع رنہیڑہ کھیڑہ کے شمال میں ایک میدان ہے اس میں ایک مزار ہے، یہ بھی بڑے پایہ کے بزرگ ہیں۔ یہاں ایک بہت بڑی فیکٹری حیدر آباد کے نام سے بنی ہے، اس فیکٹری میں سیمنٹ کی چادریں، بجلی کے کھمبے، پانی کے پائپ وغیرہ بنائے جاتے ہیں

اس قبر کو دیوار کے اندر لے لیا۔ رات کو ایک مرہٹہ چوکیدار پہرہ پر تھا، اس کو ایک سفید ریش بزرگ نے حکم دیا کہ صبح اپنے مالک سے کہہ دینا کہ یا تو ہماری قبر کو دیوار سے باہر کر دے ورنہ انجام برا ہوگا۔ چوکیدار نے مالک سے سارا ماجرا کہہ سنایا۔ مالک نے سُنی اَن سُنی کر دی، اور چوکیدار کا مذاق اڑایا، دوسری رات کو ساری بلڈنگ ہل گئی، اور وہ دیوار دھڑام سے گرگئی سیکڑوں کام کرنے والے مزدور مر گئے، مگر ظاہر کئے صرف پندرہ بیس آدمی۔ دوسرے دن مالک نے کئی من لڈّو تقسیم کئے اور قبر ٹھیک طرح بنا دی۔

ایک اور صاحبدل بزرگ گلاب فیکٹری کے دروازہ پر ہے۔ یہ فیکٹری ریلوے لائن کے مشرق میں بلب گڑھ سے دھوج کو جانے والی سڑک کے شمال میں ہے جس میں لوہے کی ڈھلائی کا کام ہے فیکٹری کے مالک نے اس قبر کی بے حرمتی کی جس کی پاداش میں فیکٹری فیل ہوگئی، لاکھوں کی لاگت سے بنی ہوئی فیکٹری دس بارہ سال سے بند پڑی ہے، اب اس کو دوبارہ چالو کیا جا رہا ہے۔

بلب گڑھ کی عیدگاہ کے غرب میں ایک فیکٹری ہے اس کے احاطے میں بھی ایک بزرگ آرام فرما ہیں اس قبر کی وہ خوب دیکھ ریکھ کرتے ہیں بے ادبی اور بدتمیزی نہیں کرتے۔ اور مشہور ہے، باادب بانصیب، بے ادب بے نصیب۔ اللہ رب العزت ادب و تہذیب اور شائستگی کو پسند فرماتے ہیں۔

موضع سروہی | سوہنہ سے بلب گڑھ جانیوالی سڑک پر بالکل درمیان میں موضع سروہی کا بس اسٹاپ ہے اس سے شمال مغرب میں پہاڑ کے دامن میں تکیہ عنایت شاہؒ ہے جو بہت اہم اور سلسلۂ مداری کی بہت بڑی خانقاہ ہے۔ عنایت شاہؒ کے بعد ابراہیم شاہؒ ہوئے۔ ممکن ہے کہ عنایت شاہ شاہ کابل دھوج کے ہمراہی ہوں

مگر وضاحت سے کوئی بات صاف نہیں۔ یہ خانقاہ ہمیشہ آباد و معمور رہی، سلسلہ حسب روایت سجادہ نشین اس طرح ہے: ابراہیم شاہؒ کے بعد مستان شاہؒ پھر حیدر شاہؒ، پھر بھولے شاہؒ پھر گدڑ شاہ پھر لوٹن شاہؒ، پھر عشق علی شاہؒ پھر صدقی شاہؒ پھر کالو شاہؒ، پھر دیوان شاہؒ۔ مگر ان سب حضرات کا عہد متعین کرنا مشکل ہے، موجودہ سجادہ نشین حج کر آئے ہیں اور خانقاہ میں مدرسہ کا اجراء کر دیا گیا ہے اس خانقاہ کے معافی کی کافی زمین ہے۔ سجادہ نشین حاجی تگڑ شاہ بڑے ملنسار بامروت اور خلیق ہیں۔

سیکری | ضلع بھرت پور کا معمور و آباد قصبہ ہے، دولوت پال کا بہت بڑا گاؤں ہے، اس میں جہاں چودھری گدائی رحم سنہ ۱۲۰۲ھ خلیفہ و مجاز حضرت شاہ چوکھا قدس سرہٗ آرام فرمائیں، وہیں کچھ اور بزرگان دین کے مزارات بھی قصبہ کی آبادی سے جانب غرب واقع ہیں:

(۱) سید بہادر علی | متوفی سنہ ۱۱۰۰ھ تقریباً آپ کا مزار قصبہ سے پچھم میں ہے۔ مزار بہت قدیم بنا ہوا ہے، ایسا لگتا ہے کہ یا تو سید صاحب عہد اسلامی میں اس قصبہ کے حاکم تھے، اور ان کا یہ خاندانی مزار ہو۔ یا پھر کسی حاکم کے لئے تیار کیا گیا تھا مگر اسے اس میں آسودگی میسر آسکی اور پھر آپ کو اس میں دفن کیا گیا۔ بہر حال قدیم معلوم ہوتا ہے اور سنہ ۱۱۰۰ھ سے پہلے تعمیر ہو چکا ہے۔ اس مقبرہ کے جنوب میں ایک اور قبہ دار مزار ہے، اس کی ساخت اس سے بھی پرانی معلوم ہوتی ہے۔ اس کے تناسب سے ہی سید بہادر علیؒ کے مزار کو زیادہ بلند بنایا گیا ہے۔ آپ کے دو خلیفہ مشہور تھے:

(۱) امام شاہؒ —— فقیر برادری سے تعلق رکھتے تھے —— اگر اس نام کی کوئی برادری بھارت میں ہے۔ انھیں کشف بہت ہوتا تھا اور یہ ایسی

باتوں کی قبل از وقت نشاندہی کر دیتے تھے جو بہت بعد میں وقوع پذیر ہوتی تھی ان کے مرشد کو جب یہ معلوم ہوا تو ان پر پابندی عائد کر دی

(۲) پیروا شاہؒ ـــ میراثی قوم سے تھے، جو میو قوم کی خادم اقوام میں سے ایک ہے۔ یہ بڑے ملنگ قسم کے بزرگ تھے ایک مرتبہ گاؤں میں کوئی بہت بڑی تقریب تھی۔ ان کا کام تھا ہر جگہ اطلاع پہنچانا۔ اس لئے یہ فرض منصبی اسے سونپا گیا کہ تمام رشتہ دار اور مدعو حضرات کو وقت، تاریخ اور دن سے مطلع کرے۔ مگر یہ اپنے گھر ہی رہے۔ جب ان سے کہا جاتا: "بھائی وقت بہت کم ہے جلد جلد کام کرو گے تو پورا ہوگا اتنی سستی سے تو سارا کاروبار ٹھپ پڑ جائے گا"۔ یہ جواب میں صرف اس قدر کہتے: "فکر نہ کرو مالک سب کام ٹھیک کر دیں گے"۔ وقت مقررہ پر جب تمام رشتہ داریاں آگئیں تو ان سے پوچھا گیا: آپ کو خبر کس نے کی؟ ان سب نے بیک زبان ہو کر کہا: پروا شاہ نے۔ لوگ بڑے حیران ہوئے، اور سب نے مل کر آپ سے معافی مانگی اور آئندہ کے لئے آپ کو اس خدمت سے سبکدوش کر دیا گیا۔ یہ دونوں بزرگ قصبہ ہذا کے مغربی جانب آرام فرما ہیں۔ کچھ اور بزرگوں کی بھی نشاندھی کی گئی جن کے مزارات صحیح طور معلوم نہیں:۔

(۱)۔ بھولا شاہ رحمۃ اللہ متوفی سنہ ۱۳۰۰ھ۔ (۲)۔ قاسم علی شاہ رحمۃ اللہ متوفی سنہ ۱۳۴۰ھ۔ (۳)۔ پیر ابراہیم شاہ رحمۃ اللہ متوفی سنہ ۱۳۰۰ھ۔ (۴)۔ ہدایت شاہ رحمۃ اللہ متوفی سنہ ۱۲۵۰ھ۔ (۵)۔ بھورا پیر رحمۃ اللہ متوفی سنہ ۱۳۰۰ھ۔ (۶)۔ عشق علی شاہ رحمۃ اللہ سنہ ۱۱۰۰ھ۔ (۷)۔ سبز علی شاہ رحمۃ اللہ متوفی سنہ ۱۱۰۰ھ۔ (۸)۔ گن سید رحمۃ اللہ متوفی سنہ ۱۲۵۰ھ [1]

---

[1] روایت حاجی اسماعیل و میانجی جورمل سیکری

اس قصبہ سے جنوب مشرق میں ایک مقام ہے "گل پاڑا" دولوت پال کا یہ بہت بڑا گاؤں ہے یہاں ایک بزرگ گذرے ہیں، حاجی الف خاں جو سلسلۂ راج شاہی کے اہم فرد، صاحب نسبت و اجازت اور جنوبی میوات میں راجشاہی مشن کے علمبردار تھے۔ فیروز پور جھرکہ اور موضع کامینڈہ کے درمیان۔ مولانا محمد حسن صاحب فیروزی متوفی سنہ ۱۹۴۴م کے مزار کے قریب آپ کا مزار ہے۔ قصبہ سنگار کے میاں صاحب۔ میاں جی عبداللہ۔ آپ ہی کے خلیفہ و مجاز تھے۔ رحمہم اللہ تعالیٰ۔

قصبہ پہاڑی

بھرتپور ریاست کا مشہور و معروف قصبہ اور سب تحصیل ہے، اسلامی آثار میں یہاں ایک قدیم دور کی شاہی مسجد ہے، کتبہ وغیرہ تو اس پر نہیں دکھائی دیتا البتہ اس کی ساخت، پتھروں کی تراش خراش اور کم سے کم چونے کا استعمال وغیرہ سے فیروز شاہ تغلق کے عہد کی معلوم ہوتی ہے۔ اس سے بظاہر بہت بعد کی ایک اور مسجد ہے اس میں کتبہ ہے:

در عہد داد گستر صاحبقران ثانی — تعمیر ساخت مسجد عبدلستا بانی
تاریخ بست و ہفتم ماہ جماد الاول — اتمام شد عمارت سال از غنی ستانی ۱۰۹۱ھ

یہاں پر شہاب خاں شہید کی خانقاہ بھی ہے اور مدرسہ بھی ـــ مدرسہ اب بھی ہے، وہ یہاں کے حاکم بھی تھے اور درویش بھی۔ بلند شہر میں سنہ ...ھ کے قریب شہادت پائی۔

برمزار شہاب خاں شہید — می رسد صبح و شام خلق خدا
بست سال شہادت او شعیب — گشت از غیب ذوالجلال ندا

قصبہ ڈیگ

میوات کا مشہور قصبہ ہے، بھرتپور کے شمال میں اکیس میل دور واقع ہے۔ یہ بھرتپور ریاست کا پرانا دار الخلافہ تھا یہاں مہاراجہ کا قلعہ بھی ہے اور

اس کی تفریح گاہیں بھی۔ جو مغل خاندان کے آخری دور میں فنِ عمارت کے عمدہ قسم کے نمونے ہیں، یہاں ایک مچھلی کنڈ ہے جس کی ساخت مچھلی جیسی ہے۔ مہاراجہ جسونت سنگھ کے زمانے میں یہاں ایک بزرگ تھے: معبداللہ شاہ عرف امان اللہ مہاراجہ کے کوئی لڑکا نہ تھا۔ ان بزرگ سے عرض کیا گیا انھوں نے دعا کی اللہ تعالے نے مہاراج کے گھر میں لڑکا پیدا کر دیا۔ مہاراج نے خوش ہو کر کہا: فرمائیے حضور کیا خدمت کی جائے؟ بزرگ نے فرمایا: مسجد مصری کی بنوا دو۔ راجہ کے لئے کیا بھاری تھا۔ مصری کے ڈھیر ہو گئے، کچھ لوگوں نے عرض کیا: مصری پگھل جائیگی اور عمارت ڈھے جائے گی۔ درویش نے فرمایا: نہیں مسجد مصری ہی کی بنے گی، پھر کچھ خدام نے عرض کیا حضور اسے لوگ توڑ توڑ کر کھا جائیں گے۔ درویش کی سمجھ میں یہ بات بیٹھ گئی اور مصری کے ڈھیر کو مسجد کی بنیادوں میں ڈال دیا گیا اسی باعث وہ مسجد مصری کہلاتی ہے۔ مسجد کی تعمیر ۱۲۰۰ھ میں ہوئی۔

ایک اور بزرگ ہیں کریم شاہ ڈیوڑھی والے تالاب کے پاس جو لالہ کے کنڈ سے مشہور ہے[1]۔

بھرتپور ریاست بھرتپور کا صدر مقام، آگرہ سے مغرب میں چھتیس میل کے فاصلے پر اور متھرا سے بیس میل دور واقع ہے اٹھارویں صدی تک جنوبی میوات کے اس علاقے پر میو راجہ اور سردار تھے، اس کے بعد جاٹوں نے مرکزی سلطنت کے ڈھیلے پڑنے پر قبضہ کر لیا اور بھرتپور کو اپنی راجدھانی بنایا جو پہلے ایک بڑا گاؤں تھا۔ مگر ریاست کی راجدھانی بننے کے بعد اس میں شہریت آگئی، متھرا اور بمبئی

---

[1] روایت حاجی اسماعیل و میانجی نور مل سیکری۔

ریلوے لائن پر اچھا خاصا رونق دار شہر بن گیا۔ یہاں ایک جھیل ہے جس میں مختلف آبی جانور تربیت پلتے ہیں۔ بڑی عمدہ، سنگ سرخ سے بنی ہوئی جامع مسجد ہے اور غازی الدین حیدر شاہ سکنہ سہنہ (گوڑگانوہ) خلیفۂ اوّل میاں راج شاہ متوفی ۱۲۰۶ھ غازی صاحب کا وصال بھی بھرتپور ہی میں ہوا اور یہیں فصیل شہر سے باہر مگر اس کے متصل دفن ہیں۔ مہاراجہ بھرتپور نے آپ کا مقبرہ بنوایا ـــ حیدر شاہ کی خانقاہ صرف بھرتپور تک محدود نہ تھی بلکہ اس کے آس پاس کی کئی ایک ریاستوں کا ایک حلقہ سا بنا کر بھرتپور کو اس کا مرکز قرار دیا، اس طرح آپ نے راج شاہی فیوض و برکات کا جنوبی میوات اور میو قوم سے متعلق دیگر قوموں میں سلسلہ جاری رکھا۔ رحمہ اللہ وجزاہ اللہ خیر الجزاء۔

قصبہ نگر یہ قصبہ ریاست بھرتپور کا اہم اور آباد قصبہ ہے۔ یہاں الور، بھرتپور اور سیکری و ندبئی جانے والے راستوں کا بڑا خوبصورت چوراہا ہے اس چوراہے پر مدرسہ رسولیہ واقع ہے جس کے بانی مولانا محمد رسول شاہ ہیں، پڑھے لکھے ہیں، سمجھدار ہیں۔ حضرت مولانا عبدالسبحان قدس سرہ کے چہیتے شاگرد ہیں، طب بھی باقاعدہ پڑھی اور کچھ دواؤں سے شناسائی بھی ہے مگر پیشہ ور طبیب نہیں، نیک اور صالح ہیں۔ ان کا مدرسہ خانقاہ کے فرائض بھی انجام دیتا ہے۔ مؤلف کو آپ سے شرف تلمذ حاصل ہے، برج کا پہلا استھان ہے۔ برج کے یاتری یہاں تیار ہو کر جاتے ہیں۔ تقریباً تین سو سال پیشتر یہاں ایک بزرگ ہوئے تھے بہادر علی شاہ متوفی ۱۱۰۱ھ شہر میں انکا مزار ہے مگر کتبہ وغیرہ کچھ نہیں[1]۔ اس قصبہ میں رسول شاہی خانقاہ کو الور و فیروز پور جھرکہ کے رسول شاہیوں سے نہ ملایا جائے۔ کیونکہ یہ پابند شرع بزرگ ہیں۔ اور وہ لوگ فرقہ ملامتیہ جیسے طور طریق رکھتے تھے: وہ چار ابرو صفایا تھے اور یہ چار ابرو لبقایا۔

---

[1] روایت حاجی اسمٰعیل و میانجی نور مل قصبہ سیکری

موضع بشمبرہ ضلع متھرا پاہٹ قبیلہ کا یہ مشہور گاؤں کوسی کلاں سے جانب شرق تقریباً دس میل کی دوری پر واقع ہے، خوبصورت اور خوش منظر ہے دل کشی و رعنائی اس کے ذرّہ ذرّہ سے عیاں اور پریم وآشتی اس کے چپّہ چپّہ میں نہاں ہے۔ یہ برج کا علاقہ ہے جہاں کرشن جی نے پیار کی بنسری بجائی تھی اور محبت کے گیت گائے تھے۔ یہ رادھا کا دیس ہے، اور اس کی صاف اور ستھری اداؤں کا امین۔ اس کی سندر رنگینیوں کا یہاں کی فضاؤں میں اثر باقی ہے ؂

بلاگئی رادھا پیاری کانہا برسانے میں آجیو
پتلی پتلی پوئیں پھلکیا غرض پڑے تری کھا جیو
چن چن کلیاں سیج بچھایو غرض پڑے تری سو جیو
تاتو پانی دھر دو تیرہ غرض پڑے تری نہا جیو [1]

آبادی کے شمالی جانب ولایت علی شاہ طبقاتی کی خانقاہ، عیدگاہ اور آپ کی آخری آرامگاہ واقع ہے مزار سے ملحقہ تقریباً بارہ سو بیگھہ اراضی معافی میں موجود ہے۔ کچھ اسی گاؤں میں ہے اور کچھ دوسرے مواضع میں پھیلی ہوئی ہے یہاں کی سجادہ نشینی کے لئے ضروری ہے تجرد کی زندگی اور یہ روایت ابھی تک باقی تھی مگر موجودہ سجادہ نشین میاں رمزو شاہ نے شادی کر لی ہے اور ان کے اپنے قول کے مطابق وہ عیالدار ہے، رمزو شاہ ملنسار، مہمان نواز اور مخلص ہے۔ یہ خانقاہ مداری سلسلہ کی میوات میں شاید آخری خانقاہ ہے، اس کے بعد کسی مداری

---

[1] رادھا: حیات کرشن جی کا ایک اہم کردار۔ کانہا: کرشن جی۔ برسانا: برج کا ایک مشہور گاؤں اور رادھا کا وطن۔ پوئیں: پکائیں۔ تاتو: گرم۔ تیرہ: پانی گرم کرنے کا برتن۔

خانقاہ کا میوات میں کہیں سراغ نہیں ملتا

متھرا موجودہ میوات کی سب سے پہلی خانقاہ بھی برج میں تھی اور آخری خانقاہ بھی۔ شیخ علی راوتی قدس سرہٗ م سنہ ۴۰۰ھ متھرا میں ایک ہیناءی حکم کے تحت تشریف فرما ہوئے تھے اور سنہ ۴۰۰ھ سے بیشتر انھوں نے یہاں اپنے تربیتی اعمال شروع فرما دیئے تھے۔ متھرا ایک تاریخی شہر ہے اور کرشن جی کے کارن مقدس بارکت بھی۔ اسے بلد المنادر بھی کہتے ہیں یعنی مندروں کا شہر۔ کہتے ہیں جتنے مندر متھرا میں ہیں اتنے دنیا کے کسی ایک شہر میں نہیں ہیں۔ اسی طرح بھوپال کی بھی مسجدوں کے شہر کے نام سے شہرت ہے۔

کامان میوات کا معروف قصبہ ہے۔ برج کا مغربی کنارا ہے اور مہاراجہ بھرت پور کے خاص برہمن کا مرزو بوم۔ برج دیس کی روایات کا سلسلہ یہیں سے شروع ہو جاتا ہے یہاں میوات کی سب سے قدیم مسجد ہے جسے طغرل خان نے بعہد شہاب الدین غوری و قطب الدین ایبک سنہ ۶۰۲ھ میں تعمیر کیا اور وہ یہاں "چوراسی کھمبہ" کے نام سے مشہور ہے، کچھ لوگ اسے مندر بتاتے ہیں مگر تاریخی حقائق وسماجی روایات اس کی نفی کرتی ہیں۔ ممکن ہے پہلے یہاں مندر رہا ہو اور اسی کے ملبہ سے یہ مسجد تعمیر ہوئی ہو، مگر یہ واقعہ ہے کہ اب یہ مسجد ہے اور محکمۂ آثار قدیمہ کی زیر نگرانی [1]

الور الور کا تفصیلی ذکر مدارس کے سلسلہ میں ہو چکا ہے۔ یہ شہر جہاں مدارس کے لئے مشہور ہے خانقاہوں کے لئے بھی اس کی شہرت کم نہیں۔ یہاں سب سے پہلی خانقاہ جہاں تک مجھے معلوم ہو سکا ہے شیخ مبارک محدث الوری کی

---

[1] تاریخی معلومات ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی سے لیں

ہے جو خانقاہ کے ساتھ ساتھ مدرسہ و مکتب بھی تھی اور ان کے بھائی شیخ مخدوم کمال الوری کی خانقاہ بھی قابل ذکر ہے۔ یہ چشتی خانقاہیں تھیں، یہاں سہروردیہ مشائخ کی بھی تکیہ تمیلی شاہ میں تربیت گاہ تھی، زاں بعد یہاں قادری سلسلہ کی خانقاہ بنی جو پہلے الور شہر میں تھی بعد میں وہ الور کے قریب موضع موگس کا میں قائم ہوئی، اس کے بعد نقشبندیہ خانوادہ کی خانقاہ تھی موضع دادد پور میں جو ریلوے اسٹیشن کے قریب ہے، مگر یہ سارے سلسلے ۱۹۴۷ء تک الور میں رہے، پھر پاکستان منتقل ہو گئے۔

الور شہر میں ہندوستان کے چاروں معروف خانوادوں کی تربیت گاہیں تھیں۔ اپنے اپنے ڈھنگ پر سلوک و تربیت کے طریقے استعمال کرتی تھیں، اور اپنے اسلاف کے جادۂ مستقیم پر گامزن ہو کر اکابر کی سونپی ہوئی خدمات انجام دیتی تھیں۔ امکانی حد تک لایعنی باتوں سے حذر بھی ضروری تھا، مگر واقعہ یہ ہے کہ افراط و تفریط کے درمیان۔ طریق معتدل۔ کو پاکر بھی افراط و تفریط کے خشک و تر دلدل میں پھنسنے سے کوئی معقول بچاؤ نہ ہو سکا، ہندوستانی سماج کی بعض اہم قدروں کو اختیار کر کے سلیم الفطرت اکابرؒ کے وقار و مرتبہ کو بدعقیدگی و بے راہ روی کی باد سموم سے محفوظ نہ رکھ سکے۔ مگر اس جزوی کوتاہی سے ان کے کلیدی کردار۔ اشاعت و تحفظ اسلام اور جہات ضروریہ میں خدمت عوام پر نکیر کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی، اسلامی اخلاق و تہذیب کی اہم قدروں کی پاسداری۔ اس حد تک کہ ان میں کسی بھی قسم کی کمی نہ آنے دی۔ گو کچھ زیادتی ضرور ہوئی ــــ کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

قصبہ بہادر پور سادات۔ الور الور شہر سے کشن گڑھ جانے والی سڑک پر ایک سنگم ہے۔ چکانی کا تراہہ۔ یہاں سے مشرق میں چار۔ پانچ کلومیٹر دور قصبہ بہادر پور واقع ہے۔ یہاں شاہی دور کی ایک مسجد ہے۔ اس پر کوئی کتبہ

نہیں مگر یقیناً حملۂ تیمور سے پہلے کی تعمیر ہے۔ کوٹلہ ناہر تحصیل نوح ضلع گوڑگانوہ کی مسجد کا سنِ بنا ۷۹۵ھ اور اس کا زینہ ۸۰۵ھ میں تعمیر ہوا ہے، یہ مسجد بالکل اسی کے مشابہ ہے اور انھیں جیسی ایک اور مسجد قصبہ پہاڑی میں ہے، صوری مشابہت تعینِ سن بنا کے سلسلہ میں ممد و مددگار بنجاتی ہے۔ یہاں شیخ نعمت اللہ بہادر پوری کی خانقاہ ہے، قصبہ سے شمال مغرب میں ایک کیلومیٹر کے فاصلے پر ایک آبادی کا نام ہے پہاڑی ــــ یہاں ایک چھوٹی سی پہاڑی ہے۔ اس پر سید جمال بہادر پوریؒ کی خانقاہ تھی، وہاں مسجد بھی ہے اور آپ کا مزار بھی۔ مسجد اکہری ہے۔ برآمدہ نہیں ہے مسجد کے صحن میں سید جمالؒ کی آخری آرامگاہ ہے، یہاں مدرسہ بھی تھا اور خانقاہ بھی۔ سید جمال نے دونوں گوشوں میں کام کیا ہے۔ بعض تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ خواجہ سید گیسو دراز قدس سرہ جب دہلی سے دکن تشریف لے گئے تو راہ میں سید جمال بہادر پوری کے یہاں قیام فرمایا۔[1] مگر اس میں الجھن یہ ہے کہ خواجہ گیسو درازؒ کا سنِ وصال ۸۲۵ھ ہے اور سید جمالؒ کا سن پیدائش ۸۲۳ھ۔ اور آپ کی پیدائش بدایوں۔ یوپی۔ میں ہوئی ہے۔ بہر حال دونوں باتیں تو صحیح نہیں ہو سکتیں۔ یقیناً ایک خلافِ واقعہ ہوگی ــــ البتہ یہ طے ہے کہ سید گیسو درازؒ کا دکن جانے کے لئے راستہ سرزمین میوات ہی میں سے گذرتا ہے، آپ نے چراغ دہلی سے رختِ سفر باندھا مہرولی ہوتے ہوئے دکن کو میوات کی سرزمین سے ہوئے بغیر سفر نہیں کیا جا سکتا۔ بہر حال بہادر پور میں چشتی اور سہروردی خانقاہیں تھیں۔ اسی سرزمین سے سید رسول شاہ بہادر پوری ابھرے جو رسول شاہی جماعت کے موسس و سربراہ بنے۔ ان کے مرشد شیخ نعمت اللہ بہادر پوری تھے، جن کا مزار قصبہ ہذا کے جانب شرق آبادی سے متصل مگر علیحدہ، کس مپرسی کے عالم میں ہے۔

گھانسولی الور سے کشن گڑھ جانیوالی سڑک کے جانب غرب دامن کوہ

[1] روایت مولانا نیاز محمد صاحب، قصبہ نوح۔

میں واقع ہے۔ ترا ہا چکانی سے تھوڑا آگے۔ میاں چاند شاہؒ کی خانقاہ ہے جسے لوگ "اللہ کی درگاہ" کہتے ہیں اور یہاں کے عرس کو بھی "اللہ کا میلہ" کہا جاتا ہے۔ یہ مداری سلسلہ کی تربیت گاہ ہے۔ اس مسجد و خانقاہ کے شمال مغرب میں ایک اور بزرگ ہیں" لالہ پیتھو مل Pethoumal جنھیں شاہ مدارؒ نے اسلامی چادر اوڑھائی تھی، وہ ذاکر و شاکر بزرگ تھے اور شاہ مدارؒ نے رفع نزاع کی خاطر ان کی جائے قیام پہاڑ کے بالکل دامن میں بنوائی اور میاں چاند شاہ آبادی دیہہ مذکور کے متصل شمالی جانب آباد ان کیا۔ مگر جس دور اندیشی سے ابتدا میں کام لیا گیا اب اس کے بالکل علی الرغم لالہ پیتھو مل کے خاندان کا ایک فرد میاں چاند شاہ کی خانقاہ پر قابض و متصرف ہے — پتہ نہیں مداریوں کی حمیت و غیرت نے یہ چیلنج کس طرح قبول کر رکھا ہے۔

بہروز الور شہر سے جانب شمال جیند ولی کی گھاٹی سے اتر کر جب تمار پور کے چوراہے پر پہنچیں تو بائیں جانب مغرب میں دامن کوہ میں قادر شاہ کی خانقاہ ہے۔ یہاں باقاعدہ مزار پر کتبہ ہے اور خانقاہ کی چار دیواری بھی۔ اس وقت تو یہ آبادی میوات کے تقریباً کنارہ پر واقع ہے، مگر جس زمانے میں یہ خانقاہ آباد تھی تو اس کے چاروں طرف میو قوم سکونت پذیر تھی۔ کھیر تل منڈی سے الور کو جانے والی سڑک پر چوراہا تمار پور ہے، یہاں سے جب الور کو چلیں تو داہنی طرف بہروز واقع ہے۔

موضع چاندولی الور سے جیند ولی کی گھاٹی پر چڑھنے سے پہلے سڑک سے آدھے کیلومیٹر کی دوری پر واقع ہے یہ سینگل پال کا بہت مشہور گاؤں ہے۔ چاروں طرف پہاڑ ہیں۔ گو کچھ دوری پر ہیں — بڑی خوش منظر، سندر من موہن

آبادی ہے۔ یہیں آبادی سے جنوب مغرب ایک درہ کوہ (گھاٹی) میں خواجہ عبدالرحمنؒ عرف چوہڑ سدھ (Chohar Sedh) کی خانقاہ اور آخری آرام گاہ ہے، یہ مداری سلسلہ کے بزرگ تھے بڑی عجیب جگہ منتخب کی ہے۔ عبادت و ریاضت میں کسی قسم کا کوئی شخص خلل نہیں ڈال سکتا۔ اس لئے کہ یہاں پہنچنا کارے دارد ہے کئی پہاڑوں سے چار پانچ کیلومیٹر گذر کر یہ خانقاہ ملتی ہے، پانی کا بہت عمدہ اور شیریں جھرنا ہے، یہاں پھاگن کے مہینہ میں خواجہ عبدالرحمنؒ کا عرس ہوتا ہے گاؤں اس سمے ویران ہو جاتے ہیں اور یہ درہ کوہ (گھاٹی) آباد و نغمہ ریز بنجاتا ہے بڑی چہل پہل، رونق اور تازگی ہوتی ہے، یہاں کی سجادہ نشینی کسی ایک کی میراث نہیں ہے بلکہ پورا چاندولی گاؤں اس کا ذمہ دار ہے اسی لئے یہاں ناپسندیدہ اعمال کا ظہور نہیں ہوتا۔

دھولی دوب موضع چاندولی سے الور کو جاتے ہوئے پہلے وجے ساگر مہاراجہ الور کا رہائشی محل وغیرہ آتا ہے اس کے بعد لب سڑک دائیں جانب موضع دھولی دوب آتا ہے۔ یہاں میاں لال خاں کے والدین کے مزارات ہیں، اور یہیں اس کی جائے پیدائش۔ افسوس کہ اس کے والدین کی خانقاہ پر غیروں کا تسلط ہے۔ یہ ضلع الور کی دوسری مسلم خانقاہ ہے جو غیروں کے تصرف میں ہے۔

شیرپور تیسری خانقاہ خود لال خاں کی ہے جو موضع شیرپور باندھولی میں واقع ہے وہاں باقاعدہ قلعہ نما احاطہ ہے اور متفرق عبادت خانے، لال خاں میو کی قبر کچی ہے اس پر پختہ تعویذ ہے اور وہ مسجد کے صحن میں واقع ہے، پھر مسجد کو دو منزلہ کیا گیا ہے اور صحن مسجد کو بھی، پھر مزار کی شکل بنائی اور اس پر گنبد ہے، یہ باقاعدہ ایک مسلم اور میو درویش کی خانقاہ و مزار ہے مگر اسکا

متولی الور شہر کا ایک بنیا ہے، اگرچہ لال خاں بھگتی تحریک سے متاثر تھے اور اسی رنگ میں ان کے ملفوظات ہیں مگر میو ہونا اور مسلمان ہونا تو غیر مشکوک ہے۔ چونکہ تصرف غیروں کا ہے اس لیے اب انھوں نے اپنا قبضہ مضبوط اور استوار بنانے کی خاطر مزار کے اندر سے قبروں کے نشانات مٹا دیئے ہیں اور اس کی پیشانی پر لکھ دیا ہے۔ "لال داس جی کا مندر" یہ چیز سیکولرزم کے منافی ہے۔ اور میو قوم کی غیرت و حمیت کے لیے چیلنج سے کم نہیں

دھولی دھوب کے مزار و خانقاہ کے سلسلہ میں حاجی نہنا مرحوم نے عدالت سے رجوع کیا تھا اور عدالت نے اسے پروانۂ تولیت دیدیا تھا مگر اس کے بعد فوراً ۱۹۴۷ء کا ہنگامۂ قیامت آفریں پیش آگیا اور ہزار سالہ اسلامی ہندوستان پر تقسیم کا غیر معقول اور منحوس سایہ پڑ گیا جس نے تہذیب و تمدن کی مشترک قدروں کے ساتھ ساتھ رواداری و ہم آہنگی کا بھی گلا گھونٹ دیا۔

قصبہ فیروز پور جھرکہ

مدارس کے باب میں اس قصبہ کا تفصیلی تذکرہ گزر چکا ہے یہاں شاہ غلام نبی کی خانقاہ ابوالعلائی متلاشیانِ عرفان کا گہوارہ تھی۔

شاہ عبداللطیف حضرت شاہ غلام نبی کے ساتویں سجادہ نشین تھے سلسلہ اس طرح ہے شاہ عبداللطیف عن شاہ عبدالمجید عن شاہ عبدالعلی عن شاہ اسد اللہ عن شاہ عطاء اللہ عن شاہ نور اللہ (وفات ۱۱۴۶ھ) عن شاہ غلام نبی۔[1] آٹھویں سجادہ نشین شاہ محمد یسین تھے ۱۹۴۷ء میں یہاں سے ترک سکونت کراچی منتقل ہو گئے[2] یہاں قادری خانقاہ بھی تھی اور سہروردی مجاذیب کی آخری آرامگاہ بھی اولاً الور میں مدفون ہوئے مگر حاکم الور کے عتاب کے باعث انکی لاشیں وہاں سے اکھاڑ کر یہاں تحصیل سے جانب غرب ایک مسجد کے سامنے دفن کی گئیں۔ اور قادری سلسلہ شیخ جلال قادری کے ذریعہ فیض رساں ہوا مولانا محمد حسن (وفات ۱۹۰۰ء) کے ذریعہ چاروں سلاسل کا افادہ عام ہوا۔[3]

---

[1] حیات کرم حسین ص۳۶۷ ، [2] مرقع الور و تاریخ جدولیہ ، [3] حیات الابرار مخطوطہ۔

میوات کی عہد ساز شخصیتیں

حضرت بیرزطن رضی اللہ تعالیٰ عنہ

جاٹ اور میو پرانے دور سے ہی باہم شیر و شکر اور جگری بھائیوں کی طرح رہتے آئے ہیں، وسط ایشیا سے ساتھ ساتھ آئے، سندھ میں ایک جگہ رہے سندھ سے ایران، عرب۔ نجد و یمن و حجاز وغیرہ۔ جب گئے تو ساتھ ہی گئے اور جب راجپوتانہ میں آئے تب بھی ایک دوسرے کی ہمراہی میں۔ اس طرح ان کے باہمی تعلقات و روابط کی بنیادیں بڑی گہری اور بہت استوار ہیں۔ ان کی آبادی مخلوط نہیں بلکہ ساتھ ساتھ ہیں اس طرح کہ یہ میوات اور یہ جٹیانت Jatyant, Mewat میو بھی اکٹھے بسے اور جاٹ بھی، مگر علیحدہ علیحدہ، میو جب جاٹوں کے گاؤں میں رہنے لگے تو اسے محبت و پیار اور بطور مزاح "میوڑا" کے لقب سے پکارا گیا۔ ایک جاٹ کے لڑکا نہیں تھا اور بھائیوں میں بھی کوئی اس قابل نہیں تھا جو اس کی جانشینی کے فرائض انجام دیتا اور اس کے نام کو باقی رکھ سکتا۔ اس لئے اس نے ایک سمجھدار میو بچہ گود لیا یعنی لے پالک بنالیا جس کا رواج قدیم دور میں بھی بہت تھا اور اب بھی یہ رسم باقی ہے۔

اسلام نے اس رشتہ کو کالعدم قرار دیا ہے۔ اب چونکہ یہ میو طفلک (بچہ) بطور خود جاٹ گاؤں میں مقیم نہ ہوا تھا بلکہ ایک سماجی رشتے میں منسلک ہو کر اس نے جاٹوں میں رہنا شروع کیا اس لئے اسے بجائے "میو" اور "میوڑا" "جاٹنی کا بیرا" کہا جانے لگا۔

جب یہ "جاٹنی کا بیرا" عرب گیا، اور یمن میں سکونت اختیار کر لی، تو یہی پھر "بیرزطن" کہلایا۔ عربی زبان کا قاعدہ ہے کہ غیر عربی لفظ کو جب

عربی میں منتقل کیا جائے تو اگر عربی قواعد سے متصادم نہ ہو تو اسے جوں کا توں نقل کر لیتے ہیں، بیر کے معنی بھائی اور زطن زط کی مونث ہے، بیر کو 'اخ' بھی کیا جا سکتا تھا مگر اس ترکیب میں ثقل ہو جاتا اور ادغام کا بھی خطرہ تھا جو بلا ضرورت غیر محمود ہے اس لئے بیر (بھائی) کو علی حالہ رہنے دیا۔ یہ ہے بیر زطن کی وجہ تسمیہ، اور یہ ہے اس کی قوم۔

اس پس منظر میں سنیئے:۔

آپ یمن میں جا بسے تھے اور ان اطراف میں "بھنگ" کو بطور دوا آپ ہی نے مشہور کیا تھا، میو قوم میں پرانے زمانے سے ہی حقہ اور بھنگ بطور دوا استعمال ہوتے رہے ہیں۔ قاضی اطہر مبارکپوری نے لکھا ہے:

"وھو اول من اسلم من اھل الھند[1]"

(وہ ہندوستانیوں میں سب سے پہلا مسلمان تھا۔)

دوسری جگہ لکھا ہے:۔

"اس علاقہ میں یمن کے ایک خالص ہندوستانی بزرگ حضرت بیر زطن رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں"

یہ ہندوستانی علاج کے ماہر طبیب تھے، انھوں نے بڑی عمر پائی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں اسلام قبول کیا، لیکن آپؐ سے ملاقات کا ثبوت نہیں۔ حافظ ابن حجرؒ نے الاصابہ کی قسم سوم میں ان کا تذکرہ کیا ہے جس میں ایسے حضرات کا بیان ہے جنھوں نے آپؐ کا زمانہ پایا اور آپ کی حیات طیبہ ہی

---

[1] رجال السند والہند۔

میں اسلام قبول کیا۔ الاصابۃ میں ان کا ذکر اس طرح ہے کہ شیخ حسن بن محمد شیرازی نے کتاب السوانح میں حضرت شیخ جعفر بن محمد شیرازی کی روایت سے لکھا ہے:۔

"بیر زطن رضؓ ہندی شاہان ایران کے زمانے میں ایک بوڑھے آدمی تھے، بھنگ کے علاج میں ان کا واقعہ مشہور ہے، اس کو ان اطراف میں سب سے پہلے انہی نے رواج دیا تھا، اور یمن میں اس کی شہرت ان کی وجہ سے ہوئی تھی، انھوں نے اسلام کا زمانہ پایا اور قبول کیا[1]"

مولائے اسلام دیبلی

محمد بن قاسمؒ ۹۳ھ میں ساحل سندھ پر اترے، ان سے ملتے ہی سندھ کے بعض لوگ حلقۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔ ان میں سے ایک شخص مولائے اسلام تھے جنکو تاریخ میں "مولائے دیبلی"، "مولائے اسلامی" اور "مولائے اسلام دیبلی" کے مختلف ناموں سے موسوم کیا گیا ہے۔

یہ محمد بن قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر ایمان لائے۔ نہایت ذہین، زیرک اور دانا تھے، پہلے سے پڑھے لکھے اور راجہ داہر کے سرکاری حلقوں سے تعلق رکھتے تھے اسلامی تعلیمات بہت جلد حاصل کر لی جس سے محمد بن قاسمؒ کے معتمد بن گئے عربی زبان بھی بہت تھوڑی مدت میں سیکھ لی۔

جب محمد بن قاسمؒ نے وادئ سندھ میں قدم رکھا، اور حالات کا جائزہ لینے کے لئے اپنے شامی مشیر کو قاصد کی حیثیت سے داہر کے پاس بھیجا اور بطور ترجمان "مولائے اسلام" کو ان کے ساتھ روانہ کیا۔ یہ داہر کے دربار میں پہنچے تو مروجہ درباری آداب بجا لائے اور راجہ کو سر جھکا کر سلام کئے بغیر بیٹھ گئے۔

---

[1] عرب و ہند عہد رسالت میں ص ۱۳۹

داہر مولائے اسلامیؒ کو جانتا تھا مگر اسے یہ معلوم نہ تھا کہ یہ مسلمان ہو گیا ہے۔ لہٰذا اس سے سلام و کورنش کے تقاضے پورا نہ کرنے کی وضاحت طلب کرتے ہوئے پوچھا: "تم نے درباری آداب و قواعد کی شرط پوری کیوں نہیں کی؟ شاید تمھیں اس سے روک دیا گیا ہے۔؟"

مولائے اسلامیؒ نے جواب دیا: "جب میں تمہارے مذہب میں داخل تھا، اس وقت درباری نوعیت کی بندگی و نیاز مندی کے قواعد پر عمل کرنا میرے لئے ضروری تھا لیکن اب کہ میں شرفِ اسلام سے بہرہ یاب ہو گیا ہوں اور میرا تعلق بادشاہِ اسلام سے قائم ہو چکا ہے، مجھ پر کافر کے آگے سر جھکانا واجب نہیں رہتا۔

داہر اس انداز گفتگو کی توقع نہیں رکھتا تھا اس لئے بہت خفگی کے عالم میں مولائے اسلام سے کہا: "اگر تو قاصد نہ ہوتا تو اس قدر سزا دیتا کہ تو موت کے گھاٹ اتر جاتا۔" مولائے اسلامیؒ نے جواب میں کہا: "اگر تو نے مجھے قتل کرنے کی ٹھان لی ہے تو یاد رکھ، عربوں کو اس سے کوئی نقصان نہ پہنچے گا اور میرے خون کا انتقام لینے والے موجود ہیں جن کے ہاتھ تیرے جیب و داماں تک بہر حال پہنچ کر رہیں گے[1]

محمد بن قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے دور میں جس قدر میو قوم اسلام لے آئی تھی، ان کی تعلیم و تربیت میں مولائے اسلامیؒ نے اہم خدمات انجام دیں۔ ان کا تعلق کس قوم سے تھا یہ محقق نہیں ہو سکا البتہ ان کے سوانح و کوائف سے صاف جھلکتا ہے کہ یہ میو قوم کے ہی ایک اہم فرد تھے واللہ اعلم۔ وفات ۱۱۰ھ کے قریب ہوئی۔

[1] مقتباب ... [illegible]

شیخ علی راوَلی قدس سرہٗ

متھرا ــــ م ۳۰۰ھ

آپ قدمائے اولیاء متصرفین سے ہیں، باشارۂ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم واسطے ترقی دینِ محمدی کے عرب سے ہند کی طرف تشریف لائے۔

کہتے ہیں کہ آپ نے قصبۂ متھرا میں آکر سکونت کی۔ گاؤ سنگین جس کی پرستش ہنود کیا کرتے تھے اس سے ہر روز دودھ دوہتے اور پیا کرتے تھے۔ جب تک آپ زندہ رہے اسی کا دودھ پیا، کبھی دوسرا طعام نہ کھایا۔ ریاضت و عبادت و زہد و تقویٰ میں ہمیشہ مصروف رہتے۔

ہزارہا مشرک و کافر وہاں کے آپ کے تصرفات ظاہری و باطنی دیکھ کر مسلمان ہوئے۔ آپ کے قدوم کی برکت سے متھرا اور اس کے اطراف ملک کفرستان میں اسلام نے اپنا قدم جمایا۔ ہزاروں نے زنار کفر کو توڑ کر خرقۂ اسلام در بر کیا۔ ۳۰۰ھ میں آپ کا وصال ہوا۔ متھرا میں آپ کا مزار ہے اور وہ گاؤ سنگین جس کا آپ دودھ پیا کرتے تھے مزار کے پاس پڑا ہوا ہے[1]۔

آپ عربی النسل نہیں بلکہ ہندی نژاد ہیں چنانچہ آپ کی نسبت "راوَلی" سے ظاہر ہے۔ راوٹ جاٹوں کا ایک گوت بھی ہے اور ایک گاؤں کا نام بھی "راوت کا" ہے جو ضلع متھرا میں قصبہ کوسی کلاں تحصیل میں واقع ہے۔ میو قوم کی آبادی متھرا تک پھیلی ہوئی تھی اب آکر سکڑ و سمٹ کر کچھ محدود سی ہو گئی ہے مگر متھرا ابھی تک اہلِ میوات کے بازاروں میں ہے اور اس کے آس پاس میو آبادیاں ہیں۔

[1] برکات الاولیاء ص ۵

سیّد سالار مسعود غازیؒ (۴۰۵ھ تا ۴۲۴ھ)

سالار مسعود بن ساہو بن عطاء اللہ غازیؒ، مجاہد و شہید فی سبیل اللہ ہندوستان کے مشہور و معروف بزرگ محمد بن حنفیہ علویؒ کی اولاد میں ہیں۔ ہندوستان بھر میں غزوات کئے اور بہرائچ ضلع سلطان پور میں جامِ شہادت نوش کیا اور وہیں دفن ہوئے۔ بعد میں ایک مسلمان بادشاہ نے ان کی قبر پر بلند قبہ بنوایا۔ دور دراز سے لوگ یہاں آتے اور عقیدت و نیازمندی سے حاضری دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ وہ کنوارے ہی شہید ہو گئے تھے۔ اس لئے ہر سال ان کی شادی رچاتے ہیں۔ مزار پر نذر و نیاز میں کپڑے کے علَم (جھنڈے) بھی آتے ہیں جنہیں مزار پر نصب کر دیا جاتا ہے۔ تاریخ فرشتہ اور ابن بطوطہ مغربی سیاح نے اپنی کتاب میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ محمد شاہ تغلق شیخ صالح مجاہد پارسا شہید سالار مسعود کی زیارت کے لئے گیا جنہوں نے یہاں کے اکثر شہر فتح کئے۔ ان کی بڑی عجیب و غریب روایات اور مشہور غزوات ہیں۔ وہاں زائرین کا اژدحام ہوتا ہے ہم نے اس مرد مجاہد کی زیارت کی مگر بھیڑ کی وجہ سے اس گنبد کے اندر کا راستہ نہ پا سکے۔ شیخ عبدالرحمٰن انبیٹھویؒ نے "مراۃ مسعودی" میں ان کی تفصیلی سوانح حیات قلمبند کی ہیں۔ عہد سے لودھک کے واقعات کو عینی شاہد کی طرح بیان کیا ہے۔ حالانکہ وہ عہد جہانگیر (۱۵۶۹ء-۱۶۲۷ء) کا ہے۔ تقریباً درمیان میں چھ صدیوں کا فاصلہ ہے۔ اس میں مذکور ہے۔ ۲۱ رشعبان ۴۰۵ھ کو اجمیر میں سلطان محمود غزنوی کی بہن ستر معلی کے بطن سے پیدا ہوئے۔ والد ماجد سلطان مذکور کی طرف سے حاکم اجمیر تھے۔ وہیں آپ کی پرورش ہوئی اور سید ابراہیم علویؒ سے علم حاصل کیا۔ اپنے ماموں کے پاس غزنہ کا سفر کیا پھر واپس ہندوستان آئے۔ ان کے ہمراہ گیارہ ہزار مجاہد تھے، یہاں جہاد و قتال کیا،

دہلی، قنوج، کٹرہ، مانکپور، سترکھ اور دوسرے شہر فتح کئے جب بہرائچ پہنچے تو بیدینوں کے ہاتھوں ۱۴ ر رجب ۴۲۴ھ میں جامِ شہادت نوش کیا۔ تاریخ فرشتہ میں سالِ شہادت ۴۵۵ھ لکھا ہے کرامت حسینؒ نے "مبدا الانساب" میں کندن لال مؤلف تنقیح الاخبار کے حوالے سے اسی کی تائید کی ہے مؤلف کا بھی یہی خیال ہے۔

سیّد ابراہیم علویؒ | بارہ ہزاری سے معروف استاذ سالار مسعود غازی ریواڑی ضلع گوڑگانوہ۔

خواجہ رکن عالم شہیدؒ تجارہ | قصبہ سے باہر کالیا نامی مشہور گنبد کے پاس ٹیلے پر پرانے قبرستان میں حسب ذیل چار دیواری سولہ ہاتھ لمبائی چودہ ہاتھ چوڑائی کے اندر مزار ہے۔ جنوب دروازہ پر چوبی کواڑ چڑھے ہوئے ہیں۔

روشن شہیدؒ تجارہ مزار نزدیک درگاہ میراں صاحبؒ

بھکن شہیدؒ تجارہ مزار آبادی کے متصل کربلا کی جانب۔

حمید شہید کوٹ قاسمؒ۔ ریواڑی کے غزوہ میں شہید ہوئے اسی حال میں کسی صورت کوٹ قاسم پہنچے اور سواد قصبہ سے متصل ندی کے عین وسط میں آکر روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی اور وہیں مدفون ہوئے۔ میاں لاڈخاں قدس سرہٗ کے مزار سے قریب ہے۔ رکن عالم شہید ۴۲۳ھ ارزنگ تجارہ میں، تاریخ مسعودی کے حوالے سے لکھا ہے کہ ۴۲۳ھ میں بعہد سلطان محمود غزنوی سید ابراہیم عرف بارہ ہزاری صاحب استاذ حضرت سید سالار مسعود غازیؒ کے غزاؤں کیوقت جب وہ شہادت پا چکے اور تیج پال کی گرفتاری تجارہ کے مقام پر ہوئی اس مقابلے و مجادلے میں اسلامی سواروں کی جو شہادت ہوئی تھی انھیں میں یہ تینوں، رکن عالمؒ، روشنؒ، بھکنؒ، شہید ہوئے تھے کسی مستند تاریخ اور ابتدائی تذکروں میں ان بزرگوں کے کوائف نہ ملنا انکے عدم وجود کو مستلزم نہیں کیونکہ عدم علم سے نفی وجود نہیں ہوتی۔ سید ابراہیم بارہ ہزاریؒ کا ریواڑی میں مزار ہے اور آجتک اسی نام سے مشہور ہے۔ تاریخ شہادت لفظ "ہیہات" سے نکلتی ہے۔

۵+۱۰+۵+۴۰۰+۴۰۰ = ۴۲۱ھ

نزہۃ الخواطر ار ۱۷۷ ۔ روایت نمبردار نثار احمد خاں کوٹ قاسم ۱۹۷۵ء۔ حیات الابرار مخطوطہ۔ تذکرۃ القبور مخطوطہ ص ۱۶۳-۱۶۱۔

مشائخ چشت کا مقامِ تبلیغ

اور

ہندوستان

اگر گیتی سراسر باد گیرد　　چراغ چشتیاں ہرگز نمیرد

حضرت سلطان الہند خواجۂ بزرگ اجمیری قدس سرہٗ نے تبلیغ و اشاعتِ دین کے لئے ہندوستان میں سب سے پہلے اجمیر شریف کو اپنا مرکز بنایا اس کے بعد ناگور اور دہلی میں اپنے خلفاء عظام حضرت صوفی حمید الدین ناگوری اور حضرت بختیار کاکی رحمہا اللہ کو مقرر فرمایا جنھوں نے اجمیر کا نام خوب روشن کیا۔

اجمیر میں خواجۂ خواجگان کے قیام کی مدت اندازاً چالیس سال ہے۔ اس عرصہ میں آپ نے علاوہ مجاہدات و ریاضات اور مشاغل ذاتی کے اسلام کی تعلیمات کی اشاعت و تبلیغ کر کے برصغیر ہندوستان میں ایک انقلابِ عظیم پیدا کر دکھایا۔

خواجہ معین الدین حسن چشتیؒ کی ذات آفتاب درخشاں کی مانند ہے جس کی تجلیوں کے سامنے تمام روشن ستارے ماند ہیں، آپ کی تبلیغی مہم کوئی راز سربستہ نہیں، آپ یہاں تنہا بلا خوف تشریف لائے اور وہ بھی اس عالم میں کہ آپ کے ساتھ نہ کوئی فوج، نہ کسی سلطانِ وقت کی اعانت و امداد، چند معتقدوں کے ساتھ وارد ہندوستان ہوئے، زبان بھی اجنبی تھی اور آپ بذات خود یہاں اجنبی تھے، نہ کسی کو اپنا مافی الضمیر سمجھا سکتے تھے ایسے سماج اور ماحول میں تبلیغی دشواریوں کا اندازہ اس قدر سہل نہیں جتنا سمجھ رکھا ہے اور پھر ہندوستان کے حالات کے پیش نظر تو یقین ہی

نہیں کیا جاسکتا کہ یہاں اس دین کی تبلیغ و اشاعت ممکن ہو سکے گی جس کی تمام اہم کتابیں عربی زبان میں ہیں اور سارا پیغام عربی میں ہے، اور یہ تو خواب میں بھی کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا کہ دین محمدیؐ بھارت میں رواج پذیر ہو کر سربلند بھی ہوگا۔

وما ارسلنا من رسول الا بلسان قومہ　　نہیں بھیجا ہم نے کوئی رسول مگر اس کی قوم کی زبان میں جس کی طرف اسے مبعوث کیا گیا ہے۔

حق تعالیٰ نے جس قوم میں بھی کوئی نبی اور رسول مبعوث فرمایا تو دونوں رسول اور اس کی قوم کی زبان ایک ہوتی تھی، وہ اسی قوم میں پیدا ہو کر ان کی اصلاح کیا کرتا تھا، یا کسی قوم کی زبان، تاریخ، عادات و اطوار کا مکمل علم عطا فرما کر کسی قوم میں احقاقِ حق کی خاطر کسی نبی کو بھیجا جاتا تھا۔ انبیائے بنی اسرائیل علیہم الصلوٰۃ والسلام اسی اہتمام والتزام کے ساتھ مبعوث ہوئے اور تبلیغ حق کے لئے محنت و کاوش فرمائی انھیں اپنی قوم میں رہ کر تبلیغ میں بڑی مراعات حاصل تھیں، انھوں نے اپنی صداقت اور پاکبازی اور اپنے بے داغ کردار سے ایک قسم کا اعتبار و اعتماد حاصل کر کے حق کا اعلان فرمایا نتائج کیا برآمد ہوئے۔؟ یہ محتاج بیان نہیں مگر مشائخ چشت خصوصاً سلطان الہند خواجہ غریب نوازؒ کو یہ تمام مراعات کسی درجہ میں بھی حاصل نہیں تھی۔ اس کے باوجود تبلیغ حق اور اشاعتِ دین کے سلسلہ میں جو کارنامے ان حضرات نے انجام دیئے اس پر عقل و فکر حیران ہیں، آپ کی تبلیغ نے وہ کام کیا جو فاتحین مسلمان نہ کر سکے۔ فرمانروایانِ ہند کی تلواروں کے سامنے ہندوستانیوں کی گردنیں تو جھک گئیں مگر ان کے دلوں میں اسلام کے لئے وہ کوئی مقام پیدا نہ کر سکیں۔ آپ نے اپنے پاکیزہ اخلاق، پسندیدہ طور طریق اور محبت و وداد کی روش سے ہندوستان کا نقشہ ہی بدل دیا۔

آپ نے تبلیغ کے لئے ہندوستان میں بڑے تدبّر، دور اندیشی اور

ضابطہ سے کام لیا، ایک مرکز بناکر خود قیام فرمایا اور مرکز کے لئے اس مقام کو تجویز فرمایا جو ایسی قوم کا مرکز تھا جو ہندوستانی الاصل ہو کر عرب و ایران کے تمدن سے آشنا، مذاہب سے باخبر اور رسم ورواج سے شناسا تھی یعنی میو قوم جو خواجہ علیہ الرحمۃ سے ڈیڑھ سو سال پیشتر سلطان محمود غزنوی کے عہد میں اور سالار مسعود غازی علیہ الرحمۃ کے دور میں اسلام کے سایۂ عاطفت میں آچکی تھی وہ اجمیر اور اس کے نواح میں اور دور تک ناگور، بیانہ، نارنول، دہلی، متھرا، آگرہ، ریواڑی، پاٹودی اور ہینہ تک پھیلی ہوئی تھی یعنی دارالخیر اجمیر جو محل وقوع کی حیثیت سے بھی بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ دہلی جو عرصہ دراز سے ہندوستان کا مرکزی مقام تھا اور اس وقت کے مستقبل میں اسے ہندوستان کا دارالسلطنت بھی بننا تھا۔ اس پر جس طرح راجستھان متاثر تھا اس قدر اور کوئی دوسرا حصہ نہ ہو سکتا تھا، اور پھر راجستھان سے گذر کر سندھ۔ جو میو قوم کا قدیم مسکن رہا ہے۔ اور پھر سندھ کے ریگستانوں کا عرب کے ریگستانوں سے ہم آہنگی کا گو تعلق نہ تھا، مگر سندھ کے لوگ عرب میں اس کثرت سے آمد و رفت رکھتے تھے کہ عرب ان کا وطن بن گیا اور پھر عربی صاحبانِ فضل وکمال بھی پہلی صدی ہجری ہی سے سندھ کی طرف متوجہ ہو گئے۔ چنانچہ تاریخ وسیر کی کتب اس کی شاہد ہیں کہ فلاں بزرگ سندھ میں توطن پذیر ہو گئے، مستقل اس موضوع پر قاضی اطہر صاحب مبارکپوری کی دو کتابیں ہیں۔ رجال السندھ والھند ا الدر الثمین فیمن ورد السندہ والھند من الصحابة والتابعین۔
خیر ان سب چیزوں نے مل کر اجمیر کی اہمیت بہت بڑھادی تھی۔ خواجہ نے اسے منتخب فرمایا اور بلکہ بقول بعض۔ یہ قیام آپ کے لئے قدرت کی طرف سے منتخب کیا گیا۔ پھر اجمیر سے جو اشاعت اسلام وتبلیغ دین کا اہم کارنامہ انجام پذیر ہوا وہ بلا کسی نزاع واختلاف مسلّم ومشہور ہے۔ مشائخ چشت رحمہم اللہ کی یہی وہ حیثیت

ہے جو انھیں بلند ترین مقام دیتی ہے۔ ہندوستانیوں کے دل جس طرح مشائخ چشت رحمہم اللہ کی بلند شخصیتوں کے ساتھ مربوط ہیں اتنے کسی دوسرے سلسلہ کے ساتھ نہیں۔ اشاعت وتبلیغ کا کوئی شعبہ اور کوئی پہلو ایسا نہیں جہاں ان نفوس قدسیہ کے انفاس مبارک سرگرم کار نہ ہوں۔ اجمیر میں بیٹھ کر تخت دہلی کی حفاظت کی، اور مسلم قوم کے اسلامی کردار واخلاق کی نگہداشت فرمائی، غیر مسلموں کے دلوں میں اخلاق ومروت، محبت ووداد کے گھر کرکے انھیں اسلام کی جانب مائل فرمایا، اور لاکھوں غیر مسلموں کو اسلام کی دولت لازوال سے مشرف فرمایا اور پھر ایسے آثار وعلائم، اصول وضابطے ایجاد فرما گئے جو آپ کے پیروکاروں اور جو بھی اسلام کی خدمت کسی بھی حیثیت سے کرنا چاہیں ان کے لئے رہتی دنیا تک کام آتے رہیں گے فجزاہم اللہ خیرا۔

کفرزار ہند میں اسلام گو پہلی صدی ہجری ہی میں آچکا تھا، اس وقت سے بہت پہلے جب کہ تصوف وسلوک کے یہ مشہور سلسلے اور خانوادے منصۂ شہود پر آئے تھے، اس لئے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اسلام کو ہندوستان میں مشائخ چشت ہی لائے، ہاں البتہ عمومی اشاعت اسلام مشائخ رحمہم اللہ کی مساعی کی رہین منت ہے، یہ مشائخ خانقاہوں کے مسند نشین نہیں تھے بلکہ اسلام کے سچے خادم تھے اور مذہب کی نصرت وحمایت میں وہ سب کچھ قربان کرنے کو آمادہ وتیار رہتے جس کا وقت اور ماحول مقتضی ہوتا تھا، نفس وشیطان کی ریشہ دوانیوں کو ہر محاذ پر کمندیں ڈال کر پابند سلاسل کیا، وقت کے شہنشاہوں سے ٹکر لی اور میدان کارزار میں سینہ تان کر کھڑے ہو گئے، عوام پر مسلط جہل ونادانی کے عفریت کو علم ودانش کی بوتل میں بند کیا، غلط قسم کے رسم ورواج کو نیچرل روپ دے کر فطری سادگی کا لباس پہنایا، تشنہ کامان علم ودانش کو آگہی بخشی، سرور

اور طمانیت سے نوازا ، یقین و عرفان کے طلبگاروں کو سیراب فرمایا ، اخلاق و انسانیت کا علم بلند فرمایا ، اور شرافت و آدمیت کے رموز سے خبردار کیا ، محنت و عمل اور جد و جہد کو عملی روپ دے کر سمجھایا ۔ حقوق کی تعیین و تنظیم کی ۔ وہ ماں باپ کے ہوں یا بہن بھائیوں اور دیگر اعزہ و اقارب کے ، پڑوسیوں کے ہوں رفقائے سفر اور راہ گیروں کے استاد و شاگرد کے ہوں یا حاکم و محکوم کے ، بندوں کے ہوں یا معبود کے عبد و معبود کے رشتہ میں جسقدر مجہول تھے وہ درست کئے غرض ریاضت و مجاہدہ ، وعظ و ارشاد ، تبلیغ و نصیحت ، استقلال و ثابت قدمی ، محبت و اخلاق اور ربط و ضبط کا وہ بلند ترین مینار بنایا کہ قطب مینار اس کی یکرخی جھلک اور تاج محل اس کا عکس جمیل ہے اور دار الخیر اجمیر کو سجدہ گاہ نیاز عقیدت بنا دیا ، وحشت و بربریت کی تیز و تند آندھی عقیدت و محبت کے اس چراغ کو گل نہیں کر سکتی اور لاقانونیت و انار کی میل ملاپ کے اس چمن کو خزاں سے ہمکنار نہیں بنا سکتی ۔

حضرت شیخ سعدی لنگوجیؒ

آپ کا مزار مبارک شہر نارنول میں ہے اور آپ حضرت عثمان ہارونی کے خلیفہ ہیں ۔

سید معین الدین بیانویؒ

آپ خواجہ عثمان ہارونی کے خلیفہ ہیں اور آپ کا مزار مبارک بیانہ ضلع بھرتپور میں ہے ۔

میر سید حسین خنگ سوار

آپ سلطان محمد غوری کی فوج کے ساتھ ہندوستان تشریف لائے اور یہیں بس گئے غوری کے چلے جانے کے بعد قطب الدین نے خود پہلے کہرام اور پھر دہلی میں قیام کیا اور اجمیر میں میر خنگ سوار کو داروغہ مقرر کیا[۱] ۔ جو شیعہ مذہب کے تھے وہ حضرت خواجہ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے ۔

خواجۂ بزرگؒ کی دوسری شادی آپ ہی کے خاندان میں ہوئی ، آپ اکثر حضرت خواجہ کی خدمت میں حاضر رہتے اور محرمانہ صحبتیں برپا ہوتیں ، بہت سے لوگ آپ کی بدولت حضرتؒ کی خدمت میں باریاب ہو کر خلعت اسلام سے شرفیاب ہوتے تھے ، اسی لئے اس علاقے کے غیر مسلم آپ کے خلاف ہو گئے ، جب قطب الدین ایبک کی وفات کی خبر اجمیر میں مشہور ہوئی تو ان لوگوں کی جرأت بڑھی ، اس وقت آپ کا بیشتر لشکر اجمیر سے باہر تھا اور آپ معدودے چند آدمیوں کے ساتھ قلعہ میں مقیم تھے ، مخالفین نے ایک بڑی جماعت کے ساتھ حملہ کیا ، اور آپ کو سب ساتھیوں کے ساتھ شہید کر دیا ۔ صبح کے وقت حضرت خواجہ بزرگ تشریف لائے اور شہدا کی نماز جنازہ پڑھائی ۔ میر خنگ سوار کا مزار تارا گڑھ کی پہاڑی پر ہے ، اور قریب ہی گنج شہیداں ہے جہاں آپکے ہمراہی دفن ہیں ۔ آپ کے مزار کی نسبت ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس میں بہت سا اضافہ ہندو امراء نے کیا[۱] ۔

---

[۱] آب کوثر ۔ محمد اکرام ۔ مطبوعہ لاہور ۱۹۵۲ء ص ۲۰۹ - ۲۱۰

سلطان الہند خواجہ خواجگان

حضرت خواجہ معین الدین اجمیری قدس اللہ سرہ العزیز

۱۱۳۵م ——————— ۶۳۳ھ

آپ سجستان میں پیدا ہوئے، لیکن آپ کی تعلیم و تربیت خراسان میں ہوئی۔ ابھی پندرہ سال کے تھے کہ یتیم ہوگئے۔ ان کے والد نے ایک باغ اور ایک پن چکی ورثہ میں چھوڑی تھی جس کی آمدنی سے آپ بسر اوقات کرتے تھے۔

ایک روز آپ اپنے باغ میں تشریف فرما تھے اور درختوں کو پانی دے رہے تھے کہ ایک قلندر شیخ ابراہیم قندوزی نام آپ کے باغ میں آیا، حضرت نے بڑے تپاک سے اس کا خیر مقدم کیا ایک سایہ دار درخت کے نیچے اسے بٹھایا اور انگوروں کا خوشہ ما حضر کے طور پر سامنے رکھا، قلندر نے برغبت تمام یہ انگور کھائے اور حضرت خواجہ کی مہمان نوازی اور ذوق شوق سے خوش ہوکر، ایک کھانے کی چیز اپنی بغل سے نکال کر چبائی اور حضرت کو کھانے کو دی، تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ اس کے کھاتے ہی انوار الٰہی جلوہ گر ہوئے اور حضرت کا دل دنیا سے متنفر ہوگیا، تمام جائیداد منقولہ و غیر منقولہ فروخت کرکے مساکین میں تقسیم کی اور خود سمرقند کا رخ کیا۔ حضرت خواجہ کی زندگی میں اس اہم تبدیلی کی وجہ شاید ایک اور بھی ہے، اسی زمانے میں یا اس سے کچھ پیشتر تاتاریوں نے شہر پر حملہ کیا اور حضرت کے وطن مالوف پر اس طرح ظلم توڑے کہ حضرت کا دل اس دارالابتلاء سے سرد ہوگیا اور دنیا اور دنیا داروں سے ایک طرح کا انقباض پیدا ہونے لگا۔

ترک وطن کے بعد ایک عرصہ تک حضرت نے سمرقند میں تحصیل علم کی اور

کلام مجید حفظ کیا، اس کے بعد عراق کا رخ کیا، راستے میں قصبہ ہرون جو نیشاپور کے نواح میں ہے حضرت خواجہ عثمان ہرونیؒ چشتی کی خدمت میں حاضر ہوئے، ایک عرصۂ دراز ان کی خدمت میں رہے۔ اور کمال مجاہدہ اور ریاضت کے بعد ان سے خرقۂ خلافت حاصل کیا، خواجہ عثمان ہرونیؒ کے بہت سے حالات کتب صوفیہ میں مذکور ہیں، لیکن ان کی زندگی کے ایک واقعہ سے جسے شیخ جمالیؒ نے سیر العارفین میں نقل کیا ہے یہ خیال ہوتا ہے کہ انھیں اشاعتِ اسلام کا بڑا خیال رہتا تھا:-

کہتے ہیں کہ جب حضرت معین الدین اپنے مرشد سے خرقۂ خلافت حاصل کرکے اور عراق اور دوسرے مقامات مقدسہ میں پھر پھرا کر ہندوستان تشریف لائے تو خواجہ عثمان کا دل بھر آیا اور ان کی جدائی میں بیقرار ہوا اور وہ اپنے جلیل القدر مرید کی ملاقات کے لئے ہندوستان کی طرف چلے، راستہ میں ان کا گذر ایک ایسے مقام پر ہوا جہاں پارسیوں کا ایک بڑا آتش کدہ تھا، خواجہ عثمان ہرونیؒ نے اس کے قریب قیام کیا اور اپنے خادم کو بھیجا کہ افطار کے واسطے آگ پر روٹی پکا لائے خادم گیا لیکن آتش پرستوں نے اسے آگ نہ دی، حضرت کو خود ان کی طرف متوجہ ہونا پڑا، جب آپ آتش کدہ کے پاس پہنچے تو وہاں ایک بوڑھا موبد مختار نام سات برس کا لڑکا آغوش میں لئے کھڑا تھا۔ حضرت کی اس سے گفت و شنید ہوئی، آپ نے اس سے کہا کہ آگ ایک فانی چیز ہے ایک چلو پانی سے معدوم ہوجاتی ہے، اسے کیوں پوجتے ہو اور خدائے برتر و تعالیٰ کو جو اس آگ کا خالق ہے نہیں پوجتے؟ اس نے کہا کہ آگ ہمارے مذہب میں بڑا مرتبہ رکھتی ہے اسے کیوں نہ پوجیں۔؟ حضرتؒ نے پھر کہا کہ تم اتنی مدت سے اس آگ کی صدق دل سے پرستش کرتے ہو کیا تم یہ کرسکتے ہو کہ اپنا ہاتھ یا پاؤں اس آگ میں ڈالو اور وہ نہ جلائے، موبد نے کہا کہ جلانا آگ کی خاصیت ہے جو اس میں ہاتھ ڈالے گا جل جائے گا۔

اگر صد سال گبر آتش فروزد
چوں یک دم اندروں افتد بسوزد

حضرت نے یہ سنکر موبد کے فرزند کو اس کی آغوش سے لیا اور خود آیۂ کریمہ قُلْنَا يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَسَلَامًا عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ پڑھ کر آگ میں داخل ہوئے، یہ دیکھ کر موبد اور اس کے ساتھی حیران و پریشان ہوئے، آگ کے گرد شور و فغاں کرتے تھے لیکن اندر جانے کی ہمت نہ پڑتی تھی، ایک عرصہ کے بعد حضرت خواجہ مع اس بچے کے صحیح سلامت اس حالت میں آگ سے نکلے کہ ان کے کپڑوں پر ایک دھبہ بھی نہ تھا، تمام آتش پرست یہ حال دیکھ کر ششدر رہ گئے اور حضرت کی کرامت دیکھ کر ان کے ہاتھ پر ایمان لائے لڑکے کا نام ابراہیم رکھا گیا اور بوڑھے موبد کا شیخ عبداللہ۔

خواجہ عثمان ہرونیؒ سے خرقۂ خلافت حاصل کرنے کے بعد حضرت خواجہ معین نے ایک عرصہ تک بلادِ اسلامیہ کی سیر و سیاحت کی اور اس دوران میں چیدہ اولیاء اللہ سے ملاقات کی، سیر العارفین میں لکھا ہے کہ آپ ستاون روز تک حضرت غوث الاعظمؒ کے ساتھ ایک حجرے میں مقیم رہے، شیخ شہاب الدین سہروردیؒ اور سہروردی سلسلہ کے بانی شیخ ضیاء الدین ابوالنجیب سہروردیؒ سے بھی آپ کا بہت ربط ضبط رہا۔ اسی طرح شیخ نجم الدین کبریؒ، شیخ ضیاء الدینؒ، خواجہ اوحدالدین کرمانیؒ، شیخ ابوسعید تبریزیؒ (جو شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے پہلے پیر تھے) اور دیگر کئی بزرگوں سے آپ کی ملاقات کا ذکر ملتا ہے۔

بلادِ اسلامی میں بھی آپ کو بڑا مرتبہ حاصل ہوا چنانچہ سیر العارفین میں مولانا رومؒ کے خلیفہ شیخ حسام الدین چلپیؒ کا یہ بیان نقل ہوا ہے کہ شیخ اوحدالدین کرمانی نے حضرت خواجہ اجمیریؒ سے خرقۂ خلافت حاصل کیا اور شیخ

شہاب الدین سہروردیؒ نے بھی آپ کی صحبت سے فیض اٹھایا۔

اصفہان میں آپ کی ملاقات خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ سے ہوئی جو ان دنوں مرشد کی تلاش میں سرگرداں تھے، حضرت قطب الدینؒ حضرت خواجہ بزرگؒ کے مرید ہوئے اور بعد میں جب حضرت خواجہ بزرگؒ نے اجمیر میں اقامت فرمائی تو خواجہ قطب الدینؒ نے ان کے فیض کا سلسلہ دہلی میں جاری فرمایا۔

بغداد، ہرات، تبریز اور بلخ سے ہوتے ہوئے حضرت خواجہ غزنی کے راستے ہندوستان آئے اور پہلے لاہور پہنچے، مشہور ہے کہ یہاں آپ نے حضرت داتا گنج بخش کے مزار پر چلہ کشی کی۔ لاہور سے، بقول بعض تذکرہ نگاراں آپ ملتان تشریف لے گئے، جہاں آپ نے طویل قیام فرما کر ہندوستانی زبان میں مہارتِ تامہ حاصل کی، اس کے بعد آپ دہلی آئے اور تھوڑا عرصہ یہاں قیام کرکے اجمیر کا رخ کیا، جو ابتدا میں اجمیر و دہلی کے راجہ کا دارالخلافہ اور دہلی سے بھی زیادہ اہم تھا۔

سیر الاولیاء میں حضرت سلطان المشائخؒ کی زبانی لکھا ہے کہ جب خواجہ بزرگؒ اجمیر تشریف لائے، اس وقت رائے پتھورا ہندوستان کا بادشاہ اجمیر میں رہتا تھا۔ جب آپ نے اجمیر میں سکونت اختیار کی تو رائے پتھورا اور اس کے مقربوں کو ناگوار گذرا، شیخ کی عظمت و کرامت کو دیکھ کر دم نہ مار سکتے تھے، لیکن شیخ کے وابستگان میں سے ایک شخص رائے پتھورا کے پاس نوکر تھا اس کو ایذا پہنچانی شروع کی، اس نے شیخ کے پاس فریاد کی، شیخ نے رائے پتھورا کے پاس اس کی سفارش کی لیکن پتھورا نے یہ سفارش قبول نہ کی بلکہ الٹا شیخ کی نسبت جلی کٹی باتیں کہیں۔ جب یہ باتیں حضرت تک پہنچیں تو ان کی زبان سے نکلا: "ما پتھورا را زندہ گرفتیم و دادیم"۔

ان ہی دنوں سلطان معز الدین غوری کا لشکر دوسری مرتبہ غزنی سے ہندوستان پہنچا رائے پتھورا نے اس کا مقابلہ کیا اور زندہ گرفتار ہوا۔

یہ روایت عام طور پر مشہور ہے، لیکن طبقات ناصری کے حوالہ سے خیال ہوتا ہے کہ حضرت خواجہ اجمیر میں سلطان معز الدین غوری کی لشکر کشی سے پہلے نہیں بلکہ اس کے ساتھ تشریف لائے اور ترائین کی دوسری لڑائی کے زمانے میں سلطان محمد غوری کے لشکر کے ساتھ تھے، اس لڑائی کا ذکر کرتے ہوئے طبقات ناصری کا مؤلف کہتا ہے:

"ایں داعی از ثقہ شنید کہ از معارف بلاد تولک بود لقب او معین الدین بود، او می گفت: من دراں لشکر با سلطان غازی بودم، عدد سوار لشکر دراں وقت صد و بست ہزار برگستوران بود"۔

بدایونی کی منتخب التواریخ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے:

"حضرت خواجہ معین الدین چشتی قدس سرہ العزیز کہ سرچشمۂ اولیاء کبار و مشائخ عظام دیار ہند است مزار متبرک وے در اجمیر واقع است، دریں نوبت با سلطان ہمراہ بود، و ایں فتح بموجب راندن نفس مبارک حمائی آں قطب ربانی رو نمودہ"۔

یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ جمالی، جس نے سیر العارفین میں پہلی مرتبہ حضرت خواجہؒ کے حالات تفصیل سے بیان کئے، اس واقعہ کا ذکر نہیں کرتا بلکہ بالصراحت کہتا ہے: "حضرت خواجہ دہلی ان دنوں تشریف لائے جب سلطان محمد غوری یہ مقام فتح کر کے واپس جا رہا تھا۔ اور پھر چند ماہ دہلی میں قیام کر کے اجمیر کا رخ کیا۔

اجمیر میں حضرت خواجہ معین الدین رحمۃ اللہ علیہ کی آمد کا جو اثر ہوا اس کی

نسبت سیر العارفین میں لکھا ہے:

"بیشترے کفار نامدار ازاں دیار بہ برکت آثار آں زبدۃ الابرار بہ تشریف ایمان مشرف شدند و بیشتر کہ ایمان نیاوردند نذر و فتوح بے حد و عد بحضرت ایشاں می فرستادند کہ ہنوز آں کفار بداں نمط معتقد اند ہر سالے می آیند و سر بر خاکِ آں آستانۂ عظیم القدر، و آں بدر سپہر شیخت می نہند و مبلغ ہائے کلی بمجاوران روضۂ مطہرۂ ایشاں می رسانند و خدمتے بجائے می آرند"[1]

سیر الاولیاء میں بھی آپ کی تبلیغی کامیابی کی نسبت لکھا ہے:

"دوسری کرامت یہ ہے کہ آپ کے آنے سے پہلے تمام ہندوستان میں کفر و بت پرستی کا رواج تھا اور ہند کا ہر ایک سرکش 'انا ربکم الاعلیٰ' کا دعویٰ کرتا تھا اور اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کا شریک سمجھتا تھا اور وہ سب پتھر، ڈھیلے، درخت، چوپایوں اور گایوں اور ان کے گوبر کو سجدہ کرتے تھے اور کفر کی تاریکی سے انکے دلوں کے تالے اور بھی مضبوط ہو رہے تھے۔

ہمہ غافل از حکم دین و شریعت ہمہ بے خبر از خدا و پیمبر
نہ ہرگز کسے دیدہ ہنجار قبلہ نہ ہرگز شنیدہ کسی اللہ اکبر

جناب کے ہند میں تشریف لانے سے جو کہ اہل یقیں کے آفتاب اور در حقیقت معین الدین تھے اس ولایت کی تاریکی کفر نور اسلام سے روشن و منور ہو گئی۔

از تیغ بجائے صلیب و کلیسا در دار کفر مسجد و محراب و منبر ست
آں جا کہ بود نعرۂ فریاد مشرکاں اکنوں خروش نعرۂ اللہ اکبر ست[2]

---

[1] ص ۱۳ [2] ص ۴۴

اجمیر فتح کرنے کے بعد غوری کے نائب السلطنت قطب الدین ایبک نے اجمیر کی حکومت رائے پتھورا کے لڑکے کو خراج کے وعدہ پر تفویض کی تھی، لیکن جب اس کے چچا نے اسے شکست دیکر اجمیر سے نکال دیا تو ایبک نے پھر اس شہر کو فتح کیا اور یہاں ایک مسلمان گورنر مقرر کیا، سب سے پہلے گورنر سید حسین مشہدی خنگ سوار تھے، اب حضرت خواجہ کے کام میں کوئی رکاوٹ نہیں رہی اور آپ دلجمعی سے یادِ الٰہی میں مشغول ہو گئے۔ جو کوئی آپ کے پاس اخذِ فیض یا رہنمائی کے لئے آتا، اس کی آپ ہر طرح مدد کرتے۔ آپ کی وفات ۹۷ برس کی عمر میں ۶ مارچ، ۱۲۳۵ء میں ہوئی، مزار شریف اجمیر میں ہے اور زیارت گاہ خاص و عام ہے۔

ہندوستان آکر آپ کا قیام بیشتر اجمیر میں رہا، دہلی میں چشتی سلسلہ کا کام آپ نے اپنے خلیفہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کو سونپ رکھا تھا جنھوں نے یہ کام بڑی خوبی سے سرانجام دیا، آپ کے مشہور مرید فقط دو ہوئے ہیں:

(۱) خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ (۲) سلطان تارکین شیخ حمید الدین ناگوریؒ
(اگرچہ شیخ کبیر بابا فرید نے بھی آپ سے ایک مرتبہ براہ راست فیض حاصل کیا تھا[1])

[1] سیر الاولیاء میں حضرت سلطان المشائخؒ کی زبانی لکھا ہے کہ ایک دفعہ حضرت خواجہ اجمیری خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ اور بابا فرید ایک ہی حجرہ میں تھے، شیخ معین الدینؒ نے شیخ قطب الدینؒ کو فرمایا کہ بختیار! اس جوان کو کب تک مجاہدے سے جلاؤ گے اسے کچھ عنایت کرو۔ شیخ قطب الدینؒ نے عرض کیا کہ بندہ کیا مجال کہ آپ کے روبرو بخشوں؟ شیخ معین الدینؒ نے فرمایا: یہ مرد آپ کا ہے پھر کھڑے ہو کر فرمایا کہ آؤ دونوں مل کر بخشیں، چنانچہ دائیں طرف شیخ معین الدینؒ کھڑے ہوئے اور بائیں طرف شیخ قطب الدین اور بیچ میں آپ اور آپ کو دونوں صاحبوں نے جو بخشا سو بخشا۔ (سیر الاولیاء ص ۶۴-۶۵)

لیکن عنایتِ الٰہی سے آپ کا سلسلہ اس طرح پھیلا کہ ہندوستان کے تمام سلسلوں پر غالب آگیا، حضرت خواجہ کے ملفوظات کا ایک مجموعہ "دلیل العارفین" کے نام سے شائع ہوا ہے اس کی ترتیب قطب صاحبؒ کی طرف منسوب ہے مگر یہ وضعی ہے۔

حضرت خواجہ معین الدینؒ نے اجمیر میں اپنا وقت نہایت خاموشی سے گذارا صرف ایک مرتبہ آپ کے ایک سفرِ دہلی کا ذکر ملتا ہے اور یہ سفر دلچسپی سے خالی نہ رہا۔ سیر الاولیاء میں ہے کہ شیخ الاسلام شیخ معین الدین اجمیریؒ کے پاس اجمیر کے گرد و نواح میں ایک گاؤں بطور جاگیر حاصل تھا، مقامی حکام نے تقاضہ کیا کہ اس کے لئے شاہی فرمان حاصل کیا جائے، اور شیخ کے صاحبزادوں نے انھیں اس پر مجبور کیا کہ وہ دہلی جائیں اور بادشاہ سے فرمان لائیں، چنانچہ شیخ کو اس ضرورت کی بنا پر اجمیر سے دہلی آنا پڑا۔ دہلی میں وہ شیخ قطب الدینؒ کے پاس ٹھہرے، شیخ قطب الدین نے آپ کا مقصد سفر سُن کر کہا کہ آپ کو (بادشاہ کے پاس) جانے کی ضرورت نہیں، میں جاتا ہوں اور یہ فرمان لے آتا ہوں"۔ چنانچہ وہ سلطان شمس الدین التمشؒ کے پاس گئے۔ بادشاہ انھیں دیکھ کر حیران ہوا۔ کیونکہ اس سے پہلے وہ بادشاہ کے پاس کبھی نہ گئے تھے، بلکہ جب کہ خود بادشاہ نے ان سے ملنے کی خواہش کی تو انھوں نے قبول نہ کیا۔ چنانچہ جس وقت ملاقات ہوئی تو بادشاہ نے اسی مجلس میں فرمان مقرر و اشتہت مع اشرفیوں کے توڑوں کے ان کے حوالے کیا۔ شیخ قطب الدینؒ نے یہ چیزیں لا کر شیخ معین الدین کی خدمت میں پیش کیں۔ اور شیخ معین الدین نے شیخ قطب الدین کی شہرت اور ان کے حق میں خلقت کا اعتقاد ملاحظہ کیا تو فرمایا کہ تم نے یہ کیا کر رکھا ہے۔ عزلت میں پوشیدہ رہنا بہتر ہے۔ شیخ قطب الدین نے عرض کیا کہ بندے نے اس بارے میں کچھ نہ کیا[1]

[1] سیر الاولیاء ص ۹۱۔

سفرِ دہلی کے دوران ہی میں آپ کو شیخ قطب الدین اور شیخ نجم الدین صغری کے اختلافات سے واقفیت ہوئی، سیر الاولیاء میں سلطان المشائخؒ کی زبانی لکھا ہے:

"خواجہ معین الدین اجمیریؒ، اجمیر سے جب دہلی تشریف لائے تو اس وقت شیخ نجم الدین صغریؒ دہلی میں شیخ الاسلام تھے، ان دونوں میں پرانی دوستی تھی، چنانچہ حضرت خواجہ ان سے ملنے گئے، شیخ نجم الدین اسوقت اپنے مکان کے صحن میں ایک چبوترہ بنوا رہے تھے، جب حضرت خواجہؒ کے استقبال کو شیخ صاحب تپاک سے آگے نہ بڑھے تو اس پر خواجہؒ صاحب نے فرمایا کہ "شاید شیخ الاسلامی نے تمہارے دماغ کو برہم کر رکھا ہے" نجم الدین نے کہا کہ میں تو وہی مخلص اور معتقد ہوں، لیکن آپنے اس شہر میں ایک ایسا مرید چھوڑ رکھا ہے جو میری شیخ الاسلامی کی کچھ بھی حقیقت نہیں سمجھتا، حضرت خواجہ مسکرا کر گویا ہوئے کہ "تم فکر نہ کرو۔ میں بابا قطب الدین کو اپنے ساتھ اجمیر لے جاؤں گا، جب آپ مکان پر تشریف لائے تو خواجہ قطب الدین سے فرمایا کہ "بابا بختیار تم اس طرح مشہور ہو گئے کہ خلقت تمہارے متعلق شکایت کرتی ہے، بہتر ہے کہ تم میرے ساتھ اجمیر چلو، اور وہیں اقامت کرو، چنانچہ دونوں بزرگ دہلی سے اجمیر کی طرف جانے کے لئے تیار ہوئے، لیکن اس سے تمام شہر دہلی میں شور برپا ہو گیا، اور اہل شہر مع سلطان شمس الدین التتمشؒ کے آپ کے پیچھے روانہ ہوئے، جب خواجہ اجمیریؒ نے یہ دیکھا تو فرمایا کہ بابا بختیار تم یہیں قیام کرو، میں نہیں دیکھ سکتا کہ تمہارے جانے سے اتنے لوگوں کی دل شکنی ہو چنانچہ سلطان شمس الدینؒ حضرت خواجہؒ کی قدم بوسی کے بعد اہل شہر اور

شیخ قطب الدینؒ کے ساتھ خوشی خوشی دہلی کی طرف واپس پھرا۔ اور حضرت خواجہؒ اجمیر کی سمت روانہ ہوئے۔"[۱]

حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد ان کی نعش مبارک اسی حجرہ میں دفن کر دی گئی، جس میں آپ عبادت کیا کرتے تھے لیکن پختہ مزار کوئی تعمیر نہ ہوا اور آپ کی وفات کے تقریباً ڈھائی سو سال تک بیرونی دنیا نے اجمیر اور خواجہ اجمیر کو فراموش کئے رکھا۔ فقط شیخ حمید الدینؒ ناگوری کے جانشین کبھی راجپوتانہ کے دوسرے بڑے اسلامی مرکز ناگور سے آتے اور زیارت و دعا، فاتحہ سے فیض یاب ہوتے۔

۱۴۶۴ء میں خواجہ حسین ناگوری نے مالوہ کے بادشاہ سلطان محمود خلجی سے استدعا کی اور حضرت خواجہ کا مزار پختہ ہوا، ۱۵۷۰ء میں اکبر نے درگاہ میں ایک شاندار مسجد تعمیر کرائی اور خود زیارت کے لئے بارہا حاضر ہوا، اس کے بعد درگاہ کو بڑی رونق ہوئی۔

جہانگیر ایک زمانے میں عرصہ تک اجمیر میں مقیم رہا اور نو مرتبہ درگاہ کی زیارت کو حاضر ہوا، مگر درگاہ میں سب سے شاندار اضافہ شاہجہاں نے کیا جس نے سفید سنگ مرمر کی ایک خوبصورت جامع مسجد بنوائی اور ایک بلند دروازہ تعمیر کرایا، روضہ کا گنبد بھی بنوایا۔[۲]

---

[۱] سیر الاولیاء ص ۵۴

[۲] آب کوثر - محمد اکرام مطبوعہ لاہور ۱۹۶۸ء ص ۱۹۹ - ۲۰۸ مسلسل

شیخ محمد ترک نارنولی رحمۃ اللہ علیہ

۵۶۷ — ۶۴۲

اصل باشندے ترکستان کے تھے وہاں سے ہندوستان آئے اور نارنول میں سکونت اختیار کی۔ حضرت خواجہ عثمان ہارونی کے مرید ہیں[1]۔ اور آپ کے خلیفہ ہیں اور خواجہ اجمیریؒ سے بھی آپ کو اجازت حاصل تھی[2]۔

ملفوظات مشائخ میں ان کا ذکر میں نے نہیں دیکھا، مگر اس شہر کے عوام ان کو۔ پیر ترک۔ اور۔ ترک سلطان۔ کہتے ہیں۔ مقبرہ ان کا ملجا عوام و خواص ہے۔ ترکستان سے جب ہندوستان میں آئے تو اس وقت قصبہ نارنول میں ایک حوض تھا اس حوض کے کنارے پر آپ کا مزار ہے اور اب وہ حوض ٹوٹ گیا اور اس جگہ شہر آباد ہو گیا ہے، مجرد تھے متوکل اور مرید کسی کو نہیں کیا۔

روایت ہے کہ شہر نارنول میں مسلمان تھوڑے اور ہندو بہت تھے، اور مسلمانوں سے ان کو خاص عناد تھا۔ عید کے روز جب مسلمان نماز میں مصروف تھے ہندوؤں نے یکبارگی حملہ کر کے بہت مسلمانوں کو شہید کیا، شیخ (محمد) احمد بھی شہید ہو گئے۔ اکثر شہداء کو حوض تھن پال کے کنارہ دفن کیا۔ اور شیخ جہاں رہتے تھے وہیں دفن ہوئے۔ اس گنج شہیداں میں دو شہید ہیں ایک کا مزار بلندی پر ہے، ان کو بلند شہید کہتے ہیں۔ دوسرے کا مزار نشیب میں ہے ان کو نشیب شہید کہتے ہیں، دونوں شہید قرآن شریف کے حافظ تھے۔ کہتے ہیں کہ بعض صالحین

---

[1] اخبار الاخیار ص ۷۰ ، [2] خزینۃ الاصفیا ۲۸۳

نے ان کی قبروں سے قرآن کریم پڑھنے کی آواز سنی ہے، گویا وہ دونوں دور کر رہے ہیں۔

نقل ہے کہ ایک مرتبہ حضرت شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی کو بادشاہ نے زبردستی ملک ٹھٹھہ کی جانب روانہ کیا۔ نارنول کے راستہ سے ٹھٹھہ کو چلے جب نارنول سے ایک کوس کے فاصلہ پر پہنچے سواری سے نیچے اترے۔ اتر کر شیخ محمد ترکؒ کے روضہ کی طرف روانہ ہو لئے۔ روضہ کے اندر ایک پتھر لگا ہوا ہے، تھوڑی دیر اس کے مقابل (سامنے) کھڑے رہے۔ پھر شیخ کی قبر کی طرف متوجہ ہوئے، جب زیارت سے فارغ ہو لئے لوگوں نے عرض کیا۔ اس میں کیا بھید تھا؟ فرمایا! کیا خوش نصیب ہے وہ خدمت گار جس کی پرورش کے واسطے اس کے آقا اس کے گھر میں آئیں۔ میں نے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارک کو اس پتھر پر جلوہ افروز دیکھا۔ جب تک وہ معنی مجھ پر منکشف رہے میں اس پتھر کی طرف متوجہ رہا، جب وہ میری نظر سے پوشیدہ ہو گئے میں قبر شیخ کی طرف متوجہ ہوا، پھر حضرت نصیر الدین محمود مراقبہ میں گئے اور سر اٹھا کر فرمایا،

"جس کسی کو کوئی سخت مہم پیش آئے وہ اس روضہ کی طرف متوجہ ہو، امید ہے وہ مہم آسان ہوئے گی"

ایک بیباک عقیدتمند بھی وہاں موجود تھے، انھوں نے عرض کیا! —"اب خود آپ ہی کو مہم درپیش ہے" — آپ نے فرمایا! "اسی سبب سے میں کہتا ہوں کہ میری دشواری کو حق تعالیٰ ان کی برکت سے آسان کرے"۔

دو تین منزل نارنول سے نہ گذرے تھے کہ بادشاہ کا واقعہ گذر گیا۔ حضرت واپس دہلی میں تشریف لے آئے وہ پتھر اب تک ان کے مزار کے مقابل ہے، لوگ زیارت کرتے ہیں۔ رحمۃ اللہ علیہ[1]۔

---

[1] اخبار الاخیار اردو ص ۷۰۔

شیخ فخرالدین قدس سرہٗ

حضرت خواجۂ بزرگ معین الدینؒ چشتی کے فرزند ہیں ۔ موضع ماندل قریب اجمیر شریف میں کھیتی کیا کرتے تھے ۔ ملفوظات مشائخ چشتیہ میں ہے کہ حضرت خواجہ کے فرزندوں کا ایک گاؤں جاگیر تھا ، اس میں زراعت کیا کرتے تھے ۔ حاکم وقت نے مزاحمت کی ، اس وجہ سے حضرت خواجۂ بزرگؒ کئی مرتبہ دہلی تشریف لائے ۔ فخرالدینؒ نے اپنے والد سے بیس برس بعد انتقال فرمایا ۔ ۶۵۳ھ قصبہ سروار میں جو اجمیر شریف سے سولہ کوس دور ہے ، حوض کے کنارہ پر آپ کا مزار ہے[1]

شیخ حسام الدین سوختہؒ

ابن شیخ فخرالدین بن شیخ الاسلام حضرت خواجہ معین الدین سنجری رحمۃ اللہ علیہ

آتش محبت سے جلے ہوئے اور ناوک محبت کے زخمی تھے ، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ سے مصاحبت رکھتے تھے ۔ مدفن ان کا قصبہ سانبھر میں اجمیر کے راستہ کے سرے پر واقع ہے ۔ ان کے والد نے ان کا نام اپنے گمشدہ بھائی حسام الدین کے نام پر رکھا تھا ۔

---

[1] اخبار الاخیار اردو ص ۵۷

حضرت خواجہ بزرگ کی دو بیبیاں تھیں ۔ ایک بیٹی سید وجیہ الدین کی ہیں ، جو چچا ہیں سید حسین خنگ سوار کے جو قلعہ اجمیر یعنی تاراگڑھ پر آسودہ ہیں ان کا نام بی بی عصمت تھا ۔

دوسری بیوی ملک یمین میں ہیں ۔ نام امۃ اللہ تھا ۔ حضرت خواجہ بزرگ کی شادی نکاح کا قصہ اس طرح ہے کہ حضرت خواجہ کی عمر شریف زیادہ ہوگئی تھی مگر ہنوز صاحب اہل وعیال نہ ہوئے تھے ۔ آخر ایک شب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ فرماتے ہیں کہ : "تم میرے دین کے معین ہو اور پھر میری ایک سنت کو ترک کر رکھا ہے" ۔ اتفاقاً اسی شب قلعہ پتیلی کے حاکم ملک خطاب خان نے اس طرف کے کافروں پر حملہ کیا تھا اور وہاں کے راجہ کی ایک بیٹی ان کے ہاتھ آگئی تھی ۔ ملک خطاب حضرت خواجہ کے مرید تھے ، اس لڑکی کو حضرت کی نذر کردیا ، حضرت خواجہؒ نے قبول فرمایا ۔ یہ واقعہ تاریخ بلاد خانی میں لکھا ہوا ہے ۔

دوسرے نکاح کا سبب یہ ہوا کہ سید وجیہ الدین مشہدی کی ایک صاحبزادی تھی کمال عفت وعصمت سے آراستہ بالغ ہوگئی تھی مگر بسبب کفو نہ ملنے کے شادی موقوف تھی ۔ ناگاہ ایک شب امام جعفر صادق علیہ السّلام کو خواب میں دیکھا کہ فرماتے ہیں : اے فرزند وجیہ الدین حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اشارہ ہے کہ اس لڑکی کو خواجہ معین الدین کے سپرد کردو اور ان کے حبالۂ نکاح میں دیدو ۔ سید وجیہ الدین حضرت خواجہ کے پیوستگان میں تھے ، اس واقعہ کو حضرت کی خدمت میں عرض کردیا ۔ حضرت نے فرمایا :

"اے وجیہ الدین میری عمر اب آخر ہوئی لیکن چونکہ حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے اس کے قبول کرنے سے کچھ چارہ نہیں ہے"

حضرتؒ کے ان دونوں خاتونوں سے اولاد ہوئی ۔ بی بی جمال حافظ

اس راجہ کی بیٹی سے ہیں جن کا قصہ عوام میں مشہور ہے ان کے خاوند شیخ رضی تھے ان کا حظیرہ ناگور میں مندلا حوض کے اوپر ہے۔

بی بی جمال کے دو لڑکے ہوئے جو بچپن ہی میں اس جہاں سے رخصت ہو گئے۔ حضرت خواجہ کے تین فرزند تھے: شیخ سعید اور شیخ فخر الدین اور شیخ حسام الدین۔ شیخ سعید وجیہ الدین کی صاحبزادی سے ہیں اور شیخ فخر الدین اور شیخ حسام الدین میں اختلاف ہے، سید محمد گیسو دراز اور ایک جماعت درویشوں کی اس طرف گئی ہے کہ بی بی عصمت سے ہیں۔ اور سید شمس الدین طاہر اور درویشوں کے ایک گروہ نے کہا ہے کہ بی بی امۃ اللہ سے ہیں۔ واللہ اعلم [1]

حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اوشی قدس اللہ سرہ العزیز

آپ ترکستان کے شہر اوش میں پیدا ہوئے [2] اور تعلیم و تربیت کے بعد بغداد میں حضرت خواجہ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے مرید ہوئے۔ جب حضرت خواجہ بزرگ ہندوستان تشریف لائے تو حضرت بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ بھی ان کی زیارت کے لیے بغداد سے ہندوستان آئے، پہلے ملتان پہنچے اور شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے مہمان رہ کر دہلی آئے اس کے بعد آپ نے حضرت خواجہ بزرگؒ کی خدمت میں حاضر ہونے کی خواہش ظاہر کی، لیکن انھوں نے جواب دیا کہ قرب روحانی کے آگے بعد مکانی کوئی چیز نہیں، [3] تمہیں دہلی ہی میں قیام کرنا چاہیے، چنانچہ حضرت قطب صاحب اس کے بعد دہلی میں ہی رہے۔

حضرت خواجہ نے دہلی میں بڑا اثر حاصل کیا، خاص و عام ان کے عقیدتمند ہوئے، طبیعت میں استغراق و انجذاب کا بھی ایک بڑا عنصر تھا۔

[1] اخبار الاخیار اردو ص ۱۶۳ - ۱۶۴
[2] آب کوثر ص ۲۱۳ - ۲۱۵

سیر الاولیاء میں سلطان المشائخ کے حوالے سے لکھا ہے:

"شیخ الاسلام قطب الدین کا ایک چھوٹا بیٹا تھا، وہ فوت ہو گیا، اس کو دفن کر کے لوگ جب واپس آئے تو آپ کی زوجہ محترمہ نے رونا شروع کر دیا، آپ نے ایک رفیق شیخ بدر الدین غزنوی سے پوچھا: کیا ماجرا ہے؟ انھوں نے کہا: مخدوم زادہ فوت ہو گیا ہے، اس کی والدہ غم سے بے قرار ہو کر آہ و زاری کر رہی ہیں، آپ افسوس کرنے لگے اور فرمایا: کہ اگر مجھے اس کی علالت کا پتہ ہوتا تو میں ضرور اس کی زندگی کے لئے خدا سے دعا کرتا۔ یہ بیان کر کے سلطان المشائخ نے فرمایا: دیکھو استغراق کس درجہ کا تھا کہ اپنے بیٹے کی زندگی یا موت کی خبر نہیں" [1]

آپ کے حالات دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ شریعت اور طریقت کی جس کش مکش نے آگے چل کر ہندوستان کی تاریخ میں بعض ناخوشگوار صورتیں اختیار کیں آپ کے زمانے میں شروع ہو گئی تھی۔ سیر العارفین میں ہے: کہ اس زمانے میں شیخ الاسلام کا عہدہ خالی ہوا، سلطان شمس الدین التمش نے حضرت بختیار کاکی سے یہ عہدہ قبول کرنے کی خواہش کی، لیکن آپ نے منظور نہ کیا، بالآخر یہ عہدہ شیخ نجم الدین صغری کو ملا جو ایک باخدا بزرگ تھے اور حضرت خواجہ معین الدین کے عزیز اور عقیدتمند تھے، لیکن خواجہ بختیار کاکی سے ان کی نہ بن سکی۔ اس کی غالباً ایک وجہ یہ تھی کہ خواجہ صاحب کو سماع کا شوق تھا اور شیخ الاسلام اس پر اعتراض کرتے تھے۔ دوسری وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ شیخ الاسلام کو یہ بھی ناگوار تھا کہ لوگ خواجہ صاحب کا مجھ سے زیادہ ادب و احترام کرتے ہیں۔ خواجہ بزرگؒ نے اسی اختلاف کو مٹانے کے لئے خواجہ قطب الدین کو اجمیر لے جانا چاہا۔ مگر معتقدین کے اصرار کی وجہ سے یہ ارادہ ترک کرنا پڑا۔

سلطان التتمش خواجہ بختیار کاکی کا بڑا معتقد تھا، چنانچہ اس نے خواجہ قطب کی جب آمدِ دہلی کی خبر سنی تو خدا کا شکر بجا لایا اور حضرت سے شہر دہلی کے اندر قیام کرنے کی درخواست کی۔ حضرت خواجہ نے پانی کی کمی کے باعث یہ درخواست قبول نہ کی، مگر دوسرے موقعوں پر جب آپ اندرون دہلی تشریف لائے تو سلطان نے شاندار طریقہ سے استقبال کیا اور باہمی مراسم پیدا ہو گئے[1] بلکہ بعض تو کہتے ہیں کہ دہلی کا قطب مینار اسی پاک ہستی کی یادگار میں سلطان نے تعمیر کیا تھا[2]۔

سلطان التتمش درویشانہ طبیعت کا انسان تھا اور صوفیہ سے بڑی عقیدت رکھتا تھا، طبقات ناصری میں ہے:

"غالب ظن است کہ ہرگز بادشاہے بحسن اعتقاد و آب دیدہ، و تعظیم علماء و مشائخ مثل او از مادر خلقت در قماط سلطنت نیامدہ[3]"

خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کو سماع کا بڑا شوق تھا چنانچہ سلطان المشائخ کی زبانی ایک روایت ہے کہ ایک دفعہ آپ خواجہ قطب الدین سجستانی کی خانقاہ میں تشریف لے گئے، وہاں محفل سماع برپا تھی اور قوال یہ بیت گا رہے تھے: ؎

کشتگان خنجر تسلیم را ہر زماں از غیب جانِ دیگر ست

حضرت خواجہ کے مزاج میں ایسا تغیر ہوا کہ بے ہوش ہو گئے، ان کے ساتھی انھیں مکان پر لے آئے لیکن جب ہوش آیا تو قوالوں کو پھر اسی شعر کی تکرار کا حکم دیا، اور پھر وجد فرما کر حال میں مستغرق ہو گئے۔ یہ حالت چار دن رات رہی اور حضرت خواجہ کا بند بند درد کرنے لگا، بالآخر اسی حالت میں ۲۷ر دسمبر ۱۲۳۵ء/ ۱۴ر ربیع الاول ۶۳۳ھ کو اس دنیا کو الوداع کہا[4]۔

---

[1] سیر العارفین ص ۲۰-۲۱ ۔ [2] کیمبرج ہسٹری ج ۳ ص ۵۵

[3] آب کوثر ص ۲۱۳-۲۱۵ ۔ [4] فوائد الفواد ص ۱۴۴ بحوالہ آب کوثر ص ۲۱۶

شیخ حمید الدین الصوفی السعیدی ناگوری سوالی

آپ کا لقب سلطان التارکین اور کنیت "ابو محمد" ہے۔ حضرت خواجہ بزرگ معین الحق والدین کے منجملہ خلفاء اعظم ہیں تجرید و تفرید میں آپ کا قدم راسخ تھا مقبول بارگاہ خداوندی تھے۔ آپ کی ہمت بہت عالی تھی۔

تصوف میں آپکی شان بہت بڑی اور قواعد طریقت کے بیان میں آپ کا مقام بلند تھا۔ سلسلۂ نسب حضرت سعید بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر منتہی ہوتا ہے۔ آپ مشائخ قدمائے ہند سے ہیں، عمر آپ کی دراز ہوئی، فرماتے تھے کہ:

"فتح دہلی کے بعد پہلا لڑکا جو مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوا تھا وہ میں تھا۔"

حضرت خواجہ معین الدین رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے سے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے تک رہے۔ احتمال ہے کہ شاید ملاقات بھی ہوئی ہو۔ دانشمند علم شیخ نظام الدین اولیاؒ نے ان کے کلمات کو ان کی تصنیفات سے انتخاب کر کے خود لکھا تھا، صاحب سیر الاولیا نے نقل کیا ہے:

"خواجہ معین الدین چشتیؒ نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ جس کو جو مانگنا ہو طلب کرے کہ یہ وقت قبولیت کا ہے۔ ایک شخص نے دنیا مانگی، دوسرے نے عقبیٰ طلب کی۔ خواجہؒ نے شیخ حمید الدینؒ سے ارشاد فرمایا کہ تم بھی کچھ مانگو۔ انھوں نے کہا مجھکو کچھ درکار نہیں، میں طالب مولیٰ ہوں۔ پھر خواجہ قطب الدینؒ سے وہی کلمہ ارشاد فرمایا۔ آپ نے

عرض کیا: بندہ کو کچھ اختیار نہیں آپ کو اختیار ہے ۔ اس کے بعد حضرت اجمیریؒ نے ارشاد فرمایا: "دنیا کو چھوڑنے والے، عقبیٰ سے بے پروا سلطان التارکین حمید الدین صوفی ہیں"۔

اسی وقت سے آپ کا لقب سلطان التارکین ہوا۔

نقل ہے کہ:۔

"سوال میں، جو ناگور کے قریب ایک گاؤں ہے، آپ کی زمین اس قدر محدود تھی کہ اس میں خیمہ کھڑا ہو جائے۔ آپ اس کو خود کاشت کرتے تھے اور پیداوار سے خود اپنا اور متعلقین کا کفاف حاصل فرماتے تھے، آپ کی وفات ۹ ربیع الاول ۶۷۳ھ میں ہوئی۔ مزار پاک ناگور میں ہے[1]

ولادت

آپ کی ولادت کی تاریخ اور سال تحقیق کے ساتھ معلوم نہ ہو سکے، کتب معتبرہ میں صرف اتنا درج ہے کہ آپ ہندوستان کے مشائخ متقدمین میں سے تھے اور آپ نے طویل عمر پائی۔

شہاب الدین غوری نے ۵۸۸ھ میں دہلی فتح کی اس کے بعد ۶۰۲ھ میں ایبک دہلی کا بادشاہ ہوا۔ لہٰذا آپکے (مندرجہ بالا) فرمان کے مطابق آپؒ کی ولادت انھیں سالوں میں ہوئی ہوگی۔ محققین نے لکھا ہے کہ آپ خواجۂ بزرگ حضرت معین الدین حسن سنجری اجمیریؒ کے زمانے سے لیکر شیخ نظام الدین اولیاؒ کے عہد تک حیات رہے اس لئے بہت ممکن ہے کہ سلطان جی کے ابتدائی دور میں ان حضرات کی باہم باہم ملاقات بھی ہوئی۔

آپ کے نانا شیخ سعیدی عربی نژاد تھے، جب آپ کے والد محترم محمد صوفی

---

[1] اخبار الاخیار اردو ص ۴۳

جو کہ ایک جید عالم اور کامل درویش تھے، لاہور سے دہلی تشریف لائے تو شیخ سعیدی عربی نے اپنی لڑکی کا نکاح اُن سے کر دیا، کچھ عرصہ تک محمد صوفی دہلی میں ہی مقیم رہے اور وہیں سلطان التارکین کی ولادت باسعادت ہوئی۔

آپ کے نانا منجم تھے انھوں نے اپنی لڑکی سے فرمایا تھا کہ تمہارے لڑکا تولد ہوگا جس کا آدھا جسم سبز اور سینہ ابھرا ہوا ہوگا۔ اور وہ زبردست عالم ہوگا۔ مگر وہ لڑکا میرے انتقال کے بعد پیدا ہوگا۔ شیخ بزرگ کی والدہ نے یہ سنکر بہت افسوس کیا کہ میں ایسے لڑکے کا کیا کروں گی جو میرے باپ کے مرنے کے بعد پیدا ہوگا۔ چنانچہ وہ اپنے گھر کے قریب ایک حوض میں جا گری۔ مگر اللہ تعالیٰ کو اس کی جان بچانی مقصود تھی، اس کو صحیح سلامت نکال لیا گیا، کچھ عرصہ بعد شیخ بزرگ پیدا ہوئے، ان میں وہ سب نشانیاں موجود تھیں جن کی پیشین گوئی ان کے نانا مرحوم نے کی تھی نصف جسم سبز اور سینہ ابھرا ہوا تھا۔

والدہ محترمہ

حضرت سلطان التارکین کی والدہ محترمہ بھی اپنے زمانے کی رابعہ تھیں، آپ فرمایا کرتے تھے اگر کوئی عورت میری والدہ سے بہتر اور بزرگ ہوتی تو میں اس کے بطن سے پیدا ہوتا۔ گویا آپ کی والدہ محترمہ اپنے زمانے کی بہترین اور بزرگ ترین عورت تھیں[1]۔

زوجہ محترمہ اور اولاد

آپ کی بیوی کا نام خدیجہ تھا، یہ سیدانی اور قاضی قصبہ لاڈنو کی صاحبزادی تھی جو معین القضاۃ ہمدانی کی اولاد میں سے تھے۔

سیر العارفین میں شیخ جمالی نے لکھا ہے کہ آپ زہد واتقاء اور ورع میں اپنے دور کی رابعہ تھیں، ہفتہ میں ایک بار نیم کے پتوں سے روزہ افطار کیا کرتی تھیں۔

---

[1] ص ۸۹ سلطان التارکین

رحم دل اور سخی اس قدر تھیں کہ کسی سوالی کو اپنے گھر سے خالی ہاتھ نہیں لوٹاتی تھیں۔
سلطان التارکین کے دو صاحبزادے شیخ عزیز الدین اور شیخ مجیب الدین آپ ہی کے بطن سے تھے[1]

بیعت

مولانا شمس الدین حلوائی آپ کے استاد تھے، آپ فرمایا کرتے تھے: کہ میرے تین پیر ہیں: خواجہ بزرگ معین الدین خلافت کے پیر، شیخ حمید نوئی خرقہ کے یعنی روحانی پیر۔ اور مولانا شمس الدین حلوائی علم ظاہر و صحبت کے پیر۔ صاحب سیر الاولیاء نے حضرت خواجہ بزرگؒ آپ کے مرید و خلیفہ ہونے کا واقعہ اس طرح رقم کیا ہے، کہ آپ نہایت حسین و جمیل تھے، ایک روز جب آپ خواجہ بزرگ کے سامنے سے گذر رہے تھے تو حضرت خواجہ کی نظر آپ پر پڑی، خواجہ بزرگ نے فرمایا:

"کس قدر حسین و جمیل شخص ہے جس پر دنیا فریفتہ ہے، اگر یہ میرے پاس آئے تو اللہ بھی اس کا شیدا ہو جائے۔"

چنانچہ آپ خواجہ بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوئے، جب آپ کی نظریں اس آفتاب ولایت پر پڑیں تو خیرہ ہو کر رہ گئیں، معدن جود و کرم، اور مصدر لطف و عطا خواجہ بزرگ نے جب آپ کو جوہر قابل پایا تو اپنی دولت خلافت سے نوازا، آپ نے اپنے اندر ایک تبدیلی محسوس کی، حجابات جو حائل تھے اٹھ گئے دنیا کی محبت سے دل یکسر خالی ہو گیا اور آپ نے زندگی کی نئی راہ اختیار کی جو کچھ آپ کے پاس تھا وہ فقیروں اور درویشوں میں تقسیم کر دیا اپنی اور اپنے بال بچوں کی کفالت کے لئے محض دس جریب زمین موضع سوال میں رکھی اور تمام عمر اسی پر قانع رہے۔

---

[1] ص ۹۳ سلطان التارکین۔

سیرت و اخلاق حمیدہ

حضرت سلطان التارکین سادہ رہائش اور اعلیٰ افکار کے مصداق تھے۔ آپ گدڑی پہنا کرتے تھے فتوح اور نذرانہ قبول نہیں کیا کرتے تھے۔ آپ کے پیر و مرشد حضرت خواجہ اجمیریؒ آپ سے بہت خوش تھے۔ خواجہ بزرگؒ نے آپ کو سلطان التارکین کے گرانقدر لقب سے نوازا تھا۔

حضرت سلطان التارکین اتباع سنت کے بڑی سختی سے کاربند تھے، اپنے مریدین اور متعلقین کو علم فرائض حاصل کرنے کی تلقین فرمایا کرتے تھے، سرور الصدور میں لکھا ہے:

"فرمودند اگر فرائض بحث کنند نیکو باشد کہ اول علمے کہ مقصود باشد علم فرائض باشد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم فرمودہ است کہ تَعَلَّمُوا الفَرائِضَ وَعَلِّمُوا

آپ صحیح دینی جذبہ پیدا کرنے کے لئے بے چین رہتے تھے اور چاہتے تھے کہ ہر مسلمان دین کے بنیادی مسائل اوامر و نواہی اور فرائض سے پوری طرح واقفیت حاصل کرے، آپ نے ہمیشہ علم حدیث کو تصوف پر فوقیت دی چنانچہ ایک دن اپنے ایک مرید سے فرمایا:

"مرا ایں جا مشغولی است کہ خلق ناگور درین وقت از من علم احادیث می شنوند ومرا فرصت نیست کہ دریں میان ترا علم تصوف بیاموزم۔"

مجھے یہاں یہ مشغولیت ہے کہ آج کل ناگور کے لوگ مجھ سے علم حدیث سننے میں مجھے فرصت نہیں کہ اس دوران تجھے علم تصوف سکھاؤں۔

نماز نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ ادا فرماتے تھے کہ ایسی دو رکعت بھی پڑھنا ہر شخص کا کام نہیں، جب شیخ نماز پڑھنے کے لئے دست مبارک سینہ پر

رکھتے تو اس طرح حضوری قلب کے ساتھ مشغول ہوتے کہ دنیا و ما فیہا سے بے خبر ہو جاتے چنانچہ ایک مرتبہ آپ نہر والی مسجد میں نماز پڑھ رہے تھے وہاں آپ کے استاد مولانا شمس الدین حلوائی[1] اور چند دیگر بزرگ اجمیر سے آپ سے ملاقات کی غرض سے تشریف لائے شیخ بزرگ بدستور اپنی نماز میں مشغول رہے کافی دیر ہو گئی اور یہ حضرات انتظار کی تاب نہ لا کر واپس تشریف لے گئے۔ جب کسی اور جگہ ملاقات ہوئی تو مولانا شمس الدین نے شکوہ کیا اور فرمایا کہ ہم تو تمہاری ملاقات کے لئے آئے اور تم نماز ہی پڑھتے رہے آپ نے فرمایا، قبلہ مجھکو بالکل خبر نہیں کہ مسجد میں کون آیا اور کب گیا[2]

سرور الصدور میں مذکور ہے کہ شیخ بزرگ کے سامنے شیخ عبداللہ تستری کے چلہ کی اسناد پڑھی جا رہی تھیں اس میں لکھا تھا کہ آدم علیہ السلام کے ایک فرزند کا نام "سقنار" تھا ان کی دوستی جنوں سے تھی کسی جن نے ان کو ایک دعا بتلائی تھی جس کے باعث وہ بھوک اور پیاس سے بے نیاز تھے اور اسی سال بعد ایک دفعہ سجدہ سے سر اٹھاتے۔ اس طرح اپنے خالق کی عبادت کیا کرتے تھے، شیخ فریدالدین نے یہاں تک پڑھا تھا کہ شیخ بزرگ کی زبان سے کلمہ سبحان اللہ نکلا، یہ کلمہ سنکر شیخ فریدالدین خاموش ہو گئے۔ شیخ بزرگ نے فرمایا کہ میں نے آج اپنی عمر کا حساب لگایا تھا جس کی رو سے میں اسی سال کا ہو گیا ہوں اور اب تک میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہوں۔ اس حکایت سے اللہ تعالیٰ نے مجھے آگاہ فرمایا ہے کہ: حمید تو اپنے اسی سال کا کیا حساب لگاتا ہے ہمارا ایک بندہ گذرا ہے جو اتنی مدت میں تو ایک سجدہ بجا لاتا تھا[3]

آپ وَاَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ کی اتباع میں کسی سوالی کا سوال رد نہ فرماتے

---

[1] ص ۱۰۳ - [2] ص ۱۰۳ اسلطان التارکین

اور خطاکار کی خطا معاف فرما دیتے۔

خواجگی نامی ایک شخص سے آپ کچھ رنجیدہ خاطر تھے۔ ایک دفعہ شیخ عزیزالدین نے آپ سے عرض کیا:

بابا! خواجگی اکثر آپ کے پاس آتے ہیں مگر آپ ان سے نہ معلوم کیا فرما دیتے ہیں کہ وہ اٹھ کر چلے جاتے ہیں، ایسی بات کیوں نہیں فرماتے کہ وہ اٹھ کر نہ جائیں۔

آپ نے فرمایا:

"عزیز او آمدنی نیست اگر من بدانم کہ او آمدنی باشد در خانہ او روم و سر قدمش نہم و او را بیارم"۔

ترجمہ:- "پیارے وہ آنے والا نہیں، یہاں ویسے ہی آجاتا ہے، اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ وہ آنے والا ہے تو اس کے گھر جاؤں اور اسکے پیروں پر سر رکھ کر اس کی خوشامد کرکے اسے لاؤں"۔

کچھ عرصہ بعد خواجگی نے یہ غزل لکھ کر آپ کی خدمت میں بھیجی:

عیسیٰ نفس ست یار دم از من دریغ داشت — یار عیسیٰ نفس ہے مگر اسے مجھ پر دم کرنے میں دریغ ہے

بیمار او شدم قدم از من دریغ داشت — میں اس کا بیمار ہوں مگر اسے آنے میں دریغ ہے

من چون کبوتران بوفا طوق دار او — میں قمری کی طرح اسکی وفا کا طوق پہنے ہوئے ہوں

او کعبہ من زین جرم از من دریغ داشت — وہ میرا کعبہ ہے بس اس جرم میں مجھے محروم کر رکھا ہے

آخر چہ سستی است ازاں آفتاب روئے — آخر اس آفتاب جیسے چہرے والے کی کیا سستی ہے

کز بوئے خود بہ صبح دم از من دریغ داشت — کہ صبح کے وقت مجھے اپنی خوشبو سے محروم رکھا ہے

رقعہ کی پشت پر ایک دائرہ بنا کر اس کے بیچ میں ایک شکل بنائی۔ شیخ بزرگ نے جب یہ رقعہ پڑھا تو قلم دوات منگا کر آپ نے اس کے جواب میں شعر لکھا جو غالباً آپ ہی کا ہے۔

چشم چوں برائے روئے نکویت گریست فریاد برآورد و بزاری بگریست
گر با تو بودم دریغ باید مرد ور بے تو بودم دریغ باید زیست

آپ نے یہ جواب لکھ کر خواجگی کو بھجوانا چاہا۔ شیخ عزیزالدین نے حضرت شیخ سے دریافت کیا کہ بابا! اس رقعہ کی پشت پر گول گول سی کیا شکل بنی ہے۔ آپ نے فرمایا: "جس رقعہ پر یہ شکل بنائی جاتی ہے وہ مسترد نہیں کیا جاتا۔" شیخ عزیز نے عرض کیا: "بابا آپ بھی اس رقعہ کو مسترد نہ فرمائیں"۔ یہ سنکر شیخ بزرگ اٹھے اور مع حاضرین خواجگی کی مزاج پرسی کے لئے تشریف لے گئے۔ یہ ہے آپ کی عفو درگذر کی کیفیت۔

سفر حج کے متعلق حضرت سلطان التارکینؒ اپنا ایک واقعہ بیان فرماتے ہیں کہ:۔

دوران سفر حج جب ہمارا گروہ جو فقراء پر مشتمل تھا ایک مقام پر پہنچا تو میرے ساتھیوں نے مجھ سے کہا کہ آج تک تو ہم مانگ کر لائے ہیں آج آپ مانگ کر لائیں گے اور ہم لوگوں کو کھلائیں گے۔ آپ یہ سنکر خاموش ہو گئے اور سوچنے لگے کہ حاجت براری کے لئے خدا کے سوا میں کس کے سامنے ہاتھ پھیلاؤں، کیونکہ کسی کے سامنے اب ہاتھ پھیلایا نہیں جاتا۔ ادھر دوستوں کی فرمائش کا خیال۔ بہرحال خیالات کی اسی کشمکش میں آپ جھولی ہاتھ میں لٹکا کر چل پڑے مگر منہ سے کسی قسم کی صدا نہ لگاتے تھے، فرماتے ہیں کہ ایک عورت مجھے بغور دیکھ رہی تھی، میں نے کہا: "بی بی! کیا دیکھتی ہو؟ اور کیا سوچتی ہو؟"۔ اس نے جواب دیا کہ اے فقیر میں یہ سوچ رہی تھی تو گداگر نہیں ہے۔ آپ نے کہا: کبھی تو ٹھیک ہو، یہ زندگی میں پہلا اتفاق ہے، اس نے کہا:

اپنی جھولی دے، وہ جھولی دودھ اور چاول سے اتنی بھر لائی کہ دوسرے در پر جانے کی ضرورت نہ رہی۔ میں اپنی قیام گاہ پر واپس آگیا اور کھانے سے بھری ہوئی جھولی ساتھیوں کے سامنے رکھدی سب نے خوش ہو کر کھایا۔ پھر آپ نے ارشاد فرمایا: "جو شخص اپنے رب کو رزق رسانی کے باب میں نہیں پہچان سکتا وہ اس کو کسی مقام میں نہیں پہچان سکتا"۔[1]

مجاہدۂ نفس

سلطان التارکین کی زندگی عسرت و تنگی سے بسر ہوتی تھی مگر اس فقر و فاقہ کو آپ باعث فخر سمجھتے تھے۔

سرور الصدور میں مذکور ہے کہ:

حضرت شمس الدین حلوائی کو جو آپ کے استاد تھے کسی بزرگ نے خواب میں دیکھا، فرماتے تھے کہ ... محمد دنیا کی طرف مطلق توجہ نہ کی۔ مَا مَالَ اِلَی الدُّنیَا قَطُّ۔

آپ کا ارشاد ہے:

"ترک دنیا کی راہ صرف یہی ہے کہ درویش عالی ہمت ہو"

یٰسین نامی آپ کا ایک مرید تھا جو نہایت دولت مند اور صاحب ثروت تھا مگر کسی حادثہ کے باعث بالکل مفلس ہو گیا تھا اس کے لئے آپ فرمایا کرتے تھے کہ میرا جی اکثر چاہتا ہے کہ میں اس کے لئے اللہ تعالیٰ سے کچھ مانگوں مگر پھر یہ خیال مانع رہتا ہے کہ دنیا میں اس کو پھر کیوں مبتلا کروں۔ آپ کا ارشاد ہے کہ: "خدائے عزوجل اپنے بندوں سے یہ پوچھے گا کہ دنیا سے میرے واسطے کس قدر زہد لائے ہو۔؟"

---

[1] ص ۱۰۰۔ سلطان التارکین۔

ایک مرتبہ حاکم ناگور نے چاہا کہ آپ کی خدمت میں کچھ نذرانہ پیش کرے مگر اسے خیال آیا کہ کہیں آپ اس کے نذرانے کو مسترد نہ کردیں اس لئے شیخ وحیدالدین سے اپنی خواہش ظاہر کی انھوں نے اس کو بتایا کہ شیخ کے مسلک میں نذرانہ روا نہیں ہے، پھر اسکی اپنے رشتہ دار سے جو آپ کا مرید تھا اپنا یہ خیال ظاہر کیا اس نے اس سلسلہ میں شیخ عزیزالدین کی وساطت حاصل کی جب شیخ عزیزالدین نے آپ سے حاکم ناگور کی سفارش کی تو آپ نے، بیوی صاحبہ سے مخاطب ہو کر فرمایا: "تمہیں معلوم ہے کہ میں کسی قسم کا نذرانہ قبول نہیں کرتا"۔ اس پر بی بی صاحبہ نے فرمایا: "آپ اپنے زہد و ترک پر قائم رہیں اللہ ہمارا مددگار ہے"۔

ارشاد خداوندی ہے:

یَا اَیُّھَا الرُّسُلُ کُلُوا مِنَ الطَّیِّبٰتِ	اے گروہ انبیاء ورسل، نفیس یعنی حلال
وَاعْمَلُوا صَالِحًا :-	کھاؤ اور عمل صالح کرو۔

اس سے معلوم ہوا کہ عمل صالح سے پہلے اکل حلال کا حکم ہے۔ اس کے قریب ایک حدیث کا مضمون ہے:

"اپنے ہاتھ کی کمائی سے زیادہ حلال رزق اور کوئی نہیں"

چنانچہ ہم انبیاء کرام علیہم السلام کی فہرست میں دیکھتے ہیں کہ حضرت زکریا علیہ السلام بڑھئی تھے اور حضرت داؤد علیہ السلام آہن گر اور حضرت سلیمان علیہ السلام باہمہ شوکت و وقارِ سلطنت، بوریاں بُن کر گذر اوقات فرماتے تھے۔

حلال روزی حاصل کرنے کا ایک ذریعہ زراعت بھی ہے۔ چنانچہ سلطان التارکین حضرت صوفی حمیدالدین ناگوری ؒ نے اپنے واسطے پیشۂ زراعت پسند فرمایا، پرگنہ ناگور موضع سوال میں آپ ایک بیگہ زمین میں خود کاشت کرکے اپنی اور اپنے بال بچوں کی روزی حاصل کرتے تھے۔

لباس کا یہ حال تھا کہ ایک چادر کمر پر اور دوسری جسم پر پڑی رہتی تھی بیوی صاحبہ کو دوپٹہ بھی میسر نہ تھا پیراہن کا دامن سر پر ڈال لیا کرتی ہیں مگر اس عسرت و تنگی میں بھی ایک شان استغنا تھی ؎

ایں دو روزہ حیات نزد خرد
چہ خوش و ناخوش چہ نیک و چہ بد

اکل حلال انسان کے دل اور جوارح کو اللہ کی یاد کی طرف مائل کرتا ہے اور اکل حرام و مشتبہ دل کی نورانیت زائل کرکے انسان کو مالکِ حقیقی کی بغاوت پر آمادہ کرتا ہے، سلطان محمود غزنوی جب فتح ہندوستان کی دعا کی غرض سے خواجہ ابوالحسن خرقانی ؒ کی جھونپڑی پر حاضر ہوا تو خواجہ ؒ نے سنت کے مطابق کھانا پیش کیا جو رات کے باسی ٹکڑوں اور پانی کے ایک پیالہ پر مشتمل تھا، محمود نے کہا: "حضرت مجھے ڈر ہے کہ کہیں یہ باسی روٹی میرے معدہ کو خراب نہ کردیں۔ خواجہ نے اس کی رد میں فرمایا: "محمود مجھے خطرہ ہے کہ کہیں یہ مشتبہ اور مشکوک مال جو تو میرے نذرانے کے لئے لایا ہے میرے دل کو زنگ آلود نہ کردے"۔

کام و دہن جب حلال و طیب کی چاشنی کے ذوق آشنا ہو جائیں تو حرام اور مشکوک و مشتبہ مال ان کے لئے زہر سے کم نہیں جسے بقائمی ہوش و حواس کبھی بھی روا نہیں رکھا جا سکتا۔ سلطان التارکین سے زیادہ اس بھید کا محرم اور کون ہو سکتا تھا، چنانچہ ایک مرتبہ حاکم ناگور نے شاہ وقت کی جانب سے کچھ زمین اور کچھ نقد روپیہ آپ کی خدمت اقدس میں پیش کیا اور اس کو قبول کرنے کی درخواست کی تاکہ آپ فارغ دلی سے عبادت الٰہی میں مشغول رہیں، حضرت صوفی علیہ الرحمۃ نے فرمایا کہ جب میرے خواجگان میں سے کسی نے نذرانہ و فتوح قبول نہیں کی تو میں کیسے کر سکتا ہوں، میرے واسطے میری ایک بیگہ زمین کافی ہے، آپ نے معذرت چاہی

اور یہ نذر واپس کردی، اس حاکم نے آپ کی قناعت اور مجاہدۂ نفس کا حال بادشاہ سے عرض کیا جس پر بادشاہ نے اس کو ایک گاؤں کا فرمان اور پانچ صد روپیہ بھیجکر لکھا کہ یہ نذرانۂ عقیدت میری جانب سے حضرت صوفی صاحب کی خدمت میں پیش کرکے اسے قبول کرنے کی درخواست کرو۔ چنانچہ حاکم ناگور اس فرمان شاہی کی تعمیل میں پھر حضرت سلطان التارکین کی خدمت میں حاضر ہوا اور بادشاہ کا نذرانہ پیش کیا، آپ نے اس کو کچھ فرمایا نہیں، اٹھ کر گھر میں تشریف لے گئے اور بیوی سے فرمایا کہ بادشاہ نے ایک گاؤں کا فرمان اور پانچ سو روپیہ بھیجا ہے اس کو قبول کیا جائے کہ نہیں۔ اس وقت بیوی صاحبہ سر برہنہ تھیں اپنے کرتہ کا دامن سر پر ڈال رکھا تھا، حضرت کا تہ بند بھی بوسیدہ ہو کر پھٹ چکا تھا۔ اللہ رے شان استغنا بیوی صاحبہ نے عرض کیا:

"اس کو قبول کرکے اپنے فقر کو باطل کروگے؟ میں نے دو سیر سوت کاتا ہے اس کی قیمت سے میری چادر اور دوپٹہ اور آپ کا تہ بند بن جائیں گے۔"

بیوی کا یہ جواب سنکر آپ بے حد خوش ہوئے اور آکر حاکم سے کہدیا کہ "مجھے ان چیزوں کی ضرورت نہیں"[1]

یہ تعمیل ہے اس ارشاد نبوی کی کہ:

"اپنے شکموں کو گرسنہ رکھو، جگروں کو تشنہ اور تنوں کو برہنہ تاکہ اپنے رب کو دیکھ سکو"

اندرون از طعام خالی دار　　تا دروں نور معرفت بینی

سیر العارفین میں حضرت شیخ جمالی لکھتے ہیں کہ جب شیخ نجم الدین صغریٰ

---

[1] ص ۱۱۱ سلطان التارکین۔

شیخ الاسلام دہلوی نے حضرت جلال الدین تبریزی پر تہمت لگائی تو اس مقدمہ کے انفصال کے لئے سلطان شمس الدین نے حضرت سلطان التارکین اور شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا ملتانی کو بلایا تھا۔ اس موقع پر ان ہر دو بزرگوں میں فقر و غنا پر کافی گفتگو ہوئی؛ سلطان التارکین نے شیخ الاسلام ملتانی سے استفسار کیا؛

"مخدومی! اس میں کیا حکمت ہے کہ جس جگہ مال و متاع رکھا جاتا ہے وہاں سانپ بھی رہنے لگتا ہے اور یہ مشہور بھی ہے کہ جس جگہ خزانہ ہوگا وہاں سانپ بھی ہوگا اور جہاں پھول ہوں گے وہاں کانٹے بھی ہوں گے حالانکہ سانپ اور مال میں نہ ظاہری مناسبت ہے نہ باطنی پھر دونوں کی یکجائی کا کیا سبب ہے۔؟؟"

شیخ الاسلام بہاء الدین نے جواب دیا کہ اگرچہ دونوں میں ظاہری مناسبت تو نہیں مگر باطنی ضرور ہے، وہ یہ کہ زہر کے باعث سانپ بھی ہلاکت ہے اور مال بھی اکثر آدمیوں کی ہلاکت کا موجب بنتا ہے"۔ حضرت صوفی علیہ الرحمہ نے فرمایا: "بقول آپکے سانپ اور مال اس معنی میں مترادف ہیں، یا یوں کہہ لیجئے کہ جو مال رکھتا ہے سانپ بھی رکھتا ہے۔

شیخ بہاء الدین صاحب دولت و ثروت ہونے کی بناء پر سمجھ گئے کہ حضرت صوفی علیہ الرحمۃ کا کنایہ ان کی طرف ہے اور فوراً جواب دیا کہ "مال و دولت اگرچہ سانپ ہے مگر اس شخص کو گزند نہیں پہنچاتا جس کو منتر آتا ہو"۔ صوفی علیہ الرحمۃ نے فرمایا کہ "یہ کیا ضروری ہے کہ زہریلے اور مہلک جانور کو پالا جائے جس کے واسطے منتر کی محتاجی رہے۔

شیخ بہاء الدین لاجواب ہو کر تھوڑی دیر تو خاموش رہے اس کے بعد اپنے سر شیخ طریقت شیخ شہاب الدین سہروردی کی طرف بذریعہ مراقبہ رجوع

کیا اور ان کے ایمار سے صوفی علیہ الرحمۃ کو کہا :

"آپ کی درویشی اتنی حسین و جمیل نہیں جس کو نظر لگ جائے اور ہماری درویشی ایسی ہے کہ اگر ہم اپنے رخ پر دنیا کی سیاہی کا وسمہ نہ لگائیں تو ہمیں نظر لگ جانے کا احتمال ہے"۔

سیر العارفین اور دیگر کتب میں ان حضرات کی گفتگو بس یہیں تک لکھی گئی ہے ، مگر حضرت نجم الدین پروانہ فتح پوری مصنف "مناقب التارکین" فرماتے ہیں کہ ان کے ہم خرقہ بھائی میاں قادر بخش افغانی فرماتے تھے کہ انھوں نے کسی کتاب میں پڑھا ہے کہ شیخ الاسلام بہاء الدین زکریاؒ ملتانی کے اس جواب پر حضرت صوفی علیہ الرحمۃ نے فرمایا :

"کہ آپ کی درویشی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی درویشی سے تو زیادہ حسین و جمیل نہیں ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: اَلْفَقْرُ فَقْرِیْ ، وَالْفَقْرُ مِنِّیْ ، یعنی فقر میری فقیری ہے اور فقر مجھ سے ہے"۔

آپ کے اس جواب کے آگے شیخ الاسلام لاجواب ہو کر خاموش ہو گئے کہ حضرت صوفی کا مقام ترک و سلوک میں بہت اعلیٰ ہے ۔

ملتان پہنچ کر شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا نے امتحاناً سونا چاندی بیلوں پر لدوا کر کسی بنجارے کے ہمراہ شیخ بزرگ صوفی کی خدمت میں ناگور شریف بھجوایا اور اس کو قبول کرنے کی درخواست کی ۔ آپؒ نے فرمایا کہ اس کو گنیسرنی تالاب کے میدان میں پھینک دو تاکہ مفلس و محتاج اُسے لوٹ لے جائیں ۔ بنجارے نے تعمیل حکم میں ایسا ہی کیا ، غریب غربا یہ سونا چاندی لوٹ کر لے گئے ۔

جب بنجارے نے رخصت چاہی تو آپ نے فرمایا کہ ہماری طرف سے کچھ اسی تالاب کے سنگریزے بھر کر شیخ الاسلام کے پاس لے جاؤ اور تحفۃً

پیش کرو ، بنجارے نے تعمیل حکم کی جب وہ ملتان پہنچا تو دیکھا کہ تمام سنگریزے سونے کے ہیں ؎

آنانکہ خاک را بہ نظر کیمیا کنند   آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند[۵۱]

ایک ہندو نے اس واقعہ کو اپنی زبان ہندی میں اس طرح قلم بند کیا ہے :-

بڑے پیر ملتان کے جہاں دین کا لشں   بالد بھری بہاؤ دین چشتی تارکین کے پیش
گنیسرنی کے چوک پر آرے بالد آئے   حکم کیا سلطان جی جھن میں لے لوٹنے
کنکر بہائے گون بچ کھوئے کنچن مال   تم کو میاں بہاؤ دین چشتی دی ارسال
بھیٹر پڑی جب گارٹی کون پکڑی آئے   حکم کیا سلطان جی جھن میں لیں لوٹائے

سلوک کے سلسلہ میں ایک مرتبہ ارشاد فرمایا :

"راہِ سلوک کا پہلا مرتبہ علم ہے ، علم حاصل کرنا ضروری ہے کیونکہ علم کے بغیر عمل درست نہیں ہوتا ۔ دوسرا مرتبہ عمل ہے کیونکہ عمل کے بغیر نیت کا وجود نہیں ، تیسرا مرتبہ نیت ہے ، نیت صحیح ہونی چاہئے کیونکہ صحیح نیت کے بغیر باطل کے علاوہ اور کوئی عمل نہیں ہوتا ، چوتھا مرتبہ صدق ہے ، صدق کا ہونا ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر عشق کا وجود نہیں ہوتا ، پانچواں مرتبہ عشق ہے کیونکہ عشق کے بغیر توجہ درست نہیں ہوتی ، چھٹا مرتبہ توجہ ہے اور توجہ اس لئے ضروری ہے کہ اس کے بغیر سلوک حاصل نہیں ہوتا ، ساتواں مرتبہ سلوک ہے ، سلوک اس لئے درکار ہے کہ اس کے بغیر حضوری حاصل نہیں ہوتی ، آٹھواں مرتبہ حضوری ہے ، حضوری اس لئے ضروری ہے تاکہ مقصود کا دیدار نصیب ہو ،

[۵۱] ص ۱۱۷ ۔ [۵۲] ص ۱۱۸ سلطان التارکین

آپ کا ارشاد ہے کہ آخرت کے عمل سے دنیا طلب نہیں کرنا چاہیئے بلکہ دنیا کو دنیا کے کاموں سے طلب کرنا چاہیئے، اسی مفہوم کو آپ نے اپنی اس رباعی میں بیان فرمایا ہے:

دنیا چو باآخرت حسابست مخواہ   عقبی چو بعاقبت عقابست مخواہ
از پیر مرید را نشانے عجب است   ہر چیز کہ آنست حجابست مخواہ

بغیر فنا بقا ممکن نہیں۔ کس قدر لطیف انداز میں یہ حقیقت واشگاف کی ہے:

تا در تو پندار ہستی باقی است   میداں بیقیں کہ بت پرستی باقی است
گفتی "پندار شکستم" رستم   ایں بت کہ تو پندار شکستی باقی است
تا یک نفس از نفس تو پیدا ست ہنوز   بر درگہ دل ز دیو غوغا ست ہنوز
تا سود و زیاں است در اندیشۂ تو   عشقت نہ بدرست کہ سودا ست ہنوز

کشف وکرامات کشف وکرامات سے کسی بزرگ کی بڑائی کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ کرامت کو اولیاء کرام رحمہم اللہ اسی طرح چھپاتے ہیں جس طرح عورت اپنے ایام حیض کو پوشیدہ رکھتی ہے۔ لیکن اخلاق حمیدہ تقوی، اتباع سنت اور ترکِ ماسوا اللہ ہی اس راہ کا سرمایہ ہے چھپانے کے باوجود کچھ نہ کچھ چھنک کر معلوم ہو جاتا ہے۔ سلطان التارکین کی بھی کچھ کرامتیں ظاہر ہوئیں، مثلاً:- "قصبہ ناگور میں ایک ہندو تھا جس کے متعلق آپ فرمایا کرتے تھے:

"یہ صاحب ولایت ونعمت ہے"۔ کیونکہ کرامت کو عقلی طور پر سمجھنا مشکل ہے اس لئے سامعین کو تعجب ہوتا کہ ایک کافر کو آپ ولی فرماتے ہیں، مگر ایسا ہی ہوا جیسا کہ آپ نے فرمایا تھا وہ ہندو مسلمان ہو کر

---

[1] ص ۱۰۴ سلطان التارکین۔

درجۂ ولایت کو پہنچا"۔

آپ اپنے مرشد خواجہ اجمیری قدس سرہٗ کی مسجد واقع اجمیر میں امامت فرماتے تھے۔ جب آپ تکبیر تحریمہ کہتے تو ہر مقتدی کو عرش اعظم نظر آتا تھا۔ مقتدی بھی بزرگ تھے وہ اسے اپنی کرامت سمجھتے، ایک دن آپ مسجد میں موجود نہ تھے اس لئے کسی اور بزرگ کو امامت کرنی پڑی، اس روز کسی کو عرش اعظم نظر نہیں آیا اور یہ راز منکشف ہوا کہ جلوۂ عرش اعلیٰ محض آپ کی بدولت نظر آتا تھا۔

تبحر علمی علمی اعتبار سے سلسلہ چشتیہ عالیہ بہت بلند ہے، عربی، فارسی اور ہندی تینوں زبانوں پر آپ کو کامل عبور تھا، قرآن وحدیث پر بڑی گہری اور وسیع نظر رکھتے، متقدمین مشائخ کی تصانیف پر پورا عبور تھا خود صاحب تصنیف تھے اپنی تصانیف میں قرآن واحادیث اور اقوال بزرگان مشائخ اس کثرت سے لاتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام مضامین آپکے ذہن میں اس قدر مستحضر ہیں کہ ضرورت کے وقت بلا تکلف نوکِ قلم پر آکر زینت قرطاس بنجاتے ہیں۔

سرور الصدور کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی تصانیف کثیر ہیں مگر اس وقت کچھ ہی ہمیں دستیاب ہوئی ہیں:

"۱۔ سرور الصدور، ۲۔ اصول الطریقۃ، ۳۔ رسالۃ السلوک،
۴۔ رسالہ چہار منزل، ۵۔ رسالۃ السماع، ۶۔ رسالۃ العشق،
۷۔ رسالہ سوال وجواب، ۸۔ دیوانِ حمید۔

مندرجہ بالا تصانیف کے علاوہ اور کچھ نہیں ملتا۔ مگر یہ کتابیں بھی بڑی اہم ہیں۔ یہ آپ کے دور میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں اور آج بھی یہ تصوف وسلوک کا گرانقدر سرمایہ ہیں"[1]۔

---

[1] ص ۱۳۲

وفات آپ کا وصال ۲۹ ربیع الآخر ۶۷۳ھ میں بعہد سلطان غیاث الدین ہوا اور ناگور کی سرزمین کا وہ پاک گوشہ آپ کی ابدی آرام گاہ بنا جہاں انوار و برکات کی ہمیشہ چھما چھم بارش ہوتی ہے۔[1]

ایک معتقد، فتح محمد عباسی ناگوری نے آپ کی وفات پر ذیل کا قطعہ کہا ہے:-

اے شاہِ تارکین، تو ئی واصلِ خدا	برنامِ پاک تو بکنم جانِ من فدا
اے شہسوار معرکۂ قرب ایزدی	مسند نشین ملک شرائع محمدی
مقبول ہر دو عالم و محبوب ذوالجلال	مطلوب جن و انس باین عظمت و کمال
از لطف خویش بر من مسکین نظر کنی	و ز لوح سینہ حادثہ و غم بدر کنی
امداد کن کہ از سر لطفت شوم قبول	مشغول ذکر باشم و بے خاطر ملول
فتحی ز جان معتقد خاندان تو	باشد قدیم مخلص بار و دمان تو
فتحی ز سال فوت تو ارتخ تارکین	بنماعدد ز ہجرت تا این زمان یقین
پرسد اگر کسے ز تو تاریخ سال را	از - تارکین ترک دہی حرف دال را

۶۸۱
۸ - ۳
۶۷۳ [1]

پسماندگان و خلفاء

حضرت شیخ بزرگ صوفی حمید الدین ناگوری رحمۃ اللہ علیہ کے دو فرزند تھے ۔ بڑے شیخ عزیز الدین اور چھوٹے شیخ نجیب الدین، چھوٹے صاحبزادے کا انتقال بچپن ہی میں ہو گیا تھا۔

---

[1] یہ طریقۂ تخرجہ کہلاتا ہے - ص ۱۲۹ سلطان التارکین

شیخ عزیز الدین آپ کا اسم مبارک محمد سعید صوفی ہے، آپ کا شمار صوفیائے کاملین میں ہوتا ہے۔ آپ اپنے والد بزرگوار کے مرید اور خلیفہ تھے، آپ عنفوانِ شباب ہی میں بحالت وجد و سماع واصل بحق ہو گئے، واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ:

"ایک رات کسی صوفی کے مکان پر محفل سماع گرم تھی، جب قوال نے یہ شعر پڑھا ؎

جاں بدہ و جاں بدہ و جاں بدہ   فائدہ گفتن بسیار چیست

یعنی زیادہ قیل و قال کا کیا فائدہ؟ جان دیدے، جان دیدے، جان دیدے۔

آپ نے زور سے ایک نعرہ مارا اور فرمایا "دادم دادم" اور جان بحق تسلیم کی۔"

یہ شعر آپ کے والد بزرگوار حضرت سلطان التارکین کا ہے ان کی ایک مشہور غزل ہے جس کا مطلع ہے ؎

مست شدی جستن خمار چیست
پست شدی گفتن اسرار چیست

یہ واقعہ ۲۲ رجب بروز دوشنبہ ۶۷۶ھ کو پیش آیا رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ۔

مزار آپ کا حضرت سلطان التارکین کے مزار کے برابر ناگور شریف میں ہے۔

آپ ایک عالم صوفی تھے، آپ نے تفسیر امام ناصر الدین لکھنا شروع ہی کیا تھا کہ واقعۂ مذکورہ پیش آ گیا اور آپ خدا کو پیارے ہو گئے، ان کے بعد ان کے صاحبزادے فرید الدین نے اس کام کو سرانجام دینا چاہا، اس پر حضرت شیخ بزرگ سلطان التارکین نے فرمایا:-

"فرید جو تفسیر تمہارے والد لکھ رہے تھے وہ ادیبانہ تھی مگر ذاکروں کے لئے جو تفسیر مفید ہے وہ راہ رو راد چہ کی ہے جو سعید الدین ہنسدال کے پاس ہے"۔

شیخ عزیز الدین کا ارشاد ہے: "درویش کے لئے بجز ایک زحمت زحمت ہی زحمت ہے اور تونگر کے لئے بجز ایک راحت زحمت ہی زحمت ہے"، دریافت کرنے پر اس کی وضاحت یوں فرمائی کہ:-

"درویش کی زحمت تو یہ ہے کہ وہ بھوکا رہتا ہے اور تونگر کی راحت یہ ہے کہ وہ شکم سیر رہتا ہے"۔

شیخ عبدالعزیز کے تین فرزند تھے: شیخ وحید، شیخ فرید، شیخ نجیب ان تینوں کے متعلق سلطان التارکین نے فرمایا تھا:

"وحید وحید من است وآنچناں	وحید میری طرح وحید و یگانہ و فرد
شد کہ وے فرمودہ بود، مجرد بے	ہے، اور فرید میرا صاحب سجادہ ہے،
تعلق، و فرید صاحب سجادۂ من است	اور نجیب صاحب دیوان ہے چنانچہ
نجیب صاحب دیوان است	آپ کے ارشادات صحیح ثابت ہوئے۔
ہم چناں واقع شد کہ او خبر دادہ۔	وحید دنیا سے بے تعلق اور آزاد رہے، فرید
	صاحب سجادہ ہے اور نجیب صاحب دیوان ہوئے۔

شیخ وحید الدین | آپ شیخ عزیز الدین کے فرزند اور حضرت سلطان التارکین کے پوتے ہیں، آپ کا نام شیخ احمد سعید صوفی اور عرف شیخ وحید الدین تھا، آپ کو ذوقِ سماع بہت اچھا تھا صاحب علمِ ظاہر و باطن اور عارف کامل تھے، اپنے دادا شیخ حمید الدین صوفی۔ سلطان التارکین کے مرید تھے، آپ پر سلطان التارکین کی خاص توجہ تھی، آپ فرمایا کرتے تھے کہ:

"وحید مجھ جیسا وحید (یکتا) ہے"۔ یہ تعریف دادا اور عارف کامل کی آپ کے حق میں بہت کافی ہے۔

آپ کے کئی صاحبزادے تھے مگر آپ کی نسل آپ کے صاحبزادے شیخ محمد رحمۃ اللہ علیہ سے چلی شیخ محمدؒ کے دو لڑکے تھے، بڑے شیخ نظام الدین، چھوٹے شیخ شمس الدین۔ بڑے صاحبزادے کی اولاد زیادہ تر قصبہ جھنجنوں میں ہے اور چھوٹے کی ناگور میں، مخدوم حسین ناگوری اور حاجی نجم الدین فتحپوری (صاحب مناقب الحبیب) شیخ نظام الدین کی اولاد میں ہیں۔ آپ کی وفات ۱۱ جمادی الثانی سنہ ٦٤٢ھ میں ہوئی۔ آپ کا مزار ناگور میں اپنے دادا بزرگوار کے قریب ہے[1]

شیخ نجیب الدین | آپ حضرت شیخ عزیز الدین کے بڑے صاحبزادے اور سلطان التارکین کے پوتے ہیں آپ کا نام ابراہیم سعید صوفی ہے اور عرف شیخ نجیب الدین وجد و سماع کے شائق، مکمل صوفی، اپنے دادا کے مرید اور صاحبِ علم ظاہر و باطن تھے۔ سلطان التارکین نے آپ کے لئے فرمایا:

"نجیب نجیب ہے اور صاحبِ دیوان"

سلطان المشائخ حضرت محبوب الٰہی سے آپ کی دوستی تھی۔ آپ کی وفات سنہ ٦٣٤ھ میں ہوئی۔

شیخ فرید الدین | آپ بھی شیخ عزیز الدین کے صاحبزادے اور سلطان التارکین کے پوتے ہیں نام شیخ محمد سعید صوفی لقب فرید الدین چاک پراں ہے۔ وجہ تسمیہ یہ ہے کہ قریب ایک من وزنی چاک، جو ناگور کے لال پتھر کا

---

[1] ص ۳۱۲ سلطان التارکین

بنا ہوا تھا۔ گلے میں ڈال کر بحالت سکر آپ ناگور سے دہلی تشریف لے گئے تھے۔
حضرت محبوب الٰہی کے ہم عصر، صاحب مقام اور جامع علم ظاہر و باطن تھے، وجد و سماع کے بے حد شوقین، اپنے دادا کے مرید اور خلیفہ تھے، اپنے دادا کے وصال کے بعد ان کے سجادہ نشین ہوئے۔ اپنے مرشد اور دادا جان کے ملفوظات کو کتابی صورت میں مرتب فرمایا جو سرور الصدور کے نام سے موسوم ہے۔ ناگور کی بجائے آپ نے سکونت دہلی میں اختیار کرلی تھی۔ بیگم پور مہرولی کے ماحول میں وجے منڈل کے قریب آپ کا مزار ہے۔ یہیں آپ رہتے تھے اور وہ پتھر بھی یہاں پڑا ہوا ہے جس کی وجہ سے آپ کو چاک پراں کا لقب ملا۔ سن وفات ۷۳۱ھ۔

در لقائے حبیب شد معدوم

۷۳۱ھ

شیخ فریدالدین رحمۃ اللہ علیہ کے سات صاحبزادے تھے، اور ہر ایک اپنے والد بزرگوار کے مرید اور خلیفہ تھے صاحب علم ظاہر و باطن تھے۔ تفصیل یہ ہے:
شیخ اوحدالدین احمد — عزیزالدین — ناصح الدین — معین الدین
مظہرالدین — سعیدی بزرگ — سعیدی خورد
سلطان محمد تغلق کو مشائخ سے خصوصاً حضرت محبوب الٰہی اور شیخ نصیرالدین چراغ دہلوی سے بہت عداوت تھی، لیکن شیخ فریدالدین چاک پراں سے بے حد عقیدت تھی یہاں تک کہ سلطان نے اپنی لڑکی کا شیخ فریدالدین کے پوتے فتح اللہ کے ساتھ نکاح کر دیا۔ اس سلسلہ میں خود ہی پیش قدمی کی۔
کہتے ہیں کہ شیخ فتح اللہؒ بن شیخ اوحدالدینؒ بن شیخ فریدالدینؒ چاک پراںؒ واحد العین تھے، ایک دن آپ بچوں میں کھیل رہے تھے، بچوں نے آپ کو طعنہ دیا کہ "تم کانے ہو تم کو لڑکی کون دے گا"۔ آپ روتے ہوئے اپنے دادا بزرگوار

کے پاس پہنچے اور یہ حال بیان کیا۔ دادا نے سنکر فرمایا کہ "میں سلطان محمد تغلق کی بیٹی تیرے لئے لاؤں گا"۔ کچھ عرصہ بعد سلطان محمد تغلق نے اپنی لڑکی کی خانہ آبادی کے متعلق آپ کو رقعہ لکھا:۔

"دنیا کے بادشاہوں کی کیا مجال تھی کہ ہماری لونڈی تک کا نام لیتا۔ مگر آپ کے لئے میں اپنی لڑکی کا پیغام پیش کرتا ہوں مہربانی فرما کر قبول فرمائیں۔ محمد تغلق"

شیخ فریدالدین نے جواب میں لکھا:۔ ؎

"انصاف کن فریدا با او ترا چہ نسبت
تو مفلس او تونگر، او شاہ تو فقیری"

اس پر سلطان نے پھر لکھا:۔
"میں غلام غلاماں ہونے کا متمنی ہوں، میری درخواست قبول فرمائیں"۔
شیخ فریدالدین نے بادشاہ کو لکھا:۔ ؎

"ما ئیم نوائے بے نوائی بسم اللہ اگر حریف مائی"

کہتے ہیں سلطان محمد تغلق نے شادی کی تیاری شاہانہ طریقہ پر کی اور شیخ کو کہلا بھیجا کر براتی زیادہ لائیں۔ شیخ فریدالدینؒ صرف دو تین براتی لے کر دہلی روانہ ہوگئے۔ بادشاہ کی طبیعت پر یہ بات گراں گذری اور آپ سے کہنے لگا: "حضرت میں نے بہت بڑی بارات کے کھانے کا انتظام کیا ہے"۔ آپ نے فرمایا: "بارات آتی ہے"۔ آپ نے نفل نماز پڑھ کر دعا مانگی، مردان غیب کی ایک جماعت آئی اور بادشاہ کے انتظام کردہ تمام سامانِ خورد و نوش کو کھا کر رخصت ہوئی۔

شادی کے بعد بادشاہ نے اپنے داماد یعنی حضرت شیخ فریدالدین کے

پوتے شیخ فتح کو بہت بڑی جاگیر اور دولت عطا کی، اور شاہی محل رہنے کو دیا گر شیخ فتح اللہ کے دل سے اپنے گھر کی یاد کبھی نہ گئی اکثر یہ رباعی وردِ زبان رہتی:-

وصلی مرا بجائے ناگور نشد — اینجا دل غمگین من مسرور نشد
ہر چند نگار خانہ دارند مرا — واں چہرۂ کہنہ ز دلم دور نشد

جب وطن کی یاد نے آپ کو زیادہ ستایا تو آپ نے بادشاہ سے ناگور جانے کی اجازت چاہی۔ بادشاہ نے یہ دیکھ کر شیخ فتح اللہ رنجیدہ رہتے ہیں ان کو مع اپنی لڑکی راستی بیگم کثیر مال و متاع کیساتھ موضع ڈیہہ بھجوا دیا۔

کہتے ہیں کہ ایک دن بی بی راستی بیگم حضرت فریدالدین کو وضو کرانے آئیں وہ سونے کا زیور پہنے ہوئے تھیں۔ آپ نے فرمایا:

"تجھ سے پلیدی کی بو آتی ہے"۔ بی بی راستی آپ کے اس فرمان سے بہت شرمندہ ہوئیں اور اللہ تعالیٰ سے دست بدعا ہوئیں کہ:

"خداوندا اگر زمین پھٹ جائے تو میں اس میں سما جاؤں"۔

اللہ تعالیٰ نے یہ دعا قبول فرمائی اور زمین شق ہو گئی اور آپ اس کے اندر چلی گئیں۔ آپ کے پلو کا ایک کونا باقی رہ گیا جو زیارت گاہِ خاص و عام ہے[1]

سلطان محمد تغلق کی خواہش تھی کہ حضرت سلطان التارکین کے مزار پُر انوار کا ایک روضہ تعمیر کرے، ایک دن جب وہ خواب سے بیدار ہوا تو اس نے اپنے سینہ پر ایک کاغذ کا ٹکڑا پڑا پایا تو اس میں مرقوم تھا:

قبہ ام آسمان فرشِ زمیں — روضۂ صوفی حمیدالدین

سلطان گنبد بنوانے سے باز رہا اور دروازۂ خانقاہ اور احاطہ بنوا دیا رحمہم اللہ تعالیٰ۔

---

[1] ص ۳۱۰ سلطان التارکین

فرمایا:-

سلطان التارکین کے استاد مولانا شمس الدین نصیر عدم کا شکر وجود سے پہلے ادا کیا کرتے تھے اور فرماتے تھے:

"الحمد للہ علی عدم الامکان"

راوی نے دریافت کیا کہ عدم کیا دولت ہے۔؟ آپ نے فرمایا: اصل دولت تو یہی ہے اور پھر فرمایا:-

"عامی آدمی مرجاتا ہے اور اس کے گناہ بھی مرجاتے ہیں اور عالم مرتا ہے اور اس کے گناہ اس کے بعد بھی باقی رہتے ہیں"۔

ایک مرتبہ کسی نے دریافت کیا کہ بعض آدمی دو تین ہزار بار لاالٰہ الا اللہ کہتے ہیں تب ایک بار محمد رسول اللہ کہتے ہیں کیونکہ اس طرح کرنا ان کے نزدیک جائز ہے آپ نے فرمایا کہ شاید وہ اللہ کے ساتھ ایسے مشغول ہیں کہ محمد رسول اللہ انہیں یاد نہیں آتا۔ حاضرین ہنس پڑے، آپ نے فرمایا: "حضرت رابعہ بصری نے ایک رات محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا، عرض کیا!:-

"یا رسول اللہ مجھے معاف فرما دیجئے کہ میں ذکر خدا میں ایسی مشغول رہوں کہ آپ مجھے یاد نہیں آتے"۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ:

"اے رابعہ تجھے معلوم نہیں کہ میرا یاد کرنا خدا کا یاد کرنا ہے لاالٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہنے میں دونوں آجاتے ہیں"۔

اپنے صاحبزادے سے فرمایا کہ اگر فریضہ کی بحث کرو تو اچھا ہے، کیونکہ سب علوم میں علم فرائض مقصود ہے جیسا کہ ارشاد نبوی ہے:

تعلّموا الفرائض وَعَلِّمُوْهَا   فرائض سیکھو اور سکھاؤ

ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ لوگوں کو معلوم نہ ہوگا کہ میراث کیسے تقسیم ہوتی ہے۔ عوام میں مشہور ہے کہ متوفی کے ورثہ میں ایک حصہ لڑکے کا کیونکہ وہ قوی ہے اور دو حصے لڑکی کے ہیں چونکہ وہ ضعیف ہے۔ کسی نے عرض کیا: "لوگ جانتے ہوئے نہیں کرتے یہ بدتر ہے یا یہ کہ نہیں جانتے ہوئے کرتے ہیں یہ بدتر ہے؟"۔

آپ نے فرمایا کہ واقف ہو کر نہ کرنا ایک وبال ہے اگر خود نہیں کرتا تو دوسروں کو تو بتا دے گا کہ ایسا کرو اور ناواقف ہو کر کرنے میں دو وبال ہیں ایک وبال ناواقفیت اور دوسرے ناواقفیت کے باوجود کام کر بیٹھنا۔ نامعلوم ہونے کی صورت میں درستگی و صلاح کیونکر میسر ہوگی۔

آپ فرمایا کرتے تھے کہ ایک ساعت بھی بے کار نہ رہنا چاہیئے، یا تو نماز پڑھنا چاہیئے یا ذکر کرنا چاہیئے یا دین کے کام میں مشغول رہنا چاہیئے کیونکہ ؎

ہر کہ او تخم کاہلی کارد   آخرش کاہلی بار آرد

[جو شخص کاہلی کا بیج بوتا ہے تو اس سے کاہلی ہی پیدا ہوتی ہے]

ایک روز آپ صبح کی نماز ادا کرنے کے بعد مسجد کی محراب کی طرف پشت کرکے بیٹھ گئے اور فرمایا کہ "مولانا شرف الدین بوسنجی فرمایا کرتے تھے کہ مولانا رکن الدین امام زادہ بھی صبح کی نماز ادا کرنے کے بعد محراب کی طرف پشت کرکے بیٹھ جایا کرتے اور طالب علموں کو سبق دیا کرتے تھے"۔ لوگوں نے مولانا سے پوچھا کہ کیا صبح کی نماز کے بعد اوراد و تسبیح پڑھنا اور دعا مانگنا سنّت ہے؟"

آپ نے فرمایا: "ہم تو فرض میں مشغول ہو جاتے ہیں کیونکہ درس و تدریس

فرض ہے۔

ایک بیٹے کے مدت کے بعد بڑھاپے میں ایک لڑکا پیدا ہوا وہ آپ کی خدمت میں لے کر آیا اور قدموں میں ڈال دیا اور ٹوپی پیش کی کہ آپ اپنے دستِ مبارک سے اس بچے کو اڑھا دیں تاکہ باعثِ برکت اور کامیابی ہو۔ آپ نے اس بچے کو اپنے زانو پر بٹھایا اور ارشاد فرمایا:

"ہر لڑکا فطرتاً اسلام پر پیدا ہوتا ہے"۔ اس کے بعد یہ دعا مانگی کہ: "اے اللہ اس کو دینِ فطرت پر قائم رکھنا اور ثابت قدمی مرحمت کرنا۔ اس کے بعد آپ نے اپنی ٹوپی سر سے اتار کر اس کو پہنا دی اور فرمایا کہ حاضرین فاتحہ پڑھیں تاکہ اللہ تعالیٰ اسکو فطرت پر ثابت قدم رکھے۔ اس کے بعد چند خرمے اس کے ہاتھ میں دیئے اور ہندی میں فرمایا: "تو میرا مرید ہے انشاء اللہ تو صاحب مقام فقیر ہوگا"۔ اس کے بعد بیٹے کو کہا کہ اسے گھر لے جاؤ۔

فرمایا: "جس کا خلق جتنا زیادہ ہوگا اتنا ہی زیادہ اچھا صوفی ہوگا کیونکہ خلق کا نام ہی تصوف ہے"۔

فرمایا:- ایک مرتبہ ایک درویش نے کہا کہ یہ امر مسلّم ہے کہ سو ولی ایک نبی کی گرد کو نہیں پہنچ سکتے۔ مگر منصور حلاج، جو ولی تھے، فرماتے ہیں کہ

اُقْتُلُوْنِيْ يَاثِقَاتِيْ ، فَاِنَّ فِيْ قَتْلِيْ حَيَاتِيْ ،۔

اور موسیٰ علیہ السلام، جو نبی مرسل تھے فرماتے ہیں کہ: فَاَخَافُ اَنْ يَّقْتُلُوْنَ ۔ یہ کیا بات ہے کہ نبی مرسل ؑ تو اپنے قتل سے خائف ہو گیا، اور ولی نے اپنے قتل کی خواہش ظاہر کی، آپ نے فرمایا:-

موسیٰ علیہ السلام جن صفات کے حامل تھے، اس وقت کوئی دوسرا ایسا نہ تھا، موسیٰ علیہ السلام اس باعث ڈرے کہ اے اللہ اگر میں مار ڈالا گیا تو یہ بڑا

کام جس کے لئے مجھے پیدا کیا گیا ہے دوسرے سے نہ ہو سکے گا۔ منصور حلاج ایک ولی تھے اگر قتل ہوتے تو ان جیسی صفات کے حامل ہزاروں ولی تھے۔

فرمایا: "جب سورج سرخ نکلے اور سرخ ہی ڈوبے تو سمجھ لو کہ سطح زمین پر کوئی بلا آنے والی ہے، استغفار و توبہ کرو"۔

فرمایا: "حدیث شریف میں آیا ہے کہ جن کلمات کی برکت سے موسیٰ علیہ السلام دریا سے پار ہوئے اور انھوں نے فرعون کے شر سے نجات پائی وہ یہ تھے:۔

اللهم لك الحمد، واليك المشتكى، وانت
المستعان، وبك المستغاث ومنك الفرج
واليك التكلان، ولا حول ولا قوة الا بالله العلى العظيم"۔

آپ نے ساتھ ساتھ یہ بھی فرمایا: "حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کلمات سننے کے بعد ان کا ورد کبھی ترک نہیں کیا۔ یہ دعا اشراق کے وقت شکر کی دو رکعت پڑھنے کے بعد پڑھنی چاہیئے

فرمایا:۔ "جمعہ کی نماز کو اس وقت مقبول سمجھنا چاہیئے جب دوسرے جمعہ کی نماز جماعت سے ادا کرے"۔[1]

حضرت صوفی حمیدالدین ناگوری کے اقوال زرّیں

فرمایا:۔ کہ اہل تشبیہ کے مانند حق تعالیٰ کا طالب نہ ہو۔ کہ وہ سب کچھ انسانوں کی طرح حق تعالیٰ کے لئے بھی ثابت کرتے ہیں۔ اور معطلوں کی مانند

[1] سلطان التارکین حذف و اختصار کے ساتھ ص ۲۲۳ - ۲۴۰

ترک طلب نہ کر۔ خداوند تعالیٰ کسی ایک جہت میں نہیں کہ تو اسے ڈھونڈے اور کسی مکان میں نہیں جہاں اس کی جستجو کرے، وہ آنے والا نہیں کہ اس کو کوئی بلائے وہ دور نہیں کہ کوئی اس سے نزدیک ہو۔ وہ گم شدہ نہیں کہ کوئی اس کو تلاش کرے، وہ زمانی نہیں کہ کوئی زمانہ کا منتظر ہو، یہ سب طلب کی نفی ہے۔ پس اثبات یہ ہے کہ اپنی اور اپنے اوصاف کی نفی کرے یعنی بشریت سے گذر جائے اور ہر چیز سے علیحدگی اختیار کرے، طلب یہ نہیں کہ اس کا اثبات کرے طلب یہ ہے کہ اپنی ہستی کو مٹا دے طلب یہ نہیں کہ اس کی طرف دوڑے، طلب یہ ہے کہ اپنے آپ کو اس میں فنا کر دے، طلب یہ نہیں تو اسے ڈھونڈے طلب یہ ہے کہ خود گم ہو جائے۔

فرمایا:۔ سلوک کا پہلا مرتبہ یہ ہے کہ دو جہاں سے فارغ ہو، اور مقصود یہ ہے کہ خود نہ رہے، ایک راہ درپیش ہے تاریک اور دراز اور تجھ کو ایک عمر دی ہے بے ثبات اور کوتاہ، اس تاریکی میں مطلع عنایت سے تیرے لئے ایک چاند طلوع کیا ہے، اٹھ اور دوڑ، اس ماہ خیر کو غنیمت جان اور اس عمر کو گذرا ہوا۔ اور اپنے آپ کو مردہ سمجھ ؎

جانے ست ہر آئینہ بخواہد رفتن
اندر غم عشق تو رود اولی تر

فرمایا:۔ "جس طرح اپنی جان و تن کو جانتے ہو اسی طرح شریعت و طریقت کو سمجھو، طریقت جان شریعت ہے"۔

آپ سے دریافت کیا گیا کہ ارباب شریعت اور اصحاب شریعت کی راہ کون سی ہے؟۔

فرمایا کہ "اہل شرع کی راہ نفس حال سے باہر آنا اور بے فکر ذات حق

کی طرف متوجہ ہونا اور سالکانِ طریقت کا راستہ جان و دل سے گذرنا اور راہِ وحدت میں قدم رکھتا ہے۔

مالک الملک کہاں ہے کہ اس کی طرف توجہ کی جائے، کے جواب میں فرمایا کہ کون سی جگہ ہے جہاں وہ نہیں اَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ۔

جب پوچھا گیا کہ آتش دوزخ کا درویشوں سے کچھ تعلق ہے، فرمایا:

"نار دوزخ اہل فقر کے ساتھ کچھ آویزش اور آمیزش نہیں رکھتی"۔

فرمایا:۔ فقر عدمی شے ہے اور عدم کے ساتھ فخر کرنا مذموم ہے اور اس کے وجود کے ساتھ فخر کرنا محمود ہے اسی باعث خواجۂ عالم فخر بنی آدم صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا و آخرت پر فخر نہیں کیا مگر جب فقر کا معاملہ آیا تو فرمایا الفقر فخری یعنی فقر میرا فخر ہے[1]۔

خواجہ محمد موسیٰ قدس سرہٗ

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کے خلیفہ ہیں[2]۔ اور بعض مورخوں نے لکھا ہے کہ آپ سلطان المشائخ رح کے مجاز بیعت ہیں[3] اور ایک مقامی روایت یہ ہے کہ آپ کو شیخ حیدر رح سے اجازت ہے۔ جن کا مزار لاڈو سرائے مہرولی میں ہے۔ اور بعض مورخوں نے لکھا ہے کہ آپ سلطان المشائخ کے تربیت یافتہ ہیں[4]۔ میرا خیال ہے کہ یہ تینوں باتیں صحیح ہیں۔ سلطان المشائخ رح سے بیعت ہوئے، شیخ چراغ دہلی نے تربیت فرمائی، اور شیخ حیدر رح نے مجاز بیعت بنایا۔ سیر الاولیاء میں آپ کا ذکر اس طرح ہے۔

[1] سلطان الت‍ارکین ص۲۳۔ [2] تذکرۃ الابرار مخطوطہ۔ [3] تاریخ نظامی ص۹۰۔ [4] تاریخ نظامی۔

"از ان جملہ علم میں مشہور، حلم میں مذکور، زہد و تقویٰ کے ساتھ موصوف خواجہ موسیٰ ابن خواجہ بدر الدین اسحٰق رح ہیں، جو خواجہ امام کے برادر حقیقی تھے، ان بزرگوار نے بھی جناب سلطان المشائخ رح کی نظر مبارک سے پرورش پائی تھی، اور تمام علوم میں کمال حاصل کیا تھا۔ اپنے زمانے کے ذو فنون اور فرزانۂ عصر تھے۔ آپ نے اصولِ فقہ میں بزدوی مولانا وجیہ الدین پائلی سے پڑھی تھی، اور کلامِ ربانی کے حافظ تھے، تحقیق سخن میں کوشش کرتے اور طبع فیاض اور لطافت بہت رکھتے تھے۔ عربی و فارسی اشعار و نظم میں پورا حصہ حاصل تھا، اور اکثر اوقات پُرسوز غزل کہتے تھے۔ جو لوگ علمِ موسیقی میں مہارتِ تامہ اور ادراکِ کامل رکھتے تھے وہ اس علم کے دل رُبا لطائف آپ کے روح افزا نغمات سے حاصل کرتے تھے۔ غرض خواجہ موسیٰ رح تمام علوم میں ید طولیٰ رکھتے تھے خاص کر علم حکمت میں وہ کمال پایا تھا جس کی نظیر اس زمانے میں باوجود تلاش کے بھی دستیاب نہیں ہوتی تھی، طبی تجربات میں خاص حصۂ وافر حاصل تھا۔ بڑے بھائی محمد امام کی عدم موجودگی میں خود سلطان المشائخ رح کی امامت کرتے اور نہایت خوش لحنی سے قرأت پڑھتے۔ یہ دونوں بزرگ اور بزرگ زادے حظیرۂ سلطان جی رح میں مشرقی دروازہ کے متصل اندر کی جانب واقع ہے۔ مگر خواجہ موسیٰ رح کی قبر کہاں ہے؟ یہ صاف طور پر واضح نہیں۔ تاریخ نظامی میں ہے: "مولانا خواجہ موسیٰ رح خلیفہ سلطان جی رح، پتہ: نوح[1]"

[1] تاریخ نظامی ص۹۰

خواجہ حسین ناگوری

(۱۳۹۰ ــــ ۱۴۹۵)

خواجہ شیخ حمید الدین صوفی کی اولاد میں ہیں، بڑے بزرگ اور صاحب مقامات بلند تھے، اور کرامتیں ان کی ظاہر تھیں، شریعت و طریقت اور حقیقت کے جامع تھے، اس ملک کے لوگ ان کی ولایت اور بزرگی پر متفق ہیں۔ ذوق و عشق کمال کیساتھ رکھتے تھے، زہد و تقویٰ سے موصوف تھے اور یہ شیخ وحید کی اولاد سے ہیں۔ شیخ کبیر کے مرید تھے، ولایت گجرات میں اپنے پیر کی خدمت میں مدت تک رہے اور علوم کسبی و وہبی کی خوب تحصیل کی۔ پھر وطن اصلی کی طرف چلے گئے، اور برسوں حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے مزار شریف کے مجاور ہوئے اور عبادت مولا کرتے رہے جس زمانے میں کہ اجمیر خراب تھا اور اس کے آس پاس شیروں کا جنگل ہو گیا تھا، اس وقت مزار شریف پر کوئی عمارت نہ تھی۔ اول جس نے کہ عمارت بنائی وہ یہی شخص تھے اور پھر حضرت اجمیریؒ کے ہی اشارے سے ناگور میں جا کر علوم دین کی تعلیم اور تلقین طریق ارباب یقین میں مشغول ہوئے۔ ان کی ایک تفسیر ہے بنام "نور النبی" قرآن شریف کے ہر پارہ کی جداگانہ جلد لکھی ہے، ترکیبوں کا حل اور بیان معانی جو کچھ اور تفسیروں میں ہے، سب اس میں بالتفصیل سہولت کے ساتھ بیان فرمایا ہے، قسم ثالث مفتاح کی بھی شرح لکھی ہے اور ان کے رسائل و مکتوبات بھی ہیں کہتے ہیں کہ سوانح شیخ احمد غزالی کی بھی شرح لکھی ہے۔

آپ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے بھرے ہوئے تھے

جو کچھ آپ کا گھر اور باغ وغیرہ تھے سب کو حضرتؐ کے نام پر وقف کر رکھا تھا۔ نقل ہے:
ــــ کہ انھوں نے ایک دن اپنے جد بزرگوار کا عرس کر کے لوگوں کو کھانا تقسیم کیا اور اپنے حصے کے کھانے کو افطار کے واسطے رکھ چھوڑا اکثر اس ملک میں جو عرسوں کے واسطے پکاتے ہیں وہ چاول اور دہی اور ساگ وغیرہ قسم کی چیزیں ہوتی ہیں، ان سب کھانوں کو ایک برتن میں ملا کر رکھا تھا کہ چار مردانِ غیب آئے کہ کسی نے انکو نہ پہچانا اور وہ علت جذام (کوڑھ کی بیماری) میں مبتلا تھے، ان کی انگلیوں میں سے پیپ اور خون ٹپکتا تھا انھوں نے آکر آپ سے کھانا مانگا۔ آپ نے وہی کھانا جو اپنے واسطے رکھا تھا حاضر کیا۔ ان چاروں نے اس کھانے کو کھایا اور جو برتن میں بچا اس کے متعلق آپ سے کہا کہ تم کھا لو۔ آپ نے صدقِ نیت، غلبۂ حال و کمالِ شوق سے اس کھانے کو کھا لیا۔ اسی دن سے آپ کو اور ہی فتوحات ہونے لگیں۔

نقل ہے کہ آپ کے پاس ایک عرابہ (گاڑی) تھا جیسا کہ ناگور میں عموماً ایسی گاڑی ہوتی ہیں، اس پر سوار ہو کر خود اس کو ہانکتے تھے اور اس میں جن بیلوں کو جوتتے تھے ان کو بھی خود ہی چراتے اور آپ ہی ان کی حفاظت کرتے تھے اور نہایت پرانا اور موٹا کپڑا پہنتے تھے، (فقیر (مصنف) نے ان کے جامہائے مبارک کی زیارت کی ہے، شیخ عبد القادر آپ کی اولاد میں ایک شخص تھے کہ مشرب فقر سے بہت ہی مناسبت رکھتے تھے دہلی میں اکثر ان کے تبرکات لائے تھے انھیں میں تینوں جامے دستار اور پیرہن اور ازار سب ایک ہی کپڑے کے دیکھے گئے جس کا ایک گز ایک پیسہ کو نہیں بکتا۔

نقل ہے کہ ایک دن ان کو سماع میں وجد آرہا تھا، اسی حالت میں جنگل کو چلے گئے، ایک بھنگی تھا جو انھیں کے ہاتھ پر ایمان لایا تھا اور ظاہری باطنی طہارت حاصل کی تھی، ایک وہ اور دو قوال حضرت کے پیچھے روانہ ہوئے شہر

ناگور کے باہر ایک حوض ہے، بہت گہرا۔ خواجہ بسبب حالتِ وجد کے اس حوض پر ایسے چلنے لگے جیسے کوئی زمین پر چلتا ہے ان دونوں نے بھی آپ کی متابعت کی اور حوض میں روانہ ہوئے، قوال سے قدم آگے نہ بڑھ سکا وہ وہیں کھڑا ہوگیا۔

نقل ہے کہ ان کو سلطان غیاث الدین خلجی نے جو ملک مندو کا بادشاہ تھا بہت بلایا مگر کبھی نہ گئے۔ ایک دفعہ بادشاہ کے پاس کہیں سے حضرت سرورِ انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا موئے مبارک آیا۔ لوگوں نے کہا۔ اگر یہ خبر خواجہ حسین کو ہوگی تو وہ فوراً آجائیں گے، ہرگز توقف نہ فرمائیں گے۔ سلطان غیاث الدینؒ یہ خبر شیخ حسین کو پہنچائی۔ خواجہ حسینؒ اسی وقت ملک مندو کا قصد کیا اور درود پڑھتے اور سلوع کرتے ہوئے چلے، جب اس ملک کے قریب پہنچے بادشاہ استقبال کو آیا دیکھا کہ ایک شخص غبار آلود کپڑے پرانے پہنے ہوئے گاڑی پر بیٹھے ہیں، سمجھے کہ شیخ کوئی اور ہوں گے۔ لوگوں نے کہا شیخ یہی ہیں۔ شیخ کو موئے مبارک کی زیارت کا اتنا شوق تھا کہ ان کی طرف مخاطب ہونے کی کیا اپنی خبر نہ تھی۔ کہتے ہیں کہ جس وقت شیخ کی نظر موئے مبارک پر پڑی موئے مبارک اڑ کر ان کے ہاتھ میں آگیا۔ سلطان غیاث الدین ان کو اپنے باپ کی قبر پر لے گئے اور ان کے واسطے دعاءِ مغفرت منگوائی۔ انھوں نے دعا کی اور جو کچھ ان کا حال کشف ہوا وہ بھی بیان کیا۔ سلطان نے تحفے وغیرہ ان کی خدمت میں پیش کئے، انھوں نے کچھ قبول نہ کیا اور سب کو رد کردیا۔ کہتے ہیں کہ شیخ کے فرزند کو کچھ اندرونی میل پیدا ہوا، شیخ کو معلوم ہوگیا۔ شیخ نے فرمایا۔ یہ سانپ ہیں۔ سانپ کو بھی کسی نے پالا ہے یا اس کی حفاظت کی ہے ؟ جب زر کا میل فرزند کی طبیعت میں بہت پایا۔ فرمایا اگر اس میں سے کچھ لے کر حضرت خواجہ بزرگؒ اور اپنے دادا کے روضے کو بناؤ تو لے لو کیونکہ اس باب میں اپنے شیخ کبیر سے میں نے سنا ہے، فرماتے تھے کہ

تمہارے ہاتھ زر لگے گا جس کو تم مشائخ کے مزارات پر صرف کروگے۔ کہتے ہیں کہ ان کو تمام عمر میں سوائے اس زر کے جو مندو میں ہاتھ آیا تھا اور کچھ ہاتھ نہیں آیا جس سے خواجہؒ کے مزار پر عمارت انھوں نے بنوائی۔ حضرت خواجہؒ کے دروازہ کی عمارت کو کسی اور مندو کے بادشاہ نے ان کے بعد بنایا ہے۔ اور شیخ حمید الدین کے روضۂ شریف کی عمارت، جو ناگور میں ہے، وہ بھی انھوں نے بنائی ہے اور مقبرہ ناگور کی چار دیواری سلطان محمد تغلق کی بنائی ہوئی ہے[1]۔ کہتے ہیں کہ خواجہ حسین ناگوریؒ سفر کرتے ہوئے ایک شہر میں پہنچے، سرائے کی بھٹیاری کو روٹی بنانے کیلئے آٹا دیا، وہ روٹی پکانے لگی اور آپ تلاوت قرآن کریم میں مشغول ہوگئے۔ خواجہ صاحب حافظ اور قاری تھے اور علم تجوید و قرات میں کامل تھے۔ سرائے کی بھٹیاری کا چھوٹا بچہ رونے لگا بھٹیاری کہنے لگی کہ الٰہی کیا کروں ؟ دو دو مصیبتیں ہیں، ایک یہ لڑکا روتا ہے اور دوسرے یہ مسافر قرآن شریف غلط پڑھ رہا ہے اور مجھے گنہگار کر رہا ہے، خواجہ صاحب یہ سن کر متحیر ہوئے کیونکہ آپ قرأت و تجوید کے رموز سے اچھی طرح واقف تھے، فرمایا: اے نیکبخت میں قرآن شریف پڑھنے میں کیا غلطی کر رہا ہوں اور کون سا حرف یا لفظ غلط پڑھ ... رہا ہوں؟ بھٹیاری بولی۔ میں تو نہیں جانتی البتہ جب آپ روٹی کھالیں گے تو میں اپنے استاد کے پاس آپ کو لے چلوں گی، ان کے سامنے پڑھنا۔ وہ آپ کی کمی بتلادیں گے۔ جب آپ کھانے سے فارغ ہوئے تو بھٹیاری آپ کو لے کر اپنے استاد کے پاس پہنچی، آپ نے دیکھا ایک مرد برقعہ پوش ... جس نے اپنا سارا منہ کپڑے سے ڈھانک رکھا ہے، بھٹیاری نے کہا: حضرت! یہ مسافر چاہتا ہے کہ آپ کو اپنا قرآن سنائے۔ وہ شخص بولا اچھا شروع کرو آپ نے قرآن کریم تلاوت کی ابھی آپ نے دو ایک رکوع ہی پڑھے ہوں گے کہ مرد بولا: تم قرآن شریف بہت غلط پڑھتے ہو، اگر تم چاہتے ہو کہ اپنا قرآن کریم صحیح پڑھنا سیکھ لو

[1] اخبار الاخیار اردو ص ۲۶۴ - ۲۶۳

تو یہاں چند دن ٹھہرو اور مجھ سے از سر نو الف بے سے پڑھنا شروع کرو، آپ نے کہا بہتر ہے۔ آپ نے پڑھنا شروع کیا، چونکہ آپ عالم و فاضل تھے اس شخص کی تعلیم سے چند دنوں میں ہی اس جیسا قرآن شریف پڑھنا شروع کر دیا، اور قرآن شریف ختم کر لیا۔ وہ شخص بولا۔ آؤ تاکہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ جو قرات تم پڑھتے تھے اور جو مجھ سے سیکھی ہے ان دونوں میں کیا فرق ہے؟؟ اور اس کی کیا تاثیر ہے؟ آپ کو لے کر ندی پر گیا اور کہا اوّل وہ قرأت پڑھو جو تم پہلے پڑھا کرتے تھے آپ نے اسی لہجہ میں قرأت فرمائی کوئی اثر نہ ہوا، پھر اس شخص نے کہا کہ "اب وہ قرأت پڑھو جو مجھ سے سیکھی ہے آپ نے وہ قرأت کی اسے پڑھتے ہی ندی سے زر و جواہر اور سونا چاندی برآمد ہونے لگا یہاں تک کہ ڈھیر لگ گیا۔ وہ شخص بولا، تمہیں معلوم ہے دونوں میں کیا فرق ہے؟، اب میں تمہیں جانے کی اجازت دیتا ہوں مجھ کو بھی دعا میں یاد رکھنا۔

آپ نے کہا، میری ایک گذارش ہے اگر آپ قبول فرمائیں۔ استاد بولے: "کیا ہے؟ بتاؤ"۔ آپ نے عرض کیا کہ آپ اپنے رخ سے برقعہ اٹھالیں تاکہ میں دیدار سے سرفراز ہو سکوں، استاد بولے کہ میرا منہ تو دنیا میں ہی سور جیسا ہو گیا ہے، مجھ سے ایک گناہ سرزد ہو گیا تھا، میرا منہ نہ دیکھو ورنہ تمہیں رنج ہو گا۔ آپ نے پوچھا: آخر گناہ کیا تھا، استاد نے بتلایا کہ ایک دن میں نے نماز میں امام سے پہلے سر اٹھا لیا تھا۔ آپ نے کہا: جو کچھ بھی ہو آپ اپنا چہرہ مجھے دکھا دیجئے استاد نے منہ پر سے برقعہ اٹھا دیا: چودھویں رات کے چاند جیسا چہرہ تھا، آپ نے چہرہ دیکھ کر کہا: وہ بات تو نہیں جو آپ نے کہی تھی، استاد بولے: "آپ خواجہ حسین ناگوری ہیں؟؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔ استاد نے الحمد للہ کہکر فرمایا: آج میری مرادیں پوری ہو گئیں۔ آپ نے دریافت کیا: "وہ کیسے؟" تو اس نے کہا کہ جب اس گناہ کی سزا میں میرا منہ سور جیسا ہو گیا تھا، میں دن رات

روتا تھا اور جناب باری میں دعائیں مانگتا تھا کہ میرا منہ اصلی حالت پر آجائے، ایک دن ہاتفِ غیب سے آواز آئی کہ جب تم خواجہ حسین ناگوری کا روئے مبارک دیکھو گے تمہارا چہرہ اصلی حالت پر آجائے گا۔

وہاں سے رخصت ہو کر خواجہ صاحبؒ ایک ایسے شہر میں پہنچے جہاں کا حاکم بہت ظالم اور کافر تھا اس نے ہر ایک مسلمان کے گھر میں ایک سور بندھوا رکھا تھا، آپ جس گھر میں جاتے سور بندھا ہوا دیکھتے، جب ایک گھر سے نکل کر آرہے تھے تو مالک مکان نے کہا: آپ یہاں ٹھہر جائیں، جہاں جائیں گے سور بندھا ہوا دیکھیں گے، آخر سور بھی خلق خدا ہے، آپ کا کیا لیتا ہے، آپ اپنے کام میں مشغول ہو جایئے۔ آپ اس کے یہاں ٹھہر گئے، نماز کا وقت آیا تو مالک مکان کی لڑکی بولی: بابا بیت اللہ میں اذان ہو گئی ہے جلدی کیجئے، وہ شخص آفتابہ لے کر روانہ ہوا اور پھر آپ سے پوچھا کیا آپ یہاں ہی نماز پڑھیں گے یا بیت اللہ میں"۔؟؟ آپ نے فرمایا:" میں بھی خانہ کعبہ میں نماز پڑھوں گا"۔ وہ اپنی لڑکی سے بولا کہ: اے لڑکی جب یہ مسافر کھانا کھا چکے تو اس کو بھی اپنے ساتھ لیتی آنا، آپ کھانا کھا رہے تھے کہ لڑکی نے تاکید کی کہ جلدی چلو خانہ کعبہ میں نماز ہونے والی ہے۔ جب آپ کھانے سے فارغ ہو گئے، لڑکی نے کہا آؤ میرے پاؤں پر پاؤں رکھو، آنکھیں بند کرو اور "یا کوی" کہو، وہ لڑکی جاہل تھی اس لئے کاف کہہ رہی تھی۔ آپ نے کہا 'یا قوی'۔ لڑکی نے کہا 'یا کوی' کہو۔ آپ نے پھر 'یا قوی' کہا۔ لڑکی نے کہا جلدی کرو اور 'یا کوی' کہو جس طرح میں کہتی ہوں، میری بھی نماز قضا کراتے ہو، خانہ کعبہ میں تکبیر تحریمہ ہو چکی ہے۔ آخر آپ نے بھی 'یا کوی' کہا اور خانۂ کعبہ پہنچ گئے نماز سے فارغ ہو کر وہ شخص بولا کہ آپ یہاں ہی ٹھہریں گے یا میرے ہمراہ واپس چلیں گے؟" آپ نے کہا واپس چلوں گا آپ نے اس شخص کے

پاؤں پر پاؤں رکھا اور شہر آگئے، اس کے بعد آپ وہاں سے روانہ ہوکر اپنے وطن آگئے۔[1]

قاضی شمس الدین شیبانی رح

(۹۰۸ھ/۴۰)

دانشمند متبحر تھے، دہلی سے تغلق شاہ کے زمانے میں نارنول آگئے تھے، شروع زمانے میں کہ ابھی سنتِ نکاح پوری نہ کر پائے تھے خانہ کعبہ کی زیارت کے قصد سے چلے، جب گجرات میں پہنچے تو ایک مسجد میں دیکھا کہ ایک واعظ معتزلی مذہب کا منبر پر بیٹھا ہوا مذہب اعتزال کے اس عام گلئے کی ... کہ بندے اپنے افعال کے خود خالق ہیں ___ گفتگو کر رہا تھا، کہتا تھا: "دیکھو یہ میرا ہاتھ ہے، میں جب چاہتا ہوں اس کو بند کر لیتا ہوں اور جب چاہتا ہوں کھول دیتا ہوں ___" تمام حاضرین میں کسی کو اس سے مجادلہ و مناظرہ کی طاقت نہ تھی، قاضی شمس الدین نے جواب دیا "اگر قدرت تیرے اختیار میں ہے تو پھر تو پشت پر کیوں ہاتھ نہیں باندھ لیتا۔؟"

حاکم گجرات کو آپ کا یہ دخل دینا اچھا معلوم ہوا، ایک لونڈی جو دارالحرب سے پکڑی ہوئی آئی تھی آپکی خدمت میں پیش کی۔ ان سے اولاد ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی اولاد میں برکت بخشی اور علم نصیب کیا۔ انکی اولاد میں ایک شخص تھے جنکو تاج الافاضل کہتے تھے، ان سے پانچ لڑکے پیدا ہوئے، سب کے سب متقی تھے منجملہ انکے ایک قاضی مجد تھے شیخ احمد کے والد۔ انکا ذکر انکی جگہ پر ہوگا۔ ان کے سات لڑکے تھے سب عالم و فاضل۔[2]

---

[1] حالات سلطان التارکین ص ۳۷۰-۳۷۳، [2] اخبار الاخیار اردو ص ۲۱۸۔

خواجہ خانون علاتاج ناگوری
قدس سرہٗ

آپ کی قبر گوالیار میں ہے، آپ نے ناگور سے نکل کر اس شہر کو اپنا وطن بنالیا تھا، آپ کی مقدس روح عنصری جسم کے ساتھ شامل ہوکر سن آٹھ سو ترپن (۸۵۳ھ) میں عالم دنیا میں آئی، ستاسی برس صورت خانہ تقدیر کا نظارہ کیا مگر پابندی علاقہ سے آزاد رہے، اور ہر ایک کا حفظ مراتب ملحوظ رکھ کر دل کو مصور حقیقی کے مشاہدے سے منور کیا، نو سو چالیس ہجری (۹۴۰) میں نقش ہستی چار دیوار عناصر سے مٹا کر سلیم دل اور مطمئن خاطر کے ساتھ حضور اقدس کو روانہ ہوگئے، آپ شیخ اسماعیل کے خلیفہ ہیں جنھوں نے طریقت کے تمام مقامات اور سلوک کی منزلیں طے کرکے اپنے پدر بزرگوار خواجہ حسن سرمست سے خلافت پائی تھی، خواجہ حسن سرمست توحید اور تصوف کی مجلس میں پرانے میگسار تھے، اجازت و رہنمائی اپنے والد ماجد شیخ سالار فاروقی سے رکھتے تھے۔ شیخ سالار کعبہ تحقیق کے مسافروں میں قافلہ سالار تھے، اجازت ہدایت خواجہ اختیار الدین عمر سے ملی تھی، خواجہ اختیار الدین اپنے زمانہ کے اکثر مشائخ میں برگزیدہ تھے خرقہ خلافت خواجہ محمد سعدی سے پایا تھا، خواجہ محمد سعدی شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کے بزرگ خلیفہ اور نائب اعظم ہیں قدس اللہ اسرارہم۔

شیخ معروف دھاروالے اپنے شجرہ میں لکھا ہے کہ خواجہ خانون کو خرقہ خلافت شیخ حسین ناگوری سے بھی ملا تھا، جو تین واسطہ سے سلطان التارکین شیخ حمید الدین سوالی ناگوری تک پہنچتے ہیں۔[1]

---

[1] اذکار ابرار اردو ترجمہ گلزار ابرار ص ۲۴۴۔

آپ بزرگ، عشق و محبتِ الٰہی میں سوختہ تھے، خواجہ حسین ناگوری کے مرید، اور خرقہ خلافت چشتیہ شیخ اسماعیل چشتی فرزند حسن سرمست چشتی سے حاصل کیا[1]۔ جو چند یری میں سوئے ہوئے ہیں[2]۔ اور آپ نے روحانیت سے خواجہ بزرگ[؟] کے فیض باطنی اخذ کیا (بسبب کبر و سن و ضعیف ہونے کے کسی کی تعظیم نہیں کرتے تھے)۔

شیخ نظام نارنولی — پیر و مرشد حضرت شاہ محمد وارث عرف شاہ چوکھا قدس سرہٗ — اور شیخ اسماعیل برادر شیخ نظام آپ ہی سے فیض یافتہ ہیں۔ بسنہ ۹۴۰ھ میں آپ کا وصال ہوا، گوالیار میں آسودہ ہیں[3]۔ کسی کی تعظیم نہ دینے سے متعلق حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں:-

"حضرت والد صاحب ان کی صحبت میں گئے تھے، قیام نہ کرنے کا — جو لوگوں میں مشہور ہو گیا تھا - حال دریافت کیا فرمایا: میں ضعیف ہو گیا ہوں ہر ایک کے لئے قیام نہیں کر سکتا"[4]

رفت چوں خانو ازیں دارِ فنا	صورتِ گل شد بگلزارِ جناں
شاہ خلد است اے جواں تاریخ او	بار شد ابر عطا خانو عیاں[5]
۹۴۰	۹۴۰

---

[1] اخبار الاخیار

[2] ایضاً

[3] برکات اولیاء ص ۶۵

[4] اخبار الاخیار ص ۳۲۱

[5] خزینۃ الاصفیاء ص ۴۴۵

علامہ شیخ احمد مجد شیبانی نارنولی رحمۃ اللہ علیہ

۸۳۲ — ۹۲۷

بزرگ علوم شریعت و اسرار طریقت، زہد و ورع اور تقویٰ کے جامع، امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں جانباز و شجاع - اہل دنیا کی ان کے آگے کچھ قدر نہ تھی، ان کی مجلس خواجہ ابو سفیان ثوری کی مجلس سے مشابہ تھی، یہ مرید و خلیفہ خواجہ حسین ناگوری کے ہیں، کہتے ہیں اٹھارہ سال کی عمر میں کل علموں میں درس دیتے تھے -

ان کی پیدائش نارنول میں ہوئی، پرورش اجمیر میں اور مزار ناگور میں ہے - ان کے والد قاضی مجدالدین بن قاضی تاج الافاضل بن شمس الدین شیبانی امام محمد شیبانی کی اولاد میں ہیں جو امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں۔

قاضی مجدالدین کے سات بیٹے تھے۔ سب عالم و متقی و متدین تھے سب میں بڑے شیخ احمد تھے جو علم و عمل میں سب سے بڑھے ہوئے تھے، طالب علمی کے زمانہ میں علماء سے بحث کرتے اور عربی و فارسی میں خوب تقریر کرتے تھے۔ بادشاہوں اور امراء کی مجالس میں اکثر بحث کیا کرتے تھے -

شروع جوانی میں خواجہ حسین ناگوری کے مرید ہوئے اور بحث و جدال اور بادشاہوں کے گھر میں جانے سے توبہ کی اور طریقت کا علم شیخ سے پڑھنے لگے -

اٹھارہ سال کے سن میں نارنول سے اجمیر میں آئے اور ستر برس تک اس مبارک مقام میں زہد و ورع و تقویٰ کے ساتھ عمر بسر کی - امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں امیر و فقیر ان کے یہاں سب برابر تھے -

نقل ہے: وہ فرماتے تھے کہ میں ایک دفعہ اپنے اقربا کے ساتھ
مدد معاش کے واسطے مندو میں گیا۔ میں اس زمانے میں خورد سال تھا۔ شیخ محمود
بجلی تب اس وقت شیخ الاسلام تھے اور علماء کی صدارت ان سے متعلق تھی۔
انھوں نے نماز میں امام سے پہلے نیت باندھ لی۔ جب نماز سے فارغ ہوئے دانشمندوں
میں سے کسی نے، جو پہلی صف میں تھے، اُن سے کچھ نہ کہا جب میں نے دیکھا کہ سب کے
سب مداہنت کرتے ہیں میں آگے آیا اور شیخ الاسلام سے کہا کہ یہ تمہاری نماز درست
نہیں ہے، تم نے امام سے پہلے نیت باندھی تھی۔

اور یہ بھی کہتے تھے کہ مندو کے بادشاہوں کی رسم تھی کہ لوگ ان کے سامنے
پشت خم کر کے اور کمر کی انگلی زمین پر رکھ کر سلام کرتے تھے، انھوں نے اور قاضی ادریس
دہلوی نے اس طرح سے سلام نہ کیا اور کہا کہ یہ بدعت ہے اور "السلام علیکم" کہہ کر بادشاہ
کے برابر بیٹھ گئے۔ بادشاہ نے ان کے انصاف کی داد دی اور قاضی ادریس کو اجمیر
کا قاضی کیا اور چار گاؤں دیئے اور فتوے کا کام، جو پہلے شیخ احمد کے بزرگوں کے
سپرد تھا، ان کو دیا۔

ان کو خاندان نبوت سے اپنے پیر کے طریقہ پر بہت محبت تھی، کہتے
ہیں کہ عشرۂ محرم سے ربیع الاول تک نئے کپڑے نہ پہنتے تھے۔ ایام عاشورہ
کی راتوں میں سوائے خاک کسی اور چیز پر نہ سوتے تھے اور سادات کے مقبروں میں
اعتکاف کرتے تھے اور ہر روز جہاں تک ممکن ہوتا حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کا
خاندان مطہر کے واسطے کچھ نہ کچھ تقسیم کرتے۔ جب عاشورہ کا روز ہوتا نئے آبخورے
شربت سے بھر کر اپنے سر پر رکھ کر سادات کے گھروں میں جاتے اور یتیموں اور فقیروں کو
شربت پلاتے اور ان دنوں میں اتنا روتے کہ گویا وہ واقعہ ان کے سامنے ہوا ہے
عورتوں اور لڑکیوں کے نالہ و فریاد سنکر۔ جو اس ملک میں مروج ہے۔ حالت وجد

میں آجاتے اور آنکھوں سے خون برساتے، صحابہؓ اور تمام مشائخؒ کے عرس امکانی
حد تک ترک نہ کرتے اور سرود کو بہت پسند کرتے، ہر چند اس کے طالب نہ تھے
اور نہ رقص و وجد کرتے تھے اور مجلس بھی نہ کرتے تھے اور اکثر اوقات جامہ خسیس کم دھلا
ہوا کہ جو بہت سفید نہ ہوتا تھا پہنتے تھے اور سر پر ٹوپی رکھتے تھے، دستار نماز کے
علاوہ بہت کم باندھتے تھے بسبب گرمی کے۔ کہتے ہیں کہ بڑی دستار اور نفیس
و عمدہ پیرہن یعنی کرتا تیار رکھتے تھے جمعہ اور عیدین کو پہنتے تھے اور اگر کوئی دنیا دار
آتا تب بھی، ان کی دلجمعی اور پاس خاطر کے لیئے، پہن لیتے۔ اور شیروں کی
طرح مجلس میں بیٹھتے اور خدا اور رسول کی بات نہایت ہیبت و عظمت کے ساتھ
بیان کرتے کہ بادشاہوں کا زہرہ بھی پانی ہوجاتا تھا۔ اور اپنے مریدوں سے فرمایا
کرتے تھے کہ:

"اہل دین کو دنیاداروں کے سامنے ذلیل نہ ہونا چاہیئے کیونکہ
یہ لوگ ظاہر بین ہیں۔"

فقیر اور بعض دیوانوں کی، جو اس ملک میں تھے، بہت عزت کرتے
تھے۔ اور جس راستہ سے سوار ہو کر جاتے اگر کوئی مجذوب مل جاتا تو فوراً گھوڑے
سے نیچے اتر آتے اور دست بستہ کھڑے ہو جاتے اور جو کچھ وہ مجذوب کہتا وہی
کرتے۔ اگر کوئی ان کے سامنے کسی غائب کی غیبت کرتا یا کوئی بے فائدہ بات
کرتا تو وہ فرماتے: "بابو خاموش رہ"۔ اور اگر کوئی ان کا نام، مریدوں کی عادت
کے مطابق تعظیم سے لیتا وہ چشم پُرآب کرتے اور فرماتے: "احمد موزوی، زیاں کار"۔
ایسے ہی خواجہ حسین کو بھی اچھا نہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی ان کی تعظیم کرے
اور کہتے تھے رانگ۔ اور رانگ اس کو کہتے ہیں جو سب سے کمتر و کمینہ ہو۔ رحمۃ اللہ علیہم
اگر کوئی ان کے سامنے آتا اور کہتا کہ میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

کو خواب میں دیکھا ہے وہ ادب سے بیٹھ جاتے اور خواب کا تمام قصہ سُنکر اس کے ہاتھ پیر چومتے اور اس کے دامن و آستین کو آنکھوں سے ملتے اور جس جگہ وہ شخص کہتا کہ میں نے فلاں جگہ دیکھا ہے وہاں جاکر بوسہ دیتے اور وہاں کی خاک اپنے منہ پر اور بالوں پر ملتے اور اگر پتھر ہوتا اس پتھر کو دھوکر اس پانی کو پی لیتے اور بدن اور کپڑوں پر گلاب کی طرح چھڑکتے ۔ اور اگر کسی شخص کو سیّد کے ساتھ دعوی یا خصومت ہوتی اس کو منت سماجت و شفاعت کرکے اس طرح مائل کرتے کہ سیّد ہی کا قول بالا رہتا اور فرماتے ۔ سادات کے ساتھ شریعت کی بات نہ کرنی چاہئے بلکہ ان سے مروت کے ساتھ بات کرنی چاہیئے ۔

نقل ہے کہ جب اجمیر میں خلل واقع ہوا اور قلعہ کو رائے سانگلنے، جو بڑا راجہ تھا، مسلمانوں سے لے لیا اور بہت مسلمانوں کو شہید کیا، شیخ احمد مجد اس حادثہ سے سات روز پہلے حضرت خواجہؒ کے اشارے سے شہر کے باہر آئے اور مسلمانوں کو خبر کی کہ اس شہر پر کچھ نظر جلال ہے ۔ حضرت خواجہ گا فرمان ہے کہ مسلمان شہر سے چلے جائیں روز دوشنبہ ۹۲۲ھ کو مسلمانوں کی ایک جماعت کے ساتھ اجمیر سے باہر آئے دوسرے دوشنبہ کو کفار نے اجمیر پر حملہ کیا اور اس شہر کو زیر و زبر کرکے وہاں کے مسلمانوں کو شہید کیا ۔

شیخ احمد جب اجمیر میں آئے تو اٹھارہ سال کے تھے اور جب گئے تو نوے برس کے قریب ہوگئے اور تین چار برس نارنول میں رہے، ایک دن الہ دین مجذوب آئے اور کہا: "احمد تجھکو آسمان پر بلاتے ہیں اپنے پیر کے پاس جا"۔ انھوں نے خود بھی خواب میں کچھ ایسا ہی دیکھا تھا ۔ اسی وقت ناگور کی طرف متوجہ ہوئے اور تھوڑے دنوں میں اس دار فانی سے دار بقا میں تشریف لے گئے ۔

کہتے ہیں کہ حالت سکرات میں جب ذرا سا افاقہ ہوتا تھا ہاتھ اٹھاکر تکبیر تحریمہ کہتے اور پھر بیخود ہوجاتے اسی حالت میں اللہ اکبر کہتے ہوئے جاں بحق تسلیم کی ۲۵ صفر ۹۲۷ھ کو روضۂ مخدوم بزرگ حضرت سلطان التارکین میں اپنے پیر کے پائیں جگہ پائی رحمۃ اللہ علیہ ۔

ان کی تاریخ رحلت ملا محمد نارنولی نے، جو ایک شخص صالح اور مقبول و معتقد مشائخ اور اپنے ملک کے مورخ بھی تھے اور بچپن میں شیخ احمد کی شرف بیعت سے مشرف بھی ہوئے تھے، کہی تھی

نظر بستہ بود احمد مجد شیباں ۔۔۔ ز دروں خدا ہچو زاہد ز شاہد
کہ تاریخ آں پیر خود نارنولی ۔۔۔ بر آورد از جملہ شیخ زاہد
۹۲۷ھ

نقل ہے کہ نارنول میں بادشاہوں میں سے ایک نامور شخص ان کا مرید تھا اور چھوٹے بھائیوں سے کچھ اس کی لڑائی تھی، ایک دن وہ پانی کا مٹکا بھرا ہوا سر پر رکھ کر شیخ کی خانقاہ میں آیا لوگوں میں غل ہوا کہ فلاں شخص شیخ کی خانقاہ کے واسطے پانی بھرتا ہے ۔ شیخ کی جوان پر نظر پڑی فرمایا: "بابو! احمد اس کام سے راضی نہیں ہوتا جاؤ اور اپنے بھائیوں کو راضی کرو اور ان کے ساتھ جو خصومت ہے اس سے باز آؤ جب میں تم سے خوش ہوؤں گا ۔

نقل ہے کہ جب سے انھوں نے بادشاہوں کے ہاں جانا ترک کیا اور مرید ہوئے ان کی عادت یہ تھی کہ آدھی رات کو حضرت خواجہ بزرگ کے مزار پر حاضر ہوتے اور تہجد کی نماز سے چاشت تک کلام نہ کرتے اور وظائف و نماز چاشت سے فارغ ہوکر علوم دینیہ کا درس دیتے اور تھوڑے سے قیلولہ کے بعد اٹھ جاتے اور پھر عصر تک اوراد میں مشغول رہتے ۔ پھر اہل مجلس کے سامنے تفسیر مدارک بیان فرماتے وعدے اور وعید پر اشارہ تے اور حالت کرتے کہ جتنے صوفی سماع میں

کرتے ہیں۔ آنکھیں ان کی زیادہ جاگنے سے ہمیشہ سُرخ رہتی تھیں اور تفسیر مدارک کا وظیفہ ان کے مشائخ کا طریقۂ سلوک ہے کیونکہ خواجہ حسین ناگوری رح اور شیخ حمیدالدین صوفیؒ ایسا ہی کیا کرتے تھے غرض اجمیر شریف میں ستر برس اسی طرح گذارے۔

نقل ہے کہ جب آدھی رات کو اپنے گھر سے حضرت خواجہ کے روضہ شریف پر حاضر ہوتے، روضہ کا دروازہ کھل جاتا تھا۔ جب یہ راز لوگوں میں فاش ہوا ایک شخص چھپ کر امتحان کے واسطے آدھی رات کو ان کے پیچھے چلا۔ جب شیخ دروازہ کے اندر چلے گئے اس نے بھی اندر جانا چاہا دو تختوں نے اندر سے آکر اسے دبالیا وہ چیخا کہ: "میاں جیو، میں نے توبہ کی۔

مولانا محمد نارنولی نے اپنے استاذ مولانا عبدالمقتدر سے کہ عالم عامل متشرع و متبع اور ثقہ و فقیہہ تھے، نقل کی ہے کہ میں نے نارنول میں چند مریدیں کے ساتھ اس دروازہ کے کھلنے کو شیخ سے معائنہ کیا ہے جو شیخ احمد ترک رح کے روضہ میں واقع تھا۔[1] رحمۃ اللہ علی جمیع عبادہ الصالحین

نوٹ:۔ آپ کی پیدائش نارنول میں پرورش اجمیر میں ہوئی اور وفات و مزار ناگور میں۔ اسی باعث آپ کو ناگوری لکھا۔ افادہ واستفادہ سب ہی اجمیر و ناگور میں ہوا صرف پیدائش نارنول میں اور تعلیم و تعلم بھی اسی لئے آپ کو نارنولی بھی کہا جاسکتا ہے۔ (علامہ شیخ احمد مجد نارنولی قدس سرہ العزیز)

---

[1] اخبار الاخیار اردو ۲۶۳ - ۲۶۸

قاضی احمد مجد شیبانی نارنولی شاگرد و مرید شیخ حسین ناگوری فرزند قاضی مجدالدین کے جو قاضی شمس الدین کے پوتے ہیں۔ امام محمد شیبانی (شاگرد امام اعظمؒ) کی نسل سے ہیں۔

کہتے ہیں کہ شیخ احمد سات بھائی تھے جو تمام علم اور پرہیزگاری کا لباس رکھتے تھے لیکن علم عمل عمر اور عبادت کے اعتبار سے سب میں زیادہ بزرگ آپ ہی ہیں۔ سولہ برس آپ کی عمر تھی کہ زمانے کے تمام علماء پر علمی بحث میں آپ غالب تھے۔ اور دولت مندوں کی محفل میں بالانشیں تھے۔

اٹھارویں سال میں رسمی طور پر بیعت کر کے مجلسوں میں بیٹھنا اور مباحثے کرنا ترک کر دیا۔ اور گوشہ نشینی کے ارادہ پر اجمیر میں آ پہنچے روزمرہ آدھی رات کے وقت خواجہ معین الاولیاءؒ کے روضہ پر جایا کرتے تھے۔ یوسفی اعجاز سے دروازے کھل جاتے تھے اور اس وقت سے لے کر چاشت کے وقت تک سوائے ورد دعا، نماز نفل اور نماز فرض کوئی کام نہیں کرتے تھے نہ کوئی حرف زبان سے نکالتے تھے، اس کے بعد سونے کے وقت تک درس، قیلولہ، نماز فرض، مستحب دعاخوانی، وعظ گوئی اور تفسیر میں مشغول رہ کر ایک پلک مارنے کی فرصت بھی اپنے اوپر جائز نہیں سمجھتے تھے[1]

غوث الاولیاء کی تصنیفات سے کچھ اوراد ہیں۔ ان میں صاحب ممدوح تحریر فرماتے ہیں:

جس زمانے میں کوہستان چنار میں رہ کر نفس کے ساتھ میں بھاری لڑائی کر رہا تھا اس زمانے کا ذکر ہے کہ میں نے خواب میں

---

[1] اذکار ابرار اردو گلزار ابرار ص ۲۲۸ - ۲۲۹

دیکھا شیخ شرف احمد یحییٰ منیری بہار بنگالہ کے مشائخ کبار کا گروہ ساتھ لئے ہوئے دریائے گنگا کے کنارے کھڑے ہوئے ہیں اور اس درویش کو بلاتے ہیں جب خواب سے بیدار ہوا تو ملازمت میں حاضر ہوا۔ ارشاد ہوا، ناگور تک تم ہمارے ساتھ چلو۔ میں نے بہانہ کیا تو قبول نہیں کیا۔ فرمایا: آج قطب زماں شیخ احمد مجد خلیفہ شیخ حسین ناگوری نے عالم علوی کو کوچ فرمایا ہے۔ اور حضرت خاتم النبوۃ علیہ السلام نماز جنازہ کے واسطے تشریف لائے ہیں، مشائخ کے پہنچنے کا انتظار دیکھ رہے ہیں۔ یہ تقریر سنکر مزید انکار کی گنجائش نہیں رہی۔ شرف الاولیار نے میرا ہاتھ پکڑا اور ھو کہا۔ ہم فوراً دہلی میں پہنچ گئے اس صوبہ کے مشائخ وہاں تھے سب نے فراہم ہوکر ایک ساتھ ھو کہا تو اپنے تئیں ناگور کی حدود میں پایا۔ ناگاہ حوض برتلے کے کنارہ ایک تابوت نظر آیا جس کے نزدیک سرور انبیار علیہ السلام بیٹھے ہوئے تھے اور بزرگان مشرق ومغرب گروہ کے گروہ کھڑے ہوئے تھے اس درویش کو اولین صف میں بلایا اور شیخ فریدالدین عطار کی طرف ارشاد ہوا کہ "اپنے فرزند سے کہو کہ امام بنے"۔ کمال ادب اور ڈر سے بدن پر رعشہ پیدا ہوگیا۔ عرض کیا گیا، "یہ ڈرتا ہے اور اس کے سوا کوئی اور ذی جسم اس جگہ پر بھی نہیں"۔ فرمایا: کہو امامت کرے"۔ میں نے عرض کیا "نماز جنازہ کی نیت اور دعار مجھکو اچھی طرح معلوم نہیں"۔ یہ ناواقفیت کا عذر بھی حضور میں پیش کیا گیا، فرمایا: جنازہ کی نماز

میں کسی خاص نیت اور دعا کی شرط نہیں ہے، بس توجہ اور تکبیر کافی ہے"۔ اس پر درویش نے ترکیب کی تعلیم کے لئے التماس کیا۔ فرمایا: "کہو الصلوٰۃ للہ والثواب للمیت اللہ اکبر اور ہر بار آنکھ بند کرلو اور کھولو اور اللہ اکبر کہو۔ یہاں تک کہ چار تکبیریں پوری ہوجائیں"۔ میں نے حکم کی تعمیل کی۔ جب آپ کو سپرد گور کردیا تو رسول خدا نے تحفۂ سلام درویشانِ حاضر وغائب کو پہنچاکر کوچ فرمایا۔ شرف الاولیار نے میرا ہاتھ پکڑا اور اپنے تکیہ میں لے آئے جب آنکھ کھلی تو اپنے تئیں معمولی جگہ پر پایا"[۱]

محمد خاں ناگوری ہندوؤں کی طرح زیور پہنا کرتا تھا، ایک دن آپ سے ملاقات کے لئے آیا، جو لباس خلاف شرع تھا اتار پھینکا مگر اس کے ہاتھ میں سونے کی انگوٹھی تھی، جب تک اس نے وہ انگوٹھی نہ اتاری آپ نے اس سے ہاتھ نہیں ملایا، اس کے لمبے اور نیچے کپڑے تھے آپ نے کاٹ کر چھوٹے کردیئے۔

ایک رئیس آپ کے پاس آیا اس کا لباس بہت لمبا تھا آپ نے اس کا دامن چاک کرکے فرمایا کہ اس سے زیادہ پہننا خلاف شرع ہے، وہ رئیس جب آپ کے پاس سے گیا تو پھٹا ہوا لباس جلو اکر شکار کے لئے چلا گیا، اتفاقاً اس کا دامن کانٹوں میں الجھ گیا اور وہیں سے پھٹ گیا جہاں سے سلوایا تھا۔ وہ آپ کے پاس آیا اور توبہ کی کہ آئندہ لمبے دامن کا لباس نہ پہنوں گا۔

حسن خاں میواتی نے آپ کے پاس مراسلہ کے ذریعہ درخواست پیش کی

---

[۱] اذکار ابرار ترجمہ اردو گلزار ابرار ص ۲۸ - ۲۲۹

کہ نارنول کے پاس بہت گاؤں میوؤں کے ہیں، ان میں سے جو گاؤں آپ کو پسند ہو قبول فرمائیں پروانہ لکھکر بھیجدیا جائے گا اور اگر آپ مرکز میوات میں تشریف لائیں تو زہے نصیب، کیونکہ اس وقت میوات میں کوئی عالم اور بزرگ نہیں ہے آپ کے قدموں کی برکت سے علم وصلاح وہاں پھیل جائے تو بہتر ہے، آپ نے سُنا تھا کہ حسن خاں نے اپنے بھائیوں کو قتل کر دیا تھا، آپ نے اس خط کی پشت پر لکھا: "چونکہ تو نے اپنے بھائیوں کو قتل کر دیا اس لئے تیرا منہہ دیکھنا روا نہیں"۔[1]

شیخ احمد مجد کے بہت سے خلفار تھے جن میں مولانا عبدالمقتدر دہلوی اور مولانا محمد نارنولی کے اسمار گرامی قابل ذکر ہیں شیخ حمزہ دھرسوی آپ سے فیض یاب ہوئے ہیں۔ حالانکہ وہ حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز (گلبرگہ شریف) کے مرید تھے۔[2]

---

[1] سلطان التارکین ص ۳۰۰

[2] " " ص ۳۰۶

حضرت بائن مجذوب

اجمیر سراپا خیر میں رہتے اور خواجۂ خواجگانؒ کے در اقدس پر پڑے رہتے تھے۔ مالوہ کے رہنے والے تھے۔ اجمیر شریف ان کو جذبہ الٰہی حاصل ہوا تھا۔ شیخ حمزہ دھرسوی سے نقل ہے:۔ کہتے تھے جب اول مرتبہ حضرت خواجہ معین الدین قدس سرہٗ کی زیارت کو گیا تو یہ بائن مجذوب ان لوگوں سے، جو اُن کے گرد تھے کہنے لگے:

"میاں آتے ہیں لوگ، ہر طرف دیکھنے لگے کہ ناگاہ ایک کونہ میں سے میں ظاہر ہوا، کہنے لگے "یہ میاں آئے ہیں"۔ جب میں قریب پہنچا، کہنے لگے: "میاں قریب آؤ"۔ میں قریب گیا۔ کٹار جو ان کی کمر سے بندھ رہی تھی، اس کو کھول کر مجھ سے پوچھا:

"یہ کیا ہے؟"

میں نے کہا "ہتھیار ہے ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت"۔ پھر کٹار کو رکھ دیا اور میرے پاس جو خرچ تھا اس کو کھول لیا اور کہا:

"یہ کیا ہے؟"

میں نے کہا: "زادراہ ہے، یہ بھی ہمارے پیغمبر کی سنت ہے"۔ میرے پاس دو کنگھیاں تھیں، ان دونوں کو پوچھا:

"یہ کیا ہے؟"

میں نے کہا: "یہ کنگھیاں ہیں"۔ سر کی کنگھی کو دور پھینکدیا

اور داڑھی کی کنگھی مجھ کو دی، اس اشارہ سے میں اسی وقت مخلوق ہوا یعنی سر منڈا لیا اسی اثنا میں شیخ احمدؒ مجد نے خبر پائی کہ قاضی کریم الدین کے لڑکے تارک ہوتے ہیں۔ مجھکو اپنے گھر مہمان کیا، اس مجلس میں میاں بائن بھی موجود تھے اور ہر ایک اہل مجلس کو اپنے ہاتھ سے نوالہ دیتے تھے اور لوگ تبرکاً لیتے تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا:

"ایک یہ مہمان ہے اس کو کیوں چھوڑتے ہو"؟ انھوں نے جو طبق ان کے سامنے رکھا تھا اٹھا کر سب مجھکو دیدیا اور فرمایا:

"ہر ایک کو ایک نوالہ اور میاں کو ایک طباق"۔

اس وقت سے جو میں اٹھا تو لوگ مجھکو میاں حمزہ کہنے لگے، اور اسی دن سے مجھ پر کشائش کا دروازہ کھلا۔

نقل ہے کہ جب بہادر بادشاہ گجرات باپ سے رنجیدہ ہو کر اجمیر شریف میں آیا تو اول حضرت خواجہ کی زیارت کو حاضر ہوا۔ اجمیر اس وقت کافروں کے پاس تھا اور حضرت خواجہ کے مزار کو انھوں نے معبد بنا رکھا تھا اور وہیں بت رکھ چھوڑے تھے۔ سلطان بہادر نے دل میں نیت کی کہ اگر خدا نے مجھکو سلطنت دی تو ان کافروں سے جو خدا انتقام ہے وہ لوں گا۔ میاں بائن بھی وہاں موجود تھے، اپنی دایہ سے کہنے لگے جس کا نام شاداں تھا:-

"شاداں! شاداں! بلند تختہ رکھو کہ ایک مرغ دریائی آیا ہے"۔

بہادر نے اس قول سے فال نیک لی اور چلے گئے، پھر جب بادشاہ ہوا اپنے عہد کے موافق اس ملک کے کفاروں سے بدلہ لیا۔[1]

---

[1] اخبار الاخیار ص ۲۰۵

الہ دین مجذوب نارنولی

یہ نارنول میں تھے، اکثر اوقات نارنول کے بازاروں میں پھرا کرتے تھے، اور قبر بھی انکی وہیں ہے جس جگہ بیٹھتے پھر کئی روز تک نہ اٹھتے اور خود بخود باتیں کیا کرتے تھے کبھی روتے کبھی ہنستے اور کبھی اپنے سے آپ اعراض کرتے، اور کبھی دوتارہ بجاتے تھے اور افغانی غزلیں گاتے اور کبھی زندکینہ اور جرکیں بغل میں رکھتے اور ہاتھ پیروں میں لوہا پہنتے تھے اور بات چیت میں یہ لفظ انکا تکیہ کلام تھا۔ "خدایا بیا خدایا برو خدایا بخشیں"۔ اور جس کسی سے بات کرتے تھے تو اسی طرح بات کرتے تھے۔ ملا محمد نارنولی کہتے ہیں کہ میری ماں کہتی تھیں کہ جب تو بچہ تھا دودھ پیتا تو اس قدر بیمار ہوا کہ زندگانی کی امید جاتی رہی تھی الہ دین دیوانہ میرے محلہ کے نزدیک سے گذرے اور ایک شخص کو آبخورہ کی مٹی دے گئے کہ یہ فلاں مکان میں دیدینا وہ مٹی اس شخص نے مجھ کو دیدی۔ میں نے تعویذ بنا کر تیرے بازو میں باندھ دی اسی دن سے خدا نے تجھے صحت دی۔ تیرے باپ گئے اور الہ دین کو گھر میں لائے تاکہ کچھ کھلائیں الہ دین کہنے لگے۔ خدایا کچھ گرم، کچھ سرد، کچھ کھٹا، کچھ میٹھا، تمہارے والد نے اسیوقت چاول پکائے اور شکر دہی موجود کیا۔ انھوں نے کھایا اور واپس چلے گئے کہتے ہیں کہ انھوں نے گندہ پیر مار کر رکھا تھا جس کسی کا پیر گندہ میں دیکھتے تھے اس کا پیر نکال کر اپنا پیر باندھ لیتے تھے۔ اور یہ بھی ملا محمد کہتے تھے کہ ایک دن چند پیسے میں نے ان کی نذر کے واسطے لئے اور انھیں ڈھونڈنے کو نکلا اکثر جگہ تلاش کیا کہیں انکا پتہ نہ لگا۔ آخر شہر کے ایک کونہ میں ایک مزبلہ میں دیکھا کہ ایک شخص زندہ سر پر اوڑھے لیٹے ہیں میرے دل میں گمان ہوا کہ شاید مردہ پڑا ہے جب نزدیک پہنچا تو وہ زندہ ہلا تب میں نے جانا کہ زندہ ہے اور انھوں نے زندہ میں سے سر باہر نکال کر کہا لا کیا لایا ہے۔ میں نے وہ پیسے جو انکی نیت سے لے گیا تھا حاضر کئے۔ انھوں نے ہاتھ باہر نکال کر لے لئے اور کہا۔ خدایا الٹا پھر جا یہ مزبلہ ہے وفات انکی ۹۴۰ھ میں ہوئی ۵ شعبان کو شب برات میں صبح کے قریب اور انکی تاریخ وفات مجذوب صادق ہے، قدس سرہٗ

۹۴۶ھ

شیخ حمزہ دھرسومی[1]

خاندان شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا کی اولاد سے ہیں اور سلسلہ انکا میر سید محمد گیسو دراز سے ملتا ہے ۔ یہ بزرگ صاحب برکت نعمت وکرامت تھے ۔ کل وقتوں کو عبادتوں سے معمور رکھتے تھے عمر بڑی تھی سلطان بہلول کے زمانہ سے اسلام شاہ کے وقت تک زندہ رہے ۔

سلوک و تربیت ابتدائی دور میں کسی بادشاہ کی خدمت میں بھی رہتے تھے ۔ ، ایک شب محل سرائے شاہی کی حفاظت کر رہے تھے ۔ دل میں خیال آیا کہ ایسے شخص کی خدمت کرنی چاہیئے جو میری حفاظت کرے ، نہ ایسے کی جس کی میں خود حفاظت کروں ۔ اسی خیال میں اجمیر شریف گئے حضرت خواجہ بزرگ معین الحق والدین کی زیارت کے واسطے ۔ وہاں ایک دیوانہ تھے بائن نام ان سے نعمت پائی اور شیخ احمد مجدؒ کی بھی صحبت میں رہے ۔ پھر وہاں سے اپنے وطن میں آئے اور قصبہ دھرسو میں جو نارنول سے تین کوس پرے سکونت اختیار کی ، ان کے والدین نوھر میں رہتے تھے ۔ ان کے دھرسو میں رہنے کی یہ وجہ ہوئی کہ وہاں بعضے سادات رہتے تھے ، جن کی عادات وضع اشراف سے خارج تھیں ۔ ان سب کو تربیت و تعلیم کی اور دو معلم ایک عربی اور ایک فارسی کے وہاں چھوڑے ۔ طالب علموں اور فقراء سے بہت محبت رکھتے تھے ، فتوحات کے دروازے ان پر بے انتہار کھلے ہوئے تھے اور بالکل انقطاع نہ رکھتے تھے ، سب کو فقراء کے واسطے خرچ دیتے اور کچھ باقی نہ رکھتے ۔ اپنی اولاد اور بیبیوں کے جو حصہ میں آتا اس سے زیادہ نہ دیتے تھے ۔ اور جب گوشۂ عزلت

میں بیٹھے پھر کبھی کسی دنیادار کے گھر پر نہیں گئے اور نہ کسی اپنے خادم کو بھیجا ۔

اخلاق نقل ہے کہ وہ جمعہ کی نماز کے واسطے دھرسو سے نارنول میں آیا کرتے تھے اور راستے میں سے لکڑیاں چن کر گٹھری باندھ لیتے اور جہاں کوئی فقیر بیٹھا ہوا مل جاتا اس کو دیدیتے ۔

نقل ہے ؛ وہ فرماتے تھے دنیا ایسی ہے جیسی آگ اتنی ہی کافی ہے جس سے روٹی پک جائے ۔ اور سردی میں گرم ہو جائیں اور جب زیادہ ہو جاتی ہے تو جلا کر ہلاک کر دیتی ہے ۔ ان کے مریدوں میں سے ایک مرید کہتے تھے کہ ایک دفعہ شیخ نے مجھکو ریگستان کی طرف رخصت کیا ۔ میں ایک جنگل میں پہنچا ۔ پیاس غالب ہوئی ۔ پانی کا اس جگہ ملنا محال تھا میرے دل میں خطرہ گذرا کہ پہلے زمانے کے مشائخ جو مریدوں کو کہیں بھیجتے تھے تو وہ پانی کی جگہ دودھ پاتے تھے اور میں اس جنگل میں بے پانی کے ہلاک ہوا جاتا ہوں کہ ناگاہ ایک چرواہے کو دور سے دیکھا کہ بکریاں چرا رہا ہے اور اس کی بغل میں ایک مشک ہے میں نے اس کے نزدیک جا کر کہا کہ تھوڑا سا پانی میرے حلق میں ٹپکا دے کیونکہ میں پیاس سے مرا جاتا ہوں ۔ اس نے کہا : یہاں پانی کہاں ہے ؟ اس مشک میں دودھ ہے اگر پیو تو میں دوں ۔ آخر میں نے اس میں سے پیا ۔ تھوڑی دیر میں پیاس نے پھر غلبہ کیا ناگاہ میں نے ریت کے ٹیلوں میں ایک گڑھا دیکھا اس میں نہایت شیریں و پاکیزہ پانی بھرا ہوا تھا میں نے خوب سیر ہو کر پیا اور نئے سرے سے زندگی پائی ۔

وفات ۲۵ ربیع الثانی ۹۶۹ھ کو ہوئی ۔ مغرب کی نماز میں دو رکعتیں پڑھ کر تیسری رکعت میں تھے کہ جان بحق تسلیم کی ۔ رحمۃ اللہ علیہ

نوٹ ۔۔ ز ہر قصبہ نوح کے مغرب میں کوہ اروَلی کے دامن میں کسی دور کا بہت اہم قصبہ تھا ۔ نوح وہیں کی آبادی میں سے آباد ہوا ہے ۔

---

[1] اخبار الاخیار اردو ص ۲۶۹/۲۷۰

مولانا عمادالدین غوری رحمہ اللہ رحمۃ الابرار

شہر نارنول کے مشائخ سے ہیں۔ ان کے آباؤ اجداد دیارِ عرب سے ملکِ عجم میں آئے تھے اور سلطان شہاب الدین کے ہمراہ غور سے ہندوستان آئے۔

نقل ہے کہ انھوں نے جوانی میں علم پڑھنے کی کوشش نہیں کی تھی، قوت بھی بہت رکھتے تھے، اور اکثر پہلوانوں سے کشتی کیا کرتے تھے، ایک دن ایک پہلوان کو، کہ جس سے زیادہ طاقتور روئے زمین پر کوئی نہیں تھا، پچھاڑ کر مغرور و مست گھر کو جا رہے تھے اس وقت کے علماء میں سے ایک شخص نے ان کو اس حالت میں دیکھکر تاسف کیا اور ان کو اس بات کا طعنہ دیا۔ اس سے انکی حمیت و غیرت جوش میں آئی اور اس وضع سے پشیمان ہوئے اور تحصیل علم چاہی مگر چونکہ بچپن میں کچھ پڑھا تھا لہذا مشکل معلوم ہوا۔ آخر کو شیخ محمد ترکؒ کے روضہ پر نارنول میں سکونت اختیار کی اور رات دن وہیں پڑے رہتے اور حصول علم کے واسطے مدد مانگتے، اسی طرح بارہ برس گذر گئے۔ آخر ایک رات کو طہارت کے واسطے باہر نکلے پیچھے سے ایک شخص نے آ پکڑا اور کہا مانگو کیا مانگتے ہو۔ یہ تو اپنے باپ دادا کے طریقہ کے طالب تھے۔ علم و تقویٰ کی درخواست کی انھوں نے کہا جاؤ اپنے باپ دادا کے کتب خانہ کو سنبھالو، اور لوگوں کو درس دو۔ حق تعالیٰ نے علوم دینیہ کے دروازے ان پر کھول دیئے۔

شیخ احمد مجد شیبانی سے منقول ہے کہ میں نے مولانا عماد کو بچپن میں دیکھا تھا۔ ایک شخص بزرگ کمال متبع سنت تھے کوئی سنت ان سے ترک نہ ہوتی تھی۔ فقر و فقرا کو بہت دوست رکھتے تھے، اور یہ مولانا عماد ان مولانا عماد

کی اولاد سے ہیں جو تغلق کے زمانۂ سلطنت میں تھے۔ تغلق نے کہا تھا کہ خدا کا فیض منقطع نہیں ہوتا، پھر فیضِ نبوت کیونکر منقطع ہو سکتا ہے۔ اب اگر کوئی نبوت کا دعویٰ کرے اور معجزہ دکھائے تو اس کی تصدیق کروگے یا نہیں؟

مولانا عماد نے اسی وقت کہا: "گوہ مخور چہ می گوئی" (ناپاکی مت کھا، یہ کیا بکواس ہے؟)

محمد تغلق نے حکم دیا کہ ان کو ذبح کر کے زبان کھینچ لو رحمۃ اللہ علیہ[1]

سیّد یوسف الحسینی

۷۰۲ھ — ۷۹۰ھ

آپ کے والد کا نام سیّد جمال حسینی ہے، آپ کے بزرگوں نے مشہد سے آکر ملتان کو وطن بنایا۔ سلطان فیروز کے زمانے میں آپ ایک فوجی کی حیثیت میں ملتان سے دہلی آئے، آپ دہلی پہنچکر فوج میں تھے کہ سلطان فیروز نے آپ کی بزرگی اور عقلمندی کے پیش نظر آپ کو اس مدرسہ میں، جہاں اس نے حوضِ خاص علائی اور اپنا مقبرہ بنایا تھا، مدرس کر دیا۔ آپ نے برسوں اس مدرسہ میں پڑھایا اور لوگوں کو عام فائدے پہنچائے۔

حکایت ہے کہ سیّد یوسف حسینی ہمیشہ جمعرات کو رات کے وقت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم کو خواب میں دیکھتے تھے۔

آپ نے قاضی نصیر الدین بیضاوی کی مشہور کتاب لب الالباب فی علم الاعراب کی ایک لمبی چوڑی شرح لکھی ہے جو، یوسفی کے نام سے مشہور ہے۔

---

[1] اخبار الاخیار اردو صفحہ ۲۸۹

ب ... ایک مختصر و کارآمد کتاب ہے جو ہمارے شہر دہلی میں بڑی مشہور کتاب ہے۔

پیدائش ۷۰۰ اور وفات ۷۹۰ ہجری ہے۔ مزار حوض خاص علائی پر ہے،

جہاں آپ مدرس تھے۔[1]

آپ کی اولاد نے دہلی اور تجارہ میں۔ جہاں میوات کے باشندے اکثر و بیشتر آتے رہتے تھے، اور آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ عوام کو اسلامی تعلیمات سے روشناس کرایا، اور خود میوات میں اصلاحی دورے فرمائے۔

سید [illegible] علی شاہ متوفی ۱۰۰۳ھ۔ جو آپ کی ہی نسل میں تھے۔

تحریک [illegible] سید احمد شہید کے سرگرم کارکن گزرے ہیں مجاہدین کے لئے خود بھی امداد [illegible] اپنے متعلقہ احباب سے فراہم بھی کرایا — اور قاضی علیم الدین (پناہ کا [illegible] تجارہ) جو خود [illegible] پنگوڑں کے تھے، ان دونوں حضرات نے مروجہ بدعت کے خلاف منظم جد و جہد کی اور اس سلسلہ میں ایک اہم کانفرنس قصبہ ریواڑی میں ۱۲۳۱ھ [illegible] جس کے اثرات کافی دنوں تک فضائے میوات میں محسوس کئے جاتے رہے۔ [illegible] کی نگہداشت کی خاطر شاہ مولوی عبد المجید [illegible] ریواڑی میں مقیم تھے جو حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ کے تربیت یافتہ تھے۔ رحمہم اللہ

---

[1] اخبار الاخیار [illegible] ص [illegible]

[2] مکتوب [illegible]

راجی حامد شہؒ

مرید شیخ حسام الدین مانکپوری کے ہیں۔ بزرگ صاحبِ نسبت و صاحبِ حالِ صحیح اور صاحبِ صفائی باطن تھے۔

نقل ہے کہ سلطان شمس الدین التمشؒ کے زمانے میں دو بھائی سادات کرو زے دہلی میں آئے ایک ان میں سے سید شمس الدینؒ تھے جنھوں نے میوات میں سکونت اختیار کی اور ان کی اولاد بھی وہیں ہے، دوسرے سید شہاب الدینؒ ہیں جو کڑہ مانکپور تشریف لے گئے اور وہیں رختِ اقامت ڈالا۔[1]

ان کے بزرگ ہمیشہ معزز و مکرم رہے وہاں کے لوگوں کی زبان میں ان کے نام پر راجی کا لفظ غالب ہے۔ یہ بھی اوّل سپاہیوں کے لباس میں رہتے تھے۔ آخر میں شیخ حسام الدین مانکپوریؒ کی خدمت میں پہنچے اور بہت ریاضتہائے شاقہ کھینچ کر صفائی باطن اور حضور وقت ان کو نصیب ہوا۔ علم ظاہر پر انھوں نے بقدر ضرورت اکتفا کی تھی مگر بڑے بڑے دانشمند اُن کے حلقۂ ارادت میں داخل تھے، کہتے ہیں جب یہ چاہتے کہ کوئی معارف کی بات کشف ضمائر سے ظاہر کریں۔ کوئی حکایت اپنی سرگذشت کی بیان کرتے جس کے ضمن میں طالب کا مقصد بھی انجام کو پہنچ جاتا۔ مزار ان کا مانکپور میں ہے[2]

راجی سید نورؒ

راجی حامد شہ کے فرزند ہیں۔ یہ بھی اپنے والد جیسے بزرگ صاحبِ کرامت

---

[1] خزینۃ الاصفیا ص ۴۹ [2] اخبار الاخیار

تھے سپاہ گری کے لباس کو پردہ بنا کے مشغولیٔ باطن کرتے تھے ۔ مزار مانکپور میں ہے [1]۔

راجی سید مصطفیٰ

آپ کے پدر بزرگوار کا نام سید مبارک ابن سید محمودؒ ابن سید نور ابن سید حامد شاہؒ ہے ، اور سید حامد شاہ شیخ حسام الدینؒ مانک پوری کے بڑے خلیفہ تھے ، آپ کے درویشانہ اخلاق اور صوفیانہ اطوار تھے ، آپ کی طبیعت ناموافق چیزوں کی برداشت نہیں کر سکتی تھی ، زندگی کمال ظریفانہ طور پر بسر کیا کرتے تھے ، بیرونی پاکیزگی اور اندرونی صفائی آپ کے خمیر میں داخل تھی ، سرود اور سماع کو بہت دوست رکھتے تھے لیکن ہر ایک نغمہ پر آپ کا دل بے قابو نہیں ہوتا تھا ۔ ، جب تک گانے والا اور بجانے والا ایسے کامل ہنر سے آراستہ نہیں ہوتا تھا جو علم موسیقی میں درکار ہے تب تک آپ کو نہ وجد اور رقت کی حالت پیدا ہوتی تھی ، اور نہ تقید کی پستی سے اطلاق کے اوج کو پہنچتے تھے ، اس صورت میں آپ کا معنوی سکر طول کھینچ جاتا تھا ، غوث الاولیاء کی خدمت میں دامادی کی نسبت تھی ، اور قطب الاقطاب کی لڑکی سے کئی فرزند ہیں منجملہ ان کے ایک راجہ سید محمد ہیں جو اپنے بزرگوار باپ کے جانشین ہیں ، اللہ تعالیٰ جل شانہ سب کو اجداد کے کمالات پر پہنچا رہے ۔

۹۶۳ھ ہجری میں جب عرش آستانی اکبر شاہ کا لشکر دار الخلافہ آگرہ سے مالوہ کی طرف کوچ کر کے آیا ، تو تمام مشائخ فقرا ، فضلا و قضاۃ اور

[1] اخبار الاخیار ۔

شعرا لشکر کے ہمراہ ہو تھے ، راقم (مصنف گلزار ابرار محمد غوثی شطاری مانڈوی) ، بزرگوں کی ملازمت کا تشنہ ہی ہے ، جب یہ خبر سنی تو بے تاب ہو کر گھر میں نہ بیٹھ سکا ۔ جو بزرگان شہر سیر لشکر کے واسطے روانہ ہوئے تھے ان کے ہمراہ میں نے بھی عزم کیا ، اسی سلسلہ میں راجہ سید مصطفےٰ کے دیدار سے ظاہری و باطنی آنکھیں منور ہوئیں [1]۔

نوٹ :- راجہ سید مصطفیٰ راجہ سید حامد شہ کی اولاد میں ہیں اور وہ سید شہاب الدین کی اولاد میں سے ہیں جو سید شمس الدین (جو گردیز سے آئے تھے) کے بھائی ہیں ۔ سید شمس الدین کی بود و باش سا کرس تحصیل فیروز پور جھرکہ ضلع گوڑگانوہ میں ہوئی اور سید شہاب الدین مشرقی یوپی میں آباد ہو گئے مانکپور وغیرہ ۔ اس حیثیت سے سید شہاب الدین اور ان کے اہل خاندان کو میوات سے ایک خاص نسبت ہے جو بہت کم لوگوں کو معلوم ہے ۔

شیخ حسن طاہر رحمہ اللہ

راجی حامد شہ کے مرید ہیں اور راجی سید نور سے نعمت خلافت پائی تھی ۔ ان کے والد شیخ طاہر ملتان سے تحصیل علم کے واسطے اس ملک میں آئے تھے ۔ ایک مدت شہر بہار میں رہ کر شیخ بڈھ حقانی سے تحصیل علم کیا اور وہیں بہار ہی میں شیخ حسن خلوت خانۂ عدم سے مہمان سرائے وجود میں تشریف لائے اور شروع جوانی و اثنائے تحصیل علم میں درویشوں کی صحبت میں مشغول رہے ۔ نقل ہے کہ انھوں نے انھیں دنوں میں کسی مشائخ سے کتاب

[1] گلزار ابرار اردو ترجمہ ص ۲۵۳ - ۲۵۴

فصوص الحکم شروع کی، ان کے والد فصوص الحکم کے طریق کے مخالف تھے۔
ایک دن انھوں نے ان سے توحید وجودی کا مسئلہ پوچھا ان کے والد نے بقدرِ علم علماء ظاہر تقریر فرمائی اور مولوی کے عقدے کے حل ہونے کے باعث ہوئے۔ اور وہ ان کو جو اس کتاب کے پڑھنے سے منع کرتے تھے باز آئے۔ ان ہی دنوں میں راجی حامد شاہ کا آوازۂ مشیخت لوگوں میں بلند ہوا۔ شیخ حسن سید کے دیکھنے کو امتحان کی طرح سے گئے اور پہلی ہی ملاقات میں بقوت جاذبۂ ازلی سلسلۂ ارادت میں داخل ہوئے ؎

کو زہرہ آنم کہ بایں جاذبۂ شوق
رخسار ترا بینم و بیتاب نگردم

علماء میں سے اوّل جو شخص سید کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے یہی تھے کہ جونپور کے مشائخ سے تھے۔ سلطان سکندر انار اللہ برہانہ کے زمانہ میں انکے بلانے سے اس ملک میں تشریف لائے۔
نقل ہے کہ سلطان سکندر کے بھائیوں میں سے ایک شخص جن کے دماغ میں ہوائے سلطنت سمائی تھی ان کے مرید ہوئے۔ ایک دن اسی خیال کر خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا حضرت شیخ فاتحہ پڑھیں تاکہ مجھکو دہلی کی سلطنت نصیب ہو۔ شیخ نے ان کو اس پاگل پن سے منع کیا اور فرمایا کہ حق سبحانہ تعالیٰ اپنی حکمت سے ایک کی ترقی چاہتا ہے تو اس کا معارضہ مت کر اور اسکا مطیع ہو۔ یہ خبر جب سلطان سکندر کو ہوئی ان کی کرامت کے معتقد ہوئے۔ اور اس جانب تشریف لانے کا التماس کیا وہ چونکہ پہلے سے مشائخ دہلی کا اشتیاق زیارت رکھتے، سلطان کے طلب کرنے سے اور بھی تاکید ہوگئی۔ اول آگرہ میں آکر ایک مدت تک وہاں رہے پھر دہلی میں آکر بجے منڈل میں جو

سلطان محمد تغلق کی عمارت ہے مقیم ہوئے اہل وعیال سمیت اور وہیں وفات پائی ان کی اور ان کی اکثر اولاد کی وہیں قبریں ہیں۔ وفات ان کی ۴ ربیع الاول ۹۰۹ھ میں ہوئی۔ طریق سلوک، علم توحید میں ان کے رسائل ہیں منجملہ ان کے ایک .... مفتاح الفیض ہے۔[1]

ملفوظات شیخ حسن طاہر

سوال:۔ سلوک کیا ہے اور سالک کون ہوتا ہے اور تزکیۂ نفس اور تصفیۂ قلب اور تخلیۂ سر اور تجلیۂ روح کیا ہے اور منزل کیا ہے اور مقصد اور کرامت اور جذبہ کیا ہے اور وصول کون ہے اور شریعت اور طریقت کیا ہے اور کیا مقام ہے۔؟

جواب:۔ سلوک کے معنی لغت میں چلنا ہے اور حسی چلنا انتقال ہے ایک جگہ سے دوسری جگہ میں اور یہاں سلوک سے معنوی چلنا مراد ہے اور اسی سلوک و انتقال کا مرتبہ نفس میں تزکیہ نام ہے۔ اور تزکیۂ نفس یہ ہے کہ نفس کو اوصاف ذمیمہ نفسانی سے اوصاف حمیدہ ملکی اور امارگی سے لوامگی اور مطمئنی کے ساتھ موصوف کرے۔ اور سلوک دل کو تصفیہ کہتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ دل کو دنیا کے ہموں اور غموں سے اور اس کی طرف میل کرنے سے اور اس کے لوگوں سے اور حرص وحب دنیا اور اندیشہائے بے فائدہ سے صاف کرے۔ اور تخلیۂ سر یہ ہے کہ سر کو اندیشہ ماسوی اللہ اور غوغا وغیر حق سے اگرچہ بہشت بھی ہوئے تب بھی اسکو خالی رکھے۔ اور سِرّ کی پاسبانی

---

[1] اخبار الاخیار اردو صفحہ ۲۰۱/۲۰۰

کرے یعنی غیرِ حق کے اندیشہ کو اس میں رستہ نہ دے اور اگر کچھ گذرے تو اسکو نفیِ خواطر سے دفع کرے ۔ تجلیہ روح یہ ہے کہ مشاہدۂ حق کا نور اور ذوق و شوق و محبت اور اسرار و انوارِ مشاہدہ سے روح کو متجلی کرے اور متحلی بنائیں پس حقیقت سلوک عبارت ہے اخلاقِ حیوانی کے بدل دینے اور اوصافِ بشری سے نکل جانے اور اخلاقِ الٰہی کے ساتھ متخلق ہونے سے حضرت قطب العالم نے اپنے رسالہ ملہمات میں شریعت و طریقت و حقیقت کا بیان فرمایا ہے :

الشریعۃ الاتباع والطریقۃ الانقطاع ۔ والحقیقۃ الاطلاع ۔ الشریعۃ الانقیاد والطریقۃ الانقاد والحقیقۃ الاتحاد (شریعت اتباع ہے ، طریقت غیرِ حق سے جدا ہونا ہے ، حقیقت اطلاع ہے ۔ شریعت مطیع ہونا ہے ۔ طریقت ماسوی سے دور ہونا ہے ۔ حقیقت حق سے مل جاتا ہے ، شریعت اطاعت کی کمر باندھنا ہے اور طریقت اپنے سے الگ ہو جانا اور حقیقت دوست سے مل جانا ۔ شریعت فرمانبرداری ہے ، طریقت غیر سے بیزاری ہے حقیقت دوست سے برخورداری ہے ، شریعت تمنا ہے طریقت فنا ہے ، حقیقت بقا ہے ۔

سالک ابتدا میں حس ہے اور توسط میں عقلِ معاد ہے اور انتہا میں نورِ معاد ہے ۔ سیر الی اللہ میں نہ کوئی منزل ہے نہ کوئی راستہ کیونکہ رستہ اور منزلت دو چیزوں میں ہوتا ہے اور جب دوئی نہیں ہے تو نہ راستہ ہے اور نہ منزل جعفر منصور حلاج سے کسی نے پوچھا : کیف الطریق ؟ فقال : الطریق بین اثنین

[خدا کا راستہ کیونکر ہے فرمایا : رستہ دو چیزوں میں ہوتا ہے]

مگر سیر فی اللہ میں بہت سی منزلیں ہیں کس واسطے کہ نہ اس کی غایت ہے اور نہ انحصار ۔ اور مقصد پہنچنا ہے وحدتِ حقیقی میں اور باہر آنا شرک و پندار خوری و دوئی

سے ۔ اور جذبہ عبارت ہے رحمتِ خاص سے کہ آتَيْنَاهُ رَحْمَةً مِنْ عِنْدِنَا ۔ اور آنحضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا ۔ اللھم انی اسألک رحمۃ من عندک تھدی بھا قلبی الی آخر (اے اللہ میں تجھ سے مانگتا ہوں رحمت تیرے پاس سے کہ دے ہدایت اس کے ساتھ میرے دل کو آخر تک) ۔ اسی پر مبنی ہے اور فیضِ حق بھی اسی کا نام ہے ، جذبۃ من جذبات الحق متوازی عمل الثقلین ۔ حق کے جذبوں میں سے ایک جذبہ جن و انس کے عملوں کے برابر ہے

ع یک ذرہ عنایت تو اے بندہ نواز ۔۔۔۔ اِنَّ لِرَبِّكُمْ فِي أَيَّامِ دَهْرِكُمْ نَفَحَاتٍ أَلَا فَتَعَرَّضُوا لَهَا ۔ ؎

تو مستحق نظر شو کمال و قابلِ فیض
کہ منقطع نشود فیض ہرگز از فیاض

والیہ أشار صلی اللہ علیہ وسلم ۔ انی لاجد نفس الرحمٰن من جانب الیمن ؎

مرد باید کہ بوئے داند برد
ورنہ عالم پر از نسیم صباست

دریں دیار از آں سر خوشم کہ گاہے گاہے
نسیم بوئے تو ام زیں دیار می آید

یہ اشارہ ہے تجلی دائم اور فیضِ حق کے ساتھ اور جذبۂ حق اور وصول بحق عبارت ہے انقطاع اور تبری پندار خودی دوری سے اور جہل کے اٹھنے اور علم سے وجودِ مطلق کے ساتھ [1]

---

[1] مفتاح الفیض بحوالہ اخبار الاخیار اردو ص ۳۰۲ - ۲۸۲

شیخ علائی رحمۃ اللہ علیہ

شیخ علائی کے باپ کا نام حسن[1] تھا اور وہ بنگالہ کے مشائخوں میں سے تھے وہ اور ان کے چھوٹے بھائی شیخ نصر اللہ جو بڑے صاحب علم شخص تھے زیارت کعبہ کے لئے گئے اور وہاں سے لوٹ کر بیانہ میں آکر مقیم ہو گئے - اس سال کی تاریخ ہے : - "وَجَاءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَالْفَتْحُ"

بیانہ میں آکر بڑے بھائی پیری مریدی کے مشغلہ میں اور چھوٹے بھائی درس و تدریس میں مصروف ہو گئے شیخ حسن کی اولاد میں سے شیخ علائی سب سے زیادہ نیک سیرت تھے - تقویٰ اور سلیم الطبعی کے آثار بچپن ہی سے ان کے چہرہ سے جھلکتے تھے - ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات - دیکھتے ہی دیکھتے انھوں نے باپ سے تمام علوم ظاہری اور باطنی کی تکمیل کر لی - جودت طبع اور سرعت ذہن فطرت نے ودیعت کیا ہی تھا، بہت ہی جلد تدریس و افادہ میں نامور ہو گئے - باپ کے انتقال کے بعد درس و تدریس کا مشغلہ ترک کر کے سجادہ نشینی اختیار کر لی اور اپنے اوقات زہد و عبادت، ارشاد و تلقین میں گزارنے لگے - اس علم و کمال اور

---

[1] شیخ حسن - ان کے والد شیخ طاہر نے ملتان سے بہار آکر شیخ بدہ حقانی سے علم حاصل کیا۔ شیخ حسن بھی بہار میں پیدا ہوئے - اس وقت شہر بہار صوبۂ بنگال کے ماتحت تھا۔ حصول علم کے بعد راجی حامد شاہ مانک پوری کے مرید ہو گئے - سلوک اور توحید کے موضوع پر ان کے متعدد رسالے ہیں ان میں سے ایک رسالہ کا نام "مفتاح الفیض" تھا - بہار سے جونپور جا کر مقیم ہو گئے تھے - سلطان سکندر نے انکو دہلی بلا لیا تھا۔ دہلی میں ان کا قیام سلطان محمد تغلق کے "برج حصار" میں جس کا نام کوشک بہی منزل تھا رہا[1]۔ ۲۳ ربیع الاول ۹۰۹ھ میں اسی جگہ وفات پائی -

(۱) منتخب التواریخ ص ۳۲۶

پارسائی کے باوجود نفس امارہ کی ڈنک ٹوٹی نہیں تھی - اس لئے وہ یہ گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ کسی دوسرے شیخ کا رتبہ ان کے مرتبہ سے بڑھ جائے - چنانچہ ایک مرتبہ انھوں نے ایک ریاکار صوفی کو پالکی سے اتار کر لوگوں میں خوب ذلیل کیا - اس وقت تک علائی کا دلی منشا یہ تھا کہ صرف میں ہی خاص و عام میں مقبول و سر بر آوردہ رہوں شیخ علائی کے دوسرے بھائی عمر میں گو ان سے بڑے تھے لیکن ان کی فضیلت کی وجہ سے سب نے ان کی اطاعت اختیار کر لی تھی اور انکی ذات پر فخر کیا کرتے تھے -

عبداللہ نیازی کا مسلک اسی دوران میں شیخ سلیم چشتی رحمہ کے ایک خلیفہ میاں عبداللہ نیازی پٹھان اپنے شیخ سے اجازت لے کر سفر حج پر گئے - وہاں انھوں نے بڑی ریاضتیں کیں اور ہر قسم کے ذکر و اشغال پورے کئے - حرمین ہی میں وہ میر سید محمد جونپوری کے جن کے متعلق مشہور ہے کہ انھوں نے امام مہدی ہونے کا دعویٰ کیا تھا - معتقد ہو گئے اور مہدوی مذہب اختیار کر کے ہندوستان واپس آئے - بیانہ ہی میں آبادی سے دور باغ کے ایک گوشہ میں حوض کے کنارے سکونت اختیار کی - ان کا معمول تھا کہ خود پانی کے گھڑے بھر کر اپنے سر پر اٹھا کر لے جاتے تھے اور اس طرف کام کرنے والے لکڑہاروں، کسانوں وغیرہ کو اکٹھا کر کے نماز پڑھایا کرتے تھے جو کوئی پس و پیش کرتا اسے وہ اپنے پاس سے کچھ نہ کچھ دے کر جماعت کی طرف راغب کرتے تھے -

شیخ علائی نے ان کے طریقہ کو بہت پسند کیا اور اپنے معتقدوں سے کہا : "دیکھو دین اور ایمان اس کا نام ہے جو میاں عبداللہ نیازی کا سلوک ہے اور ہم لوگ جس روش پر ہیں وہ محض بت پرستی اور زنار داری ہے" رباعی

تا یک سر موئی تو ہستی باقی است — اندیشۂ کار بت پرستی باقی است
گفتی بت وزنار شکستم رستم — این بت کہ ز پندار پرستی باقی است

غرض کچھ ہی دن میں علائی ان بزرگ کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ باپ دادا کے طریقہ کو ترک کر دیا مشیخت اور پارسائی کی دکان بڑھادی۔ سارا غرور و تکبر بالائے طاق رکھ دیا اور ان تمام لوگوں سے جن کو انھوں نے ناراض کر رکھا تھا منت خوشامد کر کے معافی چاہی اور رضامند کر لیا۔ خانقاہ اور لنگر کی ہما ہمی چھوڑ کر قلندرانہ روش اختیار کی اپنا سارا مال و اسباب یہاں تک کہ کتابیں بھی محتاجوں میں تقسیم کر دیں۔ بی بی سے کہا "اگر تجھے فقر و فاقہ منظور ہے تو بسم اللہ میرے ساتھ رہ اگر نہیں تو اس مال میں سے اپنا حصہ لے لے، پھر تو مختار ہے جہاں چاہے گزر کرلے"۔ وہ نیک بی بی اسی فقر و فاقہ پر بخوشی رضامند ہو گئی ؎

کار دین بعضی زناں شاید بہ از مرداں کنند
در دلیری شیر مادہ بہتر از شیر نر است

شیخ علائی کی تحریک اب کہیں جا کر نفس امارہ کا سر کچلا گیا اور شیخ علائی طلب صادق کے ساتھ میاں عبد اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے ان سے پاس انفاس کا طریقہ سیکھا اور جس ذکر کا وہ شغل کرتے تھے خود بھی اس کا ورد رکھا۔ اس ریاضت سے کلام پاک کے رموز و معانی، نکات و دقائق بہت جلد ان پر کھل گئے ان کے مرید اور خادم جن میں بعض مجرد اور بعض گھر بار والے تھے اللہ کے توکل پر ان کی خدمت میں لگے رہے اور ان سے ذکر و شغل کے طریقے سیکھنے لگے۔ ان کے مریدوں میں تین سو آدمی خانہ دار تھے۔ یہ لوگ کوئی پیشہ یا تجارت نہیں کرتے تھے کہیں سے کچھ مل جاتا تو آپس میں تقسیم کر لیتے۔ اگر ان

میں سے کبھی کوئی کچھ کمائی کر بھی لیتا تو اس میں سے دسواں حصہ ضرور راہ خدا میں دے دیتا۔ روزانہ دو وقت ایک تو فجر کے بعد اور ایک کسی اور نماز کے بعد سب چھوٹے بڑے ایک حلقہ میں بیٹھ جاتے اور قرآن کے معانی و مطالب کا درس لیتے۔ شیخ علائی کا بیان ایسا اثر انگیز تھا کہ جو کوئی ایک مرتبہ بھی ان کو سن لیتا پھر وہ سارے گھر بار، بال بچوں کو چھوڑ کر ان کا ہو جاتا اور کسی شغل کی طرف رخ نہ کرتا۔ یہ سب ایسے قانع اور متوکل تھے کہ اگر بھوک کے مارے انکا دم بھی نکلتا ہو تو ان میں سے کوئی دم نہ مارتا تھا۔ جو بھی اجنبی ان کی محفل میں چلا جاتا تو کم سے کم وہ اپنے گناہوں سے ضرور تائب ہو جاتا تھا۔

ان میں سے اکثر کا تو یہ حال تھا کہ رات میں اپنے کھانے اور استعمال کے برتن اوندھا کر رکھ دیتے تھے یہاں تک کہ نمک آٹا بلکہ پانی بھی ان کے پاس نہ ہوتا تھا۔ بس اس رزق دینے والے کی رزاقی پر توکل کر کے رات گزار دیتے تھے صبح اللہ تعالیٰ بہر حال کہیں نہ کہیں سے ان کا رزق ان کے پاس پہنچا دیتا تھا۔

اسباب دنیاوی سے یہ بے نیازی تھی لیکن ہتھیار اور سامان جنگ دشمنوں کے مقابلہ کے لئے ہر شخص کے پاس لازماً ہوتا تھا۔ اس لئے جو بھی انکو دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ یہ مالدار اور صاحب حیثیت لوگ ہیں، محتاج نہیں۔

ان سب کا وطیرہ تھا کہ شہر اور بازار میں جو بھی بات شریعت کے خلاف نظر آتی اسے وہ جبراً روک دیتے تھے اور اس معاملہ میں اکثر غالب ہی رہتے تھے چنانچہ شہر کے جو حاکم ان کے معتقد تھے وہ تو ان کی ہر طرح مدد کرتے تھے اور جو ان کو نہیں مانتے تھے وہ بھی ان کے ڈر سے دم نہیں مارتے تھے۔ شیخ علائی کی تحریک اس تیزی سے پھیلی کہ باپ بیٹے کو، بھائی بھائی کو، شوہر بی بی کو چھوڑ کر مہدوی دائرہ میں شامل ہو گیا۔

شیخ علائی کا سفر

شیخ علائی کی اس تحریکی جدوجہد اور لوگوں کے ہجوم کی وجہ سے میاں عبداللہ کے اوقات میں خلل پڑنے لگا اور وہ اس ہنگامہ آرائی کے متحمل نہ ہو سکے۔ آخر کار ایک دن انھوں نے شیخ کو بلا کر نہایت نرمی کے ساتھ نصیحت کی یہ رونق ہمیشہ نہیں رہتی اور اس زمانے کے لوگوں کو حق بات کڑوی معلوم ہوتی ہے تمہیں لوگوں کی روک ٹوک سے کیا غرض یا تو خاموشی سے گوشہ نشینی اختیار کرو یا حج کا ارادہ کر لو۔ شیخ علائی نے اپنے مربی کے حسب منشاء اسی وضع اور حالت میں چھ سات سو آدمی ہمراہ لے کر گجرات کا اس ارادہ سے قصد کیا کہ وہاں طریق مہدویہ کے کسی پیشوا کی صحبت سے فیض حاصل کریں۔

جب وہ بیانہ سے نکل کر قصبہ بساور میں پہنچے تو میرے والد مرحوم ان کی خدمت میں مجھے بھی لے کر گئے تھے چونکہ میں اس وقت بہت کمسن تھا اس لئے مجھے ان کی صورت بس وہم و خیال کی طرح کچھ کچھ یاد ہے۔

اس سفر میں شیخ علائی جب جودھپور کے قریب خواص پور پہنچے تو خواص خان جو اس جانب مامور تھا ان کے استقبال کے لئے آیا اور ان کا معتقد ہو گیا لیکن خواص خان نہ صرف یہ کہ صوفیوں کی محفل سماع میں شرکت کرتا تھا بلکہ اپنے سپاہیوں کا حق بھی مار لیتا تھا اور شیخ علائی کسی خلاف شرع بات کو برداشت نہیں کر سکتے تھے، اس لئے ان کی اور خواص خان کی نبھ نہ سکی اور کچھ دوسرے اسباب ایسے پیدا ہو گئے کہ شیخ علائی گجرات سے لوٹ کر پھر بیانہ آ گئے

علائی دربار شاہی میں

جب سلیم شاہ تخت نشین ہوا اور شیخ علائی

کا شہرہ اس کے کانوں تک پہنچا تو اس نے مخدوم الملک ملا سلطان پوری کے بہکاوے میں آ کر میر رفیع الدین محدث اور ابوالفتح تھانیسری اور دوسرے بڑے بڑے علماء کو جمع کیا اور شیخ علائی کو بھی بیانہ سے بلوایا۔

شیخ علائی اپنے چند ہر دم ساتھ رہنے والے خاص خاص مریدوں کو لے کر جو ہمیشہ زرہ پہنے ہتھیار باندھے رہتے تھے، دربار میں آئے اور اس شان سے کہ انھوں نے شاہانہ آداب و مراسم کی کوئی پروانہ کی اور مسنون طریقہ پر بادشاہ کو "السلام علیکم" کہا سلیم شاہ نے ان کے سلام کا بڑی حقارت و بیزاری سے جواب دیا۔ شیخ کی یہ حرکت نہ صرف بادشاہ بلکہ دوسرے تمام امراء کو بھی ناگوار گزری۔ مخدوم الملک نے بادشاہ کو پہلے ہی یہ باور کرایا تھا کہ شیخ علائی مہدی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور امام مہدی چونکہ تمام دنیا کے بادشاہ ہوں گے، اس لئے لازماً شیخ کا ارادہ بھی خروج و بغاوت کا ہوگا۔ اس لئے یہ شیخ گردن زدنی ہے۔ عیسیٰ حجاب نے جو بڑا مقرب امیر تھا، شیخ علائی کو پھٹے کپڑوں ٹوٹی ہوئی جوتی کے ساتھ اس خستہ حالت میں دیکھا تو کہنے لگا:۔

"چہ خوب! ذرا اس کی ہیئت کذائی تو دیکھو ان پھٹے حالوں ہم سے بادشاہت لینا چاہتا ہے، کیا ہم پٹھان مر گئے؟"

شیخ علائی کی تقریر

شیخ علائی نے دربار کی ان چبھتی ہوئی نگاہوں کو نظر انداز کر دیا اور گفتگو کے شروع ہونے سے پہلے اپنے معمول کے مطابق قرآن کی چند آیتیں تلاوت کیں اور ان کی تشریح کرتے ہوئے دنیاداری کی مذمت احوال قیامت اور علمائے زمانہ کی دنیا طلبی اور بے عملی پر ایسی مؤثر اور درد انگیز تقریر کی کہ سلیم شاہ اور اس کے درباریوں پر سکتہ سا چھا گیا اور باوجود قساوت قلبی

کے ان کی آنکھوں میں آنسو جاری ہو گئے۔

یہ بیان سنکر سلیم شاہ محفل سے اٹھ کر محل سرا میں چلا گیا اور شیخ علائی اور ان کے ساتھیوں کے لیے کھانا وغیرہ بھجوایا لیکن شیخ علائی نے اس کا کھانا نہ کھایا اور اپنے رفیقوں سے کہا جس کا جی چاہے وہ ضرور کھالے۔ جب سلیم شاہ لوٹ کر باہر آیا تو شیخ نے اس کی تعظیم بھی نہ کی۔ بادشاہ نے جب ان سے پوچھا کہ "تم نے کھانا کیوں نہیں کھایا" تو انھوں نے بلا جھجک جواب دیا "تم نے جو اپنے حق سے زیادہ خزانہ کا روپیہ خلافِ شریعت جمع کر رکھا ہے وہ تمھاری ملکیت نہیں بلکہ سب مسلمانوں کا حق ہے اور تمہارا کھانا بھی اسی قسم کا ہے۔"

سلیم شاہ کو یہ سنکر غصہ تو بہت آیا لیکن وہ پی گیا۔

مہدویت پر بحث اب علماء نے شیخ علائی سے مسئلہ مہدویت پر گفتگو شروع کی لیکن شیخ کا یہ زور بیان تھا کہ سب کے لب سل گئے۔ میر سید رفیع الدین صفوی نے جن کا انتقال ۹۵۴ھ میں ہوا۔ ان احادیث کو بیان کیا جن میں امام مہدی کی علامتوں کا ذکر ہے۔ شیخ نے ان کو جواب دیا کہ: "تم شافعی مذہب ہو اور ہم حنفی ہیں، ہمارے تمہارے اصولوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے اس لیے تمھاری توجیہیں اور تاویلیں ہم تسلیم نہیں کر سکتے، پھر ہم تمھارے استدلال کو کیسے مان لیں"۔

ان کے مقابلہ میں ملا عبداللہ کا تو یہ حال تھا زبان سے بات تک نہ نکلتی تھی۔ شیخ نے اسے خوب آڑے ہاتھوں لیا اور اس سے کہا: "تو دنیا دار فاسق ہے، دائرہ عدل سے باہر ہے، علانیہ تیرے گھر سے گانے بجانے کی آوازیں آتی ہیں اور حدیث میں ہے:

"جو مکھی نجاستوں پر بیٹھتی ہے وہ اس عالم سے ہزار درجے بہتر ہے جو بادشاہوں اور امیروں کی خوشامد میں لگا رہتا ہے"۔

اسی طرح انھوں نے دوسرے بے عمل عالموں کی خوب خبر لی اور اپنے سارے بیان کو آیتوں اور حدیثوں سے ثابت کیا یہاں تک کہ ملا عبداللہ کو دم مارنے کی مجال نہ رہی اور وہ چپکا ہو کر بیٹھ گیا[1]

سلیم شاہ سے گفتگو سلیم شاہ کا یہ حال تھا کہ وہ شیخ کی تقریر پر عش عش کرنے لگا اور کچھ ایسا فریفتہ ہوا کہ ان سے کہا:

"تم مجھے ہمیشہ قرآن کا وعظ سنایا کرو مگر مہدوی مذہب کو ترک کردو اور میرے کان میں چپکے سے اس مذہب سے انکار کے متعلق کہہ دو۔ اگر تم کو یہ قبول ہو تو میں تمہیں اپنی سلطنت کا محتسب مقرر کردوں گا اور آج تک تم یہ جو امر معروف اور نہی منکر میری اجازت کے بغیر کرتے رہے ہو، اب یہ سب میری اجازت سے کیا کروگے علمائے نے تمہارے قتل کا فتوے دیدیا ہے لیکن میں تمہارا لحاظ کرتا ہوں اور تمہارا خون بہانا نہیں چاہتا"۔

شیخ علائی کی جلاوطنی شیخ اس بیکار سے ادعاء (دعوئ مہدویت[2]) جو ضروریات دین میں بھی شامل نہیں ایسے متعصب تھے کہ انھوں نے کسی صورت

---

[1] منتخب التواریخ ص ۔۔۔
[2] سید محمد جونپوری نے مہدویت کا دعویٰ کیا تھا یا نہیں؟ یہ سوال کافی موضوع بحث رہا ہے بعض کہتے ہیں انھوں نے صرف مہدی یعنی رہبر یا رہنما ہونے کا دعویٰ کیا تھا

بھی بادشاہ کا کہنا نہ مانا اور اُسے بے باکانہ جواب دیا کہ: "تمہاری باتوں میں آکر میں اپنا اعتقاد نہیں بدل سکتا"

سلامت چو خواہی ملامت رواست
سلامت چو گم شد ملامت خطا است

بقیہ حاشیہ | "ذکر المہدی" کا یعنی وہ خاص شخصیت جس کے متعلق مسلم اعتقاد ہے کہ قرب قیامت پر اس کا ظہور ہوگا - یہی بات زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے لیکن ان کی وفات کے بعد ان کے پیروؤں نے مہدویت کے عقیدہ پر الگ سے ایک نیا مذہب اختراع کر لیا، بعد میں چلکر بعض اصول و عقائد پر مہدویت کو ماننے والوں میں دو گروہ پیدا ہوگئے - ایک "تسویت" کا قائل نہیں تھا - دوسرا اس کو لازمی قرار دیتا تھا تسویت سے مراد ختم نبوت میں سید محمد مہدی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مساوی ہونا ہے دوسرا اختلاف سید محمد مہدی کے انکار کرنے والوں کے ایمان و کفر سے متعلق تھا ایک گروہ منکرین کو کافر کہنے سے احتراز کرتا تھا اور دوسرا مہدویت کا دار و مدار ہی منکرین مہدی کو کافر قرار دینے پر رکھتا تھا - حیدرآباد دکن کے پٹھان مہدویوں نے جن کی وہاں کثرت تھی ۱۳۲۹ھ ۱۵ رجب کو محلہ چنچل گوڑہ میں ایک اجماع منعقد کرکے تسویت کی تصدیق کی تھی - مسلمان ممالک میں سیاسی نزاعات جب بھی پیدا ہوئے ہر فریق نے مہدی موعود کے اعتقاد سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور اس سلسلہ میں ایسی ایسی موضوع حدیثیں بیان کی جانے لگیں کہ مہدی موعود کی پہچان کچھ آسان بات نہ رہی - ہر فریق نے اپنے پیشوا کو مہدی ثابت کرنے میں وہی علامات گھڑ لیں جو انکے حسب حال تھیں اس لئے ان علامتوں میں بڑا تضاد ہوگیا اور جس نے بھی کچھ تھوڑی بہت قوت حاصل کرلی اس نے اپنے مہدی آخر الزماں ہونے کا دعوی کردیا - ۵۱۲ھ میں بلاد مغرب

اسی دوران ہر روز سلیم شاہ کے سننے میں آتا کہ آج فلاں سردار شیخ کا مرید ہوگیا اور فلاں امیر ان کے معتقدوں میں شامل ہوگیا اور دنیا کے

بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ | میں محمد بن تومرت مغربی نے عبدالمومن کوفی کی حمایت سے مہدویت کا دعویٰ کیا تھا - اس شخص نے کچھ لوگوں کو قبروں میں چھپا کر بٹھا دیا - اس کے حکم سے یہ نقلی مُردے قبروں سے نکلے اور اس کے مہدی ہونے کی تصدیق کی - سلطان صلاح الدین ایوبی کے عہد میں محمد بن عبداللہ میمون نے شام میں یہی دعویٰ کیا تھا اور ایک شہر "مہدیہ" بھی بسایا تھا - اس کا حال ابن کثیر ابن جوزی اور ابن خلکان نے تفصیل سے لکھا ہے کردستان میں بھی ازبک نامی ایک شخص نے شہر زور سے مہدی ہونے کا دعویٰ کیا تھا - اسے ایک کرد سردار امیر احمد خاں نے قتل کردیا - سات سو ہجری میں بلاد مغرب ہی سے ایک کیمیاگر سید محمد نامی بھی یہی دعویٰ لے کر اٹھا تھا ۹۱۰ھ میں محمد بن عبداللہ نے مصر میں اسی دعوی پر بغاوت کی تھی - شیخ اویس رومی جو سلطان بایزید کے عہد کے نامور صوفی ہیں انکے متعلق بھی مشہور ہے کہ انھوں نے اپنے آپ کو مہدی سمجھا تھا، لیکن اس کے ادعا سے پہلے ہی ان کو معلوم ہوگیا کہ یہ محض شیطانی وسوسہ تھا - سید محمد جونپوری سے متعلق بھی یہی کہا جاتا ہے - چنانچہ صاحب "معارج الولایت" کی تحریر ہے:

"سید محمد نوربخش جون پوری کو ایک روز حال آیا دیکھتے کیا ہیں کہ ایک شخص مخاطب ہوکر کہتا ہے کہ "انت مہدی" یعنی تو مہدی ہے - انھوں نے سمجھا میں موعود مہدی ہوں - ایک مدت تک اسی دعوی پر رہے - آخر جب حج کو چلے - اثنائے راہ میں ان کو کشف ہوا کہ میں مہدی بایں معنی ہوں کہ ہدایت یافتہ ہوں - پس اس دعویٰ سے باز آکر مریدوں اور ہمراہیوں کو اس اعتقاد سے پھیر دیا اور کہا کہ جب اس سفر سے پلٹوں گا باقی مریدوں

معاملات چھوڑ دیئے - ادھر ملا عبداللہ برابر بادشاہ کو شیخ کے قتل پر ترغیب دے رہا تھا۔ آخر سلیم شاہ نے شیخ کو حکم دیا کہ تم اس ملک سے نکل جاؤ اور دکن میں جا کر سکونت اختیار کرو"۔

دکن میں مہدویت دکن میں مہدوی مذہب کافی پھیل چکا تھا۔ خود شیخ عرصہ سے وہاں جانے کے آرزومند تھے - یہ حکم تو ان کے لئے خوش خبری سے کم

بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ کو بھی اس اعتقاد سے باز رکھوں گا - آخر اثنائے راہ میں وفات پائی۔ ہمراہیوں نے یہ خبر دوسروں تک پہنچائی - ان میں سے بعض نے یہ عقیدہ ترک کر دیا اور بعض پہلے اعتقاد پر ہی قائم رہے"۔

مہدویوں کے عقیدے کے لحاظ سے فرائض کی تعداد تیس ہے - اس میں سے بیس فرائض اعتقادی ہیں جن کے متعلق ان کا کہنا ہے کہ ان میں کسی کو اختلاف نہیں - یہ بات بھی کچھ زیادہ صحیح نہیں ہے ان اعتقادی فرائض میں بھی مہدیوں کے درمیان اختلاف رہا ہے - دس فرائض عملی ہیں جن میں ان کا باہم اختلاف ہے ان دس فرائض میں سے عشر، نوبت، اجماع، تسویت اور صحبت صادقین پر اختلافی رسالے لکھے جاتے رہے ہیں۔

کسی وقت مہدوی فرقہ ایک تبلیغی اور تحریکی فرقہ تھا لیکن عرصہ دراز سے اس کی حیثیت ایک قبیلہ اور قوم کی رہ گئی ہے اور بس -

تاریخی شواہد ایسے ہیں جن سے قیاس ہوتا ہے کہ سید محمد جون پوری کی جدوجہد ایک صحیح اسلامی تحریک تھی جو ہندوستان میں سیاسی قوت کے ذریعہ اسلامی نظام کیلئے میدان ہموار کر رہی تھی بعد میں تحریکی روح ختم ہو گئی اور ان کے پیرو دور از کار عقائد کی الجھنوں میں گرفتار ہو کر رہ گئے اور اس طرح ایک نیا مذہب "مہدویت" پیدا ہو گیا -

نہ تھا۔ چنانچہ وہ بے تامل دکن کی طرف روانہ ہو گئے - دکن کی سرحد پر جب وہ ہندیہ پہنچے تو وہاں کا حاکم بہار خاں جس کا لقب اعظم ہمایوں شروانی تھا، ان کا معتقد ہو کر اس مسلک کا پیرو بن گیا - وہ ہر روز ان کا وعظ سنا کرتا تھا - اس کا آدھے سے بھی زیادہ لشکر شیخ کا معتقد ہو چکا تھا مخبروں نے یہ خبریں بادشاہ تک پہنچائیں یہ بات اسے بڑی ناگوار گزری - مخدوم الملک تو شیخ علائی سے خار کھائے بیٹھا ہی تھا، اس نے جھوٹ سچ ملا کر بادشاہ کو اور بھڑکایا، یہاں تک کہ سلیم شاہ نے شیخ علائی کو واپس لانے کے لئے فرمان صادر کر دیا۔

عبداللہ نیازی کا واقعہ اسی دوران میں سلیم شاہ نیازی پٹھانوں کا فتنہ رفع کرنے کے لئے آگرہ سے پنجاب کی طرف روانہ ہوا تھا۔ جب وہ اس سفر میں بیانہ کے قریب ہرآور میں پہنچا تو مخدوم الملک نے بادشاہ سے عرض کیا۔ "شیخ علائی کا تو معمولی فتنہ تھا جس سے نجات مل گئی سب سے بڑا فتنہ شیخ عبداللہ نیازی ہے جو علائی کا مرشد اور سارے نیازیوں کا پیر ہے اور ہمیشہ وہ تین چار سو مسلح آدمیوں کو لیکر بیانہ کے پہاڑوں میں دنگا فساد کرتا رہتا ہے"۔

یہ سنکر سلیم شاہ کو جو نیازیوں کے خون کا پیاسا ہو رہا تھا بس آگ ہی لگ گئی، اسی وقت حاکم بیانہ میاں بھوہ کے پاس فرمان بھیجا کہ شیخ نیازی کو فوراً حضور میں روانہ کر دو - میاں بھوہ شیخ کا بڑا عقیدت مند تھا، اس نے خفیہ جا کر شیخ سے یہ درخواست کی کہ "اس وقت مصلحت یہی ہے کہ آپ یہاں سے کسی طرف کو ٹل جائیں پھر بادشاہ کو آپ کا خیال بھی نہ رہے گا اور میں یہاں سے کوئی معقول عذر لکھ کر روانہ کر دوں گا"۔ شیخ عبداللہ نے اس کی بات کو قبول نہ کیا اور اس سے کہا:- "بادشاہ کے دل سے میرا خیال نہیں جائے گا، ویسے بھی

مخدوم الملک ہمیشہ تاک میں لگا رہتا ہے، میں کہیں دور دراز چلا بھی جاؤں اور پھر بادشاہ مجھے وہاں سے طلب کرے تو مجھے لمبے سفر کی زحمت اٹھانی پڑیگی اس سے بہتر تو یہ ہے کہ اس وقت جبکہ بادشاہ صرف دس کوس پر ہے یہیں اس سے جاکر مل لوں۔ خدا کا جو حکم ہے بہرحال وہ پورا ہوکر ہی رہے گا ؎

عناں کار نہ در دست مصلحت بین است
عناں بدست قضا دہ کہ مصلحت این است

شیخ نیازی لشکر شاہی میں غرض یہ بزرگ راتوں رات چل کر شاہی لشکر میں پہنچ گئے اور صبح جب وقت سلیم شاہ کوچ کے لئے سوار ہو رہا تھا شیخ نے "السلام علیکم" کہا۔ میاں بھوہ نے زبردستی ان کی گردن یہ کہتے ہوئے جھکا دی "اے شیخ بادشاہوں کو اس طرح سلام کرتے ہیں"۔ شیخ نے بھوہ کو کڑی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "جو سلام سنت ہے اور جو رسول اللہ اپنے صحابہؓ کو کیا کرتے تھے اور صحابہؓ رسول اللہؐ کو وہی طریقہ ہے جو میں نے کیا اسکے سوا میں کسی اور سلام کو نہیں جانتا"۔

سلیم شاہ نے غضب ناک ہوکر پوچھا: "علائی کا پیر یہی ہے؟"

ملا عبداللہ نے جو گھات میں لگا ہوا تھا جھٹ سے کہا: "ہاں یہی ہے"۔

بادشاہ نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا اور انھوں نے اس مرد حق کو لاتوں، گھونسوں پر رکھ لیا۔ لکڑیوں کوڑوں سے خوب پٹائی کی۔ شیخ کو جب تک ہوش رہا وہ یہ آیت پڑھتے رہے:

"رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِي أَمْرِنَا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ"۔

سلیم شاہ نے پوچھا: "کیا کہتا ہے"؟

ملا عبداللہ نے کہا: "مجھ کو اور آپ کو کافر کہہ رہا ہے"۔

سلیم شاہ کا پارا اور چڑھ گیا اور ان کو اور زیادہ اذیت پہنچائی غرض بادشاہ برابر ایک گھنٹے سے زیادہ وہاں سوار کھڑا رہا اور اس مظلوم کو بے گناہی کے گناہ میں سزا دیتا رہا۔ جب یہ معلوم ہوا کہ ان کا دم نکل گیا ہے تب چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔

شیخ میں جان باقی تھی، اسی وقت لوگوں نے ان کو چمڑے میں لپیٹ کر ایک رات ایک دن برابر آگ کی گرمی میں رکھا اور ان کے حواس کچھ ٹھکانے ہوئے۔ یہ حادثہ سنہ ۹۵۵ھ میں پیش آیا تھا۔

شیخ نیازی کی مہدویت سے توبہ کچھ عرصہ بعد شیخ نے بیانہ چھوڑ کر سیاحت اختیار کی اور افغانستان روہ میں جاکر کافی مدت ٹھہرے، پھر عرصہ تک پٹن میں بجوارہ کی سرحد پر انبیرا اور انبر سر کے درمیان مقیم رہے۔ شیخ کہا کرتے تھے "اہل قیل و قال کی صحبت کا یہ خمیازہ بھگتنا پڑا"۔

آخر میں جب شیخ سرہند میں آکر رہے تو انھوں نے مہدوی مسلک سے توبہ کر لی اور اس عقیدہ سے تمام مہدویوں کو باز رہنے کی تلقین کی۔

جس زمانہ میں اکبر بادشاہ نے اٹک کا سفر کیا تھا تو اس نے شیخ موصوف کو سرہند میں بلاکر ان کے اور ان کے بیٹوں کے نام بطور معاش کچھ اراضی مقرر کر دی تھی۔ شیخ عبداللہ نیازی نے نوے برس کی عمر میں سنہ ۱۰۰۰ھ میں انتقال کیا۔

مخدوم الملک کی فتنہ پردازی جب سلیم شاہ نیازیوں کا قلع

قمع کرکے آگرہ واپس آیا تو مخدوم الملک ملا عبداللہ نے بادشاہ کو شیخ علائی کے خلاف پھر بھڑکانا شروع کیا اور کہا: "شیخ علائی کو تو اس ملک سے نکل جانے کا حکم دیا گیا تھا لیکن وہ ہندیہ میں بدستور موجود ہے۔ بہار خاں اس کا مرید اور معتقد بن گیا ہے اور اس کا سارا لشکر شیخ کا مطیع ہو گیا ہے اندیشہ ہے کہ وہ کوئی فتنہ برپا کردے گا۔"

سلیم شاہ نے دوبارہ شیخ علائی کو بلایا اور اس قضیہ کو کبھی نمٹا دینے کا ارادہ کرلیا۔ سلیم شاہ بخوبی جانتا تھا کہ شیخ عبداللہ صاحب غرض ہے اور آگرہ اور دہلی میں کوئی عالم علائی سے بحث کرنے کے قابل نہیں، اس لئے اس نے حکم دیا کہ شیخ علائی کو بہار میں شیخ بدھ طبیب دانش مند کے پاس لے جاؤ اور وہ جو بھی حکم دیں اس کے مطابق عمل کرو۔

شیخ بدھ بڑے نامی گرامی عالم تھے۔ "ارشاد قاضی"[1] پر ان کی شرح بڑی معتبر اور مشہور ہے۔ شیر شاہ تو ان کا ایسا معتقد تھا کہ ان کی جوتیاں سیدھی کرکے ان کے آگے رکھا کرتا تھا۔

علائی بدھ کی خدمت میں شیخ علائی جب وہاں پہنچے تو بدھ طبیب کے گھر میں سے گانے بجانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ انھوں نے شیخ بدھ کی مجلس میں اور بھی خلافِ شرع باتیں دیکھیں جن کا ذکر مناسب نہیں ان سے بھلا کہاں رہا جاسکتا تھا، بے محابا وہ شیخ بدھ کو ان حرکتوں پر ملامت کرنے لگے شیخ بدھ اس وقت کافی بوڑھے ہو چکے تھے، ان میں بات کرنے کی بھی قوت نہ تھی، ان کے بیٹوں نے جواب میں کہا۔ "ہندوستان میں بعض رسمیں

---

[1] یہ فقہ کے موضوع پر قاضی شہاب الدین جونپوری کی تصنیف ہے۔

ایسی مروج ہو گئی ہیں اگر ان سے منع کیا جائے اور اتفاق سے اس اثناء میں جان و مال کا کوئی نقصان ہو جائے تو ہندوستان کی بے وقوف عورتیں یہ سمجھتی ہیں کہ نقصان اس رسم کے روکنے کی وجہ سے ہوا اور اس صورت میں ان کے بالکل ہی منکر اور کافر ہو جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ ظاہر ہے کافر ہو جانے سے ان کا فاسق رہنا ہی غنیمت ہے۔" شیخ علائی نے کہا" یہ ایک فاسد خیال ہے کیونکہ جب پہلے ہی سے یہ عقیدہ ہو کہ گناہ کے چھوڑنے سے جان مال کا نقصان ہوتا ہے اور سنت کے موافق عمل کرنے سے آدمی مرجاتا ہے تو وہ پہلے ہی سے کافر ہے پھر ان کے اسلام کا لحاظ کرنا کوئی ضروری نہیں بلکہ اس صورت میں تو نکاح کی صحت بھی مشتبہ ہو جاتی ہے۔

اس تقریر سے شیخ بدھ کے بیٹے اور ہم نشین قائل ہو گئے اور انکی تعریف و توصیف کرنے لگے اور ان کی بڑی تعظیم و تکریم کی۔ شیخ بدھ طبیب نے بھی منصف مزاجی سے کام لیا، ان کے اعتراض کو مان کر ان تمام باتوں سے توبہ و استغفار کی۔

شیخ بُدھ کا خط شیخ بدھ نے ان کے متعلق بادشاہ کے نام پہلے خط میں جو لکھا تھا اس کا مضمون یہی تھا کہ:-

"مسئلہ مہدویت پر ایمان کا انحصار نہیں اور امام مہدی علیہ السلام کی علامات میں بھی بڑا اختلاف ہے اسی لئے قطعی طور پر شیخ علائی کے کفر یا فسق کا حکم نہیں لگایا جاسکتا۔ ضرورت اس کی ہے کہ ان کو اس مسئلہ میں جو اشتباہ ہے وہ دور کردیا جائے۔ یہاں کتابیں کمیاب ہیں وہاں کے علماء کے کتب خانوں میں بے شمار

کتابیں ہوں گی اسس لئے اس مسئلہ کی اسی جگہ بہتر طور پر
تحقیق ہوسکتی ہے"۔

(شیخ بدھ نے اس خط میں اپنے طور پر شیخ علائی کے بچاؤ کے پہلو
رکھے تھے)

لیکن ان کے بیٹوں نے انھیں سمجھایا کہ ملا مخدوم صدر الصدور ہے
آپ اس کی مخالفت کر رہے ہیں اس صورت میں لازماً بادشاہ آپ کو طلب
کرے گا۔ اس ضعیفی میں یہ طویل سفر بہت دشوار ہوگا"۔

بیٹوں کی اس فہمائش پر شیخ بدھ نے وہ خط روانہ نہ کیا (اور نہ انھوں
نے دوسرا خط لکھا) لیکن ان کے بیٹوں نے باپ سے چھپا کر بالا بالا سلیم شاہ کو خط
لکھا جس میں انھوں نے ملا عبداللہ کی بڑی خوشامد کی لکھا:

"آج اگر کوئی بڑا محقق ہے تو وہ ملا عبداللہ مخدوم الملک ہی ہے،
وہ جو فتوی بھی دے درست ہے"۔

شیخ علائی کی شہادت | یہ خط سلیم شاہ کو پنجاب میں ملا اور اس کے
ساتھ ہی شیخ علائی بھی پہنچے۔ ان کی بادشاہ سے یہ ملاقات بن کے مقام
پر ہوئی۔ بادشاہ نے خط پڑھ کر شیخ علائی کو اپنے پاس بلایا اور کہا:

"تم میرے کان میں دعوی مہدیت سے توبہ کہدو پھر جہاں
چاہو رہو"۔

شیخ علائی نے اس مرتبہ بھی بادشاہ کے کہنے کو تسلیم نہ کیا اسکے
بعد بادشاہ نے ملا عبداللہ سے کہا۔ "اب تم کو اختیار ہے"۔ پھر اس نے
اپنے سامنے شیخ کو درے لگانے کا حکم دیا۔ اتفاق سے شیخ علائی کی گردن

میں طاعون کی گلٹی نکل آئی تھی اور دوا کے لئے اسس پھوڑے میں ایک بتی
رکھی جاتی تھی۔ ان دنوں طاعون کی وبا پھیلی ہوئی تھی۔ اس پھوڑے کی تکلیف کے
علاوہ سفر کی صعوبتوں سے بھی شیخ بہت تھکے ہوئے تھے اسلئے تیسرے کوڑے
ہی میں ان کی روح عالم بالا کو پرواز کر گئی۔

سلیم شاہ کا بغض | بادشاہ کو اسس پر بھی چین نہ آیا۔ اس کے حکم سے اس
(مظلوم) کی لاش کو ہاتھی کے پاؤں میں باندھ کر پامال کیا گیا اور ان کو دفن کرنے
کی ممانعت کردی گئی۔ خدا کی عجب شان ہے اسی وقت بڑی بھیانک آندھی
اٹھی۔ یہ ایسی خوفناک آندھی تھی کہ لوگ سمجھے بس اب قیامت آگئی۔ سارے
لشکر میں ان کا ماتم ہونے لگا اور سب کو یقین آگیا کہ بس اب سلیم شاہ کی حکومت
کی خیر نہیں۔ لوگوں نے ان کے جنازہ پر اتنے پھول ڈالے کہ ان کا بدن پھولوں
میں چھپ گیا بس یہ معلوم ہوتا تھا پھولوں کی قبر ہے۔

جلال الدین فیروز شاہ خلجی نے سیدی مولہ کو شہید کرا دیا تھا اور بہت
ہی جلد اس کو اس کی سزا مل گئی تھی۔ یہ قصہ بھی اسی طرح کا ہے سلیم شاہ کو تو اتنی
بھی مہلت نصیب نہیں ہوئی۔ وہ اسس واقعہ کے بعد دو برس بھی حکومت نہیں
کرسکا۔ یہ سارا فتنہ صرف ملا عبداللہ کا برپا کیا ہوا تھا اس کو تو اہل اللہ سے بس لی
عداوت تھی۔

شیخ علائی کی شہادت ۹۵۵ھ میں ہوئی۔ میری (مصنف ہذا کی)
عمر اس وقت دس سال تھی۔ اسی عمر میں میں نے ان کی شہادت پر دو تاریخیں
نکالی تھیں:۔

(۱) "ذاکر اللہ" (۲) "سقاہم ربہم شراباً"[1]

---

[1] منتخب التواریخ ص ۱، ۴۰۱ - ۴۰۴

شیخ عبدالعزیز بن حسن طاہرؒ

"آپ کا لقب عزیز الحق۔ اور پدر بزرگوار کا نام شیخ کمال الحق حسن ابن طاہر تھا، آپ جونپوری ہیں[1]۔

خلیفہ میاں قاضی خاں کے ہیں، متاخرین مشائخ چشتیہ میں مشہور تھے۔ علوم شریعت وطریقت وحقیقت کے عالم تھے، بچپن ہی سے ریاضتہائے شاقہ میں رہے یہاں تک مرتبہ مشیخت کو پہنچے، ابتدا عمر سے آخر عمر تک جو اوراد اپنے ذمہ لازم کر لئے تھے کبھی ان کو فوت نہ ہونے دیا، مشائخ کے اتباع اور حفظ قواعد و آداب میں یگانۂ عصر، تواضع، حلم، رضا، تسلیم، شفقت اور اعانت فقرا میں بے مثل تھے۔ غرضکہ اپنے زمانہ میں مشائخ چشت کی یادگار تھے، دہلی میں ان کی وجہ سے ارشاد و مشیخت کا سلسلہ قائم رہا۔ آپ صاحب سماع تھے حتی کہ آخر وقت رحلت میں بھی ذوق وشوق کے ساتھ دار بقا کو تشریف لے گئے[2] اور خاتمہ اس آیت پر ہوا:

"فَسُبْحَانَ الَّذِیْ بِیَدِہٖ مَلَکُوْتُ کُلِّ شَیْءٍ
وَّاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ۔"

حضرتؒ کے والد صاحب فرماتے تھے کہ عالم جوانی میں جب ہماری نظر حضرت شیخؒ کے چہرہ پر پڑتی تھی تو بے اختیار گریہ طاری ہوتا تھا بسبب اس شوق و غربت کے جو ان کے چہرۂ مبارک میں نظر آتا تھا۔ پیدائش انکی جونپور میں ۸۹۸ھ میں ہوئی ڈیڑھ برس کی عمر تھی کہ اپنے والد کے ساتھ دہلی تشریف

[1] گلزار ابرار اردو ترجمہ ص ۲۱۱۔ [2] گلزار ابرار ص ۲۱۱۔

لائے[1] اور ۹ رجمادی الآخر ۹۷۵ھ میں وفات پائی[2] مزار ان کا ان ہی کی خانقاہ کے صحن میں ہے۔ فقیر نے ان کی وفات کا قطعہ تاریخ کہا ہے:-

شیخ کامل، عارف دوران خود عبدالعزیز — آنکہ میداد اہل دل را مجلس یاد از بہشت
ہر چہ از اوصاف اہل اللہ در عالم بود — حق تعالیٰ ز اول فطرت بذات او سرشت
یادگار اہل چشت او بود در دوران خود — گشت از آن تاریخ فوتش یادگار اہل چشت

ان کی اولاد میں سب سے بڑے شیخ قطب العالم ہیں۔ عالم وفاضل صاحب اخلاق حمیدہ و اوصاف پسندیدہ صدق استقامت کا قدم والد کے سجادہ پر رکھ کر اوقات کو طاعت وعبادت میں مصروف رکھتے ہیں۔ اور حضرت کے بڑے خلیفہ شیخ چاالدہ ہیں جو کل خلفاء اور مریدوں میں سب سے زیادہ شیخ سے خصوصیت اتحاد رکھتے تھے اور شیخ کے محرم راز تھے۔ اب شیخ کا جانشین انھیں کو جانتے ہیں دوسرے شیخ عبدالغنی بدایونی ہیں۔ وہ بھی علم وعمل وحال وریاضت فقر وعزلت اور کل آداب سلوک سے موصوف ہیں، شہر دہلی کے باہر ایک مسجد جس کا استر فیروزی ہے اس میں مقیم اور عبادت مولیٰ کے ساتھ مشغول ہیں اور ان کے اوضاع و اقوال سے قوت و استقامت کے آثار ظاہر ہوتے ہیں[3]۔

زیادہ تر تعجب کی بات یہ ہے کہ آپ خطوط میں اپنا نام ذرۂ ناچیز عبدالعزیز لکھا کرتے تھے تقدیر سے ذرۂ ناچیز کے ابجدی اعداد آپ کی تاریخ وصال کے برابر ہوئے ایک روز حسین ابن خانون دہلوی نے جن کی پیشانی سے مقبولیت کے آثار نمایاں ہیں بیان فرمایا:

"ایک بزرگ نے عالم مثال میں شیخ نظام الدین اولیاء ...

[1] آغاز ۸۹۶ھ میں۔ پیدائش کے دو سال بعد دہلی کو روانگی، گلزار ابرار اردو ترجمہ ص ۲۱۱ [2] ایک بیان کے مطابق ۹۷۶ھ میں گلزار ابرار ص ۲۱۲
[3] اخبار الاخیار اردو ص ۳۹۷۔

(سلطان جی) قدس سرہ کی خدمت میں التماس کیا کہ عرس گاہ
میں جو کثرت کے ساتھ ہجوم ہوتا ہے اس سے مخدوم کو کوئی خفا
اور منظوری نہیں ہے۔ جواب ملا: البتہ جس عرس میں عزیز
آتے ہیں ہم بھی آجاتے ہیں اور انکی صحبت سے خوش ہوتے
ہیں[1]

حضرت شیخ (نجم الحق عرف) چاپن میواتی رح

قصبہ سہنہ ضلع گوڑگانوہ

مشہور صوفی صافی بزرگ شیخ عبدالعزیز دھلوی کے مشہور خلفاء میں سے تھے
اور فقر و قناعت کی ریاست کے اورنگ زیب تصوف کی بڑی بڑی کتب فصوص الحکم
ونقد الفصوص وغیرہ کا زمین طلبہ کو درس دیا کرتے تھے، آخری عمر میں آپ سے
جلال الدین محمد اکبر کو بہت عقیدت پیدا ہوگئی تھی چنانچہ بعض ملکی مہمات میں آپ سے
امداد و دعا طلب کیا کرتا تھا، شاہی محل کے قریب آپ کے لئے عبادت خانہ بنوایا
ت کی تنہائی میں اکثر آپ کے خلوت خانہ میں آپ سے نیاز حاصل کرتا تھا۔
جب آپ سے نمونہ معکوس کا مشاہدہ کیا تو اس کی عقیدت یکسر ختم ہوگئی سنہ ۹۹۰ھ
میں آپ کا وصال ہوا۔[2]

صاحب نزہۃ الخواطر نے بدایونی کے حوالے سے لکھا ہے:-
"اکابر مشائخ چشتیہ میں سے تھے، خداوند کریم کا ان پر بڑا فضل

[1] گلزار ابرار ص ۳۱۲ ۔ [2] تذکرہ علمائے ہند فارسی ص ۴۳

تھا کہ شیخ عبدالعزیز ابن الحسن العباسی دھلوی کی صحبت پر اثر سے علوم کسبیہ
و معارف وھبیہ میں کمال حاصل کیا مدۃ العمر فقر و غنا اور تسلیم و رضا کے جادہ پر گر
رواں دواں رہے۔ فصوص الحکم اور نقد الفصوص اور اس قسم کی دوسری کتابوں
کا انتہائی تحقیق و دیدہ وری سے درس دیا کرتے تھے۔ اکبر نے فتحپور
سیکری میں شاہی محل کے قریب آپ کے لئے عبادت خانہ بنوایا[1]
آپ کا نام چاندہ ہے۔ عزیز الحق کے بڑے خلیفہ ہیں۔ قصبہ سہنہ میں
جو مضافات دھلی میں سے ہے مکان تھا۔ آپ ریاضت کے دریا میں ڈوبے ہوئے
اور مجاہدہ کی آگ میں پگھلے ہوئے تھے بہت سے ریاضت والوں نے آپ کی خدمت
سے فائدہ اٹھایا[2]

"لہ سہنہ میوات کا قصبہ ہے، دھلی سے چھتیس میل جنوب میں ہے،
وہاں ایک گرم چشمہ ہے، جو گندھک کی کان سے برآمد ہوا ہے، اس چشمہ
کے پانی کا رنگ سبز اور اس کی بو گندھک جیسی ہے، سردیوں میں
اس قدر گرم ہوتا ہے کہ بدن پر نہیں ڈالا جا سکتا، خارش وغیرہ جیسے
جلدی امراض میں اس پانی سے غسل مفید ہوتا ہے، اس کے رنگ و بو
سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا سرچشمہ گندھک ہے۔ گرمی کی راتوں میں
اس قصبہ کے پہاڑ پر جا بجا خود بخود آگ ظاہر ہوتی ہے"۔

شیخ چاپن شیخ عبدالعزیز کے مشہور خلفاء میں ہیں، اور جادۂ فقر و تصوف
کے مستقیم اور متین شہسوار ہیں، مخصوص طلبہ کو کتب تصوف۔ فصوص و نقد فصوص وغیرہ
کا درس دیتے، آخری عمر میں اکبر بادشاہ کو آپ سے اعتقاد ہو گیا تھا بعض مہموں میں

[1] نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۸۰ [2] گلزار ابرار اردو ترجمہ ص ۳۲۶

وہ آپ سے ہمت افزائی و ہمت آفرینی کے ساتھ دعا کا بھی طالب ہوا اور اپنے محل کے قریب عبادت خانے میں آپ کے لئے ایک جگہ مخصوص کی ، رات کی خلوتوں میں اکثر آپ کے پاس رہتا تھا ، نماز معکوس جو شیخ کو پڑھتے دیکھا تو اس کی عقیدت و ارادت بھی بدل گئی ۔

۹۹۸ھ میں جب مرض موت لاحق ہوا تو شیخ قطب عالم ابن شیخ عبد العزیز لشکر بار کو ، جو فوجی ملازمت کئے ہوئے تھے ، دہلی سے طلب فرمایا اور خرقہ و عصا اور دوسرے لوازم مشیخت اس کے سامنے رکھ کر فرمایا : ـــــ "یہ آپ کے والد ماجد کی امانت ہے ، آپ اس کے زیادہ مستحق ہیں" ۔ یہ کہہ کر سفر آخرت اختیار فرمایا ــــــ حقیقتِ فقر سے تاریخ وفات ظاہر ہوتی ہے ۔
۹۹۸ھ

شیخ قطب عالمؒ نے پیشنگر ملازمت سے سبکدوشی حاصل کی اور اپنے پدر بزرگوار کے نقش قدم پسند کر کے دہلی میں سکونت اختیار فرمائی اور قدم شریف کے متولی ہوئے ۔ اپنے پیر اور اپنے والد ماجد کے خلیفہ شیخ چاین کے حسب ارشاد ہر وارد و صادر کی خدمت پر کمر باندھی ، اور باپ کے اخلاق سے سرفراز ہوئے[1]

شیخ مبارک الوریؒ

شیخ مبارک الوری بن ابو المبارک الحنفی الوری مشہور صاحب رشد و ہدایت اور ذی صلاح و فلاح عالم و فاضل اور محدث و فقیہہ تھے ، ہاشمی خانوادہ سے متعلق تھے ۔ غالباً اسی وجہ سے افغانیوں میں مقبول اور نہایت اثر و رسوخ

[1] منتخب التواریخ ج ۳ ص ۱۱۰-۱۱۱

کے مالک تھے ، شہنشاہ ہند سلیم شاہ سوری ان کی محفل میں حاضر ہوتے اور اس حاضری کو باعث برکت خیال کرتے تھے اور شیخ کی جوتیوں کو اٹھا کر سیدھی کر کے ان کے سامنے رکھتے " ملا عبد القادر بدایونی نے ان سے ملاقات کی اور اپنی تاریخ "منتخب التواریخ" میں آپ کا تذکرہ کیا ہے ۔ چنانچہ ایک جگہ مذکور ہے : ۔

"شیخ سلیم بن بہاء الدین چشتی سیکروی جب افغانوں کے ہاتھوں مبتلائے امتحان و آزمائش اور قلعہ رن تھمبور (Ran Thambaur) میں قید کر دیئے گئے تو شیخ مبارک افغانوں کے پاس گئے اور شیخ سلیم کی سفارش فرمائی ۔ آپ کے کہنے سے پٹھانوں نے شیخ مبارک کو رہا کر دیا ، پھر شیخ سلیم دوبارہ مکہ مکرمہ چلے گئے "

ملا بدایونی کہتے ہیں کہ میں نے انھیں ۹۸۰ھ میں دیکھا اور ملاقات کی اسی سال کے دوران آپکی وفات کا سانحہ پیش آیا ، وصال کے وقت آپ کی عمر نوے سال تھی[1] ۔

اس زمانے میں کمالات صوری و معنوی مولانا شیخ مبارک کی الور میں دھوم تھی ۔ ہندو اور مسلمانوں میں کرامات ان کی علی العموم تھی ۔ سلیم شاہ کے دل میں ان کی ولایت کا عقیدہ آیا اور سب سے پہلے وہ ان پر اعتقاد لایا حتی کہ روزانہ خدمت شیخ میں جاتا تھا اور آپ کے قدموں میں سر جھکاتا تھا ۔ کئی بار جوتا آپ کا بادشاہ نے خود صاف کیا اور غلاموں کی طرح بے تکلف کام خدمت گاری انجام دیا ۔ باتباع شاہ کل افاغنہ بھی شیخ مبارک کے رام ہوئے اور مثل درم ناخریدہ ان کے غلام ہوئے کہ شیخ صاحب کا حکم اس قوم کو بمنزلہ آیت قرآن تھا اس مرتبہ مطیع ان کا ہر ایک پٹھان

[1] نزھۃ الخواطر ج ۴ ص ۲۸۱

تھا - چنانچہ ایک مرتبہ جو افغان اپنی جہالت پر آئے حضرت شیخ سلیم چشتی کو فتح پور سے رن تھمبور پکڑ لائے، یہ سنکر شیخ مبارک رنتھمبور تشریف فرما ہوئے اور سعیٔ رہائی حضرت شیخ سلیم چشتی میں بر سر التجا ہوئے پٹھانوں نے تعمیل حکم شیخ مبارکؒ میں کچھ عذر نہ کیا اور اسی وقت شیخ سلیم چشتیؒ کو رہا کر دیا[1]

۹۸۲ھ میں حین معاودت اجمیر شریف اکبر شاہ رونق افروز الور ہوا خوشی آمد بادشاہ میں نشاط اندوز ہر فرد بشر ہوا - عوام الناس مشہور کرتے ہیں کہ قوم ملک سکنائے مونگانہ نے سر شورش اٹھایا تھا ان کی سرکوبی کیلئے محمد اکبر شاہ اس طرف آیا تھا چنانچہ قوم ملک کا بادشاہ نے قتل عام فرمایا اور مونگانہ کو ویران کر کے قریب اس کے اکبر پور بسایا - اکبر پور ہنوز موجود ہے اور آبادی مونگانہ کی کچھ کچھ نمود باقی ہے -

چونکہ آوازۂ کرامت حمیدہ شیخ مبارک صاحب شہرۂ آفاق تھا - اکبر شاہ کو مدت سے ان کی ملازمت (ملاقات) کا بھی اشتیاق تھا، جب جلال الدین اکبر شاہ نے الور میں نزول اجلال فرمایا تو موقع قدمبوسی شیخ صاحب ہاتھ آیا - ، چنانچہ بادشاہ حصول تمنائے دلی کو تیار ہوا اور ہودج زرنگار میں سوار ہوا - چونکہ در خانقاہ شیخ مبارک صاحب ایسا تنگ گزار تھا کہ نکلنا ہاتھی کا اس سے دشوار تھا اسس وجہ سے اکبر شاہ اندر جانے سے رکا، اور سر عقیدت سے پائے مکاشفۂ شیخ پر جھکا، شیخ مبارک نے کشف سے کاشف حال ہو کر فوراً یہ تصرف دکھلایا کہ خود بخود حلقۂ در کشادہ ہوا اور فیلِ بادشاہ اندر چلا آیا اور جبکہ ہاتھی بادشاہ کا بے تردد گذر گیا پھر دہ دروازہ حیثیت اصلی پر ہو گیا - بمشاہدہ اسکے عقیدۂ بادشاہ

---

[1] مرقع الور ص ۵۰ - ۴۹

ایک سے ہزار ہوا اور خدمت شیخ مبارک میں معتقدانہ خدمت گذار ہوا - جو دو گاؤں سلیم شاہ نے شیخ کو دے رکھے تھے وہ بدستور معاف کئے اور قطعات سات سو بیگہ اراضی جنیلی بلیغ اپنی طرف سے اسس پر المضاعف کئے، ہنگام واپسی دروازہ نے پھر راہ نہ دی بشکستگی دیوار احاطہ سواری شاہ نکلی - وہ دروازہ اب تک برقرار ہے اور نہایت درجہ استوار ہے -

جس خانقاہ میں کہ آپ رہتے تھے عوام اس کو دائرہ کہتے تھے اب بھی نزدیک و دور اسی نام سے مشہور اور بحکم اکبر شاہ آپ کے دائرہ میں مسجد رفیع بنائی گئی اور قریب اسس کے بادڑی پختہ تیار کرائی گئی - اسس مسجد کو مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے زنبور کخانہ بنایا تھا سنہ ۱۲۶۵ء میں نواب نشاط علی خاں نواب ناظر نے مہاراج شیودان سنگھ سے عرض کر کے اس کو چھڑایا تھا -

"شیخ مبارک صاحب نے دوبار حج بیت الحرام سے شرف پایا اور نوے برس کی عمر میں ۹۸۲ھ میں جنت الماوی کو قدم رنجہ فرمایا - چمن آپ کی اولاد کا گلزار ہے اور فصل گل کی طرح پر بہار ہے[1]

شیخ مخدوم کمال چشتیؒ

مخدوم کمال چشتی اور شیخ مبارک بہشتی کا ایک زمانہ تھا، بیرون لال دروازہ شیخ نگر میں مخدوم صاحب کا بزرگ خانہ تھا حضرت شیخ سلیم چشتی فتحپوری اور مخدوم کمال چشتی الوری باہم برادر تھے وہ اس دیس کے تاج اور یہ اس ملک کی چادر تھے قصص کمالات باہرہ مخدوم صاحب شرح زبان سے باہر، اور

---

[1] مرقع الور ص ۵۰ - ۵۵

کرامت خرق آپ کی افواہ عوام سے ظاہر مشہور ہے کہ ایک کیمیاگر آپ کی خدمت میں آیا اور کچھ سونا پیش کر کر جوہر کمال اسنے اپنا دکھلایا۔ مخدوم صاحب کہ تکیہ توکل کے سہارے دنیائے دوں کو لات مارے بیٹھے تھے یہ دیکھ کر مسکرائے اور زبان فیض ترجمان پر لائے: "سونا کیا ناپاک فقیر کو اکسیر بھی خاک ہے" ؎

خاک پا یار کو ہوں رتبہ افلاک کے مول

اے ہوس تیری اکسیر ہوں خاک کے مول

بابا جس نے برحق پر دھونی رمائی ہے دولت کونین اس کے ہاتھ آئی ہے بچہ وہ خود حکم پارس رکھتا ہے والفقر حرارت دوسری کیمیا کب جچتا ہے۔ اس وقت آپ مسواک کر رہے تھے ڈھیلا استنجے کا بیچ درخت املی پر مارا اس کے لگتے ہی وہ سونے کا ہو گیا سارا۔ ہوس یہ حال دیکھ کر گھبرایا اور سر اپنا اس نے نخل ندامت سے ٹکرایا، اور دم بھی نہ لیا کہ وہاں سے چلدیا۔ وہ درخت املی کئی روز تک اسی صورت پر رہا یعنی جڑ سے تا شاخ و برگ مثل طلاء احمر مرئیہ رہا۔ بعدش خلق کو بوجہ طمع گرد اس کے پایا۔ حضرت مخدوم صاحب نے دعا کی کہ وہ اپنی اصلی ہیئت پر آیا، کئی ایک پھل اس کے جو سونے کے ٹوٹے ہوئے برقرار رہے اور وہ آپ کی اولاد کے پاس مدتوں یادگار رہے اور قریب دروازہ مسجد کے وہ درخت کھڑا تھا عرصہ گزرا کہ وہ زمین میں گر پڑا۔

اکبر شاہ باآنکہ حضرت سلیم چشتی کا مرید تھا تاہم اس کو پاس اطاعت مخدوم صاحب مد نظر تھا۔ دو گاؤں اکبر نے نذر مخدوم کیے اور تیاری مسجد کے واسطے نقد روپے بھی دیے۔[1]

---

[1] ۔ تقی الور ص ، ۵۰۰

شیخ معروف اجھیری

شیخ صالح معروف بن سعد اللہ بن محمود صدیقی اجھیری دھلوی چشتیہ سلسلہ کے بزرگ قصبہ اجھیرہ ضلع دھار میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی، پھر نارنول کا سفر کیا اور شیخ نظام نارنولی سے بیعت ہوئے اور ایک مدت ان کی خدمت میں رہے پھر دھار لوٹ آئے، اور وہاں ٹھہرے پھر حرمین شریفین کا سفر کیا، حج و زیارت سے مشرف ہوئے اور وہیں ۹۹۰ھ میں وفات پائی چنانچہ گلزار ابرار میں ہے[1]:-

"آپ صدیقی النسل ہیں، شیخ نظام نارنولی کے خلیفہ تھے، خواب گاہ خاک مدینہ منورہ آپ کے اجداد بغداد سے آئے تھے اور مشرقی دیار ہند میں صوبہ جونپور کے متعلق ایک شہر بہار نام ہے، اس کو اپنا وطن بنا لیا تھا تھا، بہار سے آپ کے دادا شیخ محمود سلاطین خلج کے عہد میں منڈو (مانڈو) میں آئے اور یہیں سامان اقامت کیا، چند روز بعد قصبہ اجھیرہ کے قاضی ہو گئے جو مانڈو سے بارہ کوس اور دھار سے پانچ کوس دور ہے اس قصبہ کے پان ایسے خوشبودار اور عمدہ مزہ دار ہوتے ہیں کہ دوسرے صوبوں میں لوگ سوغات لے جاتے ہیں، جب شیخ محمود کو آسمانی قضا آئی تو ان کے بیٹے شیخ سعد اللہ مسند شریعت پر بیٹھے، جب انھوں نے بھی عالم دنیا کو چھوڑا تو اس وقت میں شیخ معروف چھوٹے تھے جب شیخ معروف کا زمانہ ہوش آیا تو پیر طریقت کی جستجو میں بھاگ دوڑ کرنے

---

[1] نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۳۶۵

گئے، اس اثنا میں شیخ نظام نارنولی کی فیض رسانی کا شہرہ سُنا، دل سے مجبور ہوگیا
رہا ناچار نارنول جاکر مرید ہوئے اور چند سال خدمتِ حضور سے فیض پایا ۔
فرماتے تھے ۔ پیر کے ہمرکاب نارنول سے دہلی کو جاتا تھا، ایک سیاح شیخ
عبداللہ تھے انکو عالم ارواح کی رموز اور عالم شہود کے حقائق سے اچھی واقفیت تھی اثناء
راہ میں ایک گاؤں کے اندر انکی ملازمت ہم نے حاصل کی ۔ ہر ایک قسم کی باتیں کیں،
بالآخر میں اور وہ دونوں ایک دوسرے کے بنی عم چچیرے بھائی نکلے، بہت کچھ
دلجوئی اور نوازش عمل میں آئی، اور مجھکو ہر ایک خانوادہ کے پیروں کی خلافت کا خرقہ
مرحمت فرمایا سوائے اجازت سلسلہ چشتیہ قدسیہ کے جو مجھکو پیر سے حاصل تھی
چند سال بعد قصبۂ بھار میں لوٹ آئے اور اسی قصبہ کی حدود میں ایک کوٹھری پسند
کی جہاں پر نفس کشی ساتھ لڑائی میں مشغول ہوئے، اور اس خانگی چور اور ہم نشیں قزاق
کی درآمد و برآمد کے راستوں پر چوکیدار مامور کئے، تھوڑی تھوڑی غذا گھٹانے
سے نفس فربہ ہونے سے باز رہا ۔ اور اس طریقہ پر سونے اور کھانے کی پابندیوں
سے رہائی پائی، سبحان اللہ اگر پانی یا شربت آپ پیتے نہ ہوتے تو وَمَا جَعَلْنٰهُمْ
جَسَدًا لَّا يَأْكُلُوْنَ الطَّعَامَ کی نفی میں شامل ہونے سے آپ مستثنیٰ ہو جاتے
بایں ہمہ آتشِ خار ایک پرانی گودڑی کے اندر لپٹا ہوا پیراہن کے اندر ہمیشہ رکھتے
تھے، اور تمام عمر نماز معکوس میں راتوں کو دن کرتے رہے ۔
ہجری نو سو چھیانوے ۹۹۶ھ میں صوبہ مالوہ کے حاکم نواب خان اعظم مرزا عزیز
بزرگ کوکہ اکبر شاہ تھے ۔ اس سال میں شیخ نے اجین سے احرام عمرہ باندھا
اور راہ حجاز اس شکل کے ساتھ طے کرنے کا عزم دل میں مصمم کرلیا کہ سر کو نیچے جھکائے
ہوئے جاؤں گا، لیکن نواب سے دوستی تھی، نواب نے آپ کو روکا، اور نیز
دوستوں اور عقیدت مندوں نے بھی اسی طرح التماس کیا، لہذا آپ نے مہربانی

فرماکر اس سال میں توقف کیا، جب زیارت کعبہ کے شوق کا غلبہ ہوا تو آپ نے
آنکھوں پر پٹی باندھ لی تاکہ دوسری دیکھنے کی چیزیں دیکھنے میں نہ آویں، اور اپنے
اوپر لازم کیا کہ جب تک جمال کعبہ نہیں دیکھ لوں گا پٹی نہیں کھولوں گا دوسرے سال
قرار داد کے مطابق زادراہ اور سفر خرچ کے واسطے جس قدر ضرورت تھی اور وہ بھی
صرف اس قدر کہ درویشی میں بھی خلل انداز نہ ہو نواب عزیز کے خزانے سے لے کر انتظام
سفر کیا، ایک آدمی کے قد کے برابر ایک حجرہ تیار کراکر دو اونٹوں پر بندھوایا اور اُس
حجرے کے اندر آپ نے اپنے تئیں اونٹا لٹکایا اسی طریقے سے سمندر کے کنارے پہنچے
بعدہ حجرے کو جہاز میں کھڑا کر دیا اور اس میں بدستور آویزاں تھے کہتے ہیں کہ راستہ
کے اندر آپ بہت روئے، آنسوؤں کی حرارت سے پٹی کے اوپر جلنے کا داغ لوگوں
نے دیکھا ہے ۔
الغرض بیت الحرم کا دیدار آپ کو ہوا جس کی سبب سے آپکی
آنکھوں پر لذت نظارہ حلال ہوئی، عمرہ اور حج کے ارکان ادا کئے اور مدینہ مقدس
کا طواف کر کے روشن ضمیری حاصل کی، پانچ مہینے کی فرصت ملی جب تاریخ تیسری
ربیع الاول ۹۹۸ھ کو فرمان طلب صادر ہوا تو کمال آرزو و شگفتگی خاطر اور
خندہ پیشانی کے ساتھ عالم قدس کو روانہ ہوئے ۔
؎ پیش گاہ قرب باد اجائے او[1] ۔

---

[1] گلزار ابرار ص ۳۸۷ - ۳۸۹

شیخ منور بن نور اللہ

جھمراوٹی

الشیخ الصالح منور بن نور اللہ
بن منور الدین بن الهداد بن قاضی
محمد الشرعی الجهمراوتی
أحد رجال العلم أخذ الطریقة
عن الشیخ خانون بن العلاء
الناگوری ولازمه مدة بگوالیار
وسافر معه الی ناگور وجندیری
وگوالیار وآگره۔ ثم أقعده الشیخ
بآگره فسکن بها۔ مات لثلاث
بقین من شهر ذی قعدة سنة
تسعین وتسعمائة ۹۹۰ھ آگره.
نزهة الخواطر ج ۴ ص ۲۶۸

شیخ صالح، منور بن نور اللہ بن منور الدین
بن الہداد بن قاضی محمد۔ جو قصبہ جھمراوٹ،
ضلع گوڑگانوہ ہریانہ میوات کے شرعی قاضی محمد
نامور علماء میں سے تھے۔ سلوکِ طریقت
شیخ خانون بن العلاء ناگوری سے حاصل
کیا، عرصۂ دراز تک گوالیار میں ان کی
صحبت سے فیض یاب ہوئے اور ان کے
ہمراہ ناگور، چندیری، گوالیار اور آگرہ کا
سفر کیا۔ پھر ان کے شیخ نے انھیں آگرہ
میں بٹھا دیا آپ نے بحکمِ شیخ آگرہ میں سکونت
اختیار فرمائی اور وہیں ستائیس ذی قعدہ
۹۹۰ھ میں واصل بحق ہوئے آگرہ ہی میں آپ کی
آخری آرامگاہ ہے (نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۲۶۸)

آپ شیخ نور اللہ ابن قاضی معز الدین ابن قاضی الہداد ابن قاضی محمد شرعی
کے فرزند ہیں۔ قرنغ گروہ بیگ ہیں، آپ کے چوتھے باپ کا وطن زمین توران میں تھا۔
ان کو حادثات زمانہ سے ویرانی نے آگھیرا، ناچار ہند کی طرف آنے کا اتفاق ہوا، سرکار

میوات میں ایک قصبہ جھمراوٹ نامی ہے، صاحب موصوف سیر کناں اس قصبہ میں
آپہنچے اور رسمی علم کی تحصیل پر دل نہاد ہوئے، بالآخر انھیں اطراف کے کوہستان میں
کہیں گوشہ اختیار کرلیا اور اندرونی آلائش اور بیرونی لوث کی شست و شو میں
مصروف ہوئے۔

چند روز نہیں گذرنے پائے تھے کہ اس ملک کے چھوٹے بڑوں کی
انگلیاں قاضی محمد کی طرف اٹھنے لگیں اور نیک کرداری میں نامور ہوئے اتنے میں
قاضی قصبہ کی قضا آگئی۔ گاؤں کے مقدم اور نیز دیگر بڑے بڑے لوگوں کے ذہن نشین
یہ بات ہوئی کہ قصبہ کے قضیوں کے تصفیہ کا اختیار قاضی محمد کے قبضۂ اقتدار میں
دیا جائے۔ اس تجویز پر سب کا قرار داد ہو کر قاضی محمد کی خدمت میں حاضر ہوئے
اور اس قرار داد کے متعلق گذارش کو منت سماجت کے ساتھ شامل کرکے بہت
کچھ کوشش کی۔ مگر قبولیت کا جواب نہیں۔

بایں ہمہ بہت مدت تک اس گفتگو کا سلسلہ منقطع نہیں ہوا، یہاں
تک کہ ایک رات عالم مثال میں حضرت خاتم النبوۃ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد
فرمایا:

"محمد تمہاری نشست شریعت کی مسند پر ازل میں پسند
کی گئی۔ اور شرعی لقب عنایت ہوا ہے۔"

اس سبب سے قاضی محمد شرعی کرکے شہرت ہوئی۔ جب ایسا واقعہ
پیش آیا تو مجبور ہو کر اس بزرگ منصب کا بار اٹھانا قبول کیا۔ دو فرزند ان تک
ایک کے بعد دیگرے اس مبارک مسند پر جانشین ہوتے رہے۔

جب شیخ منور کی باری آئی تو منصب قضا اختیار کرنے سے پہلے الٰہی
جذبے نے آپ کی ہستی کو سر سے پاؤں تک ایسا جکڑ بند کیا کہ وطن سے نکل کر

رہنما پیر کی جستجو میں پائے تلاش آبلہ ناک ہوا ۔ جہاں کہیں کسی درویش کا نام سنا ضرور ملازمت میں پہنچکر فیض حاصل کیا ۔ کہتے ہیں ایک رات عالم خواب میں ایک دلکش میدان کے اندر ایک مزار نظر آیا چاہتے تھے کہ اس عنبریں خاک کو بوسہ دیں یکایک اس قبر کے اندر سے ایک ہاتھ نکلا ۔ آپ نے مریدوں کے طریقہ پر مصافحہ کیا اور مجاوروں سے دریافت کیا کہ یہ قبر کس خداشناس بزرگ کی ہے ۔ ؟ جواب پایا " خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کی " ۔ یہ خوشخبری پاکر دل باغ باغ ہوا ۔ صبح ہوتے ہی شاداں اور فرحاں ناگور کی طرف چل نکلے ۔ یہاں پر خواجہ خانون ؒ کی خدمت میں آپ کو فیض ہدایت حاصل ہوا پہلا ہی دیدار کرنے پائے تھے کہ تن تمام وکمال دل ہوکر گرویدۂ اعتقاد ہوا اور ارادہ بیعت خاطر میں استحکام کے ساتھ جما ۔ ہنوز اس مصمم عزم کو خانۂ خیال سے میدان گفتار میں نہیں لائے تھے کہ ضمیر شناس خواجہ نے فرمایا :

" منور ! میں نے تم کو اپنی بیعت کے فروغ سے درجۂ سعادت دیا (زیادہ تر تعجب کی بات یہ ہے کہ صرف اسی قدر بیان پر اکتفاء کرکے بیعت کے طور پر خواجہ نے ہاتھ نہیں پکڑا ۔ اور فرمایا) تم پیشتر ہی دست بوسی کی دولت سے کامیاب ہو چکے " ۔

عالم خواب کا واقعہ یاد کرکے اور زیادہ اعتقاد بڑھا ۔ کیا سفر میں اور کیا حضر میں آپنے بہت مدت پیر کی ملازمت میں گذرائی ۔ اور ناگور سے ساتھ ہوکر چندیری میں اور چندیری سے گوالیار میں آئے ۔

پیر نے چند روز بعد گوالیار میں خرقۂ خلافت آپ کو عطا فرمایا ۔ اور اپنے ہمراہ آپ کو آگرہ میں لے گئے اور جگہ دکھلائی کہ اس جگہ اپنا تکیہ بنالو ۔ چنانچہ حسب ارشاد مرشد واپسیں سفر تک کہ تاریخ ستائیس ذی قعدہ اور ہجری نوسو نوے تھا ۔ اسی قیام کی زمین میں رہے جب تک جئے اور اسی میں مرگئے ۔

دیکھتے ہیں شیخ جنید ابن شیخ بہار الدین مفتی ایک روز ادہم خاں کو شیخ منور کی خدمت میں لے کر آئے ادہم خاں دیر تک کھڑا رہا جب عرض کیا گیا کہ فلاں خاں کھڑا ہے ۔ فرمایا : کیوں بیٹھتا نہیں ہے ۔ اس نے نذر پیش کی ۔ آپ نے قبول نہیں فرمائی ۔ اور فرمایا : " شہر میں جو لوگ اس کی خواہش رکھتے ہیں ان کو تقسیم کردو ۔ اس کے بعد ادہم خاں نے دعاء کے واسطے عرض کیا تو آپ خاموش رہے ۔ آنے والا پریشان حالی کے ساتھ خدمت سے اٹھا ۔ جب ہم نشینوں نے دعاء نہ کرنے کا سبب دریافت کیا تو آپ نے جواب دیا کہ اس کے سر میں فرمانروائی کی آرزو بھری ہوئی ہے حالانکہ اس کے تن پر سر نہیں پھر ہمت کیونکر امداد کرے " ۔

کہتے ہیں کہ انھیں ایام میں اکبر خاں نے اس کو قلعہ آگرہ کے اوپر سے ڈال کر ہستی کے مکان کو روانہ کردیا [1]

ملا عبدالقادر بدایونی رحمہ اللہ

صحیح نام ، شیخ عبدالقادر بدایونی ہے ، قاری تخلص کرتے تھے ، مگر تاریخی دنیا میں ملا عبدالقادر بدایونی کے نام سے مشہور ہیں محمد حسین آزاد نے لکھا ہے :-

" امام اکبر شاہ کہلاتے تھے ، اور علمائے عصر میں فضیلت کا درجہ رکھتے تھے ، ان کے والد کا نام شیخ ملوک شاہ ابن حامد ہے (دربار اکبری)

فاضل مذکور اگرچہ بدایونی مشہور ہیں ، مگر موضع ٹونڈہ میں ، ۱۷ ربیع الثانی سنہ ۹۴۷ھ مطابق ۲۱ اگست سنہ ۱۵۴۱ء پیدا ہوئے کہ بساور کے پاس ہے ، اسے ٹونڈہ بھیم بھی کہتے ہیں ۔ یہ علاقہ بادشاہوں کے عہد میں سرکار آگرہ میں تھا اور صوبۂ اجمیر سے بھی متعلق رہا ، ان کی ننھیال بیانہ میں تھی جو آگرہ اور اجمیر کی سڑک کے کنارے پر واقع ہے

[1] اذکار ابرار ترجمہ اردو گلزار ابرار ص ۵۶، ۵۷ - ۳۵۸

شیخ زین الدین نجل الشیخ منورؒ

جھمراوتی

پدر بزرگوار کی پیروی کا خیال بالکل آپ کے سر میں بھرا ہوا تھا۔ ظاہراً اور معنیً باپ کے قدم بہ قدم چلنے کے سوا کبھی ایک قدم نہیں رکھا رسمی علم کی تحصیل زیادہ تر قاضی جلال الدین ملتانی کی خدمت میں اور کمتر ملا مقیم کے درس سے کی تھی۔

القصہ آپ کی ظاہری آرائش کامل طور پر تھی، اپنے تنگ گوشے کو چھوڑ کر کسی دولت مند کے وسیع دولت خانے پر آپ کو بہت ہی کم جانے کا اتفاق ہوا تھا، بالعموم درویشوں کی خدمت کی عادت رکھی، اور غبار آگیں ہونے سے دلوں کو محفوظ رکھنے کے لئے بہت سے طریقے کام میں لایا کرتے تھے غالباً اس لحاظ سے کسی دل کو نہیں ستاتے تھے۔

نیازارم زخود ہرگز دلے را
کہ می ترسم درو جان تو باشد

سترہ رمضان المبارک ۱۰۰۵ھ (ایک ہزار پانچ) معنوی سفر کے واسطے سامان کوچ کا باندھ کر چلے گئے۔ (خوابگاہ۔ آگرہ۔ نزد والد خود)[1]

---

[1] گلزار ابرار ص ۴۱۴

بندگی حضرت نظام نارنولیؒ

قدس سرہ

آپ مرید اگرچہ شیخ خانون گوالیاری رحمہ اللہ کے ہیں، جو قلعہ گوالیار میں اقامت گزیں ہیں، مگر زیادہ تر اپنے بڑے بھائی شیخ اسمٰعیلؒ سے مستفیض ہوئے، وہ صاحب ذوق و شوق صوفی اپنے یہاں خلوت پسند و خانقاہ نشین، افراد کے احوال و سوانح سے بغایت باخبر اور صاحب تصرف بزرگ تھے، فقیر نے معتبر اور شیخ کے خاص مریدوں سے سُنا ہے کہ اندھیری راتوں میں اپنے مریدوں کو روغن مال کنگنی کھانے کا حکم فرماتے جس کی تاثیر سے ان پر احوالِ آخرت منکشف ہو جاتے اور عجیب عجیب امور ظاہر ہوتے، قریب چالیس سال مسند ارشاد کو رونق بخشی، ابتدائے شباب سے آخر عمر تک بہت کم سال ایسے ہوئے جن میں آپ پیادہ پا قطب عالم خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت کو دہلی نہ پہنچے ہوں۔ آخری عمر میں جبکہ ضعف کے باعث سفر بہت مشکل ہوگیا تھا آپ خواجہ صاحب کے عرس کے ایام میں نارنول ہی ٹھہرے رہتے اور وہیں سے ایصال ثواب فرماتے۔ راقم نے ایک اژدحام (بھیڑ) میں آپ کی زیارت کا شرف حاصل کیا ہے مگر گفتگو کی نوبت نہ آسکی ۹۹۷ھ میں وفات پائی اور "آہ نظام" (۹۹۷ھ) تاریخ وفات ہے[1]۔

آپ ولی کامل، صاحب تصرفات ظاہری و باطنی تھے، شیخ

---

[1] منتخب التواریخ ج ۳ ص ۲۶

خانو علا تاج ناگوری چشتیؒ کے مرید و خلیفہ ہیں، عابد و زاہد صاحب ریاضت و مجاہدہ تھے، اکثر اوقات آپ بے ہوش ہو جاتے۔ جب ہوش آتا پھر عبادت و ریاضت میں مصروف ہو جاتے۔

کہتے ہیں کہ چالیس سال آپ نے مریدوں کی تلقین و ارشاد میں گذارے جماعت کثیر نے آپ سے فیوضات باطنی اخذ کئے، اور آپ کی خدمت بابرکت سے درجہ اعلیٰ پر پہنچی۔ تاریخ وفات ۱۰ صفر ۹۹۷ھ نارنول میں اپنی خانقاہ کے اندر ہی آپ کا مزار ہے[1]۔

علامہ شیخ نظام الدین بن عبدالکریم حنفی نارنولیؒ اکابر مشائخ چشتیہ میں ہیں، کہتے ہیں کہ آپ کا نام الہ داد تھا، ان کے والد ماجد شیخ محمد غوث گوالیاریؒ صاحب جواہر خمسہ کے مرید تھے، یہ بھی ان کے ہمراہ گوالیار گئے اور شیخ محمد غوثؒ کی خانقاہ میں قیام کیا اور وہیں رہ پڑے اور تحصیل علم میں مشغول ہو گئے، جد و جہد کر کے علمی مہارت حاصل کی علوم آلیہ و عالیہ میں ہم عصروں سے ممتاز ہو کر ان پر فائق ہو گئے، پھر شیخ خانو ابن العلاء گوالیاریؒ کی صحبت اختیار کی اور ان سے طریقت حاصل کی، ان کے خلیفہ و مجاز ہوئے، اور نارنول میں چالیس سال تک مسند شیخت کو رونق بخشی، نارنول میں ان کا ایک عظیم مدرسہ بھی تھا۔ آپ سے بہت سے مشائخ و علماء مستفیض ہوئے ۲۸ صفر ۹۹۷ھ میں وفات پائی[2]۔

صاحب سفینۃ الاولیاء فرماتے تھے کہ شیخ نظامؒ ہر سال پاپیادہ نارنول سے خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مزار پر انوار کی زیارت کیلئے ذوق شوق سے

[1] برکات الاولیاء ص ۵۵، ۴۹ [2] نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۳۱۸

آتے تھے اور یہاں سے پھر خواجہ بزرگؒ کی زیارت کے لئے اجمیر حاضر ہوتے، حق تعالیٰ نے انھیں قبول عام عطا فرمایا تھا اور بہت کامل و مکمل مرید رکھتے تھے،

نظام از دار دنیا چوں سفر کرد خدا بخشود بروئے باب جنت
عیاں شد سن و سال انتقالش محب اولیاءؒ مہتاب جنت[1]

نقل ہے کہ گوالیار میں ایک روز شیخ نظام نارنولی نے شیخ اللہ بخش چشتی کی مجلس میں کہا تھا:

"ہر چند ریاضت و مجاہدہ کیا لیکن غیب کے خزانچی نے اس دروازہ کی کنجی ہمارے ہاتھ میں نہیں دی جس کا کھولنا مقصود درویشی ہے" شیخ اللہ بخش نے فرمایا:

اے شیخ! اس مدعا کے دروازے کا کھلنا کیا خاص اور کیا عام تمام عالم کا عالم تمہاری بیعت کا طوق اپنی عقیدت کی گردنوں میں ڈال لیوے، اس بات پر موقوف ہے کہ گرفت مذکور کی صورت گوشۂ قلب میں مصور کی جائے[2]

اعتراف اخذ و استفادہ شکر و امتنان ہی کی ایک صورت ہے، پرانے لوگ اس کے اظہار میں اپنی کسر شان نہیں سمجھتے تھے بلکہ فخر کے ساتھ بیان کرتے تھے، چنانچہ شیخ عبداللطیف پور ملک شاہ گوری نے شیخ صدر الدین رحمۃ اللہ علیہ کی ملازمت سے درویشی اور صفا کا طریقہ حاصل کیا اور ریاضت کے ذریعہ نفس کی گوشمالی کر کے مرتبۂ کمال کو پہنچے، نوسو ستر ۹۷۰ہجری میں اجازت لی کہ حضرت غوث الرحمٰن قدس سرہ کے مقدس روضہ کی آستانہ بوسی کیواسطے

[1] خزینۃ الاصفیاء ص ۴۳۵۔ [2] گلزار ابرار ص ۲۰۲

آپ گوالیار کو جائیں۔ اثنائے راہ میں جب نارنول پہنچے تو شیخ نظام ابن شیخ عبدالکریم نارنولی کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے، جب بیان ماجرا ہوا تو سفر کا مقصد بھی دریافت کیا گیا، جواب دیا: "حضرت غوث الرحمٰن کے مرقد مبارک کی زیارت کا شوق سر میں بھرا ہوا ہے، یہ تقریب پاکر صاحب (شیخ نظام) نے کسی قدر اپنی کیفیت بیان کی جو آغاز سیر و سلوک میں پیش آئی تھی اس ضمن میں تقریر شروع کی کہ:

"فقیر نظام چند مدت تک غوثیہ خانقاہ میں کلبہ نشین رہا تھا، حضرت غوث الرحمٰن کی عنایت سے بحسب ظاہر و باطن بہت کچھ فیض پایا، اور آپ کے بار احسان کے نیچے میری گردن ہمیشہ دبی رہے گی۔"[1]

اسس قدر محنت و ریاضت کے بعد قدرت الٰہی نے نوازا ابھی تک ملک میں اس قدر پذیرائی ہوئی کہ "ہر ہر صوبہ اور سرکار میں بڑے چھوٹے کی ہدایت کے واسطے آپ کے فیض یافتہ باخبر اصحاب میں سے ایک ایک صاحب نامزد کیے گئے، آپ کے صاحب ولایت خلفار کی فہرست بڑی لمبی چوڑی ہے، اسس کتاب میں نہیں آسکتی۔

القصہ آپ کی فیض رسانی، نور پاشی، رہبری اور رہنمائی کا شہرہ اس قدر ہوا کہ تمام اطراف ہندوستان میں پھیل گیا۔ آپ کے زمانہ میں بالکل سلطان المشائخ حضرت محبوب الٰہی قدس سرہٗ کا عہد مبارک حاصل ہو گیا تھا اور نارنول کی سرزمین سے مثل دہلی اشاعت فیض ہوتی تھی۔
۲۸ صفر ۹۹۰ ہجری (۲۸/۲/۹۹۰ھ) میں عالم ناسوت سے عالم

---

[1] گلزار ابرار ۲۶۸

ملکوت کی سیر کو روانہ ہو گئے۔ ع

سیر گاہش منزل لاہوت باد[1]

حضرت شاہ محمد اعلیٰ پانی پتی قدس سرہ کو جو فیضان آپ سے حاصل ہوا اس کی کیفیت دلچسپ بھی ہے اور عبرت آموز بھی:

"حضرت شاہ اعلیٰ پانی پتی اب تک اپنے والد ماجد شیخ نظام الدین پانی پتیؒ سے بیعت تھے مگر چلّہ کے دوران عجیب تماشا دیکھا، وہی حجرہ جو چلّہ گاہ تھا جس کے دروازے سب طرف سے بند رہتے تھے، آپ نے دیکھا کہ حضرت نظام الدین نارنولی وہاں رونق افروز ہیں، اور فرما رہے ہیں کہ:

"آپ کا حصہ باطنی ہمارے یہاں ہے، آپ نارنول آئیے اور اپنا حصہ لیجیے۔"

اس کا اثر یہ ہوا کہ جیسے ہی چلّہ سے فراغت ہوئی آپ بقول مولانا سرور صاحب:

"مستانہ و بے ہوشانہ نارنول پہنچے، اور حضرت نارنولیؒ سے ارادت و بیعت کی سعادت حاصل کی خرقۂ خلافت حاصل کیا اور نہ صرف خرقۂ خلافت حاصل کیا بلکہ بارگاہ نارنول میں یہاں تک مقبولیت اور محبوبیت حاصل کی کہ بجائے شیخ عبدالسلامؒ کے حضرت مرشدؒ نے آپ کو "شاہ اعلیٰ" کے خطاب سے نوازا۔"

سیر الاقطاب میں خود آپ کا بیان نقل کیا گیا ہے، آپ نے فرمایا:
"میں ابھی نارنول میں داخل بھی نہیں ہوا تھا کہ شیخ نارنولی

---

[1] گلزار ابرار ص ۳۹۱

کا ایک خادم میرے سامنے آیا، اور اس نے حضرت شیخ رح کا عمامہ اور آپ کے نعلین مجھے مرحمت فرمائے، پھر ابھی خانقاہ میں نہیں پہنچا تھا کہ ایک دوسرا خادم سامنے آیا، اور اس نے ایک کاغذ مجھے عنایت کیا اس میں ایک "اسم" تحریر تھا اور ہدایت تھی کہ اس کی مداومت کرو اور جب تک آپ کا دل اعلیٰ نہ ہو جائے ہمارے پاس آنے کی ضرورت نہیں۔"

میں نے حضرت شیخ کے ارشاد کے بموجب سات روز تک کفش دوزوں کی مسجد میں قیام کر کے اس وظیفہ کی پوری پابندی کی یہاں تک کے صفائیِ قلب حاصل ہو گئی۔ اس کے بعد حضرت مرشد کی اجازت ہوئی میں بارگاہ میں حاضر ہوا تو فرمایا "الحمد للہ کہ اعلیٰ شدی"۔ پھر اتنی عنایتیں اور شفقتیں فرمائیں کہ احاطۂ تحریر سے باہر ہیں"۔

اس کے بعد ایک سال پانچ ماہ سترہ روز خدمت گرامی میں حاضر رہا، یہ پوری مدت چلہ کشی ریاضت و مجاہدہ میں گذری، یہاں تک ایک روز مجھے حجرۂ خاص میں طلب فرما کر ارشاد فرمایا:۔

بابا مشائخ طریقت کے چودہ خانوادوں سے جو کچھ مجھے ملا ہے وہ سب تم کو بخش رہا ہوں اور تمہیں اجازت (دیتا) ہوں کہ وطن جاؤ اور خلق خدا کی خدمت میں مصروف ہو جاؤ

پھر فرمایا:۔

آج تیسرا روز ہے کہ آپ کے دادا حضرت مخدوم جلال الدین کبیر الاولیا رحمۃ اللہ علیہ برابر خواب میں مجھے تاکید فرما رہے ہیں کہ "میرے پوتے کو جلد پانی پت بھیجدو

کہ وہاں میری گدی خالی ہے"۔

حضرت شاہ علیؒ فرماتے ہیں کہ "مجھے اس پر حیرت ہوئی کہ گدی خالی کیوں ہے، جبکہ والد صاحب وہاں موجود ہیں، بہر حال میں حضرت شیخ کی ہدایت کے بموجب نارنول سے رخصت ہوا، جب آگرہ پہنچا تو معلوم ہوا کہ والد صاحب کی وفات ہو چکی ہے۔ مجھے دنیا تاریک نظر آنے لگی، میں نے آگرہ میں مختصر قیام کیا، اور جس قدر جلد ممکن ہو سکا پانی پت پہنچا اور اپنے بزرگوں کی امانت کی حفاظت اور خانقاہ کی خدمت میں مصروف ہو گیا[1]

شیخ فیض اللہ نارنولیؒ

آپ نے جب تک ترک و تجرید اختیار نہیں کی تھی، تب تک آپ خوراک حمالی کے ذریعہ بہم پہنچاتے تھے، ایکبارگی، آپ کو توفیق شیخ نظام نارنولی چشتی کے دربار میں موکشاں (گھسیٹ کر) لے گئی، یہاں آپ لوازم ارادت بجا لاکر شیوۂ درویشی میں سرگرم ہوئے اور پیر کی روشن تلقین کی امداد سے اپنے آباد اجداد کا پیشہ ترک کر کے توکل کا خرقہ پہن لیا۔ ناگاہ ایک کسبی کے جمال سے دلبستگی پیدا ہوئی اور بڑھتے بڑھتے آخرکار اس کے سودا میں بیخودی، گرفتاری اور عاشقی کی نوبت یہاں تک پہنچی کہ ننگ و ناموس کا خیال بھی پس پشت ڈال دیا۔ کسبی کا طبلہ اور سارنگی کندھے پر اٹھا کر ہمراہ رہنا لازم کر لیا۔

القصہ اسی شکل کے ساتھ آپ ایک روز پیر بزرگوار کی خدمت

---

[1] مسلسل از۔ پانی پت اور بزرگان پانی پت، ص ۲۵۹ - ۲۶۰۔

میں بھی پہنچے، چونکہ آپ عشق کی شورش میں محو اور حسن کے تلاطم میں مضطرب تھے، مجلس کی کیفیت معلوم نہ ہوئی - اور یہ نہ جانا، میں کون ہوں، کہاں آیا ہوں، کس کے ہمراہ ہوں، کس کے سامنے کھڑا ہوں، میرا کیا طریقہ تھا اور اب کیا حال ہو گیا ہے، - پیر بزرگوار یہ محویت دیکھکر حیرت میں ہوئے اور کہا:

"فیض اللہ تم دور چلے گئے، اور دیر گردی اور بھول گئے، لوٹ آؤ ہماری یاد اب تم کو تمہارے اور پر نہیں رہنے دے گی"۔

یہ دلآویز گفتار سن کر معنوی دلدار کے قدموں پر سر رکھا اور ایک عرصۂ دراز تک خودی سے گذرے رہے، جب پھر ہوش آیا تو سر اٹھا کر ارشاد پیر کے گرویدہ ہو گئے اور سلوک کا قدم بزرگوں کے راستہ میں استحکام کے ساتھ رکھکر فریبی نفس کی لڑائی اور ہوسناک تن کے گھلانے میں مشغول ہوئے۔

رہنما پیر نے ان الفاظ کے ساتھ آپکی دلداری فرمائی:

"جس گروہ والا معشوق کے ساتھ تم کو دلبستگی تھی وہ گروہ واپسیں نفس تک تمہارا مطیع فرمان رہے گا"۔

چنانچہ آج کے روز تک کہ ہجری کچھ اوپر ایک ہزار ہیں گروہ مذکور آپکی پرستاری میں اپنا مال و متاع صرف کر کے آپکی خوشنودی کا جویاں رہتا ہے[1]

---

[1] اذکار ابرار اردو ترجمہ گلزار ابرار ص ۵۶۱ - ۵۶۲

ابو الفتح سید احمد بن محمد خراسانی
اَلْمَعْرُوف
سیّد اکبر علی شاہ چوکھا رحمہ اللہ

خراسان صدیوں سے محدثین، ائمہ مجتہدین اور مشائخ رحمہم اللہ کا مرکز رہا ہے، وہیں سنہ ۹۳۰ھ میں آپ ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئے، ابتداً اپنے والد بزرگوار حضرت سید محمدؒ کی نگرانی میں تعلیم و تربیت حاصل کی، جو ایک زبردست عالم دین اور شیراز میں منصب قضاء پر فائق تھے ـــــ علمی قابلیت کے باعث آپ کو میر فاضل محمدؒ کے نام سے بھی پکارا جاتا تھا۔ سید علی ہمدانیؒ سے بیعت تھے، جن کا مزار کشمیر میں ہے، سلسلۂ بیعت اور بھی کئی طریقوں میں تھا۔ شاہ چوکھاؒ بھی اپنے والد بزرگوار کی متابعت میں اسی سلسلۂ سید علی ہمدانی سے منسلک تھے۔

ایشاں قاضی شیراز بودند دران وقت شیراز بدست سلاطین تیموریہ بود قاضی طریقہ اہل سنت والجماعت داشتند وجناب ایشاں ہمرکاب جناب میر سید علی ہمدانی بکشمیر تشریف آوردند سلطان الوقت اعزاز بسیار نمود، در کشمیر احکام شرع شریف را بسیار جاری ساخت، صاحب تصانیف بودہ، دو رسالہ در جمع احادیث رتنیہ درست نمودہ، در انجامی نویسند کہ از نظر مبارک

بزرگوار - شاہ چوکھاؒ کے والد ماجد - شیراز کے قاضی تھے جو ان دنوں تیموری بادشاہوں کے قبضہ میں تھا قاضی سید محمد اہل سنت و جماعت کے جادہ پر گامزن تھے۔ میر سید علی ہمدانیؒ کے ساتھ کشمیر تشریف لائے، حاکم وقت نے خوب اعزاز و اکرام کیا اور کشمیر میں شرع شریف کے احکام جاری کئے۔ صاحب تصانیف تھے - ایک سالہ رتنیہ - احادیث کے سلسلہ

میر محمد گزرانیده، و حرفے کہ از علماء در احادیث رتنیہ نقل میکنند مشہور است لیکن بعض اوقات آنرا تلقین بقبول نمودہ اند[1]	میں وہی بات لکھی ہے جو عموماً مشہور ہے کہ یہ سراسر افترا ہے۔ مگر کبھی کبھی ان احادیث کی تلقین قبولیت بھی فرماتے تھے[1]

(ف)) اس کی وجہ یہ ہوئی کہ وہ بات عمدہ ہوتی ہے اس کی تلقین میں کوئی حرج نہیں کلام اس میں ہے کہ وہ حدیث رسول ہے یا نہیں — ؟؟ کلام رسول ہونا — اور مفید ہونا دو الگ الگ چیزیں ہیں۔

سید علی ہمدانی قدس سرہٗ کے یہاں آپ کی اس قدر قدر و منزلت تھی کہ وہ جو بھی کتاب تصنیف فرماتے اسے آپ کی نظروں سے ضرور گذارتے تاکہ اسنادِ صحت کے لحاظ سے مزید اعتماد حاصل ہوجائے، شاہ چوکھا قدس سرہٗ کے والد بزرگوار سید محمد سید علی ہمدانی قدس سرہما کے ساتھ ساتھ کشمیر میں دعوت و تبلیغ کے فرائض عرصہ تک انجام دیتے رہے۔ جب ان دونوں درویشوں کا وصال ہوگیا تو شاہ چوکھا رحمہ اللہ دس آدمیوں کی ایک مختصر سی جماعت بناکر عازم پنجاب ہوئے اور پاک پٹن پہنچے۔ شیخ نظام الدین نارنولی اتفاقاً پاک پٹن میں تشریف فرما تھے، آپ ان سے بیعت ہوئے۔ پھر اسی دربار سے مستقل وابستہ ہوگئے۔ البتہ دہلی آنا جانا ہوتا رہا۔

حضرت نظام الدین نارنولی قدس سرہٗ ہر سال دہلی قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں حاضری دیتے تھے۔ یہ سفر اس قدر استوار و مسلسل تھا کہ

---

[1] شجرۂ نارنولی مخطوطہ

جب تک چلنے پھرنے کی طاقت رہی اس میں فرق نہ آیا۔ شاہ چوکھا کا سفر دہلی اپنے شیخ کی ہمرکابی میں ہوتا تھا۔ دہلی سے نارنول کے کئی ایک راستے ہیں جو مختصر بھی ہیں اور طویل بھی۔ ایک راستہ میوات ہوکر بھی جاتا ہے۔ قطب صاحب سے قصبہ دھوج، کھوڑی شاہ چوکھا، فیروز پور جھرکہ، تجارہ، کوٹ قاسم، ریواڑی، نارنول۔ اس راہ میں اکثر مسلم آبادی ہے، پورا علاقہ میوؤں کا ہے۔ شاہ چوکھا عموماً اسی راستے یہ مبارک سفر طے کیا کرتے تھے۔ اپنا آخری مسکن آپ نے اسی سلسلہ میں پسند فرمایا تھا اور ۹۲۲ھ سے اکثر اسی پہاڑی پر قیام رہا۔ اسی دوران حضرت بندگی نظام نارنولی نے خلافت و اجازت سے نوازا تھا ایک دفعہ ضرورت کے تحت موضع شاہ چوکھا کے کاغذات دیکھے گئے تو آگرہ کے محافظ خانے میں شاہ صاحب کے متعلق اس قدر ملا:

"از ملک خراسان مع ہشت بالکہائے بارادہ سیر و سیاحت در ہندوستان تشریف بیاوردند"۔

"خراسان سے آٹھ مریدوں کے ہمراہ سیر و سیاحت کی غرض سے ہندوستان تشریف لائے"۔

حضرت بندگی نظام الدین نارنولی ۹۹۹ھ میں واصل بحق ہوئے، شیخ کا یہ چہیتا مرید اور خلیفہ اپنے مرشد کے فراق کو برداشت نہ کرسکا اور ۵ رجمادی الاول سنہ ۱۰۰۰ھ میں آپ بھی اپنے مولائے حقیقی سے جاملے فرحمھم اللہ تعالیٰ اجمعین

آپ شیخ نظام نارنولی قدس سرہٗ کے خلیفۂ اکبر کہلاتے تھے، اسی وجہ سے آپ کو اکبر علی بھی کہتے تھے۔

آپکے گیارہ خلیفہ تھے۔ ان سب کے مزار اسی پہاڑی پر ہیں جہاں آپکی آخری آرام گاہ ہے۔

۱ــــ شیخ لطف اللہ عرف گنگ رح

۲ــــ شیخ حسین عرف شیخ ہارون رح

۳ــــ شیخ غلام علی عرف دیندار رحمۃ اللہ علیہ۔

ان تینوں حضرات نے نکاح نہیں کیا بلکہ تجرد کی زندگی گزاری۔ باقی آٹھ خلفاء حسب ذیل ہیں:-

۱ــــ شیخ غریب اللہ رح
۲ــــ شیخ کریم اللہ عرف کالو رح
۳ــــ شیخ یوسف رح
۴ــــ شیخ امیر اللہ عرف آدم رح
۵ــــ شیخ علی محمد عرف علی رح
۶ــــ شیخ حفیظ اللہ عرف چاند رح
۷ــــ شیخ بایزید
۸ــــ شیخ حسین رحمہ اللہ

ان آٹھ حضرات نے باقاعدہ سنت نبوی پر عمل پیرا ہوکر ازدواجی زندگی اختیار کی۔ انھیں کی اولاد موضع شاہ چوکھا رح میں آباد پیرزادے ہیں۔ ان تمام خلفائے اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق دین کی خدمت کی۔ اور اپنے بعد دین کی خدمت کی داغ بیل ڈال گئے۔ ان کی بابت میواتی زبان میں ایک مشہور دوہا ہے۔

چشت گھرانے اولیاء قائم درست ایمان!
آٹھوں تھانے روشنی شاہ چوکھا برت مکان!!

شاہ چوکھا قدس سرہ کے ایک خلیفہ اور ہوئے ہیں "شیخ گدائی مرحوم" متوفی شعبان ۱۰۰۲ھ قصبہ سیکری ضلع بھرتپور۔ سیکری اور اس کے ماحول میں آباد قبیلہ نوبوت کے وہ دادا اور مورث اعلیٰ ہیں ــــ رحمہ اللہ ان کا مفصل تذکرہ آگے ملاحظہ کیجئے۔ بزرگان دین سے عوامی ربط یا ان کے اخلاق کریمانہ سے متاثر ہونے کا نتیجہ ہوتا ہے یا کشف و کرامات کے ذریعہ۔ شاہ صاحب رح سے عوامی رابطہ بہر دو صورت تھا۔ آپ کی کرامات بھی بہت ہیں اور مشہور ہیں۔ منجملہ ان کے یہ ہیں:

سنہ ۹۷۰ھ میں شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنی جماعت کے ساتھ بغرض ملاقات درویشاں دہلی تشریف لے گئے، اچانک یہ آواز سنائی دی: "آج ۲۸ تاریخ کو چاند دکھائی دے گا۔" اس انوکھی بات سے ہر کسی کو تعجب ہوا۔ تمام مسلمانوں نے بالاتفاق اس سے انکار کیا۔ جلال الدین اکبر کی تلون مزاجی کے باعث جادوگر اور جوگیوں کا حوصلہ بہت بڑھ گیا تھا، جادو کے ذریعہ وہ اسطرح عوام کو گمراہی میں ڈالنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ پناہ خدا۔ آپ کی مجلس میں کسی نے کہا، حضرت آج شام ۲۸ کو چاند ہوگا۔ آپ نے فرمایا: کذب است، بالکل جھوٹ۔ شام کو جوگی اور جادوگروں نے چاند کی شکل کا تانبہ کاٹ کر اور اس پر سفید قلعی کرکے مغربی جانب افق پر اُڑا دیا اور اعلان کر دیا کہ لوگو دیکھو ۲۸ کو چاند نظر آ رہا ہے، پھر آپ نے فرمایا: کذب است، اور اپنی کھڑاؤں کو پاؤں سے نکال کر اس جھوٹے چاند کی طرف پھینکا اور فرمایا: "بحکم خدا اس جادو کے جھوٹے چاند کو سب کے سامنے لا۔" حاضرین نے دیکھا کہ آپ کی کھڑاؤں جادو کے چاند کو بجاتی ہوئی لا رہی ہے اور مجمع عام میں لا کر ڈال دیا۔

آپ کی یہ کرامت دیکھ کر مجمع نے آپ کے مذہب "اسلام" کی حقانیت کی گواہی دی اور بے اختیار خوشی کے مارے مختلف لوگوں کی زبان سے مختلف الفاظ نکلے: "فتح دین، فتح محمد، ابوالفتح"۔ دور سے سننے والوں نے سمجھا کہ اس بزرگ کا نام فتح محمد ہے، کچھ نے سمجھا کہ فتح دین، بعض نے خیال کیا کہ ابوالفتح ہے۔ اس باعث آپ کے مختلف نام مشہور ہوئے اور نارنول کے شجرۂ مخطوطہ میں حضرت ابوالفتح سید اکبر علی شاہ چوکھا رح لکھا ہے، شہر والے آپ کی یہ کرامت دیکھ کر آپ کے پاس آنے جانے لگے۔ شاہ صاحب رح نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا کہ رات میں میوات بھاگ چلو اب یہاں کون چین لینے دے گا۔ شاہ صاحب رح کی روحانیت خوشبو

کی طرح پھیل رہی تھی ۔ شدہ شدہ اکبر اعظم کے محلوں تک پہنچ گئی ۔

اکبر بادشاہ کئی شادیوں کے باوجود لاولد تھا ۔ بغرضِ اولادِ نرینہ جو وارثِ تخت و تاج ہو سکے، ایک اور شادی کی اور اس غرض و خواہش نے شہنشاہِ ہند کو شیخ سلیم چشتیؒ کی بارگاہ میں جبیں سائی پر مجبور کر دیا حاضر ہو کر دعا کی درخواست کی شیخ سلیمؒ نے فرمایا: "ایک شرط پر دعا کرتا ہوں کہ نام سلیم رکھنا ہوگا ۔ جاؤ انشاء اللہ لڑکا پیدا ہوگا" خوشی خوشی دل سے اقرار کر کے آگرہ واپس آگیا ۔ ادھر اکبر نے شاہ چوکھاؒ کی خدمت میں اپنے خصوصی لوگوں کو دعا کے لئے بھیجا ۔ انھوں نے درخواست کی کہ دعا فرمائیں ۔ شاہ صاحبؒ نے فرمایا: "بھائی محمد سلیم دعا کر چکے میں انکی دعا کے ساتھ ہوں" یہ جملہ سنکر اکبر کے کارندے حیران ہو گئے کیوں کہ انھوں نے شیخ سلیم چشتیؒ کی بارگاہ میں حاضری کے متعلق کوئی تذکرہ نہ کیا تھا ۔ یہ لوگ شاداں و فرحاں آگرہ واپس آگئے اور جلال الدین اکبر کو اطمینان دلایا اور اپنا پورا ماجرا سنا دیا ۔

بزرگوں کی دعا اور حکمِ خدا ۹۷۷ھ میں اکبر کے شہزادہ محمد سلیم پیدا ہوا ۔ بادشاہ نے شہزادے کی خوشی میں اولاً خانقاہ شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ فتح پور سیکری میں تعمیر کرائی ، اس کی تکمیل کے بعد یہ تعمیری عملہ ملک میوات میں اس پہاڑی پر آیا اور شاہ چوکھاؒ کی خانقاہ تعمیر کرنی شروع کی ۔ کافی لمبی چوڑی خانقاہ ہے ۔ بہت کام ہو چکا تھا مگر ابھی تکمیلی مراحل طے نہ ہوئے تھے کہ ۱۰۱۴ھ میں اکبر اعظم کا انتقال ہو گیا خانقاہ شاہ چوکھاؒ کی تعمیر جہاں تک ہوئی تھی وہیں بند ہو گئی اور تا حال اسی حال میں ہے ۔

مصارفِ خانقاہ کے لئے اکبر بادشاہ نے ایک ہزار بانوے بیگھ ۱۰۹۲ زمین معافی میں بطور جاگیر عنایت کی اور ان آٹھ خلفاء کے نام عہدہ نمبرداری دیا جنھوں نے شادی کر لی تھی جو آج تک برقرار ہے ۔

شاہ چوکھاؒ کی عقیدت میں کچھ مغل خاندان کے افراد بھی یہاں آباد ہو گئے تھے

(جن کے محلوں کے نشانات ابھی تک پائے جاتے ہیں گو وہ مکانات اور ان کے مکین منہدم اور ختم ہو گئے) ۔ خانقاہ آباد و پُر رونق ہو گئی ۔ اہلِ حاجت اور ضرورتمندوں کی بکثرت آمد اہلِ میوات نے جب دیکھی اور لنگر خانے کو دیکھا کہ ہر وقت کھلا رہتا ہے تو کچھ دردمند اور صاحبِ خیر حضرات نے بہت سے گاؤں میں زمینیں وقف بنام درگاہ شاہ چوکھاؒ کیں ۔ حالات ابتر سے ابتر ہونے کے بعد ابھی تک بھی کہیں کہیں سے ان زمینوں کی آمدنی پیرزادوں کو وصول ہوتی ہے ۔

پال چھر کلوت اور شاہ صاحب کی دعا

ایک مرتبہ شاہ صاحبؒ نے دہلی جاتے ہوئے کوٹ گاؤں میں ٹھہرنے کا ارادہ کیا جب شاہ صاحبؒ موضع کوٹ میں داخل ہو رہے تھے تو کوٹ والی دادی اپنی گایوں کو ان کے ٹھکانے پر باندھ رہی تھی شام کا وقت تھا ۔ شاہ صاحبؒ نے فرمایا: "اماں کھیر پکاؤ" دادی نے کہا کہ ابھی تو کوئی گائے بیاہی نہیں دودھ کیسے دیں گی ۔ ؟ روٹی پکادوں ؟ آپ نے فرمایا اچھا دودھ کا برتن لاؤ ، دادی نے برتن لا دیا ، ایک کنواری گائے پر ہاتھ رکھا ، اور بسم اللہ پڑھ کر دوہنا شروع کیا ۔

دادی کو شاہ صاحبؒ کی یہ کرامت دیکھ کر بہت تعجب ہوا اور خوشی خوشی کھیر پکانے کی ترکیب شروع کی ۔ گھر میں چاول نہیں تھے ، سونکیہ (رائی جیسا ایک دانہ جسے کوٹ چھان کر دلیہ بناتے ہیں اور کھیر بھی ، چاول کے چورا جیسا ہوتا ہے ۔ وہ رکھے تھے انھیں) چھاج میں ڈال کر پھٹک رہی تھی ۔ شاہ صاحبؒ نے دادی سے چھاج لے کر ایک مٹھی شمال میں ، ایک جنوب میں اور ایک مغرب میں پھینک دیں ۔ پھر ایک مٹھی جہت مشرق کے لئے بھری تھی کہ دادی نے شاہ صاحب کا ہاتھ پکڑ لیا ، اور کہنے لگیں : میاں صاحب کیا تمام ہی پھینک دوگے پھر کھیر کس چیز کی پکاؤں گی ؟

شاہ صاحبؒ نے فرمایا: اماں تین طرف تیری اولاد خدا کے حکم سے بہت بڑھے گی، اگر چوتھی مٹھی دادی بند نہ کرتی تو چاروں طرف ان کی اولاد پھیل جاتی مگر مشیت ایزدی یہی تھی۔ موضع کوٹ کے تین طرف پال جھر کلوت آباد ہے چوتھی سمت جاٹوں کی آبادی ہے۔ جھر کلوت پال کے گاؤں تو زیادہ نہیں مگر اس کی مردم شماری سبھی پالوں سے زیادہ ہے۔

بہر حال حضرت سید احمد علی رحمہ اللہ عرف شاہ چوکھاؒ کے یہاں قیام کے باعث اس آبادی کا نام "موضع شاہ چوکھاؒ" ہو گیا۔ یہ بستی قطب رخ ایک چھوٹی سی پہاڑی پر واقع ہے۔ مشرقی دامن میں موضع کھوٹری اور جانب غرب موضع پھلینڈی واقع ہے عہد اکبری میں میوات کی یہاں اہم خانقاہ تھی جس نے چاروں طرف مذہبی شعور و احساس کو بیدار رکھا اور لوگوں کو عبادت و بندگی کا ذوق آشنا بنایا۔ فرحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔[1]

(۱) شاہ چوکھا ولی اللہ، و ثناء اولیاء (مخطوطہ)

شاہ گدائی رحمہ اللہ

قصبہ سیکری

ایک مرتبہ حضرت شاہ چوکھا قدس سرہٗ اپنی جماعت کے ہمراہ قصبہ سیکری ضلع بھرتپور کی طرف جا نکلے۔ وہاں پہنچکر برائے اطمینان دریافت فرمایا؛ — "ہم لوگ آج یہاں پر کہاں قیام کریں؟" — چودھری بہلول کے کوئی اولاد نہیں تھی، ویسے معزز، شریف اور فیاض قسم کے آدمی تھے، لوگوں نے، جو وہاں اس وقت موجود تھے کہدیا: — "شاہ صاحب آپ بہلول کے محلہ میں قیام کیجیے گا"۔ — آپ وہاں تشریف لے گئے تو پہلے پہل جس سے ملاقات ہوئی وہ چودھری بہلول ہی تھے۔ آپ نے ان سے دریافت فرمایا: "بھائی بہلول کہاں ملیں گے؟"۔ انھوں نے جواب دیا: "فرمائیے کیا کام ہے؟ تشریف رکھئے انھیں بھی بلا دیا جائے گا"۔ آپ نے فرمایا: — "بیٹھنے سے پہلے انھیں بلائیے انہی سے کام ہے اور انھیں سے ملنا ہے"۔ — چودھری بہلول نے جب دیکھا کہ شاہ صاحبؒ کو بہلول ہی کی ملاقات پر اصرار ہے تو دست بستہ عرض کیا — "حضور مجھے ہی بہلول کہتے ہیں"۔ تب آپ نے فرمایا: — "ہمیں آج آپ کے یہاں قیام کرنا ہے۔ ہمارے ساتھیوں کے کھانے پینے اور ٹھہرنے کا انتظام کر لیجیے"۔ اس نے آپ کی یہ درویشانہ فرمائش بسر و چشم منظور کی اور عرض کیا: — "بہت اچھا حضور"۔ انھیں دنوں وہ کچھ مال غلہ وغیرہ بیچ کر آئے تھے جس کی اچھی خاصی رقم تھی، وہ ابھی ابھی اپنی بیوی کو دی تھی۔ پھر بیوی کے پاس گھر گیا اور کہنے لگا: — "حضرت شاہ چوکھاؒ تشریف لائے ہیں اور ان کے

ساتھ میں ان کی جماعت بھی ہے ان سب حضرات کی دعوت کرنی ہے، وہ رقم مجھے دیدو کہ ضروری چیزیں بازار سے خرید لاؤں"۔ بیوی نیک بخت تھی اس نے ان بزرگوں کی میزبانی کو سعادت سمجھا اور اس کی تیاری میں مشغول ہو گئی۔

شاہ صاحب مع اپنی جماعت جب کھانا کھانے لگے تو دیکھا کہ چودھری بہلول اکیلے ہی سب کام کر رہے ہیں اور گھر میں کوئی چہچہاہٹ محسوس نہیں ہوتی آپ نے فرمایا: — "بہلول تمہارے بچے کہاں ہیں؟" بہلول نے عرض کیا: حضورؒ ابھی تک مجھے بارگاہ الٰہی سے کوئی بچہ عطا نہیں ہوا"۔ آپ نے فرمایا "اب ان شاء اللہ تمہارے بچے ہوں گے، اور پہلا بچہ ہمیں دینا ہوگا"۔ بہلول نے - جو اولاد سے مایوس ہو چکا تھا۔ اسے اپنے لئے فالِ نیک اور بشارتِ عظمیٰ سمجھ کر نیاز مندانہ لہجہ میں عرض کیا: "جیسے حضور ارشاد فرمائیں"۔

آپ دعا دیکر تشریف لے گئے اور بہلول کے یہاں یکے بعد دیگر تین بچے ہوئے۔ وہ تینوں بچوں کو لے کر شاہ چوکھاؒ کی خانقاہ میں حاضری دینے اور پہلا بچہ پیش خدمت کرنے کی غرض سے شاہ صاحبؒ کی قیامؒ کی طرف روانہ ہوئے خانقاہ کے قریب موضع پھلینڈی کے ریتیلے جنگل میں جب پہنچے تو بڑے بچے نے جس کا نام گدائی تھا پیدل چلنے پر اصرار کیا ایک بچہ گود میں، ایک کاندھے پر اور ایک بچہ کی انگلی پکڑ کر چودھری بہلول خراماں خراماں خانقاہ کی طرف رواں دواں تھے کہ سامنے شاہ چوکھاؒ تشریف لا رہے تھے۔ شاہ صاحب نے دیکھتے ہی فرمایا:

——— "اچھا ہمارے بچے کو پیدل گھسیٹے لا رہے ہو"۔

بہرحال تینوں بچوں کے وہاں بال کٹوائے اور گدائی بڑے بچے کو شاہ صاحبؒ کے حوالے کیا۔ شاہ صاحبؒ نے اس کی تربیت فرما کر کندن بنا دیا، اور پھر اسے ضلع بجر تیور کے علاقے میں کام کرنے بھیج دیا۔ گدائیؒ نے خوب کام کیا

اللہ تعالیٰ نے آپ کی اولاد کو برکات و عنایات سے نوازا۔ وہ موضع سیکری کے باشندے تھے، ان کی بہت سی کرامات وہاں کے عوام کے زبان زد ہیں۔

تاریخ پیدائش تو معلوم نہ ہو سکی، البتہ ان کی قبر پر ایک کتبہ میں ان کی تاریخ وفات درج ہے ۸۷۲ھ۔ شاہ چوکھا رحمۃ اللہ علیہ کے وصال سے تقریباً نصف صدی بعد، قصبہ سیکری اور اس کے ارد گرد کے گاؤں اکثر گدائی مرحوم کو اپنا دادا سمجھتے ہیں۔ عرصہ تک گدائی مرحوم کی اولاد میں یہ دستور رہا کہ نو مولود بچہ کے بال شاہ چوکھاؒ کی درگاہ میں منڈوائے جاتے تھے، یہ پتہ نہ چل سکا کہ یہ سلسلہ کب تک جاری رہا۔[1]

شیخ رکن الدین بیانویؒ

شیخ رکن الدین بن محمودؒ بیانوی، شہر بیانہ میں پیدا ہوئے، وہیں نشو و نما پائی، اور وہیں اپنے عہد کے اساتذہ سے علم حاصل کیا، بعد کو بیانہ چھوڑ کر مانڈو چلے گئے اور پھر وہیں سکونت اختیار کی، صالح بزرگ اور عالم باعمل تھے، فقہ اور علوم فقہ کے ماہر، سلسلۂ تدریس گھر کے اندر ہی جاری کر رکھا تھا، نماز کے علاوہ گھر سے باہر نہ نکلتے تھے۔

۱۴ رجمادی الاولیٰ ۹۱۲ھ میں فوت ہوئے۔[2]

شیخ نظام ناگوریؒ قدس سرہٗ

آپ نے اپنی گوشہ نشینی کے واسطے اپنے پیر بزرگوار کے عالیشان آستانہ پر ایک گوشہ اختیار کر رکھا تھا۔ درگاہ کی خاک سے کبھی سر نہیں اٹھایا، اور پیر کی خدمت سے جدائی کو ایک لحظہ کی بھی، کمال نقصان کا باعث سمجھتے تھے۔ اور اکثر پیر کی زبان مبارک پر یہ کلمات آجاتے تھے، ہمارا فخر فخر الدین کیسا تھا اور ہمارا نظام نظام الدین کیسا ہے۔ ؎ ناوک اہل وفا باد ہمیشہ بر ہدف[3]

---

[1] معتمد حاجی چوہڑ مل سیکری۔ [2] اذکار ابرار ص۲۰۲ و نزہۃ الخواطر ۴ ر ۱۵، ۱۱۶۔ [3] گلزار ابرار ص۲۰۸۔

سیدی سام رحمۃ اللہ علیہ

قصبہ گھاسیڑہ (۔ ماہین قصبہ ہنڈوفوج ۔ اب سے تقریباً سو سال پہلے) راجہ رائے بہادر کے قبضہ وتصرف میں تھا ۔ راجہ نے میوؤں کو بربنائے قومی تعصب ایک دوسری جگہ موضع شوگرپور رہنے پر مجبور کیا ہوا تھا۔

مہاراجہ سورج مل جاٹ والئی بھرتپور کے توسیع پسند عزائم نے مرکز تک متاثر کر رکھا تھا وہ رائے بہادر پر چڑھ آیا اور کچھ جوڑ توڑ اور کچھ تازہ دم اور حوصلہ مند فوج کے ساتھ گھاسیڑہ پر حملہ کر دیا ۔ اور راجپوتوں کی فوجوں کو پسپا کر دیا۔

سیدی سامؒ بزرگ کا عہد تو معلوم نہ ہو سکا مگر اس وقت رائے بہادر کے زمانے میں ان کی بڑی مان تھی ۔ لوگ ان کے مزار ۔ واقع جامع مسجد قصبہ گھاسیڑہ پر چادر چڑھاتے اور غریبوں کو کھانا کھلاتے ۔ ادھر راجہ کی فوج پسپا ہو رہی تھی ۔

" محمد علی، شوکت علی نے بھی ، جو صحیح النسب سید تھے اور راجہ کے نوجی بھی ۔ اپنی عقیدت ونیازمندی میں اس بزرگ کے مزار پر چادر چڑھائی فاتحہ خوانی کرائی اور غریبوں کو کھانا کھلایا اور اس بزرگ کی نسبت سے بارگاہ رب العزت میں نصرت ومدد کے طالب ہوئے غیبی آواز کے ذریعہ امداد کا یقین دلایا گیا۔ ان کے حوصلے بڑھ گئے ۔ اور وہ تینوں ۔ محمد علی ، شوکت علی ، اور راجہ رائے بہادر گھوڑوں پر سوار دشمن کی بیس ہزار فوج سے نبرد آزما ہو گئے اور اس جوانمردی اور بے جگری سے اپنی بہادری کے جوہر دکھائے کہ حملہ آور پسپا ہونے پر مجبور ہو گئے ۔ گھاسیڑہ سے آٹھ کوس دور موضع پنگواں تک ان کا تعاقب

کیا ، اور سب کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا ۔ کہا جاتا ہے کہ صرف پانچ اشخاص زندہ بچے ۔ دو سیدزادے محمد علی[1] شوکت علی[2] ، رائے بہادر[3] ، سورج مل راجہ اور وزیر دعاؤ جی۔ سورج مل نے دعاؤ جی[4] سے کہا

" دعاؤ جی تیرا ناؤں (نام) کو جڑ و بھر سو موئے
جیوت برج ملائے دیئے
دعاؤ جی بڑھ کر دل کو تو ئے[1]

ایک بادشاہ نے ایک عارف باللہ سے کہا ۔ آپ کچھ تمنا کیجئے میں اسے پورا کرنے کی کوشش کروں ۔ عارف باللہ نے ارشاد فرمایا ۔ آپ مجھ سے ایسی فرمائش کرتے ہیں حالانکہ میرے دو غلام ہیں ، جن پر مجھے پورا اختیار ہے ، وہ دونوں تجھ پر مسلط ہیں تیرے مالک ومختار ہیں میں نے انہیں دبا رکھا ہے ۔ خواہش اور لالچ ۔ آپ میرے غلاموں کے غلام پھر کس طرح میں آپ کی فرمائش پوری کروں ۔[2] (ابو العباس المرسیؒ)

اگر اہل علم دنیا سے بے رغبت ہو جائیں تو سرکشوں کی گردنیں انکے سامنے سرنگوں اور عوام انکے فرمانبردار بن جائیں مگر علماء سوء اپنا علم دنیاداروں کیلئے خرچ کرتے ہیں تاکہ ان سے انہیں کچھ مل جائے ۔ اس سے انہوں نے اپنی حیثیت بھی کم کر لی اور علم کی رسوائی کا باعث بنے ۔ اب وہ لوگوں پر بوجھ ہیں ۔ (فضیل ابن عیاضؒ)

دَعِ الْحِرْصَ عَلَى الدُّنْيَا	وَفِي الْعَيْشِ فَلَا تَطْمَعْ
وَلَا تَجْمَعْ مِنَ الْمَالِ	فَمَا تَدْرِيْ لِمَنْ تَجْمَعْ
فَإِنَّ الرِّزْقَ مَقْسُوْمٌ	وَسُوْءُ الظَّنِّ لَا يَنْفَعْ
فَقِيْرٌ كُلُّ ذِيْ حِرْصٍ	غَنِيٌّ كُلُّ مَنْ يَقْنَعْ

(امام شافعیؒ)

دنیا کی حرص چھوڑ ، آرام کی خواہش مت کر ، مال نہ سمیٹ کیا خبر کس کے لئے جمع کر رہا ہے ۔ رزق مقسوم اور بدگمانی غیر مفید ، ہر حریص فقیر ہے اور قناعت پسند مالدار ہے[3]

[1] داستان میوات حصہ دوم ص ۷۵، ۷۶ ۔ [2] الطبقات الکبریٰ ۲/۱۲ ۔ [3] الطبقات الکبریٰ ۱/۵۸ ، ۵۹ ۔

میاں مستان شاہؒ

میاں مستان شاہ بڑے پائے کے بزرگ گذرے ہیں اور بہت مستجاب الدعوات چنانچہ منشی محمد مخدوم فرماتے ہیں :۔

"دار پر کھینچے جانے نواب شمس الدین خاں کا سبب خاص دعائے بد میاں مستان شاہ ہے"

اور وہ مفصل یوں بر سر افواہ ہے کہ شمس الدین خاں نے قلعہ میں کوٹھی بنوائی تھی اور بہت شوق سے وہ تیار کرائی تھی۔ ہنوز وہ تعمیر کو نہ پہنچی تھی کہ کر چونا صرف میں آیا اور شہر میں بھی کہیں دستیاب نہ ہوا، ہر چند تلاش کرایا مگر میاں مستان شاہ میں کچھ چونا تیار پڑا تھا اور یہ شمس الدین خاں بد اعتقاد بڑا تھا اس نے بھی حال اس کا سن پایا اور خود جا کر اس چونہ کو اٹھا لایا ان مہاراج کی زبان سے نکل گیا کہ "فقیر کا چونا جس نے کہیں لگایا ہے وہ مکان آباد ہونے نہیں پایا ہے"

مستان شاہ کا یہ جملہ نواب شمس الدین نے بھی کسی ذریعہ سن لیا اس نے فوراً معذرت خواہی کے طور پر اپنا ایلچی وہاں بھیجا۔ مستان شاہ نے معذرت سنکر فرمایا : "جھر کے پہاڑوں میں چلا جائے دہلی نہ جائے ورنہ سالے کو کوئی نہیں بچا سکتا"

بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ واقعہ یہی تھا جو مستان شاہ نے فرمایا [1]

[1] روایت مولوی عبدالستار خطیب جامع مسجد فیروز پور جھرکہ

چونکہ میاں مستان شاہ قطب زمانہ تھے اور برہنہ شمشیر و سیف زبان تھے فوراً اس کلمہ نے اثر اجابت پایا اور خیال قتل فریزر صاحب بہادر شمس الدین خاں کا دل میں آیا چنانچہ قصد قتل فریزر نے ان کو اس قدر دیوانہ کیا کہ واسطے اہتمام اس کے شمس الدین خاں نے کریم خاں واصل خاں وانیا میو کو سوئے دہلی روانہ کیا آخر واصل کے ہاتھ سے وہ کار نمایاں ہوا اور بعد حصول مقصد ہر ایک وہاں سے گریزاں ہوا ہنگام تحقیقات زبانی انیا میو کے اس راز سربستہ نے صورت اصل دکھلائی اور بپاداش اس کے نواب شمس الدین خاں و کریم خاں نے پھانسی پائی۔ بعد تیاری روز عید وہ کوٹھی واسطے اجلاس کے شمس الدین خاں نے سجائی تھی لیکن پاؤں رکھنا بھی اس میں نصیب نہ ہوا کہ اسی دن نماز عید میں گرفتاری شمس الدین خاں وقوع میں آئی تھی [1]

[1] مرقع اور ص ۱۴۴

مولوی محمد اسمٰعیل کاندھلویؒ

مولوی محمد اسمٰعیل ابن شیخ غلام حسین قصبہ جھنجھانہ ضلع مظفر نگر کے رہنے والے تھے، مفتی الٰہی بخش م ۱۲۴۵) کے خاندان میں مولوی مظفر حسین کی نواسی کے ساتھ ان کا نکاح ہوگیا، اسطرح کاندھلہ وطن ثانی بن گیا۔ وہ حافظ قرآن اور جیّد عالم اور مستند فاضل تھے۔ ۱۸۵۵ء میں دلّی کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفرؔ کے سمدھی مرزا الٰہی بخش کے یہاں ان کے خاندان کے بچوں کی تعلیم کے لئے ملازم ہوئے، انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد جب مرزا نے بستی حضرت نظام الدین اولیاؒ میں سکونت اختیار کی تو چوسنٹھ کھمبے کے اندر اور باہر سکونتی مکان تعمیر کرائے اور وہیں ایک چھوٹی سی مسجد بھی بنوائی، مولوی اسمٰعیل کے رہنے کیلئے ایک حجرہ اور اپنی نشست کے لئے ایک کمرہ بنوایا جس پر ٹین کی چھت تھی جو بنگلہ کہلایا اور اسی باعث یہ مسجد بنگلہ والی مشہور ہوئی، یہی مسجد مولوی محمد اسمٰعیل کی دینی سرگرمیوں کی مرکز تھی اور اس مرکز نے آئندہ بین الاقوامی تحریک تبلیغ کے عظیم مرکز ہونے کا شرف حاصل کیا۔ اس سے بہت سے تاریک دل روشن ہوگئے۔

مولوی محمد اسمٰعیل نہایت سیدھے سادے، عابد مرتاض، زاہد شب بیدار بزرگ تھے، ذکر و عبادت مشغلہ اور تعلیم قرآن ان کا مقصد حیات تھا، بڑے بے نفس اور صلح کل تھے مخلوق کی خدمت میں ان کو خاص لطف آتا تھا، تواضع و انکساری ان کا مزاج تھا، مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ (م ۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۵ء) سے خاص تعلق تھا۔

میوات سے آپ کا تعلق اس طرح ہوا کہ ایک مرتبہ وہ اس فکر میں تھے کہ کوئی مسلمان آ تا مل جائے تو اس کے ساتھ جماعت سے نماز ادا کرلی جائے اتفاق سے چند مسلمان دکھائی دیئے، ان سے دریافت کیا کہ کہاں جارہے ہو؟

انھوں نے بتایا کہ مزدوری کرنے، آپ نے فرمایا: اگر اتنی مزدوری یہیں مل جائے تو جانے کی کیا ضرورت ہے، انھوں نے منظور کرلیا، آپ انھیں مسجد میں لے آئے اور انھیں نماز سکھانے، قرآن پڑھانے اور ان کو یومیہ مزدوری دینے لگے[1]۔ جب ان کو نماز کی عادت پڑگئی تو مزدوری چھوٹ گئی۔

دس پندرہ طلبہ ہمیشہ پاس رہتے تھے جو عموماً میواتی ہوتے تھے، آپ ان کو قرآن شریف اور ضروری مسائل کی تعلیم دے کر واپس بھیجدیتے تاکہ وہ میوات میں جاکر دینی خدمات انجام دیں، احسن المسائل اور ترجمہ شرح وقایہ انتہائی نصاب تھا۔ آپ کی کیمیا اثر صحبت کا یہ ثمرہ تھا کہ اس درسگاہ کے تعلیم یافتہ زہد و عبادت تقویٰ و دینداری، دین پر مرمٹنے کا جذبہ اور دینی امور میں اتنی جامع و مانع اور مکمل واقفیت رکھتے تھے جو موجودہ دور کے اکثر علماء کیلئے قابل رشک ہے[2]

---

[1] یہ چند مسلمان میواتی تھے، تذکرہ نگاروں نے بلا سوچے سمجھے لکھ دیا کہ نماز پڑھانے کی مزدوری دی گئی، اس سے شاید صاحب سیر کے مقامات بلند کا ذکر مقصود ہے۔ یہ سراسر گپ اور مغالطہ ہے میوات کی قدیم تاریخ، پرانی روایات اور ان کی معاشرت سے بالکل بے خبری و ناواقفیت کی وجہ سے یہ لکھدیا، ورنہ اگر اس قوم کی مذہبی تاریخ تذکرہ نگاروں کے سامنے ہوتی تو غلط بات اس طرح نہ لکھتے۔ لطف یہ ہے کہ اس روایت کے راوی کا نام مذکور نہیں، اور نہ ان مزدوروں کا جو آئندہ مدرسہ کاشف العلوم مسجد بنگلہ والی کے اساس بنے، جانبداری کی کوئی حد ہوتی ہے، مولانا محمد اسمٰعیلؒ کی بزرگی و بڑائی اور نیکی و پارسائی میں کلام نہیں، مگر ذرا خیال کیجیے کہ وہ ان آنیوالوں کو مسلمان سمجھتے ہیں اور پھر مزدوری پر نماز پڑھواتے ہیں۔ نماز سے اتنی بے بہرہ یہ قوم کسی دور میں بھی رہی کہ نماز کی اجرت لے، جو قوم زکوٰۃ و عشر کے استعمال کو اپنے لئے جائز نہ سمجھے اس قوم سے ایسی حرکت کا سرزد ہونا تعجب خیز نہیں تو اور کیا ہے۔؟ [2] تبلیغی جماعت کا تاریخی جائزہ ص ۸۱ و ۸۲، قدرے ترمیم کے ساتھ۔

۴ر شوال ۱۳۱۵ھ (۲۶ر فروری ۱۸۹۸ء) میں مولوی محمد اسمٰعیل کا انتقال ہوا اور وہ بنگلہ والی مسجد کے ایک گوشہ میں دفن ہوئے، مولوی محمد اسمٰعیل کی پہلی بیوی سے ایک صاحبزادے مولوی محمدؒ تھے جنھوں نے اپنے باپ کے انتقال کے بعد بنگلہ والی مسجد میں قیام کیا اور مدرسہ کو سنبھالے رکھا[1]

مولوی محمد صاحب کاندھلویؒ

مولوی محمد کاندھلوی کم گو، بے آزار، عزلت پسند، متوکل، ذاکر شاغل اور خوش اوقات بزرگ تھے، انھوں نے علم حدیث قطب عالم مولانا رشید احمد گنگوہی سے پڑھا تھا۔ اکثر وعظ بھی کہتے مگر بیٹھ کر جیسے کوئی باتیں کرتا ہو وہ نہایت منکسر المزاج اور غربا پسند تھے ۔ آپ کے زمانہ میں بیس پچیس طلبہ رہتے تھے جو خود روٹی پکاتے اور جنگل سے لکڑیاں لایا کرتے تھے، آپ بھی ان کاموں میں ان کی مدد کر دیتے۔ آپ کی تعلیم گو قرآن کریم اور دینیات تک تھی مگر تربیت ایسی کرتے تھے کہ طلبہ نہایت دیندار، متقی، پرہیز گار ہو جاتے، آپ کا قیام بستی حضرت نظام الدین میں کم و بیش اکیس سال رہا، ۲۵ر ربیع الاول ۱۳۳۶ھ میں مسجد نواب والی محلہ قصاب پورہ دہلی میں انتقال ہوا اور تدفین اپنے باپ کے پڑوس میں مسجد بنگلہ والی ہی میں ہوئی رحمۃ اللہ علیہ

حاجی عبد الرحمٰن اٹاوڑی

حاجی عبد الرحمٰن اٹاوڑی میوات کے ایک غیر مسلم بنیا گھرانے میں پیدا ہوئے بچپن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے خواب میں مشرف ہوئے، اور مولانا محمد صاحبؒ کے ہاتھ پر ایمان لائے، نظام الدین کے مدرسہ میں مولانا محمدؒ سے قرآن کریم اور دین کی تعلیم حاصل کی، مولانا خلیل احمدؒ سے بیعت کی، مولانا محمدؒ کے زمانہ میں ان کے معتمد خاص اور ان کے دست راست رہے، مولانا محمد الیاسؒ کے تمام دینی کاموں میں ان کے قدیم ترین رفیق و معاون تھے، مولانا ان کے متعلق نہایت بلند کلمات فرماتے تھے اور انھیں اپنی تحریک کا روح رواں سمجھتے تھے آپ میوات کے حکیم و عارف تھے اللہ تعالیٰ نے دین کی بڑی دولتیں نصیب فرمائی تھیں، آپ کا اصلی ذوق غیر مسلموں میں تبلیغ تھا جس میں آپ کو ملکۂ خاص تھا، ہزار سے اوپر آدمی آپ کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے۔ قصبہ سنگار میں نو مسلموں کا ایک مدرسہ قائم کیا جس سے اولاد کی طرح تعلق تھا، میوات کی رسوم کی اصلاح آپ کا کارنامہ تھا ربیع الثانی ۱۳۶۴ھ میں انتقال فرمایا[1]

میر جعفر شاہ، مالب ضلع گوڑگانوہ

آپ تیرہویں صدی کے مشہور اہل اللہ میں تھے، تقریباً سو سال پہلے آپ قصبہ مالب میں تشریف لائے اور عیدگاہ کے پاس جنگل میں رہنے لگے، اکثر جذب طاری رہتا، لباس سے عموماً بے نیاز ہوتے، ایک مرتبہ مولانا محمد حسن فیروز پوری م ۱۹۴۴ء آپ کی ملاقات کو تشریف لائے تو میر صاحب ان کے آنے سے پہلے ہی کہنے لگے: "ارے بھائی کوئی کپڑا لاؤ کہ ستر پوشی کر لوں ایک دانا و بینا تشریف لا رہے ہیں" ایک مرتبہ ایک بچہ کو اس کے والدین آپ کے پاس دم کرانے لائے اس وقت آپ

---

[1] ، [2] تبلیغی جماعت کا تاریخی جائزہ ص ۸۱، ۷۷ قدرے ترمیم کے ساتھ۔

[1] تبلیغی جماعت کا تاریخی جائزہ

آگ کے الاؤ کے پاس تھے، آپ نے بچہ ان کی گود سے لیا اور آگ میں ڈال دیا، بچہ کے ماں باپ بے قرار ہو گئے تھوڑی دیر بعد آپ نے بچہ کو آگ سے نکالا اور اسکے منہ پر لعاب کے چھینٹے مارے بچہ دیکھتے دیکھتے شفایاب ہو گیا۔ تقریباً ۱۸۸۶ء میں وفات پائی اور عیدگاہ سے باہر جنوب مشرق گوشے میں دفن ہوئے۔ رحمۃ اللہ[1]

مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ

مولانا محمد الیاسؒ ۱۳۰۳ھ میں کاندھلہ ضلع مظفر نگر میں پیدا ہوئے۔

قرآن مجید کی تعلیم کا آغاز وہیں حافظ منگتو کے پاس ہوا، پھر حفظ قرآن اپنے والد ماجد مولوی محمد اسمٰعیلؒ کے پاس بستی حضرت نظام الدین اولیاؒ میں کیا، اس کے بعد فارسی و عربی کی ابتدائی کتابیں کچھ یہیں دہلی میں اور حکیم محمد ابراہیم سے کاندھلہ میں پڑھیں، ان کے بڑے بھائی مولوی محمد یحییٰؒ (ف ۱۳۳۴ھ) نے باپ سے عرض کیا کہ الیاس کی تعلیم باقاعدہ نہیں ہو رہی ہے، میں ان کو گنگوہ لئے جاتا ہوں چنانچہ مولوی محمد الیاسؒ ۱۳۱۵ھ میں گنگوہ پہنچے۔ گنگوہ اس زمانہ میں علماء و صلحاء کا مرکز تھا، حضرت گنگوہی قدس سرہ جیسے قطب عالم کی سرپرستی اور مولانا محمد یحییٰؒ جیسے زیرک و فہیم اور تنک مزاج کی تربیت و نگرانی اور رشد و ہدایت کے طلبہ کا ہجوم مولانا محمد الیاسؒ نے جی کھول کر اس ماحول سے استفادہ کیا۔ مولوی محمد الیاسؒ نہایت ذہین، نازک مزاج اور بلند حوصلہ و عالی ہمت تھے زیادہ محنت کرنے سے تھک جاتے مگر کام نہ چھوڑتے اساتذہ مجبوراً آپ کے سبق بند کر دیتے پھر صحت یاب ہونے پر شروع کر دیئے جاتے ۱۳۲۶ھ میں حضرت شیخ الہند

---

[1] روایت قاری عبدالمجید و مولوی فتح محمد و مولوی عبدالوحید مالب

قدس سرہٗ کے درس میں شریک ہو کر دار العلوم دیوبند میں بخاری شریف و ترمذی شریف کی سماعت کی، پھر اپنے برادر گرامی مولوی محمد یحییٰ کے دورۂ حدیث میں شریک ہوئے، مولانا گنگوہیؒ کے وصال کے بعد مولانا خلیل احمد انبہٹویؒ سے تکمیل سلوک کی اور اجازت و خلافت سے سرفراز ہوئے۔ شوال ۱۳۲۸ھ میں آپ مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور میں مدرس مقرر ہوئے، اور ۱۳۳۳ھ میں پہلا حج کیا۔ مولانا محمد کے انتقال ۱۳۳۶ھ کے بعد دہلی کے بعض مخلصین نے آپ کو اپنے بھائی کی جگہ کام کرنے کی طرف متوجہ کیا کہ والد ماجد اور برادر گرامی کے مدرسہ اور مسجد کو آباد رکھیں، ان لوگوں نے مدرسہ کی اعانت و خدمت کا بھی وعدہ کیا اور مصارف کے لئے کچھ امداد بھی مقرر کر دی، آپ نے اپنے مرشد مولانا خلیل احمدؒ کی اجازت اور مشورے سے بستی حضرت نظام الدینؒ میں رہنا قبول کیا مظاہر علوم سے آپ نے ایک سال کی رخصت لی، مگر دلی آتے ہی ایسے بیمار ہوئے کہ زندگی کی آس نہ رہی، پھر آپ کاندھلہ تشریف لے گئے صحت یاب ہو کر دوبارہ بستی حضرت نظام الدین اولیاؒ آگئے، وہی بنگلہ والی مسجد اور وہی حجرہ تھا، کچھ میواتی اور کچھ غیر میواتی طالب علم تھے، دوسرا حج آپ نے مولانا خلیل احمد سہارنپوری کی معیت میں ۱۳۴۵ھ میں تیسرا ۱۳۵۱ھ میں کیا۔ ۲۱ رجب ۱۳۶۳ھ۔ ۱۳ جولائی ۱۹۴۴ء بروز جمعرات صبح صادق کے وقت انتقال ہوا اور باپ کے پہلو میں دفن ہوئے آپ کے والد ماجد کا جو میوات سے تعلق تھا آپ نے اسے استوار کیا بلکہ اس میں مزید اضافہ کیا۔ میوات کا محل وقوع، بہادر و غیور قوم اور پھر اولیاء نامدارؒ کا مسکن و ماویٰ اور انکی آرام گاہ بادیہ نشین قلندروں کی گذرگاہ یہ اور اسی طرح کے دوسرے عوامل تھے جنھوں نے مولانا الیاسؒ کو مجبور کیا کہ وہ اس سرزمین کو اپنی اصلاحی جدوجہد کا میدان بنائیں۔ صوفیاء و مشائخ اور علماء و دانشوروں نے اب تک یہاں

جو کام کیا تھا گو وہ انفرادی نہ تھا مگر نتیجۃً اس کی شکلیں انفرادی ہی واقع ہوئی تھیں۔ آپ نے ان سب کی مساعی کو اجتماعی شکل دے کر کام کا آغاز کیا اور میو قوم کی دینی و مذہبی حس کو اجتماعی شعور و ادراک کی پرچھائیں میں لاکر اس میں صلابت اور پختگی پیدا کی، یہاں جگہ جگہ مدارس کا اجراء کیا اور ان کی آبادی کے لئے اجتماعی گشت شروع فرمائے اور ماضی کا جائزہ لینے اور مستقبل کے لئے لائحہ عمل بنانے کیلئے جگہ جگہ اجتماع کئے قومی پنچایتیں کیں، قوم کے سربرآوردہ لوگوں کو ایک پلیٹ فارم پر لاکر ان کے احساس ذمہ داری کو بیدار کر کے طاقت و توانائی بخشی۔ ایک دفعہ مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے آپ سے فرمایا تھا: مولوی الیاس! تم نے ایک بہادر قوم کو بزدل بنا دیا تو آپ نے بڑے اطمینان سے جواب دیا: نہیں جناب میں آپ کے جنود کے لئے جندی تیار کر رہا ہوں، اس قوم کی ایسی تربیت کر رہا ہوں جو ہمیشہ آپ کے اور ہمارے کام آئے۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو وہ تمام صلاحیتیں عطا فرمائی تھیں جو ایک مجدد و مصلح کے اندر ضروری ہوتی ہیں، آپ کی گفتگو مختصر مگر جامع اور پرمغز ہوتی تھی ٹھہر ٹھہر کر اور کئی کئی دفعہ ایک بات کو دہراتے تھے۔ محبت و شفقت، ہمدردی و خیر خواہی، امت محمدیہ کے لئے دلسوزی و جانکاہی آپ کی رگ رگ میں پیوست تھی، امت میں پھیلی ہوئی غفلت و لاپرواہی نے آپ کی راحت و آسائش گویا آپ سے چھین لی تھی۔

تبلیغی نقل و حرکت چونکہ بظاہر نئی سی چیز تھی، اسلام کی پوری تاریخ میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی، اس لئے آپ یہ کام بھی کرتے اور ہر وقت کے اساطین امت کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی روداد سنا کر استصواب رائے فرماتے اور بار بار حاضر خدمت ہو کر ان حضرات سے دریافت کرتے: کوئی غلط کام تو نہیں کر رہا ہوں؟ جب ہر طرح آپ کی تسلی ہو جاتی تو کام کی دوسری شکلیں سوچتے۔ آپ کی سوانح حیات اور کارناموں پر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی دامت برکاتہم کی ایک اہم تصنیف ہے۔ مولانا محمد الیاس صاحب اور ان کی دعوت، تفصیل اس میں ملاحظہ کیجئے۔

قاری محمد داؤدؒ میو کا تحصیل نوح

آپ کے ابتدائی احوال معرض خفاء میں ہیں۔ حضرت مولانا محمد الیاس قدس سرہ کے اہم آدمیوں میں آپ کا شمار ہوتا ہے بہت کم پڑھے لکھے مگر حکمت و دانائی اور فہم و بصیرت قدرت نے بے پناہ بخشی تھی، بہت کم گفتگو کرتے تھے مگر جب کرتے پھول سے جھڑتے تھے، بڑی باضابطہ، سنجیدہ اور سنگین گفتگو فرماتے تھے، آپ کی والدہ میاں جی کلیم شاہؒ کے مریدوں کا کھانا بناتی تھیں جو سلسلہ راج شاہی کے اہم درویش تھے، وہیں سے آپ کو نظام الدین کا شوق ہوا۔ آپ اور حاجی عبدالرحمن اٹاوڑی ساتھ ساتھ دہلی پہنچے تھے حاجی عبدالرحمنؒ مولانا محمد کے حلقۂ اثر میں رہے، اور آپ حضرت مولانا محمد الیاس کے خادم بن کر رہے، قرآن کریم ناظرہ پڑھا اور بہشتی زیور تقریباً ازبر تھا جو دینی مسائل کی بلا مبالغہ ایک انسائیکلوپیڈیا ہے آپ نے مولانا محمد الیاسؒ کی بہت خدمت کی اور ان کی بے نظیر تربیت کے آپ پر خوشگوار اثرات مرتب ہوئے، مرکز کی شوریٰ کے عمر بھر اہم، مفید و کارآمد ممبر رہے، ہر اہم معاملہ میں آپ کی رائے ضروری سمجھی جاتی تھی۔ بڑے بذلہ سنج مدبر و

---

[1] بروایت مولوی نور محمد اٹاوڑی

[2] بروایت حافظ محمد یامین خویش قاری صاحب

مربی تھے۔ ایک دفعہ مدرسہ کے کچھ طالب علم سائیکل سیکھنے چلے گئے اتفاقاً آپ کا وہاں گذر ہوا، طالب علم ڈر گئے، سب کو بلایا اور وہیں کان پکڑوائے۔ طالبعلموں نے کہا: قاری صاحب اب نہیں چلائیں گے۔ آپ نے فرمایا: اچھا تم یہ سمجھے ہو کہ آئندہ نا کردنی جرم کی سزا ہے یہ۔ ایسا نہیں بلکہ اب جو تم نے بے ضابطگی کی ہے یہ اس کی سزا ہے، آئندہ پھر دیکھا جائے گا۔[1]

۲۹ر ستمبر ۱۹۰۹ء میں آپ کا وصال ہوا اور بستی حضرت نظام الدین کے عوامی قبرستان میں دفن ہوئے رحمہ اللہ رحمۃ الابرار

مولانا محمد یوسف رح
امیر تبلیغی جماعت

آپ ۲۵ر جمادی الاولیٰ ۱۳۳۵ھ مطابق ۲۰ر مارچ ۱۹۱۷ء کو کاندھلہ میں پیدا ہوئے، اس زمانے میں مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور میں مدرس تھے، سات سال کی عمر میں قرآن کریم حفظ کر لیا آپ کی تربیت پر والدین نے خاص نظر رکھی، آپ عام طلبہ کے ساتھ ان کے مشاغل اور ذمہ داریوں میں برابر کے شریک رہتے اور ان کا ہاتھ بٹاتے۔ یوں شروع ہی سے آپ میں فرائض کی ذمہ داری، وقت کی قیمت کا احساس اور تعلیم کا شوق پیدا ہوگیا، صحابۂ کرام کے پاکیزہ حالات اور خدا کی راہ میں ان کے ایثار و قربانی کے واقعات سے آپ کو گہری دلچسپی ہوگئی۔ آپ نے تجوید قاری عین الدین سے سیکھی اور گیارہ سال کی عمر میں اپنے والد حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ سے مدرسہ نظام الدین میں

---

[1] روایت مولانا عبد اللہ فارق دہلوی

عربی کی تعلیم شروع کی، میزان، منشعب، صرف میر، پنج گنج اور نحو میر کے پڑھنے کے بعد آپ کو قصیدہ بردہ، قصیدہ بانت سعاد اور چہل حدیث (شاہ ولی اللہ محدث دہلوی) یاد کرائی گئیں، یہ کتابیں اکثر حافظ منیر الدین نے پڑھائیں اور کنز الدقائق حافظ مقبول حسن گنگوہی رح سے پڑھی، اس کے بعد اوپر کی کتابیں اپنے والد ماجد سے پڑھیں، جب وہ حج کو چلے گئے تو آپ ۱۳۵۱ھ میں مدرسہ مظاہر العلوم میں داخل ہو گئے، میبذی اور ھدایہ اولین وغیرہ یہیں پڑھیں مولانا محمد الیاس رح کے حج سے آنے کے بعد پھر آپ بستی حضرت نظام الدین اولیاء میں آ گئے اور مشکوٰۃ وجلالین وغیرہ یہاں پڑھیں مولانا محمد الیاس رح کے مشورہ سے ۱۳۵۳ھ میں دوبارہ مدرسہ مظاہر علوم میں داخل ہوئے اور صحیح بخاری مولانا عبد اللطیف رح سے، صحیح مسلم مولانا منظور احمد سے سنن ابی داؤد مولانا محمد زکریا صاحب (شیخ الحدیث) سے اور جامع ترمذی مولانا عبد الرحمٰن کیمبل پوری سے پڑھیں اسی دوران آپ بیمار ہو گئے اس لئے مجبوراً آپ کو بستی حضرت نظام الدین رح آنا پڑا مولوی انعام الحسن بھی جو شروع سے آپ کے رفیق درس تھے، آپ کے ساتھ آ گئے اور صحاح اربعہ۔ صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابی داؤد، جامع ترمذی۔ کا بقیہ اور ابن ماجہ و نسائی، شرح معانی الآثار طحاوی اور مستدرک حاکم، مولانا محمد الیاس رح سے ختم کیں ــــ ۳ر محرم الحرام ۱۳۵۴ھ آپ کا عقد مولانا محمد زکریا کی صاحبزادی کے ساتھ شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی رح نے پڑھایا، پھر آپ رح اپنے والد ماجد حضرت مولانا محمد الیاس رح سے بیعت ہوئے اور ۱۹۴۴ء میں جبکہ حضرت مولانا محمد الیاس رح سفر آخرت کی تیاری میں تھے مولانا محمد زکریا مولانا شاہ عبد القادر رائے پوری اور مولانا ظفر احمد تھانوی کو ان کا یہ پیغام پہنچا:-

"مجھے اپنے آدمیوں میں ان پر اعتبار و اعتماد ہے آپ لوگ جسے چاہیں اور مناسب خیال فرمائیں اس کے ہاتھ پر ان لوگوں کو بیعت کرادیں جو مجھ سے بیعت ہونا چاہتے ہیں (۱) حافظ مقبول حسنؒ (۲) قاری داؤد (۳) مولوی احتشام الحسن (۴) مولوی محمد یوسف (۵) مولوی انعام الحسن (۶) مولوی قاری رضا حسن۔

ان حضرات نے باہم مشورہ کر کے مولانا محمد یوسف کی سفارش کی، آپ نے بھی اسے منظور فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا: مجھے منظور ہے اگر تم لوگوں نے یہی انتخاب کیا ہے تو اللہ اس میں خیر و برکت فرمائے گا پہلے بہت کھٹکا اور بے اطمینانی تھی اب اطمینان ہوگیا، امید ہے کہ میرے بعد انشاء اللہ کام چلے گا بہرحال آپ کو اپنے والد کے شروع کئے ہوئے کاموں کی ذمہ داری سونپی گئی اور زمانے نے دیکھ لیا کہ آپ نے اس کو کس قدر تندہی و جانفشانی سے نبھایا جہاں تک دعوت و تبلیغ کی تشریح و وضاحت کا تعلق ہے آپ نے اس میں اتنی محنت صرف فرمائی ہے کہ موجودہ صدی کی حد تک مزید اضافے کی گنجائش نہیں بلکہ کافی اور وافی ہے۔

دعوت کے مختلف مراحل، اس کے اسرار و رموز، اس کی ذمہ داریاں اس کی وسعت و پہنائی، اس میں جان کھپانیوالوں کی سوانح و کوائف، ایمان و اسلام اور اس سلسلہ کی قربانی و جذبۂ ایثار و ہمہ سپردگی، اللہ والوں کی صحبت و ہمنشینی، داعی کی خصوصیات، حکمت و موعظت اور مجادلہ حسنہ کی تفسیر، علم و دعوت کا ربط، انسانیت کے مختلف طبقات اُنکی نوعی تقسیم، خلافت فی الارض، اس کے احیاء کے مساعی اس کے ثمرات و نتائج وغیرہ جیسے اہم موضوعات پر زندگی بھر آپ نے اس قدر روشنی ڈالی اور اتنی دل نشین، دلچسپ و دلپذیر تشریح فرمائی کہ اہل دل جھوم اٹھے، اہل علم کو وجد آگیا، عوامی ذہن کو

بالیدگی میسر ہوئی اور مومن کی روح وجد کرنے لگی۔ بلا مبالغہ اور بغیر کسی جھجک کے کہا جاسکتا ہے کہ آپ کی زندگی دس سال اور وفا کرتی، یا پھر اس سلسلہ کو آپ جیسا یوسف ایک اور مل جاتا تو دنیا کا نقشہ یقیناً دوسرا ہوتا اور جدید تمدن و تہذیب کی چولیں ڈھیلی پڑجاتیں اور خدا بیزار و مروّت ناآشنا ماحول میں خوشگوار تبدیلی آجاتی اور انسانیت کو راحت و آرام کا سانس لینا نصیب ہوتا، مگر خدا کی خدائی ہے اس کے برعکس وہ ہی زیادہ جاتا ہے — بعض قلندروں کا کہنا ہے کہ مولانا محمد یوسفؒ نے تبلیغی تحریک کو جو سراپا حال تھی اس قدر اسے "قال" کے ڈھانچے میں کسا ہے کہ حال کی طرف رجوع مشکل معلوم ہوتا ہے — آپ کے دور میں یہ تحریک جو علاقائی تحریک تھی ایک آفاقی اور ہمہ گیر تحریک بن گئی۔ مسلمانوں کے مذہبی نزاعات، فروعی اختلافات اور فضا و ماحول کے طبعی تضاد و تباین کے باعث متفرق و پراگندہ افکار و خیالات کا اس سے اچھا اور عمدہ مداوا بظاہر حالات بہت مشکل ہے۔ منتشر ٹولیوں میں مسلمانوں کی تقسیم نے ملت اسلامیہ کو جس نقصان عظیم سے دوچار کیا ہے وہ اپنی جگہ ناقابل فراموش اور بظاہر ناقابل تلافی نقصان یہ ہے کہ مسلم قوم مذہب و دین کی روح، ایمان کی لذت و حلاوت اور رشد و فلاح کے منبع قرآن کریم کی حکمت و موعظت اور سنت رسول علیہ الصلوۃ والتسلیم کے افادات و افاضات سے بعید سے بعید تر ہوگئی، ہر فرقہ اور ہر طبقہ کے احبار و رہبان علماء و مشائخ۔ ارباب من دون اللہ بنالئے گئے، یہ تحریک اس مہلک مرض کا تریاق تھی اور مسلم قوم کو بحیثیت ایک قوم کے قرآن و سنت سے قریب لانے کا ایک اہم ذریعہ مگر طبقاتی طور پر اس کی وہ پذیرائی نہ ہوسکی جس کی یہ مستحق تھی، مستقبل قریب میں ممکن ہے ایسا ہوجائے اور حضرت مولانا محمد یوسفؒ کی شبانہ روز مساعی و مسلسل جدوجہد اپنی بہار دکھادے۔ "یہ خزاں رسیدہ چمن اور یہ بلبلوں کا ہجوم

عجب نہیں کہ پھر لوٹ کر بہار آئے ۔ ۱۹۴۷ء میں جبکہ دہلی کے بام و در اپنی جگہ سے ہل چکے تھے اور زبانوں پر صرف پاکستان کا نام تھا اس وقت مولانا محمد یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے جب کہا گیا کہ مسلمان پاکستان گیا آپ ذرا چل کر ان کی خبرگیری تو کیجئے گا۔ تو آپ نے فرمایا: جب تک میری قوم یہاں ہے میں اسے چھوڑ کر کیونکر کہیں جا سکتا ہوں انہیں دنوں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی بہ نیت جہاد دہلی تشریف لائے اور آپ سے اس سلسلہ میں گفتگو ہوئی تو آپ نے فرمایا؛ حضرت میں اپنی قوم سمیت آپ کے ساتھ ہوں[1] ۔ میو قوم کو آپ اپنی قوم سمجھتے تھے اور یہ تحریک کے ارتقاً کے لئے ضروری بھی تھا کہ عروج و ترقی تب ہی ممکن ہے کہ اساس و بنیاد مستحکم ہے میو قوم موجودہ تبلیغی تحریک کے لئے اساس اولین کی حیثیت رکھتی ہے اساسی و بنیادی شئون کا خیال و لحاظ اس کی ترقی کا ضامن اگر اس میں اس کے دم خم ہیں اور ان سے استغنا۔ پناہ خدا۔ اس کی تباہی کا پیش خیمہ ہے۔ حضرت مولانا محمد یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے زندگی بھر اس قدر شدید ریاضت، جد و جہد اور محنت کی تھی گو یا صدیاں سمٹ گئی ہیں۔ بالآخر بروز جمعہ ۲۹ ذی الحجہ ۱۳۸۴ھ (۲ اپریل ۱۹۶۵ء) آپ کو ابدی آرام مرحمت ہوا فانا للہ وانا الیہ راجعون ۔

---

[1] روایت مولوی عبدالحق اناوڑی استاد حدیث جامعہ رحیمیہ دہلی ۔

شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند

مشہور شیخ طریقت، پاکباز عالم، دیدہ ور محدث مولانا سید حسین احمد ابن سید حبیب اللہ حسنی فیض آبادی رحمۃ اللہ علیہ۔ ۱۹ شوال ۱۲۹۶ھ قصبہ بانگر مئو ضلع اناؤ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ٹانڈہ میں پائی ۱۳۰۹ھ میں دار العلوم دیوبند آئے، یہاں سات سال قیام کر کے تعلیمی مراحل طے کئے۔ حدیث حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ دیوبندی سے پڑھی اور عرصہ تک ان کی خدمت میں مقیم رہے۔ پھر گنگوہ جا کر قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہوئے۔

۱۳۱۶ھ آپ کے والد ماجد نے اہل و عیال سمیت مدینہ طیبہ ہجرت کی، آپ بھی اپنے والد محترم کے ساتھ تھے، وہاں مکہ مکرمہ میں حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس سرہ سے ملاقات کی، جو سید الطائفہ اور آپ کے شیخ کے شیخ تھے۔ آپ نے حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بھرپور استفادہ کیا اور ان کی صحبت کیمیا اثر سے فیضیاب ہوئے۔ مدینہ طیبہ میں محبت و خلوص، عقیدت و نیازمندی، صبر و رضا، قناعت و توکل اور صداقت و مروت کے ساتھ قیام کیا۔ ۱۳۱۸ھ میں آپ کے شیخ نے آپ کو گنگوہ طلب کیا۔ یہاں آپ دو سال ٹھہرے پھر آپ حجاز تشریف لے گئے اور مدینہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں تعلیمی خدمات انجام دیں۔ حدیث و تفسیر اور فقہ کے درس میں صبح سے شام تک مشغول رہتے، یہ سلسلہ ۱۳۳۲ھ تک جاری رہا، اس دوران آپ ہندوستان آ کر اپنے شفیق استاذ شیخ الہند سے مستفیض ہوتے رہے۔ ۱۳۳۳ھ میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے حج و عمرہ کا ارادہ کیا ۱۳۳۴ھ میں مدینہ منورہ پہنچے۔ آپ نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور اپنے استاذ رحمۃ اللہ علیہ کی معیت و خدمت پسند کی۔ مکہ مکرمہ آپ ان کے ہمراہ آئے۔ پہلی عالمی جنگ ۱۹۱۴ء،

ترکی خلافت کے خلاف شریف مکہ کی بغاوت اور خروج کا دور تھا، شیخ الہندؒ کے ہمراہ آپ، مولوی عزیز گلؒ، حکیم نصرت حسینؒ وغیرہ تھے۔ حاکم حجاز نے شیخ الہند کو ساتھیوں سمیت گرفتار کیا۔ آپ مدینہ منورہ حرم نبوی کے مدرس ہونے کی وجہ سے محبوب عوام تھے اس لئے آپ سے کچھ تعرض نہ کیا، مگر آپ نے اپنے استاذ سے علیحدگی گوارہ نہ کی اور ساتھ رہنے پر اصرار کیا۔ اس لئے آپ بھی گرفتار کرلئے گئے۔ اور پھر آپ، شیخ الہندؒ اور ساتھی انگریز گورنمنٹ کے حوالہ کر دیئے گئے، اس نے پہلے آپ لوگوں کو مصر رکھا پھر مالٹا منتقل کر دیا۔ وہاں یہ قافلہ حریت ربیع الآخر ۱۳۳۵ھ کے شروع میں پہنچا۔ مالٹا میں آپ حضرات کا تین سال قیام رہا، حکیم نصرت حسینؒ نے وہیں وفات پائی۔

آپ نے اپنے استاذ کی خدمت کو غنیمت سمجھ کر ریاضت و مجاہدہ اور درس و مطالعہ میں جد و جہد فرمائی۔ قرآن کریم حفظ یاد کیا، حدیث کے اسرار، فقہ کے رموز اور قرآن کریم میں غور و تدبر سیکھا۔ استاذ کی اتنی خدمت کی کہ آپ کے مخالف بھی اس کا اعتراف کئے بغیر نہ رہ سکے۔ قید مالٹا سے آپ ۲۲/۶/۱۳۳۸ھ میں رہا ہوئے۔ نہایت اکرام و اعزاز کے ساتھ ہند واپس لوٹے۔ حضرت شیخ الہندؒ کو مرض الموت لاحق ہوگیا۔ آپ دن رات ان کی خدمت میں مشغول رہے۔ اسی عرصہ میں شیخ الہندؒ نے آپ کو کلکتہ مولانا ابوالکلام آزادؒ کے مدرسہ میں مقرر فرمادیا۔ مولانا آزاد نے شیخ الہندؒ سے ان کا معتمد علیہ آدمی طلب کیا تھا۔ آپ نے اپنی مرضی پر، جو شیخ کے پاس رہنے کی تھی، استاذ کی رضا کو فوقیت دی اور کلکتہ کی راہ لی۔ ابھی آپ کا تھوڑا عرصہ ہوا تھا کہ شیخ الہندؒ کی وفات کی خبر آپ پر بجلی بن کر گری، آپ دیوبند لوٹ آئے، شیخ الہندؒ کی تدفین کے بعد کلکتہ تشریف لے گئے اور کچھ مدت وہاں تدریسی خدمات انجام دیں۔ پھر آپ سلہٹ، آسام، منتقل ہوگئے۔ یہاں چھ سال حدیث کا درس دیا۔ سلوک و تربیت کے فرائض انجام دیئے، اور لوگوں میں خودداری و خوداعتمادی نیز

آزادی کی محبت اور تڑپ پیدا کی۔ یہاں آپ سے بے انتہا لوگ فیض یاب ہوئے۔

آزادئ ہند کی تحریک اور سیاسی بغاوت زوروں پر تھی۔ آپ جیسے حریت شعار و آزادی پسند اس سے کیونکر علیحدہ رہ سکتے تھے، آپ جنگ آزادی میں کود پڑے اور انگریزی فوج کی ملازمت کو برملا حرام قرار دیا۔ ۱۳۴۰ھ میں آپ گرفتار ہوئے اور کراچی کا مشہور مقدمہ پیش ہوا اور آپ نے جرأت و بے باکی اور صداقت و حق گوئی کا وہ لازوال مظاہرہ کیا کہ اسلاف کی یاد تازہ ہوگئی، آپ کو دو سال کی قید بامشقت کا فیصلہ ہوا، ۱۳۴۲ھ میں آپ چھوڑ دیئے گئے۔

جب علامہ انور شاہ کاشمیریؒ نے دارالعلوم کی صدارت سے استعفیٰ دیا اور ڈابھیل تشریف لے گئے تو شوریٰ کی، اس منصب جلیل کے لئے نظر انتخاب آپ پر پڑی، اور آپ صدر مدرس و شیخ الحدیث بن کر ۱۳۴۶ھ میں دیوبند تشریف لے آئے، اور سلوک و معرفت کے ساتھ درس حدیث اور دارالعلوم کی نگرانی میں مصروف ہوگئے۔ آپ نے دارالعلوم کے وقار میں اضافہ کیا۔ اس کی شہرت و مرکزیت میں چار چاند لگائے اور عوام کے اعتماد کو اس کے ساتھ بحال و مضبوط کیا۔

یہ بات عجیب سی لگتی ہے کہ آپ نے تدریسی خدمات و تربیتی اقدامات کے ساتھ سیاسی مصروفیتیں بھی نہایت شد و مد اور عزم و ہمت سے جاری رکھیں۔ دلیری کے ساتھ پورے ملک کا دورہ فرمایا۔ ہندوستانی عوام میں آزادی کی روح پھونکی، سفر کی صعوبتیں جھیلیں، شب بیداری کا لطف لیا اور کسی پروگرام میں فرق نہ آنے دیا۔ مہمانوں کا اکرام، زائر و سائل کے حقوق کی نگہداشت، طلبہ کے مسائل پوری بشاشت سے سنتے اور متوازن تواضع کے ساتھ ہر مسئلہ کو مسئلہ سمجھ کر عہدہ برآ ہوتے۔ اپنی انرجی آزادی وطن کی خاطر قربان کی اور جمعیۃ علماء ہند میں شامل ہوگئے، جو مکمل آزادئ ہند کی اولین علمبردار تھی۔ اولاً اس کے اہم رکن رہے اور پھر مسلسل اس کے صدر نشین۔

۱۳۵۱ھ کی سول نافرمانی کی قیادت کی اور چھ ماہ سرکاری مہمان رہے۔ جمعیۃ علماء ہند کے کئی سالانہ جلسوں کی صدارت کی۔ ۱۳۶۱ھ میں کانگریس نے "بھارت چھوڑ دو" کا ریزولیشن پاس کیا، تحریکِ آزادی میں شدت پیدا ہوئی۔ آپ نے بڑے ہمت آفریں اور شجاعت آموز خطبات دیئے۔ جس کی پاداش میں آپ گرفتار کر لئے گئے اور تین سال کی قید بامشقت سے آپ کو نوازا گیا، رہائی کے بعد پھر جہادِ آزادی شروع فرمایا۔ مسلم لیگ کی سیاست نے زور پکڑا اور اس نے تقسیم ہند کا مطالبہ شروع کر دیا اور مسلم اکثریت جذبات کی رو میں اس کی ہمنوا ہو گئی۔ آپ تقسیم ہند میں مسلمانوں کا نقصانِ عظیم خیال فرماتے تھے۔ آپ کا کہنا تھا: "اس طرح وحدتِ ملی پاش پاش اور مسلمانوں کی مرکزیت ختم ہو جائے گی۔" اور "یہ فکر انگریزوں کی سازش کا نتیجہ و ثمرہ ہے۔" آپ نے اس فکر کی ایک مخلص مومن کی طرح مخالفت کی اور پورے ملک کا دورہ فرما کر اس کی ہلاکت آفرینیوں سے عوام کو آگاہ کیا۔ تقسیم کی مخالفت میں نہ ملامت کی پروا کی نہ خوف اور ڈر کی۔ تقسیم کے حامیوں نے آپ کے ساتھ گستاخیاں کیں، راستے روکے، مخالفت کے پہاڑ کھڑے کر دیئے۔ مگر آپ اس غیر فطری تقسیم کی مخالفت سے نہ رک سکے۔ رمضان ۱۳۶۶ھ میں آخر ملک کی آزادی اور تقسیم کا اعلان ہو گیا، فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے، دہلی اور اس کے آس پاس پنجاب وغیرہ کے شہر و دیہات مسلمانوں کے مقتلِ عظیم بن گئے اور وہ بات واقع ہو گئی جس سے آپ اور آپ کے ساتھی ڈرتے تھے۔ بہت سے مسلمان پاکستان منتقل ہو گئے۔ یہاں ٹھہرنے والوں کے ٹھکانے خطرات میں آ گئے۔ علمی و ثقافتی مراکز و مجامع ہل اٹھے، اور یہاں کے مسلمان بظاہر اکثریت کے رحم و کرم کے محتاج ہو گئے گویا وہ بساط ہی الٹ گئی۔

حالات کی نزاکت سے آپ ایک دینی واعظ اور مذہبی خطیب بن گئے اور مسلم معاشرہ میں ایمان و یقین، اعتماد علی اللہ اور دین کے ساتھ نسبت و تعلق کو مضبوط

بنانے میں مشغول ہو گئے، آپ انھیں صبر و ثبات کی تلقین فرماتے اور اسلام و احسان کی تعلیم، آپ کے اسفار و خطبات سے ٹوٹے ہوئے دل پُر امید ہو گئے مرجھائے ہوئے کنول کھل اٹھے، خزاں نے اپنے خیمے اکھاڑے اور بہار نے پڑاجمایا، قدموں کی لرزیدگی ختم ہوئی، خطرہ ٹل گیا، غم کے بادل چھٹ گئے اور دینی مراکز اصلی حالت پر آ گئے اور مسلمانوں نے گویا نئے سرے سے زندگی کی تشکیل کی۔

آپ نے عملی سیاست سے دستبرداری کی، درس و افادہ، دعوت الی اللہ اور تربیت و سلوک میں ایسے منہمک ہوئے کہ سیاسی آدمیوں سے کوئی میل جول نہیں رہا حتی کہ صدر جمہوریہ ہند کا دیا ہوا اعزاز "پدم بھوشن" آپ نے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ۔ یہ میرے اسلاف کے جادۂ مستقیم سے میل نہیں کھاتا۔ دار العلوم میں درسِ حدیث، شہروں، دیہاتوں میں گھوم پھر کر دعوت الی اللہ، تمسک بالدین، اتباعِ شریعت، سننِ نبوی کی مکمل پیروی اور ذکر الٰہی پر دلنشیں تقریریں فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو آپ کی طرف متوجہ کیا۔ اور اہلِ خیر کے دلوں میں آپ کی محبت ڈال دی۔ وہ اجتماعی و انفرادی طور پر آپ کی جانب کھنچے ہر طرف سے ان کے قافلے آپ کے یہاں آنے لگے، جگہ جگہ سے آپ کے بلاوے آتے، آپ بطیب خاطر سب قبول فرما لیتے اور تکلیف برداشت کرتے حتیٰ کہ آپ کو دل کی بیماری اور بلڈ پریشر کا مرض لاحق ہو گیا۔ کچھ عرصہ کے لئے سفر منقطع فرمائے اور گھر میں بیٹھ کر عزیز مہمانوں کی دلجوئی فرماتے۔ طبیعت میں خشوع و خضوع اور رجوع الی اللہ بہت تھا۔ بالآخر ۱۳؍۵؍۱۳۷۷ھ میں اپنے مولیٰ سے جا ملے۔ فرحمۃ اللہ۔ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا نے نماز جنازہ پڑھائی اور دار العلوم کے قبرستان میں اپنے مشفق استاذ شیخ الہند کے پہلو میں دفن ہوئے۔

مولانا سید حسین احمد مدنی یکتائے روزگار اور نادرۂ دہر تھے۔ صدق و اخلاص میں فرد، علوِ ہمت میں یکتا، عزم و شہامتِ نفس میں منفرد اور مصائب پر صبر و دشمن

سے چشم پوشی کرنے میں طاق تھے۔ دوست کے جاں نثار، دشمن کے خیر خواہ، اس کی حاجت روائی فرماتے اور ضرورت پر اس کی سفارش بھی کرتے۔ عجیب تھی آپ کی شخصیت، ہاتھ بھی کشادہ اور سینہ بھی فراخ، فیاض بھی وسیع المشرب بھی، مزاج میں لطافت و نزاکت، ارادہ میں جوش و ہمت، عقیدہ میں ثبات و صلابت، اعمال میں راستی و استقامت، معاملات میں نفاست و نزاہت، بڑے صوفی، جید عالم، تجربہ کار محدث، مخلص واعظ و خطیب اور اپنے دور کے ایک درد مند مبلغ تھے، مشفق چارہ ساز اور بہترین غم گسار تھے۔

آپ کے اوقاتِ شغل میں باضابطگی تھی۔ صبح بعد نمازِ فجر اپنے مہمانوں کے ساتھ ناشتہ، جس میں باسی روٹی ترکاری ضرور ہوتی تھی۔ پھر دارالعلوم کے پُرشکوہ دارالحدیث میں درسِ حدیث۔ صحیح بخاری اور سنن ترمذی، قرأت آپ خود بھی بلند اور صاف آواز کے ساتھ عربی لہجہ میں فرماتے، دوپہر تک، پھر اپنے مہمانوں کے ساتھ دوپہر کا کھانا تناول فرماتے، کچھ دیر قیلولہ کرکے ظہر کی نماز ادا فرماتے۔ نماز کے بعد زائرین، واردین، آنے والے، صادرین، جانے والے، کے ساتھ کچھ بیٹھتے اور انہیں سبز چائے پلاتے، پھر ڈاک دیکھتے اور سائلوں کی حسبِ مقدرت ضرورتیں پوری فرماتے۔ عصر کی نماز کے بعد مہمانوں کے ساتھ بیٹھ کر ان سے گفتگو فرماتے۔ تعلیمی سال کے اخیر، شعبان میں درس کے اوقات ذرا کچھ وسیع ہو جاتے۔ صبح سے دوپہر، ظہر سے عصر اور عشاء سے آدھی رات تک یہ سلسلہ رہتا۔ کتابیں ختم کرنا ضروری ہوتا تھا۔ آخری عمر میں دینی حمیت و مذہبی تصلب کچھ زیادہ غالب تھا۔ سنت کے خلاف کوئی کام آپؒ کی برداشت سے باہر تھا۔ ابن تیمیہؒ سے ان کے تفردات کے باعث شدید اختلاف رکھتے تھے اور ابن عربیؒ کے۔ ان کی رقت وگدازِ قلب کی وجہ سے زبردست حامی تھے۔

میانہ قد، بڑا سر، چوڑی پیشانی، کشادہ ابرو، گندم گوں، قوی بازو، گٹھیلا جسم، باوقار وبارعب، ہنس، ملنسار، بڑی من موہنی تھی آپ کی شخصیت، بشاشت ہر وقت آپ کے چہرہ پر کھیلتی تھی، کھدر کا لباس زیب تن فرماتے، انگریزوں کے، ان کے سامراجی مزاج و ذہن کے کارن، سخت دشمن تھے، بغض اللہ کے لئے۔ سونے جاگنے کی آپ کو اچھی خاصی مشق تھی۔ جب چاہتے سو جاتے جب چاہتے جاگ اٹھتے۔ رمضان المبارک میں آپ کی ریاضتیں بڑھ جاتیں۔ آپ کے مریدوں کے اجتماع کی وجہ آپ کی رہائش گاہ خانقاہ کی شکل اختیار کرلیتی۔ خود ذکر و فکر اور تلاوتِ قرآن کریم سے معمور اور پُرنور ہو جاتی۔ آپ کی یادگار آپ کے ہزاروں شاگرد، سفرنامہ اسیر مالٹا، شہاب ثاقب، نقش حیات دو جلد، اور آپ کے مکتوبات تین جلدیں ہیں۔[1] جو علم و عرفان، دین و مذہب، ایمان و یقین اور سلوک و تصوف کے سدا بہار گلدستے ہیں۔

---

[1] نزہۃ الخواطر ۸ / ۱۱۵-۱۲۱ معمولی تغیر کے ساتھ۔

محی الملۃ والدین مفتی کفایت اللہؒ (۱۳۷۲ھ)

شیخ پارسا، عالم بردبار، استاذ العلماء مولانا محمد کفایت اللہؒ بن عنایت اللہ بن فیض اللہ الحنفی شاہجہانپوری ۱۲۹۲ھ میں روہیلکھنڈ کے مرکز شاہجہاں پور شہر کے محلہ سن زئی میں پیدا ہوئے۔ مکتبی تعلیم سے فارغ ہوکر عربی کی ابتدائی تعلیم مدرسہ اعزازیہ شاہجہاں پور میں مولوی حافظ بدھن خاںؒ اور مولوی عبید الحق خاںؒ سے حاصل کی۔ پھر مولوی عبید الحق خاںؒ کے اصرار اور کوشش سے مراد آباد کے مدرسہ شاہی میں آئے، وہاں کے اساتذہ۔ مولانا عبد العلی میرٹھیؒ، مولوی محمد حسنؒ، مولوی محمود حسن سہوانیؒ وغیرہ سے فیضیاب ہوئے، ۱۳۱۲ھ میں دیوبند آئے اور ۱۳۱۵ھ میں فارغ التحصیل ہوئے۔ دورۂ حدیث مولانا عبد العلی میرٹھیؒ اور شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ سے اور بقیہ کتابیں مندرجہ ذیل اساتذہ سے پڑھیں۔ مولانا منفعت علیؒ، مولانا حکیم محمد حسنؒ (برادر خورد شیخ الہندؒ) مولانا غلام رسولؒ مولانا خلیل احمد انبیٹھویؒ۔ فراغت کے بعد آپ شاہجہاں پور لوٹ آئے اور مدرسہ عین العلم میں پانچ سال درس دیا، اور مدرسہ کی نگرانی فرمائی۔ پھر مولانا امین الدینؒ بانی مدرسہ امینیہ دہلی کی فرمائش وطلب پر دہلی کا سفر کیا اور ۱۳۲۱ھ میں مدرسہ امینیہ کے اساتذہ کے زمرہ میں شامل ہوگئے۔ عہدۂ افتاء اور صدر مدرسی آپ کے سپرد ہوا۔ ۱۳۲۸ھ میں مولانا امین الدینؒ کے وصال کے بعد مدرسہ کا اہتمام ونظامت بھی آپ کو سنبھالنی پڑی، اور درس وتدریس، طلبہ کی تربیت وتنظیم، نظم واہتمام مدرسہ اور فتویٰ نویسی پر مسلسل چالیس سال تک نہایت ثابت قدمی، دلجمعی اور صبر وشکر کے ساتھ کام کرتے رہے۔ مدرسہ امینیہ نے آپ کے دور میں بہت ترقی کی اور اس کی شہرت ومقبولیت ملک کی حدود سے نکل کر بیرونی ممالک تک جا پہنچی۔ فقہ میں آپ کو خصوصی مہارت تھی

بلکہ آپ کا اصلی میدان فکر وعمل اور امتیازی وصف ہی "تفقہ فی الدین" تھا اور سیاسی ذوق بھی صاف ستھرا اور پاکیزہ تھا، مسلمانوں کے دکھ درد سے بے چین، ان کی دل جوئی میں مضطرب اور ان کی غم خواری وغم گساری میں لگے رہتے۔ یہ چیز آپ کو اپنے استاذ محترم شیخ الہندؒ سے ورثہ میں ملی۔ آپ "تحریک شیخ الہندؒ" کے بہت بڑے حامی ومددگار اور اپنے استاذ کے تلمیذ وفا شعار تھے۔ تحریک آزادی میں پیش پیش رہے۔ ۱۳۳۸ھ / ۱۹۱۹ میں جمعیۃ علماء ہند کی بنیاد رکھی۔ بیس سال اس کے صدر رہے۔ کانگریس کے سرگرم رکن تھے۔ دو دفعہ جیل گئے اولاً ۱۳۴۹ھ چھ ماہ کیلئے، دوبارہ ۱۳۵۰ھ میں اٹھارہ مہینہ کے لئے گجرات اور ملتان جیلوں میں سرکاری مہمان رہے۔

جُسْنَا وَاُوْذِیْنَا بِغَیْرِ جَرِیْمَۃٍ
فَمَا ذَنْبُنَا اِلَّا الدِّفَاعُ عَنِ الْحِمٰی

جب شدھی سنگٹھن تحریک اٹھی تو آپ نے اس کا سرگرمی سے دفاع کیا، علماء کے وفود بھیج کر مسلمانوں کو مذہبی ثابت قدمی اور دین پر جمے رہنے کا درس دیا اور وعظ وتقریر کے ذریعہ ان کے مذہبی جذبات کو ابھارا اور ان کے ایمان واسلام کی تر وتازگی کے سامان فراہم کئے۔ ۱۳۴۴ھ میں سلطان عبد العزیز بن سعودؒ کی دعوت پر مکہ معظمہ میں جو اسلامی کانفرنس ہوئی اور اس میں ممالک اسلامیہ کے منتخب وفود شریک ہوئے تھے اس میں آپ جمعیۃ علماء ہند کے رئیس وفد بن کر تشریف لے گئے۔ کانفرنس کے مختلف سیمیناروں میں آپ کی رائے کی درستگی، فکر کی پختگی اور نظر کی گہرائی وگیرائی کھل کر سامنے آئی جس سے پورا عالم اسلام آپ کی وسعت نظر، اصابت فکر، سلامتی ذہن اور عمق وبصیرت کا قائل ہوگیا۔ ایک ملاقات میں سلطان ابن سعودؒ سے آپ نے کہا۔ اگر آپ کو مدینہ منورہ میں بھی وہی کرنا تھا جو مکہ معظمہ میں ہوا تو دنیائے اسلام سے وعدہ کیوں کیا تھا کہ ہم مؤتمر اسلامی کے فیصلے تک مدینہ منورہ میں کوئی قابل شکایت

کام نہیں کریں گے۔ سلطان نے کچھ تامل کے بعد جواب دیا کہ میری قوم کے پانچ ہزار آدمیوں نے مجھے دھمکی دی کہ اگر میں مقابر و مآثر کو منہدم نہ کروں گا تو وہ خود چڑھائی کر کے یہ کام کریں گے، مجھے اندیشہ ہوا کہ مبادا وہ مجھ سے بھی زیادہ تخریب کریں۔ اس لئے میں نے ان کا مطالبہ پورا کیا۔ آپ نے فرمایا: کیا آپ کو اپنی قوم کا حال معلوم نہ تھا؟ جب آپ ان کی وحشت و بربریت کو جانتے تھے اور اعلانِ ملوکیت کے وقت تجربہ بھی کر لیا تھا تو آپ نے اس قسم کا وعدہ کیوں فرمایا؟ سلطان تو لاجواب ہو کر سٹ پٹا گئے۔ ایک مصاحب نے کہا: جلالۃ الملک نے یہ سوچا تھا کہ میں اپنی قوم کو سمجھا لوں گا۔ آپ نے فرمایا کس طریقے پر سمجھا لینے کی امید تھی۔ دلیل و حجت سے؟ یا قوت سے؟ اس پر تمام حاضرین لاجواب ہو کر آپ کا منہ تکنے لگے۔ ۱۳۵۷ھ/۱۹۳۸ء میں فلسطین کانفرنس میں شرکت کیلئے قاہرہ تشریف لے گئے۔ جو برطانیہ کے اشارہ پر قاہرہ میں علی علوبہ پاشا کی صدارت میں منعقد ہوئی اور موتمر برلمانیۃ المصریۃ للدفاع عن فلسطین "فلسطین سے دفاع کے لئے مصری پارلیمنٹ کا اجلاس" کے نام سے مشہور ہے۔ جمعیۃ علماء ہند کی طرف سے اس کی شرکت کے لئے آپ کی صدارت میں وفد بھیجا گیا تھا۔ اس میں تمام عالم اسلام کے سات تین ہزار منتخب نمائندے شریک ہوئے تھے اور صدر کی دائیں جانب آپ کی کرسی رکھی گئی تھی اس کی سبجکٹ کمیٹی میں بھی آپ کا نام رکھا گیا۔ مصر میں آپ کا وہ بےنظیر اور شاندار استقبال کیا گیا کہ مصری قوم نے کبھی کسی کے لئے ایسا اہتمام نہ کیا۔ آپ کی علالت کی وجہ سے آپ کا تحریری بیان مولانا عبدالحق مدنی نے پڑھا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہو گیا۔ مگر آپ کی امیدوں کے خلاف ملک کے ٹکڑے ہو گئے۔ وطنی حکومت قائم ہو گئی، اسلامی ہند کی مرکزی شان و شوکت اس کے حریف دانائے فرنگ اور اس کے تلامذہ مستغربین کی سیاسی اداؤں کی نذر ہو گئی، وحدتِ ملی پارہ پارہ ہو گئی، ہزار سالہ تہذیب و ثقافت کا پائیدار محل تقسیم ملک کے انفعالی تاثر اور احساس کمتری کی

انجذابی کیفیت سے پاش پاش ہو کر زمین پر آ رہا، مجاہدین ملت و شہیدان وطن کا خواب آزادی کی پرچھائیوں میں بھی تشنۂ تعبیر رہا۔ حصولِ مقصد کے لئے بڑی بڑی دشوار گذار اور کٹھن منزلیں طے کیں، بڑی بڑی آفتیں جھیلیں، لیکن اس کارگاہ کون و فساد سے رخصت ہونے سے پہلے اپنی آرزو، احساس اور تمناؤں کا خون ہوتے دیکھ لیا۔ جن لوگوں کے ساتھ مل کر جنگ آزادی لڑی ان کی سرد مہری کیا طوطا چشمی دیکھ کر آپ دکھی ہوئے اور فرقہ وارانہ فسادات نے آپ کو بے چین کیا۔ ایک روز آبدیدہ ہو کر فرمایا: "ہم کو بھی اپنی زندگی میں کیا کیا دیکھنا تھا" ان کوائف نے آپ کا دل توڑ دیا اور آپ نے صرف درسِ حدیث اور افتاء سے شغل رکھا اور گھر میں بیٹھ گئے۔

ہو گیا مخمور اس آغاز کا انجام بھی
میں نے غم کھا تو لیا لیکن مجھے غم کھا گیا

آپ ایک سنجیدہ عالم دین، پختہ کار و وسیع المسلک فاضل، تجربہ کار محدث، دقیقہ سنج مفتی، نکتہ رس فقیہ، مسائل کی تنقیح و تحریر کے مالک و ماہر، جواب مختصر مگر متین لکھتے، نئے نئے مسائل میں بھی آپ کی نظر بڑی گہری تھی، مجلس مذاکرہ کے عمدہ شریک کار، عربی ادب کا ذوق بھی سلیس تھا، اردو عربی شعر گوئی پر ماہرانہ قدرت حساب اور علوم ریاضی میں دیدہ ور، بہترین خطاط، اعلیٰ درجہ کے خیاط، ضرورت پڑنے پر نہایت عمدہ خانساماں، چاق و چوبند، متواضع، بے تکلف باوقار، مجسمۂ اخلاق، پیکر مروت ہر شئے میں نظم و ترتیب پسند فرماتے، اپنا کام خود کرتے اور گھر کا کام بھی، سلامتِ فکر صفاء ذھن، غیبت سے حذر، بیہودہ گوئی سے اجتناب، آپ کے خصوصی امتیازات تھے۔ جوانی میں امام ربانی حضرت گنگوہی م ۱۳۲۳ سے بیعت کی اور اصلاح حال میں صدق و عفاف اور نفع بخش اعمال سے دلچسپی لی۔ مسلمان بچوں کے لئے دلی کی ٹکسالی زبان میں "تعلیم الاسلام" چار حصوں میں مرتب فرمائی۔ جس کے سینکڑوں ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں تصنیف و

تالیف سے گو شغل نہیں رکھا مگر صلاحیت بدرجۂ اتم تھی۔ آپ کے فتاویٰ کا گراں قدر مجموعہ اس کا شاہد عدل ہے۔ آپ کے خلف الصدق مولوی حفیظ الرحمٰن واصف نے "کفایت المفتی" کے نام سے نو جلدوں میں مرتب کر کے شائع کر دیا۔ فجزاہ اللہ خیر الجزاء ۱۳ر ۴ر ۱۳۷۲ھ مطابق ۳۱ ر دسمبر ۱۹۵۲ء و یکم جنوری ۱۹۵۳ء کی درمیانی شب پنجشنبہ کو ½-۱۰ بجے وفات پائی۔ بارش اور سردی کے باوجود تقریباً ایک لاکھ فرزندانِ توحید نے آپ کی نمازِ جنازہ پڑھی۔ اور قطب صاحبؒ کے جوار میں لگ بھگ دس ہزار افراد نے آپ کی تدفین میں حصہ لیا[1]۔

بال کھولے تری تربت پہ قضا روئے گی

میوات کے اکثر مولوی آپ کے شاگرد یا شاگردوں کے شاگرد ہیں۔ رحمہ اللہ وادخلہ فی جنات النعیم۔

قدوۃ المحدثین مولانا حافظ محمد ضیاء الحق دیوبندی قدس سرہ ۱۳۷۳ھ

آپ مولانا سراج الحقؒ کے فرزند تھے۔ محلہ ابوالمعالی دیوبند کے باشندے اور ایک معزز خاندان کے فردِ فرید تھے۔ ۱۲۹۰ھ میں پیدا ہوئے۔ ۱۳۱۹ھ میں مفتی اعظم محمد کفایت اللہؒ کے ساتھ ہی دارالعلوم سے فارغ ہوئے۔ مگر ایک سال اور دارالعلوم میں مزید کتابیں پڑھیں۔ مولانا امین الدینؒ نے جب مدرسہ امینیہ کھولا ۱۳۱۵ھ، تو آپ کو بھی دیوبند سے بلا لیا اور مدرس دوم مقرر کیا۔ اپنی فراغتِ تعلیم اور بنائے مدرسہ کے بعد سے وفات تک مسلسل اٹھاون سال آپ نے مدرسہ کی خدمت کی۔ اوّل یوم سے ہی مدرسے کے دارالاقامہ میں قیام پذیر رہے اور وفات بھی یہیں پائی۔ بہت خوش اخلاق، ملنسار، مرتاض، اور

(۱) نزہۃ الخواطر ۸ر ۳۷۷–۳۷۸ و مفتی اعظم کی یادگار۔

خوش پوش تھے۔ کپڑے ہمیشہ صاف ستھرے زیب تن فرماتے تھے۔ روزانہ کا معمول نماز عصر کے بعد حوض پر بیٹھ کر مغرب تک تلاوت میں مشغول رہتے، تہجد گزار اور ذاکر و شاغل تھے۔ آپ کے والد حضرت گنگوہیؒ کے خلیفہ تھے اور آپ اپنے والد سے مجاز تھے۔ مگر آپ نے کسی کو بیعت نہیں کیا اور اجازتِ سلوک کو بھی پوشیدہ رکھا۔ فرماتے تھے۔ ہند میں بڑے بڑے محدث ہوئے، مگر اتنی طویل مدت، چھپن سال، کسی نے حدیث نہیں پڑھائی۔ جس قدر خدائے کریم نے فقیر کو توفیق بخشی۔ عربیت پر زبردست عبور تھا۔ حدیث کی قرأت جملہ بندی اور پیرابندی کے ساتھ اس طرح فرماتے کہ فہم حدیث سہل ہو جاتا۔ راقم کو آپ سے شرفِ تلمذ حاصل ہے، اور میرے اساتذہ بھی آپ کے شاگرد ہیں۔ میوات کے اکثر فضلاء آپ سے نسبت تلمذ رکھتے ہیں۔ یکم شعبان ۱۳۷۳ھ بوقت ½-۹ بجے شب وفات پائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ خواجہ باقی باللہؒ کے مزار کے قریب مدفون ہوئے[1]۔

انار اللہ برھانہ وجعل الجنۃ مثواہ

[1] تذکرہ مدرسہ امینیہ ص ۲۸ و ۳۰ مختصراً۔

حضرت مولانا عبدالسبحان نوراللہ مرقدہٗ

بانی مدرسہ سبحانیہ دھلی

بیسویں صدی میں میوٗ قوم کو دینی علوم و معارف سے آراستہ کرنے میں حضرت مولانا عبدالسبحان صاحب نوراللہ مرقدہ کی مساعی کو بہت بڑا دخل ہے۔ آپ انیسویں صدی کے نصف آخر کے درمیانی عرصہ (۱۸۷۷ء) میں میوات کے ایک مردم خیز گاؤں موضع ناٹولی میں پیدا ہوئے، جو ڈیمروت پال کے مشہور گاؤں موضع "آلی میوٗ" کا ایک ٹکڑا ہے۔ ولد المعارف والتقی مصاحباً۔[1]

یہ ہوتا ہے مگر کم دشت میں وہ گل نمایاں ہو   کہ جس کے مسکرانے میں حیات قوم پنہاں ہو

آپ کا خاندان اپنی بستی میں باعزت سمجھا جاتا تھا۔ دینی و مذہبی حیثیت سے بھی پوری آبادی میں ممتاز تھا چنانچہ جب کبھی پنجاب کے اہل علم اور درویشوں کا کوئی قافلہ آپ کے گاؤں میں وارد ہوتا تو عموماً اس کی میزبانی کا شرف اسی خاندان کو حاصل ہوتا تھا۔ بچپن میں آپ نے گایوں اور بکریوں کی گلہ بانی کی جیسا کہ میوٗ قوم میں قدیم دور سے رواج چلا آرہا ہے، صحت و توانائی فطرت کی طرف سے آپ کو بہت عمدہ اور زیادہ مقدار میں ملی۔ پہلوانی بھی آپ کے عہد طفولیت کا پسندیدہ مشغلہ تھا، اس لحاظ سے آپ پوری بستی کے لئے باعث فخر تھے۔ یہ سب کچھ تھا مگر آپ اس پر قانع نہ تھے، دل میں کچھ اور ارمان تھے، امنگیں تھیں، جو ماحول پر چھائی ہوئی

---

[1] افادات مولوی عبدالمنان خلف حضرت صاحبؒ الخ۔ دھلی آنیکا قصہ بھی موصوف نے بتلایا ہے

بے خبری و بے علمی کے باعث گو واضح شکل میں آپ کے سامنے نہ آسکی مگر دل میں آپ خلش سی محسوس فرماتے ـــ اور کچھ کرنے کے جذبے کے باوجود کچھ نہ کر سکتے تھے ـــ ادھر یہ کشمکش تھی اندرونی ـــ بیرونی طور پر آپ کی بستی میں جب کوئی وعظ و تقریر کی محفل ہوتی تو آپ اس میں ضرور شریک ہوتے اور اس میں کچھ اس طرح منہمک ہوتے کہ اپنے ماحول سے باہر بلکہ کچھ فاصلہ پر بھی محفل وعظ و تقریر میں آپ نے اپنی شرکت کو ضروری سمجھ لیا۔

میوات کے کچھ طلبہ دھلی میں مسجد بنگلہ والی، مدرسہ حسین بخش اور مدرسہ امینیہ اور کچھ مسجدوں میں قائم مکتبوں میں پڑھتے تھے۔ عید بقرعید اور رمضان المبارک کی تعطیلات میں وہ گھر ضرور آتے، صاف ستھرے ہوتے تھے۔ ایسے افراد بھی آپ کی بستی آتے جاتے، آپ انھیں دیکھتے اور کچھ سوچتے۔ آخر اندرونی کشمکش وعظ و تقریر کی محفل اور دلّی کے طالب علموں کی ملاقات، اور کچھ اسی قسم کے دوسرے عوامل نے آپ کے دل میں یہ بات واضح صورت میں ڈالی کہ دلّی چلو اور علم حاصل کرو ـــ خدا کا نام لے کر آپ نے علم کی خاطر گھر چھوڑ دیا، دلّی آئے اور بستی حضرت نظام الدین اولیاء کی مسجد بنگلے والی میں حضرت مولانا محمد کاندھلویؒ کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا۔ محنت و مشقت، شوق و جذب اور مسلسل تگ و دو نے آپ کو مولانا مرحوم کا عزیز ترین شاگرد بنا دیا ـــ اہل بستی کو آپ کی گمشدگی بہت کھلی اور وہ آپ کی تلاش کرتے کرتے دھلی پہنچ گئے، مسجد بنگلہ والی میں حضرت مولانا محمدؒ ملے ـــ اور اپنی روداد سنائی۔ آنے کا مقصد بیان کیا ـــ ایک غلط فکر و خیال پہلے بھی شائع و ذائع تھا اور آج بھی جاری و ساری ہے کہ غریب طبقہ کے بچے علوم عربی و فارسی پڑھتے ہیں۔ کھاتے پیتے گھرانوں کو اس کی ضرورت نہیں۔ چونکہ آپ کا گھر بھی آسودہ تھا اس بنا پر بستی کے وفد نے

اپنے مقصد کے ضمن میں یہ بھی کہا کہ اسے یہ پڑھنے کی ضرورت نہیں ان کے گھر میں موج ہے، خدا کا دیا سب کچھ ہے۔ مولانا محمدؒ نے فرمایا: پوچھ لو ان سے اگر یہ جانا چاہے تو کون روک سکتا ہے؟؟

مگر آپ کے دل میں علم کا شوق پیدا ہو چکا تھا، مولانا محمد ابراہیم دہلویؒ کے وعظ نے آپ کو علوم اسلامی کا دلدادہ و شیدا بنا دیا تھا، بستی کے وفد کو آپ نے انکار میں جواب دیا اور وہ مایوس ہو کر لوٹ آیا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ حاجی عبدالرحمٰن مرحوم جن کے ہاتھ پر بہت سے غیر مسلم ایمان لائے تھے۔ وہ بھی آپ کے دہلی پہنچنے کے سبب یا معاون و مددگار بنے تھے، بہر حال آپ انیس سال کی عمر میں دہلی آئے، اور مولانا محمدؒ صاحب کے یہاں قرآن کریم پڑھا، آٹھ نو پارے حفظ بھی کئے مگر پورا قرآن مجید حفظ نہ کر سکے، پھر اردو دینیات، فارسی اور ابتدائی عربی مولانا محمدؒ صاحب ہی سے پڑھی۔ فارسی کا متداول نصاب گلستان، بوستان اور اخلاق محسنی تک ہوتا تھا۔ آپ کی خواہش تھی کہ فارسی میں کمال حاصل کیا جائے۔ چنانچہ فارسی کا اعلیٰ نصاب آپ نے مولوی سکندر الدین صاحب سے پڑھا، اور فارسی میں اتنی استعداد و مہارت پیدا کر لی کہ اس کی اجنبیت ختم ہو گئی۔ اور وہ مادری زبان جیسی ہو گئی۔ ابتدائی عربی آپ مولانا محمد صاحبؒ کے پاس پڑھ چکے تھے، باقی عربی کی درمیانی و اعلیٰ تعلیم کی خاطر آپ نے مدرسہ اسلامیہ امینیہ میں داخلہ لیا۔

حدیث و فقہ ہندوستان کے مشہور و مسلم استاذ محقق حضرت مولانا محمد ضیاء الحق محدث دیوبندی م ۱۳۷۳ھ اور مفتی اعظم ہند حضرت مولانا محمد کفایت اللہ م ۱۳۷۲ھ قدس سرہما سے حاصل کیا۔

آپ کے مزاج میں نقص و ناتمامی کے لئے کوئی لچک نہیں تھی ہر شے میں اتمام و کمال آپ کے پیش نظر تھا۔ آپ کے طالب علمی کے دور میں منطق و فلسفہ

اسلامی علوم و فنون میں مہارت و بصیرت کے لئے لازمی عنصر تھا ـــ سقوط بغداد ۶۵۶ھ کے بعد علماء اسلام کی تصنیفات عموماً اسی رنگ میں ہیں ان سے استفادہ کے لئے بھی فلسفہ و منطق ضروری تھی اور اب بھی ہے۔ درس نظامی میں عام طور پر اسی قسم کی کتابیں رکھی گئی ہیں۔

منطق و فلسفہ کے اعلیٰ نصاب کی تکمیل آپ نے مولوی سکندر علی ہزارویؒ سے کی، جو علامہ عبدالحق خیرآبادی کے شاگرد اور خیرآبادی اسکول کے ممتاز اور دہلی میں مثالی نمائندے تھے، مولوی انتظار احمد، مولوی جمال الدین اور مولوی عبدالغنی رحمہم اللہ بھی آپ کے فاضل اساتذہ میں ہیں۔ حکیم جمیل الدین صاحبؒ۔ والد ماجد حکیم محمد اسماعیل و حکیم عبدالجلیل دہلوی سے حکمت و طبابت حاصل کی، جو مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاںؒ کے استاذ تھے، اس طرح آپ نے علم الادیان اور علم الابدان دونوں کو محنت و مشقت جد و جہد اور مسلسل مساعی سے حاصل کیا اور دونوں میں رسوخ و کمال پیدا کیا۔

دوران تعلیم ہی آپ نے اپنے مستقبل کے نظام قوم کی تنظیم بذریعہ تعلیم کا ابتدائی فارمولا تیار کر لیا تھا۔ ایک مسجد میں آپ امامت کے فرائض انجام دیتے تھے وہیں میوات کے کچھ طالب علم اپنے پاس رکھ لئے۔ صبح خود پڑھتے اور شام میں ان طلبہ کو پڑھاتے۔ آپ کی شریک حیات بڑی باہمت اور ایثار پیشہ خاتون تھی کتابوں کی خرید و طلبہ کی دیگر حوائج ضروریہ کے لئے اپنے زیورات آپ کے حوالے کر دیئے سے

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر ہمسفر آتے رہے اور کارواں بنتا گیا

اس طرح آپ نے۔ قوم کی تنظیم بذریعہ تعلیم کے لئے ایک دینی ادارہ کی بنیاد رکھی جس کا نام مدرسہ "زینت العلوم" تھا۔ مگر آپ کے اسم گرامی قدر کے باعث۔ مدرسہ سبحانیہ۔ کے نام سے مشہور ہو گیا۔ اولاً وہ مسجد نواب والی ...

قریش نگر میں قائم ہوا۔ یہاں کے حالات جب ناموافق ہو گئے تو کوٹھی[1] متصل کھجور روڈ قرولباغ میں گیا، پھر رشیدی پورہ پھر درونغہ والی مسجد کے قریب ایک کوٹھی میں اقامت گزیں ہوا، جہاں مدرسہ صولتیہ، اور ندوۃ المصنفین دہلی کے دفاتر تھے بسے ۱۹۴۷ء تک مدرسہ اسی مکان میں رہا ـــــ مگر ۱۹۴۷ء کے ہنگامۂ قیامت آفریں کی وجہ سے جب قرول باغ مسلم آبادی سے خالی ہوگیا۔ ادھر قریش نگر کی قریشی برادری کو اپنی کوتاہی کا احساس ہوا کہ۔ یہ خیر کثیر۔ اپنے یہاں سے کیوں جانے دی۔؟ اور پھر ان کے مسلسل اصرار پر مدرسہ اپنی اولین قیام گاہ، مسجد نواب والی قریش نگر میں آگیا۔ قرول باغ سے اٹھ کر مسجد نواب والی میں قیام سے پہلے کچھ دن مدرسہ مسجد کلو والی میں رہا جو قریش نگر کی مشہور مسجد ہے اور نواب والی مسجد سے قریب ہے[2]۔

آپ کی پوری زندگی اس مدرسہ کی تربیت و تعلیم اور دیکھ ریکھ میں بسر ہوئی تقریباً پچاس سال تک اسلامی آداب و اخلاق و فنون اور شرعی علوم کی گراں بہا خدمات انجام دے کر اپنے مولیٰ سے جا ملے رحمہ اللہ ۱۹۵۷ء۔

خصائل و عادات حضرت مولانا عبدالسبحان رحمہ اللہ بڑے باکمال فاضل، خلیق، بامروت، احسان شناس اور زاہد و پاکباز انسان تھے۔ نہایت شرمیلے، باحیاء اور خلوت پسند تھے، اس قدر کام اپنے ذمہ لے رکھے تھے کہ ان کی انجام دہی سے وقت بہت کم بچتا تھا، اسی باعث ملاقات کا کوئی معمول نہ تھا، مگر جب کسی سے ملاقات فرماتے تو نہایت بشاشت و خوش خلقی کے ساتھ، علمی اور دینی مہمانوں کے لئے

---

[1] کوٹھی بنگلہ کے معنی میں نہیں بلکہ ایک مکان کا نام تھا اسی سے مشہور ہوگیا۔

[2] روایت مولوی اسمٰعیل سابق امام مسجد ہذا وحال امام و خطیب مسجد گھنٹہ والی قریش نگر دہلی ۶-۱۱-۰۰

دل و دماغ کے پٹ ہمیشہ کھلے رکھتے، عفت و پاکدامنی کے حسین پیکر تھے، عموماً استغراق کی سی کیفیت رہتی تھی، عجیب "باہمہ و بے ہمہ" صفت انسان تھے۔ پروردگار نے نرالے ڈھنگ سے فضل و کمال کی دولت سے نوازا تھا ـــــ بڑے ناز و نعم میں پلے تھے، مگر طالب علمی جب اختیار کرلی تو محنت و مشقت، جد و جہد، اور صبر و قناعت جیسے طالب علمانہ ضروری اوصاف کے ایسے خوگر ہوئے کہ معلوم ہوتا تھا اسی ماحول میں پرورش پائی ہے حالانکہ دیہات میں رہنے کے باوجود آپ اس قسم کے امور کے قطعاً عادی نہ تھے۔ جب بستی حضرت نظام الدین رحمہ اللہ میں حضرت مولانا محمد رحمہ اللہ کے پاس پڑھتے تھے وہ وقت مدارس اسلامیہ کے لئے بڑا جانگسل تھا، کئی کئی وقت کے فاقے ہوتے، درختوں کے گیلے سوکھے پتے چبا چبا کر پیٹ بھرنا ہوتا تھا۔ دلی کا کوئی صاحب خیر اگر کچھ آٹا یا غلہ مدرسہ میں دینا چاہتا تو یہی بھوکے پیاسے طالب علم کمر پر لاد کر پرانی دلی سے بستی حضرت نظام الدین لاتے تھے، آپ چونکہ پہلوان تھے، کسرتی بدن تھا، قصاب پورہ صدر بازار سے آٹے یا غلے کی بوری کمر پر لادتے اور راہ میں آرام کئے بغیر مدرسہ میں لاکر ڈال دیتے۔ استاد کی خدمت بھی طالب علمی کا ضروری عنصر ہے اس میں آپ نے وہ لازوال آثار چھوڑے ہیں جن سے صرف نظر تو ممکن ہے مگر انھیں بھلایا نہیں جا سکتا۔ حضرت مولانا محمد رحمہ اللہ کا جب وصال ہوا تو اس حال میں کہ آپ پوری طرح اپنے اس عزیز شاگرد کی گود میں تھے کس قدر استوار تھا یہ رشتۂ استادی و شاگردی؟ جبھی تو علم میں برکت ہوتی تھی۔ آپ کے ایک اور استاذ تھے، حضرت مولانا حافظ محمد ضیاء الحق عثمانی دیوبندی قدس سرہ ـــــ ہندوستان میں حدیث نبوی کے طویل المیعاد استاذ، تقریباً پچپن سال درس حدیث دیا تھا ـــــ ایک دفعہ انھوں نے اپنے اس شاگرد سے گھی خریدا ایک روپیہ کا ایک سیر اور یہ بھی فرمایا: مولوی عبدالسبحان ہم آئندہ ایک روپیہ فی سیر ہی

ہی خریدیں گے" - آپ نے عرض کیا "بہت بہتر" - بعد میں گھی کے دام بڑھے - بڑھتے بڑھتے تین - پھر چار اور بعد میں پانچ اور سات روپیہ تک فی سیر کا بھاؤ ہو گیا مگر آپ نے استاذ محترم کو ایک روپیہ فی سیر ہی کے حساب سے دیا - مرتے دم تک اسے نبھایا[1] اساتذہ کی خدمت اور پھر اس پر انبساط و اہتزاز یہ ہے کمال - مجال ہے جو کبھی ماتھے پر شکن پڑی ہو - بڑوں کی خدمت کر کے گویا آپ کو دولت کونین مل جایا کرتی تھی -

دینی و مذہبی زندگی کے تانے بانے صحبت اہل اللہ اور باکمال دل والوں کی ہم نشینی و ہمہ وقت ان کی خدمت میں حاضر باشی سے بنتے ہیں - آپ کو اساتذہ ایک سے ایک بڑھ کر میسر آئے اور آپ طالب علمی کی جملہ ضروریات سے آراستہ و پیراستہ تھے - علم و فن سے آپ کو کس قدر لگاؤ تھا اور کس طرح اس راہ میں سراپا ایثار بنے رہتے اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب آپ نے فارسی کا اعلیٰ نصاب حاصل کرنا چاہا تو فارسی کے ایک استاذ کی خدمت میں حاضر ہوئے - غالباً سکندر نامۂ نظامی پڑھنا تھا - اس دانشور نے یہ شرط رکھی کہ مولوی صاحب سے ایک شعر سمجھانے کے پانچ روپے وصول کروں گا - وہ شاید اہل زمانہ کی کور مذاقی سے تنگ آ گئے تھے - یا محض امتحان لینا مقصود تھا - بہر حال جب یہ بات مولوی صاحب کے کانوں میں پڑی تو آپ کو قدرے حیرانی ضرور ہوئی کہ آپ کی جیب تنگ تھی اور اس کی اجازت نہ دیتی تھی مگر حصول علم کے لئے شوق بے پایاں نے آپ کو فی شعر پانچ روپے دینے پر آمادہ کر لیا اور آپ نے حامی بھر لی: "ضرور جو کچھ آپ ارشاد فرمائیں بسر و چشم منظور"[2] وہ دانشور بھی چند سکوں میں اپنی دانشوری فروخت کرنا نہیں چاہتے تھے - بڑی محنت و مشقت، جد و جہد اور مسلسل مساعی سے

[1] روایت مولوی عبدالستار صاحب مدرسہ حافظ الاسلام قصبہ فیروز پور جھرکہ

[2] روایت مولوی محمد الیاس کوٹوی خویش حضرت مولانا مرحوم -

آپ نے علم حاصل کیا ــــ علم کے لئے اپنا سب کچھ جب آپ نے قربان کر دیا تو علم نے بھی اپنی نورانی شعاعوں سے آپ کو ڈھانپ لیا - قرآن کریم سے آپ کو عشق تھا بڑے والہانہ انداز میں تلاوت فرماتے تھے، سماں بندھ جاتا تھا، جھومتے جاتے، جہاں ذکر عذاب ہوتا تو جھومنا بند، پھر روتے تھے اور روتے روتے تلاوت کرتے رہتے - مگر صرف جھومنا نمایاں ہوتا، خوشی و غم کے اثرات عموماً محسوس نہیں کئے جاتے تھے - جب آپ تلاوت فرماتے تو آپ کی نشست سے آسمان تک نورانی شعاعوں کی لہر سی دوڑ جاتی - اہل دل محسوس کرتے تھے - " ایک مرتبہ ایک آوارہ لڑکا آپ سے کبھی سیدھے منہ بات نہیں کرتا تھا اور نمازیوں کو بھی تنگ کرتا تھا، وہ کہیں باہر سے آیا اور مسجد کی چھت پر چڑھ گیا، آپ صحن مسجد میں تلاوت فرما رہے تھے اس کی نگاہ جوں ہی آپ پر پڑی آپ کے سر سے آسمان تک اسے نور کا مینار نظر آیا، فوراً نیچے اتر کر آپ کے پیروں میں گرا اور معافی مانگی اور آئندہ کے لیے بے راہ روی سے باز آیا[1]

آپ نے طلبہ کو کبھی اپنا غلام و مزدور بنا کر نہیں رکھا - کوئی کام کسی سے نہ لیتے - پڑھنا، مطالعہ و درس میں لگا رہنا اور فرصت کے اوقات میں کچھ ورزشی کھیل کھیلنا، یہ تھا آپ کے مدرسہ کے طلباء کا پروگرام - مدرسہ سبحانیہ اوّلاً مسجد نواب والی قریش نگر میں آپ نے جاری فرمایا تھا، آپ اس مسجد کے امام بھی تھے اور اپنے جاری کردہ مدرسہ کے مدرس، منتظم اور مہتمم و سرپرست بھی - مسجد کے شمال مشرق کے کونے میں نیچے کنواں ہے - مسجد زمین سے دس بارہ فٹ کی بلندی پر ہے - اس کنویں سے مسجد کا حمام بھرا جاتا تھا، طلبہ کی باری لگی

[1] روایت مولوی ذاکر علی نبیرۂ حکیم مولوی عبدالسلام مرحوم -

ہوئی تھی، مگر باری والے طلبہ جب دیکھتے حمام بھرا ملتا۔ روزانہ دیکھتے دیکھتے انھیں ٹوہ ہوئی کہ اس کا پتہ لگائیں، ان کا خیال تھا کہ جن بھرتے ہیں، ادھر کشمکش تھی اور حقیقت یہ تھی کہ آپ اپنی اہلیہ محترمہ کو جگا کر، ایسے وقت جبکہ تمام لڑکے سو چکے ہوتے کنویں سے حمام بھر دیتے اور طلبہ کو اس لئے پتہ نہیں چلتا تھا کہ آپ طلبہ کے سونے کا صحیح طور پر اطمینان کر لینے کے بعد اپنا عمل شروع فرماتے۔ طلبہ نے جب زیادہ توجہ سے یہ مسئلہ حل کرنا چاہا تو ایک دن انھوں نے دیکھ لیا کہ ان کے استاذ محترم اور ان کی اہلیہ واجب التکریم یہ کام کرتے ہیں، جن وغیرہ کا شبہ بے بنیاد ہے۔ طلبہ نے جب شکایت کی، تو آپ نے فرمایا کہ مسجد سے نو روپے مجھے ملتے ہیں۔ یہ میرا فرض ہے کہ مسجد سے متعلق ہر کام میں کروں، تم لوگ پڑھنے آئے ہو، محنت سے پڑھو اور بس۔[1]

ہمدردی و خیر خواہی آپ کے خمیر میں اس طرح رچ بس گئی کہ ارادہ کر کے بھی آپ اس سے الگ نہیں ہو سکتے تھے۔ آپ کی خواہش تھی اور دل و جان سے یہ چاہتے تھے کہ آپ کی قوم زیور علم سے آراستہ ہو، قوم کا جوہر قابل ضائع نہ ہو۔ جب کوئی ہونہار بچہ آپ کی نگاہ میں آجاتا تو آپ اس کے اٹھانے کی فکر فرماتے، اکثر کامیاب ہو جاتے، بصورت دیگر بڑے درد سے فرماتے: "اچھا بچہ ہے، باصلاحیت ہے، ویسے ہی ضائع ہو گا"۔[2]

اجرائے مدرسہ کے کچھ مدت بعد محلہ کی قریش برادری اور آپ کے درمیان کسی وجہ سے ٹھن گئی، محلہ والوں کو اپنی جگہ پر گھمنڈ تھا، آپ کبیدہ خاطر ہو کر مدرسہ کو مسجد نواب والی سے اٹھا کر رشیدی پورہ لے گئے۔ خدا کی شان کہ اس کے بعد محلہ میں

[1] روایت مولوی ذاکر علی نبیرہ حکیم مولوی عبد السلام

[2] روایت مولوی محمد الیاس کوٹوی قصبہ پرنا بانہ

خارش کی وبا پھیل گئی، عورت، مرد، جوان بوڑھے سب اس مرض میں مبتلا ہو گئے حد یہ کہ نومولود بچے بھی اس وبا کے شکار ہو گئے، بالآخر آپ سے معافی مانگ کر وہ لوگ اس وبا سے چھٹکارا پا سکے۔[1] یہ کوئی آپ کی بددعا کا اثر نہ تھا، آپ تو بددعا کبھی نہیں کرتے تھے، بلکہ یہ آپ کے تعلق باللہ کا ہلکا سا اظہار تھا: اللہ تعالیٰ کو آپ کی کبیدگی پر جوش آیا اور وجہ کبیدگی مورد عتاب بن گئی (اعاذنا اللہ منہ) من کان للہ کان اللہ لہ۔

عصر کے بعد آپ کو چہل قدمی کی عادت تھی نواب والی مسجد سے نکل کر آپ سیدھے پہاڑ گنج کی طرف نکل جاتے۔ طلبہ کو خیال ہوا۔ مولانا روزانہ کہاں جاتے ہیں ذرا اس کا پتہ لگائیں۔ کچھ طلبہ ایک دن آپ کے پیچھے چل دئے۔ مگر اس طرح کہ آپ انھیں نہ دیکھ سکیں۔ آپ چلتے چلتے بھولی بھٹیاری[2] کے محلوں میں چلے گئے طلبہ نے دیکھا کہ آپ کے اندر جانے کے بعد ایک شیر آیا اور دروازہ پر آکر بیٹھ گیا۔ جب آپ وہاں سے نکلے تو شیر نے آپ کا پیر چوما اور گردن جھکا کر ایک طرف ہو لیا۔ آپ واپس مسجد تشریف لے آئے۔ طلبہ یہ منظر دیکھ کر بہت گھبرائے مگر بعد میں انھیں اطمینان ہو گیا۔[3]

شان استغنا اور بے نیازی

مدرسہ جب قرول باغ میں تھا اس وقت کا ذکر ہے کہ مدرسہ میں سبق ہو رہے تھے، اساتذہ و طلبہ پڑھنے میں مشغول تھے کہ ایک تیز

[1] روایت مولوی ذاکر علی نبیرہ حکیم مولوی عبد السلامؒ

[2] کچھ لوگوں سے راقم نے سنا ہے کہ اصل میں مکانات خواجہ بو علی بختیاریؒ کے ہیں عوام کی زبان پر بو علی بختیاری، بھولی بھٹیاری بن گیا۔ واللہ اعلم۔

[3] روایت مولوی محمد ذاکر نبیرۂ حکیم مولوی عبد السلامؒ

رفتار کار مدرسہ کے برابر اچانک رکی، بریک کی آواز بہت زوردار ہوئی، مدرسہ ایک مکان میں تھا، بظاہر اس میں مدرسہ کے نشانات نہ تھے البتہ مدرسہ کا بورڈ لگا ہوا تھا بورڈ دیکھ کر ہی کار رکی تھی۔ ایک آدمی کار میں سے اترا اور ایک مدرس کے پاس آ کر کچھ اس قسم کے سوالات کئے، یہ مدرسہ ہے؟ جی ہاں۔ کتنے طلبہ ہیں؟ ڈیڑھ سو، آمد کیا ہے؟ پندرہ روپے ۔ مجتبائی والے دیتے تھے ۔ مکان اپنا ہے یا کرایہ کا؟ کرایہ پر ہے اور پینتیس[۳۵] روپے ماہانہ کرایہ ہے۔ پھر اتنے بچوں کو کہاں سے کھلاتے ہو؟ بس یوں ہی جہاں تہاں سے کچھ آجاتا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ اس قدر خرچہ آپ کس طرح پورا کرتے ہیں؟ وہ مدرس بولا: یہ سوال مجھ سے نہ کیجئے وہ سامنے جو صاحب تشریف فرما ہیں وہ ان سوالات کے جواب آپ کو مرحمت فرمائیں گے۔

آپ اس وقت کرتہ نکالے ہوئے بیٹھے تھے، اس مدرس نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا: حضرت یہ صاحب کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں، وہ صاحب بولے: جناب میں چاہتا ہوں کہ ہر ہفتہ آپ کے مدرسہ میں دو بوری آٹا بھیج دیا کروں۔ آپ نے فرمایا: ہمارے پاس اتنا وقت کہاں ہے کہ آپ کے گھر جا کر بوریاں لائیں اور پھر ہر ہفتہ۔ اس نے کہا: اس کا بندوبست میں خود کروں گا چنانچہ اس کا نام و پتہ کچھ معلوم نہیں اور یہ بھی پتہ نہیں کہ وہ اب زندہ ہے، مگر اس نے بندوبست ایسا کیا کہ ۱۹۴۷ء تک برابر، مدتوں، ہر ہفتہ دو بوری آٹا مدرسہ آتا رہا۔[۱] یہ تھی شان بے نیازی اور یہ تھا اس کا ثمرۂ شیریں؛ اس سے بھی زیادہ توکل و اعتماد علی اللہ کی جھلک اس واقعہ میں نمایاں ہوتی ہے کہ یہی صاحب خیر

---

[۱] روایت مولوی عبدالستار صاحب مدرسہ حافظ الاسلام قصبہ فیروز پور جھرکہ۔

مدرسہ کے لئے علیحدہ سے کوئی زمین خرید کر دینا چاہتے تھے تاکہ مدرسہ کی مستقل عمارت ہو اور کسی کا عمل دخل اس میں نہ ہو۔ ایک قطعہ زمین دیکھا اور پھر آپ سے عرض کیا گیا کہ آپ اسے ملاحظہ فرمالیں۔ مگر کہا کچھ اس طرح کہ اس میں آپ نے بوئے برتری محسوس کی۔ آپ نے جواب میں فرمایا: میرے پاس وقت نہیں اور نہ مجھے ایسی جگہ کی ضرورت ہے۔ خداوند کریم کی ذات ایسی ہے کہ اگر میں پہاڑ میں جا کر بیٹھ جاؤں تو وہاں بھی مدرسہ بن جائے گا۔[۱] یہ بات جوش میں آپ نے فرمادی ورنہ اس طرح کی باتوں سے عموماً آپ حذر فرماتے تھے۔

سادگی کو آپ پسند فرماتے تھے، سیدھا سادہ کھانا اور لباس استعمال فرماتے، طلبہ کے کپڑے خود کاٹتے تھے اور مشین سے سلواتے تھے مگر اپنا کرتہ یا خود آپ ہی سیتے یا کسی طالب علم سے سلواتے، کپڑوں کا کوئی صندوق نہ تھا، ایک کپڑے میں تہ کر کے اپنے مستعمل کپڑوں کی گٹھری بنا لیتے تھے، کپڑے پاک صاف رکھنے کے عادی تھے مزاج میں نفاست بہت تھی۔[۲] آپ کا پسینہ خوشبودار ہوتا تھا، کبھی آپ کے پسینہ میں بدبو محسوس نہ ہوئی۔[۳] چائے کی عادت نہ تھی، صبح تلاوت قرآن کریم کے بعد درس میں لگ جاتے اور شام تک مختلف کتب کا درس دیتے۔[۴]

آپ نے اپنے مدرسہ میں علوم عالیہ کی تدریس کا کبھی اہتمام نہیں کیا۔ اس لئے

---

[۱] روایت مولوی محمد اسحٰق استاذ حدیث جامعہ رحیمیہ درگاہ شاہ ولی اللہ، دہلی۔
[۲] روایت مولوی سراج الدین موضع گلدستہ تحصیل فیروز پور جھرکہ۔
[۳] روایت... مطابق [۱]
[۴] روایت .... مطابق [۲]

کہ اس کے واسطے دہلی، دیوبند، سہارنپور وغیرہ میں اکابر سلفؒ کی یادگار بڑی بڑی درسگاہیں تھیں اور وہاں علوم عالیہ کا بہترین انتظام تھا۔ آپ نے علوم آلیہ۔ قواعد صرف و نحو، معانی و بیان۔ فصاحت و بلاغت، منطق و فلسفہ، ادب و لغت، اصول فقہ وغیرہ کی تعلیم کا بندوبست کیا اور اس میں درجۂ کمال حاصل کیا۔ آپ کے پڑھانے کا انداز بہت دلچسپ، نہایت دلکش، اور آسان ہوتا تھا، مشکل سے مشکل مضامین کو اس قدر تسہیل کے ساتھ پڑھاتے تھے کہ کم ذہن طالب علم بھی پالیتا تھا۔ فنی کتابوں پر آپ کو ماہرانہ عبور تھا۔ درس ہمیشہ مادری زبان میں دیتے تھے۔ علوم آلیہ سے طلبہ کی ذہنی استعداد کو پختہ بنایا جاتا ہے تاکہ علوم عالیہ میں وہ ماہر ہو جائیں۔ علوم عالیہ میں وہ دقت پسندی بھی نہیں جو علوم آلیہ میں ہوتی ہے۔ فقہ بھی علوم عالیہ میں ہے کیونکہ یہ قرآن و حدیث کا عطر ہوتا ہے اور حقیقت میں مقصد تعلیم بھی یہی ہے کہ پڑھو اور عمل کرو۔

منطق و فلسفہ کا درس آپ کے یہاں کا مشہور تھا اور صرف و نحو کی تعلیم بھی بڑے ٹھوس طریقہ پر ہوتی تھی۔ ایک دفعہ مدرسہ کاشف العلوم مسجد بنگلہ والی بستی حضرت نظام الدین اولیاءؒ میں کسی وجہ سے آپ کا قیام ایک مہینہ کا ہو گیا تھا۔ مولانا محمد احتشام الحسن کاندھلوی مرحوم وغیرہ کو اسی عرصہ میں کنز الدقائق۔ فقہ حنفی کی مشہور کتاب کو پڑھا دیا۔ خود آپ ہی فرماتے تھے کہ اس میں محنت کی ضرورت تو تھی نہیں وہ پڑھتے گئے اور میں پڑھاتا گیا عقائد و کلام کے مباحث بڑی خوش اسلوبی سے سمجھاتے تھے۔ ادب و شعر کو پڑھانے کا انداز بھی آپ کا انوکھا تھا۔ تنقیدی بصیرت کے ساتھ تحلیل و تجزیہ بھی فرماتے اور پھر دوسری زبان کے ادب سے موازنہ کر کے سمجھاتے تھے کہ انسانی فطرت، اس کے جذبات و میلانات، عواطف و رجحانات، افکار و خیالات اور اس کی تخلیقی صلاحیت میں کس قدر یکسانیت ہوتی ہے صرف لغت و زبان کا فرق ہے، ادب کا اس طرح تقابلی مطالعہ جہاں معلم کی ذہانت و طباعی اور فضل و کمال کا مظہر ہے وہاں طلبہ کی استعداد

و ذہنی و دماغی تربیت کے لئے بھی نہایت مفید و کار آمد ہے۔

سکندر نامۂ نظامی فارسی کی مشہور رزمیہ مثنوی ہے۔ اور مہا بھارت ہندوستانی سورماؤں کی معرکہ آرائیوں کا دلچسپ مرقع۔ دونوں کے دور مختلف ہیں، ماحول اور کردار بھی یکساں نہیں پس منظر (Back Ground) بھی جداگانہ ہیں مگر منظر ایک ہے: شجاعت و بہادری: غیرت و حمیت اور جنگ و جدال کا بے باکانہ اظہار۔

آپ کے یہاں جب اس کا درس ہوتا تو درس گاہ میدان کارزار معلوم ہوتی تھی، فارسی اشعار کے ساتھ انھیں کے ہم معنی ہندی کے دوہے جب آپ پڑھتے تو سماں بندھ جاتا تھا۔ تقریباً یہی حال دیوان الحماسہ۔ ابوتمام کی تدریس کے وقت ہوتا تھا۔

شوال کے مہینہ کے ابتدائی دنوں میں آپ میوات کا سفر فرماتے جس کی غرض و غایت احباب اور اپنے پرانے شاگردوں سے ملاقات تھی، آپ کے احباب میں میاں جی محمد عمر صاحب چلی، مولوی عبداللہ صاحب مالپوری، میاں جی عبداللہ صاحب عرف میاں صاحب سنگار اور میاں جی آٹاوڑ وغیرہ تھے رحمہم اللہ تعالیٰ۔ آپ کے عزیز شاگرد مولوی محمد رحیم شاہ صاحب بانی مدرسہ رحمانیہ بارہ ٹوٹی صدر بازار دہلی آپ کے ہمراہ ہوتے تھے اور باقاعدہ ہر آدمی سے اس کے گھر ملاقات کو تشریف لے جاتے، جب تک آپ چلنے پھرنے سے معذور نہ ہوئے یہ عمل بدستور جاری رہا اسی سلسلہ میں ایک مرتبہ اپنی صاحبزادی کے یہاں موضع کوٹ تشریف لے گئے۔ مولوی الیاس صاحب آپ کے داماد نے عیدگاہ میں آپ کے قیام کا بندوبست فرمایا جہاں آپ کو ہر طرح کی سہولت تھی وہاں آپ تلاوت قرآن کریم میں مشغول تھے ایک آدمی آیا اور اس نے عجیب منظر دیکھا کہ آپ کے اوپر گھٹا سی چھا رہی ہے وہ ڈر گیا یہ دراصل کیف و نور کا جھمگٹا تھا، آپ کی وفات کے بعد اس آدمی نے یہ

یہ واقعہ بتلایا۔[1]

معمولات کے بہت پابند تھے اور وقت کی قدر و قیمت کے معترف، چارپائی پر کبھی نہ سوئے اگر کسی بزرگ نے حکماً چارپائی پر لٹا دیا تو امتثالاً چارپائی پر لیٹ تو جاتے تھے مگر بتکلف۔ تہجد کے وقت اٹھتے پیشاب پاخانہ سے فارغ ہو کر بڑے اطمینان سے وضو فرماتے اور سکون کے ساتھ نوافل ادا کرتے اور قرآن کریم کی تلاوت، اولاً حزب البحر کا ورد کرتے پھر سورہ یٰسین پڑھتے اس کے بعد ایک پارہ کی تلاوت ایک ماہ میں قرآن کریم ختم کرتے، اور یہ اس طرح کا معمول تھا کہ اس میں کبھی ناغہ نہیں کر سکتے تھے، اذان فجر سے کچھ پہلے طلبہ کو بیدار کرتے تاکہ وہ حوائج ضروریہ سے فارغ ہو کر نماز کی مکمل تیاری کریں، نماز فجر کے بعد طلبہ قرآن کریم کی تلاوت میں مشغول ہو جاتے اور آپ ذکر و اوراد میں گھر چلتے پھرتے تاکہ طلبہ کی بھی نگرانی ہو سکے اور جو کچھ نماز فجر سے پہلے پڑھنے سے رہ گیا تھا وہ آپ پورا فرما لیتے۔ ناشتہ سے گویا آپ ناشناسا ہوئے تھے تلاوت قرآن کریم کے بعد درس شروع ہو جاتا جو عموماً بارہ ساڑھے بارہ بجے تک ہوتا، پھر آپ کھانا تناول فرماتے اور تھوڑا سا قیلولہ، مگر دوپہر بعد کی کتب کا مطالعہ بھی قیلولہ کے درمیان ہی فرماتے کبھی کتاب بغیر مطالعہ کئے پڑھاتے، البتہ معقولات میں آپ کو زیادہ شغف تھا کیونکہ منتہیات کی کتب کے درس و مطالعہ کے لئے اس کے بغیر استعداد نہیں بن سکتی تھی، ریاء و نمود اور نام آوری سے فطرتاً آپ متوحش تھے بلا اخلاص و للہیت تھے، تعلم و تعلیم، درس و تدریس اور اجرائے مدرسہ وغیرہ جیسے امور سے آپ کا مقصد وحید تھا وصول الی اللہ جس قدر بھی قوم ساتھ ہو کوشش یہ تھی کہ پوری قوم آپ کی اتباع کرے اور زندگی بھر اسی کے لئے محنت و ریاضت فرمائی۔

---

[1] روایت مولانا محمد الیاس گوڈوی۔ قصبہ پورا پانہ

چودھویں صدی کے مشہور عارف باللہ اور داعی شاہ محمد الیاس کاندھلویؒ

(۱۳۰۳ھ – ۱۳۶۳ھ) جو اپنے برادر بزرگ اور آپ کے استاد محترم حضرت مولانا محمد صاحب کی وفات ۲۵/۱۱/۱۳۲۶ھ کے بعد مدرسہ کاشف العلوم مسجد بنگلہ والی بستی حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے منتظم و نگراں بن گئے تھے، انھوں نے جب تبلیغی نقل و حرکت کی داغ بیل ڈالی تو آپ مولانا مرحوم کے اولین رفقاء میں سے تھے اور پھر تبلیغ کے ان اساطین کے ساتھ آپ کے تعلقات میں اس قدر استواری آگئی کہ آپ نے وفات تک اس کو نبھایا اور مبالغہ کی حد تک نبھایا۔ حضرت مولانا محمد یوسف م ۱۳۸۴ھ جو آپ کے شاگردوں کے شاگرد تھے۔ مگر چونکہ وہ مولانا محمدؒ کے بھتیجے تھے، آپ ان کے ہاتھ پیر دباتے تھے۔ ایک مرتبہ مدرسہ سبحانیہ کے طلبہ نے مدرسہ کاشف العلوم آپ کی اولین مادر علمی۔ یعنی حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے طلبہ کو کبڈی میں ہرا دیا آپکو جب اس کا علم ہوا تو بہت ناراض ہوئے فرمایا! تمہیں جرأت کیسے ہوئی وہاں کے طلبہ سے کھیلنے کی۔؟ تم سب کے سب بے ادب ہو۔ میری عقیدتگاہ پر تمہاری یورش بایں عنوان قطعاً برداشت نہ ہوگی میرے لئے کاندھلہ کا ہر بچہ مخدوم ہے اور ان کا خادم بھی۔

حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ م ۱۹۶۴ کی ہمراہی میں حج بیت اللہ کا ارادہ فرمایا اس دشوار گذار طویل سفر میں خادم نہ ہونے کی وجہ سے آپ کو اور آپ کے صاحبزادوں کو بہت فکر تھی، راقم نے بھی اس سال سفر حج کا ارادہ کر رکھا تھا۔ حضرت مولانا سے جب عرض کیا کہ خادم بھی امسال سفر حج کر رہا ہے اور آپ کی خدمت کی سعادت کا متمنی ہے، بہت خوش ہوئے اور فرمایا، اب کوئی فکر نہیں ہے اور صاحبزادے بھی مطمئن ہو گئے۔ سفر شروع ہوا۔ پرانی دلی جنکشن سے گاڑی پر سوار ہوئے، محلہ قصاب پورہ دہلی کے رخصت کرنے والے احباب کا جم غفیر الوداعی

سلام اور دعا کی درخواست کر رہا تھا اسی حال میں گاڑی نو بجکر کچھ منٹ پر روانہ ہوئی۔
نماز عشا پلیٹ فارم ہی پر ادا کر لی تھی، کچھ دیر بعد خادم نے عرض کیا حضرت آرام فرمالیں
فرمایا: بہت اچھا، سیٹ پر بستر کیا اور حضرت مولانا آرام فرما ہوتے، شب بیداری آپ کی
گویا عادت ثانیہ تھی زمانۂ طالب علمی ہی سے معلوم تھا کہ آپ کا معمول کیا ہے، اس لئے
مناسب معلوم ہوا کہ خادم جاگتا رہے تاکہ وقت ضرورت حضرت مولانا کو کوئی زحمت نہ ہو
حسب معمول آپ اٹھے، ضروریات سے فراغت کے بعد وضو فرمایا اور نوافل میں مشغول
ہو گئے، نماز فجر تک ذکر و شغل و تلاوتِ قرآن پاک میں مصروف رہے، بعد نماز ناشتہ
کرایا مولانا حسن خاں صاحب میواتی بھی ساتھ تھے کچھ خوش طبعی کی باتیں مختلف
انداز میں ہوتی رہیں، پھر اپنے معمولات میں مشغول ہو گئے، اسی طرح شب و روز ذکر و
عبادات میں گذرے، بمبئی مسافر خانہ میں چند روز قیام رہا، بمبئی کے احباب ملاقات
و دعا کی غرض سے حاضر ہوتے رہے، حجاج کرام کی بھیڑ کے باوجود حضرت مولانا
گوشۂ تنہائی میں اپنی دُھن میں مصروف رہے، چند روز بعد جہاز پر سوار ہوئے، مولانا
کے ضعف کی وجہ سے اندیشہ تھا کہ اگر چکر متلی ہوئی تو بہت پریشانی ہوئی مگر الحمدللہ طبیعت
بہت اچھی رہی اور سمندری سفر کا آپ پر کوئی اثر نہیں حضرت مولانا کا شوق بہت تیزی
سے بڑھ رہا تھا جوں جوں منزل قریب ہوتی گئی جذبات میں اضافہ ہوتا گیا صبح سے شام
اور شام سے صبح تک نماز، تلاوت، ذکر و دعا میں اتنا انہاک ہو گیا کہ رات کو
بہت تھوڑا سا آرام فرماتے تھے پیشاب کے عارضہ کی وجہ سے کئی مرتبہ چڑھنا اور اترنا
پڑتا تھا ناچیز ہر وقت ساتھ ہی رہتا تھا کئی مرتبہ وضو فرماتے نماز پڑھتے دعا کرتے
کبھی مراقب ہوتے اور کبھی ذکر میں مشغول ہو جاتے۔ جہاز میں از خود عام شہرت ہو گئی
کہ اس میں ایک بہت بڑے ولی اور صاحب دل ہیں لوگ تلاش کرتے ہوئے آتے
تھے ... حضرت مولانا کو دیکھ کر چلے جاتے تھے۔ ایک روز جہاز کا کپتان بھی آیا تھا

مولانا کے متعلق کچھ باتیں دریافت کیں کچھ علمائے کرام کیرالہ کے ہمارے قریب ہی ٹھہرے
ہوئے تھے چند روز تو وہ سب یہ منظر دیکھتے رہے ایک روز انھوں نے مجھے اور مولوی
حسن خاں صاحب کو بلا کر پوچھا یہ کون صاحب ہیں اور آپ لوگوں کا ان سے کیا رشتہ ہے؟
راقم کے متعلق تو عام خیال تھا کہ یہ ان کے صاحبزادے ہیں، ان علماء کرام سے مولوی حسن
خاں صاحب نے کہا کہ یہ ہمارے استاد ہیں، کہنے لگے کہ ان کا سلسلہ کیا ہے؟ عرض کیا گیا
کہ سلاسل اربعہ پھر کہا کہ کیا یہ بیعت بھی کرتے ہیں؟ اگر بیعت بھی کرتے ہوں تو ہم سب لوگ
ان سے بیعت ہونا چاہتے ہیں ان کی طرف دل بہت کھنچتا ہے آپ حضرات معلوم کر لیں
ہم نے کہا بہت اچھا صبح کے ناشتہ کے وقت ناشتہ سے فارغ ہو کر مولوی حسن خاں صاحب نے
کہا کہ حضرت کچھ علماء کرام آپ سے بیعت کی درخواست کر رہے ہیں اور جہاز میں بھی جناب
کے متعلق عام شہرت ہے کہ ایک بہت بڑے بزرگ ہیں۔ آپ اجازت دیں تو میں ان
حضرات سے کہدوں آپ نے زور سے قہقہہ لگایا اور فرمایا حسن خاں بھی عجیب آدمی
ہیں۔ مولوی صاحب نے عرض کیا کہ آپ تو صرف ہاں کر دیں باقی سارے کام تو میں خود
ہی انجام دے لوں گا پھر ہنسے اور فرمایا تو بہت عجیب آدمی ہے، غرض عجیب پر کیف
سفر تھا حضرت مولانا باوجود ضعف کے عبادت ذکر و تلاوت وغیرہ میں ہر وقت مصروف
رہتے تھے ایک رات ناچیز کو خیال آیا کہ مولانا تو کمزوری کے باوجود اس قدر مجاہدہ فرماتے
ہیں اور ہم جوان ہو کر بھی غافل رہیں حضرت مولانا تہجد کے وقت جب نوافل میں مصروف
ہوئے تو میں نے وضو کیا اور نماز شروع کر دی دو رکعت پڑھ چکا تھا مولانا نے دیکھ کر بلایا اور
فرمایا جاؤ آرام کرو۔ جا، سو جا، میں جو کچھ کر رہا ہوں اس سب کا ثواب تجھکو بھی ملے گا اور پھر
اپنے معمولات میں مشغول ہو گئے جب یلملم قریب آیا تو احرام کی تیاری ہوئی اسوقت
آپ پر بیخودی کی کیفیت طاری ہوئی میں نے وضو کرایا چادر پہنائی اور مصلیٰ بچھا کر
عرض کیا کہ حضرت دو رکعت احرام کی ادا فرمالیں اور نیت فرمالیں اس بے خودی میں لاتا

کیہ یاد نہیں رہا کہ یہ دو رکعت سر ڈھانک کر پڑھی جاتی ہیں ننگے سر ہی نماز ادا کی اور عمرہ کا
احرام باندھ لیا میں وضو سے فارغ ہو کر نماز کی نیت کر چکا تھا مولانا نے دیکھ کر فرمایا مولوی حسن
خاں اسحاق کو مسئلہ یاد نہیں ہے سر ڈھانک کر نماز پڑھ رہا ہے، تم اسے مسئلہ تو بتلا دو میں نے
جلدی سے نماز پوری کی، اور عمرے کی نیت کر کے تلبیہ پڑھا، بلا کر فرمانے لگے کیا مسئلہ
معلوم نہیں تھا، میں نے عرض کیا حضرت میں نے تو مسئلہ کے مطابق ہی نماز ادا کی ہے
مسئلہ سے تو آپ کو ذہول ہو گیا ہے جب آپ نماز ادا کر رہے تھے تو آپ محرم کہاں تھے،
محرم تو آپ نیت احرام کے بعد ہوئے ایک دم چونک کر فرمایا ہاں مجھے ہی ذہول ہو گیا
کفن پہننے کے بعد محبوب حقیقی سے وصال کے تصور نے عجیب اضطرابی کیفیت پیدا کر دی
جو صرف دیدنی تھی خدا خدا کر کے دو روز بعد جہاز ساحل سے لگا آپ نہایت ہی مضطر
تھے کہ جلدی سے سرزمین مقدس پر اتر کر اپنی دیرینہ آرزو پوری کی جائے خادم نے اگرچہ
بہت جلدی کی مگر حجاج کرام کے اژدحام کی وجہ سے تاخیر ہوتی رہی جدہ میں قانونی
پابندیوں کے باعث عموماً دیر ہو جاتی ہے۔ آپ نے بڑی بے تابی سے یہ وقت گزارا
بالآخر مکہ مکرمہ کے لئے روانہ ہوئے راستہ میں تلبیہ کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں —
حد حرم آنے پر راقم نے عرض کیا: حضرت اب ہم لوگ حدود حرم میں داخل ہو رہے ہیں،
ایک دم رقت طاری ہو گئی مگر ضبط کرتے ہوئے گردن جھکا لی تلبیہ بھی باواز پڑھنا موقوف
ہو گیا۔ جب مکہ مکرمہ پہنچے تو خادم اور مولوی حسن خاں صاحب نے عرض کیا حضرت
کچھ دیر آرام فرمالیں آپ کو بہت زیادہ تکان ہے فرمایا بہت اچھا۔ میں نے چارپائی
بچھائی اور آپ کو لٹا دیا چند ہی منٹ گزرنے پائے تھے اچانک اٹھ بیٹھے اور فرمایا
اسحاق مجھے جلدی لے چلو اور جلدی سے مجھے بیت اللہ دکھا دو۔ میں نے فوراً سامان
وغیرہ ایک طرف ڈالتے ہوئے حاضر ہو کر عرض کیا: حضرت تشریف لے چلئے۔ حرم
شریف میں داخل ہوتا تھا کہ آپ ایک دم کھو گئے اور حیرانی و سراسیمگی کی سی کیفیت طاری ہو گئی

راقم چونکہ پہلے حج کر چکا تھا اس لئے طواف وغیرہ کی سب ترتیب معلوم تھی۔ مولانا کو لے کر آگے بڑھا
عرض کیا حضرت سامنے بیت اللہ ہے اور اس وقت آپ حجر اسود کے سامنے ہیں نیت فرما کر
طواف شروع فرما دیں مولانا پر استغراقی کیفیت طاری تھی میں نے جہراً نیت کرائی اور
استیلام کے لئے ہاتھ اٹھائے اور طواف شروع کر دیا۔ اژدحام کی وجہ سے مطاف میں چلنا دشوار
ہو رہا تھا حضرت مولانا کو خادم نے اپنے سامنے دونوں ہاتھوں کے درمیان لے لیا ہر استلام
کے وقت عرض کرتا رہا حضرت استلام فرمالیں میں نے ہاتھ اٹھا دئے اٹھ گئے اسی محویت میں
طواف پورا کیا مقام ابراہیم پر نماز ادا کرائی اور باب الصفا سے نکل کر سعی شروع کی مولانا اب کچھ ہوش
میں تھے وہ کیفیت ختم ہو گئی تھی فرمایا میری کمر کس کر باندھ دو میں نے ایک کپڑے سے کمر باندھی
اور صفا سے سعی شروع کی خوب دعائیں کیں دوسرے شوط میں میلین اخضرین سے گذر کر اچانک
غیر اختیاری طور پر میرے دل میں خیال آیا کہ سعی میں تو بہت دیر ہو جائے گی، خیال آیا ہی تھا
کہ آپ فوراً پلٹے اور فرمایا بھائی میری وجہ سے تمہیں بھی دیر ہو گی مولانا آگے چل رہے تھے اور میں
آپ کے پیچھے تھا میں فوراً سامنے حاضر ہوا اور دست بستہ عرض کیا: حضرت یہ غیر اختیاری وسوسہ
تھا اللہ معاف فرما دیں میں تو حضرت کی ہی راحت میں خوش ہوں۔ فرمایا: بہت اچھا اور چل دیئے
اس وقت اندازہ ہوا کہ ہمارے زمانہ طالب علمی میں کیوں آپ اکثر یہ فرمایا کرتے تھے ؎ قلندر
ہر چہ گوید دیدہ گوید[1] سعی پوری کی اور احرام کھولا اور واپس جائے قیام پر آ گئے آپ جب تک
حرم سے باہر رہتے ہوش و حواس قائم رہتے جیسے ہی حرم میں داخل ہوتے وہی محویت

---

[1] اس سلسلہ میں یہ واقعہ بھی دلچسپی کا باعث ہوگا: مولوی فتح محمد صاحب آفریدی جو آپ کے ممتاز شاگرد
اور مولوی عبدالمنان مرحوم کے ساتھی ہیں سہارنپور کا ارادہ کیا مقصد تھا شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ کی زیارت و ملاقات
آپکو جب معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا: رائے پور تک چلے جانا۔ مولوی صاحب جب سہارنپور پہنچے تو معلوم ہوا کہ حضرت
شیخ یہاں نہیں بلکہ رائپور میں ہیں یہ بھی رائپور پہنچے اور نیاز حاصل کئے اور ساتھ حضرت رائپوریؒ کا مزار کی زیارت بھی ہو گئی یہ ہے
؎ قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید ہے

طاری ہو جاتی یہ بھی خبر نہیں رہتی تھی کہ کون سے دروازے سے آئے ہیں اور کہاں سے واپسی ہوگی، مکہ مکرمہ کے قیام کے دوران حضرت مولانا محمد یوسف صاحب نور اللہ مرقدہٗ تبلیغی اجتماعات کثرت سے فرماتے تھے حضرت مولانا اہتمام سے ہر ایک میں شرکت فرماتے تھے ایک مرتبہ وادیٔ فاطمہ میں ایک اجتماع ہوا فرمایا:۔ اسحاق وادیٔ فاطمہ چلنا ہے وہاں تبلیغی اجتماع ہے میں نے عرض کیا بہت اچھا معینہ تاریخ پر حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ نے خبر کی کہ آپ اگر تشریف لے چلیں تو ہم لوگ فلاں وقت جائیں گے حضرت مولانا ان حضرات کے ہمراہ وادی فاطمہ تشریف لے گئے راستہ میں حضرت مولانا یوسف صاحبؒ نے فرمایا مولوی اسحاق تم حضرت میمونہؓ کا مزار جانتے ہو پہلے کبھی گئے ہو، میں نے عرض کیا جی ہاں حاضر ہوا ہوں فرمایا جب وہاں سے گذریں بتا دینا جب قریب آئے میں نے عرض کیا اسی پہاڑی کے دامن میں مزار ہے وہاں پہلے ایک مسجد اور مزار پر گنبد بنا ہوا تھا مگر اب اسے مسجد سمیت مسمار کر دیا گیا تھا گاڑی سے اتر کر سلام عرض کیا دعا کی اور سوار ہو کر وادی فاطمہ پہنچ گئے عرب حضرات نے جاتے ہی اپنے دستور کے مطابق سب سے پہلے قہوہ پیش کیا آپ نے جب ذرا سا چکھا تو فرمایا یہ کیا ہے میں نے عرض کیا حضرت قہوہ ہے فرمایا یہ کڑوا ہے اور مجھے دیدیا پھر چائے نوش فرمائی ایک شب کے بعد مکہ مکرمہ واپسی ہوئی اس سال شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی نور اللہ مرقدہ م ۱۳۷۷ھ بھی حج میں تشریف لائے ہوئے تھے اور مکہ مکرمہ ہی میں قیام تھا ایک روز نماز اشراق کے بعد آپ نے فرمایا حضرت مدنی بھی تو تشریف لائے ہیں قیام گاہ معلوم ہے میں نے عرض کیا جی ہاں معلوم ہے فرمایا چلو میں نے قیام گاہ تک رہبری کی حضرت دوسری منزل پر تشریف فرما تھے مولانا نے فرمایا اچھا دیکھ کر آؤ میں اوپر چڑھا بہت بڑا ہال تھا علمائے کرام اور متوسلین سے بھرا ہوا تھا پیر رکھنے کو جگہ نہیں تھی صرف جوتے اتارنے کی جگہ خالی تھی میں نے کیفیت عرض کی، فرمایا چل میں آگے ہو لیا جب ایک دو سیڑھی باقی رہی میں نے عرض کیا حضرت اب آپ

چلئے فرمایا نہیں تم ہی چلو میں نے پھر عرض کیا اب میرے بس کی بات نہیں ہے اب تو آپ چلئے آپ آگے بڑھے اور حضرت کی نگاہ بچا کر فوراً جوتیوں میں بیٹھ گئے راقم بھی حضرت مولانا کے پیچھے جلدی سے بیٹھ گیا ابھی اچھی طرح مولانا بیٹھے بھی نہیں تھے حضرت مدنی رح نے دیکھ کر فرمایا: آپ کیا کرتے ہیں آپ یہاں تشریف لائیے مولانا فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اہل مجلس کے استعجاب کی کوئی حد نہیں تھی ایک فقیرانہ لباس میں سیدھے سادے دیہاتی کے ساتھ حضرت یہ برتاؤ فرما رہے تھے آپ حضرت کے قریب ہوئے حضرت نے گاؤ تکیہ خالی کر دیا اور ایک طرف ہو کر دوزانو تشریف فرما ہوئے اور فرمایا آپ یہاں تشریف رکھئے مولانا بے تکلف بیٹھ گئے مزاج پرسی کے بعد دونوں حضرات نے گردنیں جھکا لیں اور تقریباً بیس منٹ تک پورے مجمع پر سکتہ طاری رہا کیا ہوا کیا کہا یہ تو وہی حضرات جانتے ہیں، ہم نے سب کی گردنیں جھکی دیکھیں اور بس حضرت مدنیؒ نے گردن اٹھائی تو آپ نے بھی اٹھائی اس کے بعد اجازت طلب کی تو حضرت مدنیؒ نے دست بستہ بڑی نیازمندی سے فرمایا مجھے دعاؤں میں یاد رکھئے بھول نہ جائیے آپ نے سادگی میں فرمایا: اچھا، اور مصافحہ کر کے نیچے اتر آئے فرمایا: حضرت مدنی بہت بڑے بزرگ ہیں پھر چند روز بعد آٹھ ذی الحجہ کو احرام باندھا۔ آپ کو گاڑی کے ذریعہ منیٰ پہنچا یا گیا اور راقم پیدل ہی منیٰ پہنچا، وہاں کے قیام کے بعد عرفات روانگی ہوئی، آپ وہاں سے بھی گاڑی میں گئے اور راقم اپنے ساتھیوں کے ہمراہ پیدل عرفات حاضر ہوا آپ کو راقم کی غیبت تقریباً ناقابل برداشت تھی بار ہا دریافت فرمایا: اسحاق نہیں آیا، جب حاضر ہوا تو فرمایا: بہت دیر کر دی وقوف سے پہلے آپ کو غسل کرایا نماز ظہر ادا کی بعد نماز حضرت مولانا محمد یوسف صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے دعا کرائی دعا کے بعد سب لوگ اپنی انفرادی دعاؤں میں مشغول ہو گئے بعد نماز عصر میں نے عرض کیا حضرت آپ تو گاڑی سے تشریف لیجائینگے اور مجھے پیدل جانا ہے اگر آپ اجازت دیں تو میں جبل رحمت ہوتا ہوا مزدلفہ چلا جاؤں

فرمایا میں بھی چلوں گا میں نے کہا حضرت آپ بہت کمزور ہیں آپ کو بہت زحمت ہوگی
فرمایا نہیں میں تمہارے ساتھ ہی چلوں گا تمہارے بعد مجھے گاڑی میں کون سوار کرائے گا
مولوی حسن خانصاحب نے عرض کیا حضرت ہم سب آپ کے خدام حاضر ہیں فرمایا نہیں اسحاق
ہی کے ساتھ رہوں گا میں نے عرض کیا حضرت مزدلفہ میں آپ کو سوار کرا کے ہی جاؤں گا
اگر آپ فرمادیں تو میں جبل رحمت ہو آؤں فرمایا میں بھی چلوں گا میں نے عرض کیا وہاں اژدحام
بہت ہوگا آپ کو پریشانی ہوگی فرمایا تو بہت اچھا اور تکیہ پر حزب الاعظم رکھ کر پڑھنے لگے،
میں جبل رحمت چلا گیا اس کے بعد نہ معلوم آپ کو کیا خیال آیا اچانک اٹھے اور وہاں سے
چل دیئے ساتھی اپنے پڑھنے پڑھانے میں مصروف تھے کسی کو کچھ پتہ نہ چلا مولانا کہاں گئے
ہیں؟ میں جلدی سے غروب سے پہلے ہی واپس آیا دیکھتا کیا ہوں سب ساتھی پریشان ہیں
میں نے دریافت کیا مولانا کہاں ہیں؟ کہا کچھ پتہ نہیں سخت پریشانی ہوئی کیا کروں کہاں
تلاش کیا جائے خیر میں پھر جبل رحمت گیا کچھ پتہ نہیں چلا واپس آیا تو اکثر ساتھی بھی جا چکے
تھے صرف مولوی حسن خاں اور مولوی ابراہیم ناٹولوی موجود تھے میں نے مولوی حسن خانصاحب
سے کہا آپ بھی جائیے ورنہ آپ کو پریشانی ہوگی بہرحال میں تو جب تک نہیں آؤں گا کہ
جب تک پورے میدان عرفات میں نہ تلاش کرلوں گا۔ میں پھر وہاں سے چلدیا خیمے
اکھڑ چکے تھے مولوی ابراہیم صاحب چونکہ بیمار تھے وہ وہیں رہے سارے میدان میں پوری
رات تلاش کرتا رہا جب پورا یقین ہوگیا کہ مولانا عرفات میں نہیں ہیں واپس آکر مولوی ابراہیم
کے ساتھ ایک معلم کے ٹرک میں سوار ہوکر صبح صادق سے تقریباً پون گھنٹہ پہلے مزدلفہ پہنچے،
نماز ادا کی کچھ دیر کے بعد فجر کی اذان ہوئی نماز فجر سے فارغ ہوتے ہی مولوی ابراہیم صاحب
فرمانے لگے تم ساری رات پھرتے رہے ہو کچھ دیر آرام کرلو میں نے کہا مولوی صاحب کیا
ہمیں یہ زیبا ہے کہ مولانا تو پریشان ہوں اور ہم آرام کریں آپ یہیں ٹھہرئیے میں تلاش
کرتا ہوں میں وہاں سے چلدیا ہر چہار جانب دیکھ رہا تھا نگاہ جب مشعر حرام پر پڑی

تو دیکھا کہ آپ برابر سے تشریف لارہے ہیں فاصلہ بہت کم تھا جس وقت آپ پر میری نظر
پڑی عین اسی وقت مولانا نے بھی مجھے دیکھا میں جلدی سے بڑھا اور بے اختیار رونے
لگا مولانا نے فرمایا: بتا تیرے اوپر کیا گذری میں نے عرض کیا حضرت پہلے آپ فرمائیں،
فرمایا نہیں پہلے تو بتا میں نے عرض کیا حضرت ہی فرمائیں، فرمانے لگے: میں تیرے بعد
جبل رحمت کی طرف چلدیا وہاں جاکر رستہ بھول گیا ایک عربی کی گاڑی آرہی تھی میں
اس میں سوار ہوگیا اس نے مجھے اتارنا چاہا تو اور لوگوں نے کہا یہ بزرگ آدمی ہیں دعائیں
دیگا انھیں بیٹھا رہنے دو اس نے اس کے بعد کچھ نہیں کہا مزدلفہ لاکر چھوڑ دیا جہاں
جماعت والے مل گئے انھوں نے پانی وغیرہ دیدیا میں نے رات بھر خوب دعا کی اب تو
بتا میں نے کہا حضرت اب مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوئی فرمایا یہاں کب آئے؟ اور
ابراہیم کہاں ہے؟ میں نے عرض کیا نماز سے پہلے ہی آگئے تھے مولوی ابراہیم صاحب
کے پاس تشریف لائے دریافت فرمایا تم کو تو بہت پریشانی ہوئی ہوگی مولوی صاحب
نے کہا مجھے تو کوئی پریشانی نہیں ہوئی البتہ اسحاق ساری رات عرفات میں پھرتا رہا ہے
خیر وہاں سے ایک ٹرک میں سوار ہوکر منیٰ حاضر ہوگئے اور ارکان ادا کئے واپسی پر
حضرت مولانا کو مولوی نیاز محمد صاحب اور صاحبزادہ مولانا عبدالمنان صاحب کے
ہمراہ مکہ مکرمہ کے لئے سوار کیا یہ دونوں مولانا کو کسی گلی میں چھوڑ کر آگئے مولانا کو بہت
پریشانی ہوئی خیر کسی ذریعہ سے مولانا حرم میں پہنچ گئے میں مولوی ابراہیم کی وجہ سے
دیر سے آیا سب سامان بھی میرے ساتھ تھا تقریباً یہاں کے گیارہ بجے مولانا کی خدمت
میں حاضر ہوا سلام عرض کیا جواب ہی سے سمجھ گیا تھا کہ کوئی حادثہ پیش آیا ہے ابھی
سکون سے کھڑا بھی نہ ہوا تھا تیز لہجے میں کہا: تو کہاں رہ گیا تھا میں نے عرض کیا
حضرت ابھی آرہا ہوں فرمایا ہمارے ساتھ کیوں نہیں آیا میں نے کہا حضرت گاڑی والے
نے سامان کی وجہ سے نہیں بٹھایا فرمایا اس میں تو ساری دنیا بیٹھی ہوئی تھی اور سامان

بھرا ہوا تھا میں نے دیکھا کوئی عذر قابل سماع نہیں تو دست بستہ عرض کیا حضرت غلطی ہوگئی معاف فرمادیں غصہ کافور ہوگیا اور فرمایا یعنی میں ایسے دو بزرگوں کے ساتھ کیسے رہ سکتا تھا جن میں سے ایک تو حضرت رائپوری سے آگے بڑھنا چاہتا ہے اور ایک حضرت مدنی سے آگے نکلنا چاہتا ہے پھر طبیعت اعتدال پر آئی رات کو آرام کیا حسب معمول حرم میں حاضری ہوئی ناشتہ سے فارغ ہوکر پان کھایا کلی کرنے کے بعد اچانک میواتی زبان میں فرمایا" رانی ڈولے ہے دنیا حج تو میرو ہو یو ہے"[1] دومرتبہ یہی فرمایا میں حیران تھا کیونکہ یہ خلاف عادت تھا[2] مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ کو روانگی ہوئی حضرت مولانا محمد یوسف نوراللہ مرقدہ پورے قافلہ سمیت مدینہ منورہ حاضر ہورہے تھے سبھی حضرات ایک ہی وقت میں مدینہ منورہ حاضر ہوئے خادم آپ کو راستہ کی ساری منزل بتاتا رہا بدر میں نماز ظہر ادا کی اور دوپہر میں آرام کیا گرمی شدید تھی اس لئے شہدائے بدر کی قریب سے زیارت نہ کراسکا دور سے ہی مقامات مقدسہ بتائے راستہ میں جتنی منزلیں اور مقامات مقدسہ آئے بتاتا رہا جب ذوالحلیفہ

---

[1] مطلب یہ ہے کہ دنیا خوانخواہ پھر رہی ہے حج تو میرا ہوا ہے۔

[2] حج کے بعد راقم سہارنپور حضرت شیخ الحدیث نوراللہ مرقدہ کی خدمت میں حاضر ہوا اس وقت وہاں قطب العالم حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائپوری اعلی اللہ درجہ بھی تشریف فرما تھے مولانا عبدالمنان صاحب نے میرا تعارف کرایا اور فرمایا کہ یہ ابا جان کے ساتھ سفر میں خادم تھے حضرت رائپوری نے فرمایا میرے قریب آؤ میں کچھ آگے سرک گیا فرمایا اور قریب آؤ پھر قریب ہوا فرمایا مولانا کی کیفیات سناؤ میں نے پوری سرگزشت سنائی بہت مزے سے سنتے رہے اس میں یہ جملے بھی دہرائے کہ حضرت مولانا نے یہ بھی فرمایا تھا کہ حج تو میرا ہوا ہے لوگ تو بے کار پھرتے ہیں پیر حضرت تبسم گئے اور تکیہ سے سر اٹھاکر بار بار فرماتے رہے ہاں بھائی حج تو انھیں کا تھا حاجی تو مولوی عبدالسبحان ہی ہیں حج تو انھیں کا ہے۔

آیا اور روضۂ اقدس اور مسجد شریف کے حسین منارے دکھائی دیئے میں نے عرض کیا حضرت سامنے روضۂ اقدس ہے بس کیا تھا آنسوؤں سے آنکھیں بھر آئیں اور گردن جھک گئی درود شریف کا ورد اور بھی بڑھ گیا اگر سواری کی مجبوری نہ ہوتی تو کسی حال میں بھی سوار ہوکر سرزمین پاک میں داخل نہ ہوتے جی چاہتا تھا کہ سر کے بل چلیں مگر بس میں بے بس تھے کیا کریں بیر عروہ سے گذر کر جب سلع بن اکوع[1] کی پہاڑی پر گاڑی چڑھی تو دیار حبیب کا دلکش منظر سامنے آگیا طبیعت ہر آن اترنے کو مچل رہی تھی، مدینہ منورہ میں داخل ہوئے اور سامان رکھا اور ضروریات سے فارغ ہوکر آپ کا لباس بدلا خوشبو لگائی اور باوضو روضۂ اطہر پر حاضری کے لئے چلے اس کی وارفتگی کا بیان ممکن نہیں مسجد میں داخل ہوکر پہلے دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھی پھر مواجہ شریف میں حاضری ہوئی اور بصد احترام صلوٰۃ وسلام عرض کیا اور جو بھی عرض ومعروض کرنی تھی کی۔ میان عاشق و معشوق رمزیست ۔ کراماً کاتبین راہم خبر نیست - پھر قیام گاہ پر واپسی ہوئی پانچوں نمازیں مسجد نبوی میں پوری کیں اور جب تک مدینہ منورہ میں قیام رہا تھا تہجد بھی مسجد ہی میں ادا کی روزانہ نماز عشا کے بعد جب لوگ اکثر چلے جاتے تو میں آپ کو لے کر مواجہ شریف میں حاضر ہوتا تھا حضرت مولانا محمد یوسف صاحب اور حضرت مولانا انعام الحسن صاحب کی حاضری بھی اسی وقت ہوتی تھی یہ تینوں حضرات گھنٹوں مواجہ شریف میں کھڑے رہتے اور عرض نیاز میں مصروف رہتے جب مسجد کے دروازے بند ہوتے تو مسجد کے خدام آکر کہتے کہ اب دروازہ بند ہورہا ہے یہ حضرات اس وقت وہاں سے واپس تشریف لاتے یہ روزانہ کا معمول رہا مدینہ منورہ کے مآثر ومعابد اور مقامات مقدسہ کی تفصیلی زیارت کرائی مسجد قبا کئی مرتبہ حاضری دی بڑا عجیب اور پر کیف سفر تھا مدینہ منورہ سے واپسی ایک عاشق صادق کے لئے کتنی دشوار ہوتی ہے دیار حبیب کا چھوڑنا سہل نہیں واپسی ہونے سے پہلے حضرت مولانا پر ایک مدہوشی سی طا-

ہو گئی اور جوں جوں دیار حبیب سے دوری ہوتی گئی اس میں اضافہ ہی ہوتا گیا بالآخر "مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی" واپسی پر ایک دو روز بمبئی قیام رہا آپ کے صاحبزادگان کو بذریعہ تار اطلاع کر دی گئی کہ ہم فلاں وقت دہلی پہنچ رہے ہیں اسی گاڑی سے حضرت مولانا محمد یوسف صاحب تشریف لا رہے تھے اس موقع پر شیخ الحدیث سہارنپور سے تشریف لائے ہوئے تھے نئی دہلی جنکشن پر بہت پہلے سے انتظار فرما رہے تھے جب گاڑی پلیٹ فارم پر رکی تو حضرت مولانا محمد یوسف صاحب اور حضرت مولانا انعام الحسن صاحب گاڑی سے اتر کر شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے میں نے بھیڑ کی وجہ سے آپ کو روک لیا تھا جب قدرے بھیڑ کم ہوئی تو میں نے آپ کو سہارا دیکر شیخ کی مجلس میں پہنچایا شیخ اٹھ کھڑے ہوئے معانقہ کیا اور فرمایا مولانا ہم تو گھنٹوں سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں آپ ہم سے ملتے بھی نہیں یہاں چونکہ اترنا نہیں تھا ملاقات مختصر رہی پرانی دہلی آئے تو استقبال کرنے والوں کا ایک سمندر تھا کہیں تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی بھیڑ میں نے آپ کو روکا حضرت ابھی ٹھہر جائیے سامان صاحبزادگان کے حوالہ کیا اور آپ کو اندر ہی رکھا جب مولانا محمد یوسف صاحب نے دعا شروع فرمائی تو لوگ سمٹ گئے میں نے عرض کیا حضرت اب اتر جائیے راستہ میں آپ نے مجھ سے فرمایا تھا کہ یہ حضرات تو سب چلے جائیں گے میرے ساتھ کون ہوگا میں نے عرض کیا حضرت غلام حاضر خدمت ہی رہے گا بہت خوش ہوئے فرمایا ٹھیک ہے غرض یہ حضرات تو بستی حضرت نظام الدین اولیاؒ تشریف لے گئے اور میں آپ کے ہمراہ مدرسہ سبحانیہ قصاب پورہ حاضر ہوا مسجد میں دو رکعت تحیۃ المسجد ادا کی اہل محلہ ملاقات اور دعا کے لئے حاضر ہوتے رہے جب آمد و رفت کچھ کم ہوئی تو آپ نے میرے لیے چائے وغیرہ کا اہتمام فرمایا جو میرے تصور میں بھی نہیں تھا میں مسجد میں ایک طرف مولوی عبد الرحمن نثار صاحب مرحوم سے اور دیگر ساتھیوں سے باتیں کر رہا تھا مولانا نے ایک طالب علم

کے ذریعہ بلوایا فرمایا کچھ کھا لے میں نے عرض کیا حضرت چائے کا تو میں عادی نہیں ہوں پورے سفر میں کبھی چائے نہیں پی آپ نے اتنی زحمت کیوں فرمائی فرمایا کھالے تیرے اوپر جتنا بھی نثار کیا جائے کم ہے اس کے بعد میں نے پورے سفر کا حساب دیا اور بقیہ رقم واپس کی فرمانے لگے تمہیں ضرورت ہوگی تم رکھ لو میں نے عرض کیا حضرت میرے پاس کافی پیسے ہیں فرمایا بہت ہی عجیب آدمی ہے تو اور خوب ہی دعائیں دیں اور میں اجازت لے کر نظام الدین حاضر ہو گیا۔[1]

حج آپ نے اس وقت کیا جب آپ کی شخصیت انسانی مقام و منزلت کے تمام ضروری مراحل طے کر چکی تھی ریاضت و مجاہدہ کی بھٹی میں آپ نے اپنے کو اس قدر تپایا کہ قدرت نے کندن بنا دیا یہی وجہ تھی کہ آپ کے اساتذہ اور وقت کے جلیل القدر مشائخ آپ کی ملاقات کی خاطر آپ کے مقام پر تشریف فرما ہوتے اور اپنی شفقت و محبت اور لطف و مروت کے اس نخل شیریں کو پھلتے پھولتے دیکھ کر خوش ہوتے تھے حضرت مولانا شاہ عبد القادر رائپوریؒ آپ کی ملاقات کرنے مدرسہ میں تشریف لاتے اور مہینوں قیام ہوتا تھا۔ اور پھر صراحت کے ساتھ فرماتے ؛ صرف مولوی عبد السبحان کی زیارت کے لئے حاضر ہوا ہوں۔ حضرت مولانا زکریا صاحب شیخ الحدیث مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور فرماتے تھے "مولوی عبد السبحان میوات کے شاہ ولی اللہؒ ہیں" حج بیت اللہ سے فراغت کے بعد گویا ارکان ایمانی کی آپ تکمیل کر چکے تھے۔ زندگی میں بہت کام کیا تھا ضرورت تھی کہ آپ آرام فرمائیں مگر آپ نے آرام سے کبھی کوئی ربط و ضبط نہیں رکھا، فطرت الٰہی کو ترس آیا اور آپ کو آرام لینے پر مجبور ہونا پڑا۔ آخری عمر میں آپ کی آواز دھندلا گئی تھی، اور ہاتھ پیروں نے جواب

---

[1] روایت مولوی محمد اسحاق صاحب استاذ حدیث جامعہ رحیمیہ درگاہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی مہندیان دہلی۔

دیدیا تھا۔ ۱۹۵۷ء میں سفر آخرت فرمایا فاناللہ برہانہ ونور مرقدہ واعلیٰ درجاتہ فی جنات تجری من تحتہا الانہار ۔ ویرحم اللہ عبداً قال : آمینا۔

آپ کی وفات کے بعد آپ کے ہونہار اور بلند اقبال فرزندوں نے آپکے کام کو جاری رکھا اور خدمات درس و تدریس انجام دینی شروع کیں ۔ الحمدللہ مدرسہ کو جس پیمانہ پر آپ چھوڑ گئے تھے آپ کے اخلاف نے مدرسہ کو انھیں خطوط و لائنوں پر استوار رکھا فجزاہم اللہ ۔

آپ کے اخلاف میں چار فرزند اور ایک دختر اور آپ کی بیوہ ہیں[1]۔

(۱) ــ مولوی حافظ عبدالمنان صاحبؒ (۱۹۲۲ ــ ۱۹۷۴م) علوم عربی زبانؒ ادب کے ماہر فارسی لغت کے رمز آشنا اردو کے گہوارہ کے پروردہ تینوں زبانوں کے قادر الکلام شاعر والد مرحوم کے بعد مدرسہ کے مہتمم و صدر مدرس

(۲) ــ مولوی عبدالرحمٰن خاں شاکرؒ (۱۹۲۵ ــ ۱۹۸۲م) علوم اسلامیہ کے ماہر اردو کے پُرگو شاعر ۔ اور کامیاب مدرس و معلم۔

(۳) ــ مولوی عبدالحنان صاحب ۔ والد مرحوم کے بعد مدرسہ سبحانیہ کے روح رواں عالم فاضل، کم گو زاہد و عابد ، درس و تدریس میں فنا۔

(۴) ــ مولوی عبدالغفار صاحب ۔ انگریزی کے گریجویٹ ، اسلامیات کے فاضل ، کامیاب معلم مدرسہ عالیہ فتحپوری کے مدرس

(۵) ــ مریم سلمہا ۔ حافظ قرآن ، مسائل دینیہ کی ماہر ، عابدہ و زاہدہ مرتاض

---

[1] آپ ایک ولی صفت ، شب بیدار ، زاہدہ و پاک باز اور اپنے زمانے کی رابعہؒ تھیں۔ حضرت مولانا عبدالسبحانؒ کے عقد میں آنے سے پہلے آپ کی شادی ہو چکی تھی۔ آپ کی نند اور آپ دونوں تہجد گذار تھیں۔ نیند سے بچاؤ کی خاطر اپنی چوٹیاں دروازہ کی کنڈی سے باندھ لیتیں۔ قبرد لباغ

جہاں پہلے مدرسہ سبحانیہ تھا ، وہاں آپ نے اپنے لئے عبادت کی جگہ مقرر کر رکھی تھی۔ اس جگہ کا فرش آپ کے مسلسل بیٹھے رہنے سے بقیہ مکان سے قدرے نیچا ہو گیا تھا۔ اپنے گھر کے بچوں کو اس وقت تک کھانا نہیں دیتیں جب تک مدرسہ کے طلبہ نہ کھالیں ۔ وہاں سے جو بچ کر آتا وہ برابر سب میں تقسیم کیا جاتا۔ جب پہلا بچہ پیدا ہوا تو گھر میں تیل نہ تھا کہ چراغ جلائیں ۔ دائی یہ حالت دیکھ کر بلا اجرت لئے چلی گئی ۔ زندگی بہت سادہ تھی ۔ جفاکشی ، دنیا سے بے رغبتی طبیعت ثانیہ بن گئی تھی۔ ایک دفعہ اپنی بچی مریم سلمہا ، زوجہ مولوی محمد الیاس کو ٹوکی رکو چھینٹ کا کرتہ بنا دیا جو ہمیشہ کھدر پوش تھی ، بچی کرتہ کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی تھی۔ آپ نے یہ دیکھ کر اوپر سے کھدر کا کرتہ پہنا دیا اور فرمایا۔ دنیا کو دیکھ کر اس قدر خوش نہ ہو۔ ہنسی مزاق اور کھلکھلا کر ہنسنے تک اجتناب کرتیں۔ کبھی خود نہ کھلکھلا کر ہنسی اور نہ اپنے دائرہ کار میں کسی اور کو ہنسنے دیا۔

تبلیغ کا کام مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ کے فرمان سے شروع کیا۔ دادی جان نے کہا کہ میں سیدھی سادی ہوں نہ مجھے شہر کی بولی آتی ہے اور میں اتنی پڑھی لکھی بھی نہیں ہوں۔ حضرت مولانا نے فرمایا کہ صرف کلمہ اور نماز کی تبلیغ کرو۔ تبلیغ کے شروع زمانے کا ایک واقعہ بڑی خدیجہ اس طرح بتاتی ہیں ۔ کہ اماں جی ایک ایک کے گھر جاتیں ، کلمہ سنتیں اور نماز یاد کراتیں۔ ایک روز ایک پنجابی کے گھر گئیں۔ گھر والی نے اماں جی کو آٹا لاکر دیا۔ انہوں نے سوچا شاید کوئی بھکارن ہے۔ اماں جی نے کہا کہ میں مانگنے نہیں آئی بلکہ تمہاری نماز اور کلمہ سننے آئی ہوں۔

آخری عمر میں قدرے جذب ہو گیا تھا۔ ہر وقت یہی دھن تھی۔ مجھے میرے گھر لے چلو۔ گھر کے تمام افراد سوتے رہتے مگر آپ کی چارپائی سے ذکر کی آواز آتی ۔ جب آپ کا وصال ہوا تو آپ کا گھر عجیب قسم کی خوشبو سے معطر ہو گیا۔ بروز ہفتہ ۱۷ ؍ شعبان ۱۳۸۶ھ مطابق دسمبر ۱۹۶۶ء بعمر ۸۰ سال آپ نے وفات پائی اور خواجہ باقی باللہؒ کے قبرستان میں اپنے شوہر کے پہلو میں دفن ہوئیں ۔ فرحمہا اللہ ۔ اصل نام وزیری تھا۔ مگر بعد میں رحمانی ہو گیا۔

(روایت صفیہ بنت مولانا عبدالرحمٰن شاکر)

حضرت مولانا مرحوم ومغفور کا مقصد زندگی تھا: قوم کی تنظیم بذریعہ دینی وعربی تعلیم، دینی علوم اور عربی فنون سے پوری قوم کو آراستہ وپیراستہ کرنا۔ اس سلسلے میں آپ نے اپنی پوری زندگی وقف فرمادی۔ آپ کے بے شمار تلامذہ میں سے جنھوں نے آپ کے اتباع میں درس وتدریس کا مشغلہ اختیار کیا ان میں سے کچھ، جو اس وقت یاد آسکے، یہ حضرات ہیں:

(۱) مولانا محمد رحیم شاہ۔ پہاڑی ضلع بھرتپور — (۲) مولانا عبدالستارؒ۔ سنگار۔ ضلع گوڑگانوہ۔
(۳) مولانا عبدالغفور۔ گھر گھڑی ضلع الور۔ — (۴) مولانا نور محمد۔ باجھوٹ۔ ضلع الور۔
(۵) مولانا محمد سلیمان۔ باجھوٹ ضلع الور۔ — (۶) مولانا نور محمد قریشیؒ۔ اٹاور ضلع گوڑگانوہ
(۷) مولوی محمد ایوب۔ گھاسیڑہ ضلع گوڑگانوہ۔ — (۸) مولانا محمد اسحٰقؒ۔ بڑکا ضلع ؍؍
(۹) مولوی محمد اشرف۔ سنگار ؍؍ ؍؍ — (۱۰) مولوی قمرالدین۔ باس خیرجی ؍؍ ؍؍
(۱۱) مولوی ہدایت اللہ خاں۔ کھونٹا ؍؍ ؍؍ — (۱۲) مولوی نیاز محمد۔ رانیکا ؍؍ ؍؍
(۱۳) مولوی محمد حسن خاں۔ گنگوانی ؍؍ ؍؍ — (۱۴) مولوی رسول خاں۔ بنینی، ضلع بھرتپور۔
(۱۵) مولوی سراج الدین۔ گلالتہ ؍؍ ؍؍ — (۱۶) مولوی سردارؒ۔ سرولی ضلع گوڑگانوہ
(۱۷) مولوی محمد سلیمانؒ۔ سنگار ؍؍ ؍؍ — (۱۸) مولوی فتح محمد۔ مالب ؍؍ ؍؍
(۱۹) مولوی عبدالکریمؒ۔ گھاسیڑہ ؍؍ ؍؍ — (۲۰) مولوی رمضان۔ ریٹھٹ ؍؍ ؍؍
(۲۱) مولوی قمرالدین۔ ریٹھٹ ؍؍ ؍؍ — (۲۲) مولوی عبدالوہابؒ۔ رانوتہ ؍؍ ؍؍
(۲۳) مولوی سراج الدین۔ گنگورہ، ضلع بھرتپور۔ — (۲۴) مولوی شمس الدین۔ بیلول ؍؍ ؍؍
(۲۵) مولوی محمد حاتم۔ ڈونگیرہ، ضلع گوڑگانوہ — (۲۶) محمد حبیب الرحمٰن جلی، دو مولانا گھاسیڑوی ؍؍ ؍؍
(۲۷) مولوی عبدالغفور۔ گھاسیڑہ ؍؍ ؍؍ — (۲۸) مولوی محمد یونسؒ۔ گھاسیڑہ ؍؍ ؍؍

حضرت مولانا قدس سرہٗ نے عموماً علوم آلیہ کا درس دیا، آپ کی شفقت ومحبت اور دعاء کی برکت سے آپ کے شاگرد درس حدیث وتفسیر کی خدمت میں بھی معروف ہیں۔

ان میں سے کچھ یہ حضرات ہیں:

(۱) مولانا منیرالدین۔ کلینجر۔ نوح ضلع گوڑگانوہ۔ — (۲) مولانا محمد صدیق۔ اٹاوڑ، ضلع گوڑگانوہ۔
(۳) مولانا محمد اسحٰق۔ اٹاوڑ ؍؍ ؍؍ — (۴) ؍؍ عبدالکریم ابن میاں جی موسیٰ گھاسیڑہ ؍؍ ؍؍
(۵) ؍؍ محمد عمر۔ مالب ؍؍ ؍؍ — (۶) ؍؍ عبدالغفار ابن مولانا عبدالسبحان ناٹولی ؍؍ ؍؍
(۷) ؍؍ نور محمد۔ اٹاوڑ ؍؍ ؍؍ — (۸) ؍؍ محمد اسحٰق۔ نئی ؍؍ ؍؍

پورے میوات میں آپ کے انھیں شاگردوں کا فیض جاری ہے حق تعالیٰ اس چشمۂ فیض کو دوام واستمرار مرحمت فرمائے۔ یہ صرف میوات میں آپ کے تلامذہ کا تذکرہ ہے۔ دہلی میں بیرون میوات کے جو خوش قسمت افراد آپ سے فیضیاب ہوئے وہ اس سے علیحدہ ہیں۔

مولانا عبدالمنّان دہلویؒ

مولوی عبدالمنان ابن مولانا عبدالسبحان میواتیؒ ۱۹۲۲ء میں پیدا ہوئے۔ حافظ شرف الدینؒ سے قرآن کریم حفظ کیا۔ پھر اپنے والد ماجدؒ اور ان کے تلامذہ سے فارسی و عربی کی ابتدائی کتب پڑھیں۔ پھر ہر فن کو صاحب فن سے اخذ کیا۔ ادب مولانا ادریس کاندھلویؒ سے، منطق وفلسفہ مولانا سکندر علی ہزارویؒ تلمیذ مولانا عبدالحق خیرآبادی سے اور حدیث وفقہ اور تفسیر کو محی الملۃ والدین مفتی محمد کفایت اللہؒ مفتی اعظم ہند، محدث علام مولانا حافظ محمد ضیاء الحق دیوبندیؒ اور مولانا خدا بخش وغیرہ سے حاصل کیا۔ قدرت نے بےنظیر حافظہ سے نوازا۔ جذبۂ محنت، ذہن رسا اور آواز سریلی بخشی۔ اردو، فارسی اور عربی زبان کے قادر الکلام شاعر۔ آپ کا عربی مجموعۂ شعر راقم کے پاس مرتب صورت میں موجود ہے دقیقہ رس ونکتہ سنج معلم اور کامیاب مدرس، حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ کی خدمت میں رہ کر سلوک طریقت کی تحصیل کی۔ پھر ایک زندہ دل صوفی اور ذاکر وشاغل بن گئے۔ والد ماجد کی وفات ۱۹۵۵ء کے بعد مدرسہ سبحانیہ کے مہتمم وصدر مدرس ہوئے۔ جنوری ۱۹۷۲ء کو وفات پائی۔

رونق کاشانۂ علم و ادب، فضل و ہنر اے جمالِ آدمیت، زینت نوعِ بشر
علم و فن تھے اس طرح تیری جبیں پر جلوہ گر جس طرح تاروں کے جھرمٹ میں فروزاں ہو قمر

گلبن انسانیت کا حسن تھا تو ناز تھا
ضوفشاں تیرا تکلم تھا کہ اک اعجاز تھا

تو زبان گل فشاں، کوثر چکاں کا تھا دھنی آگہی علم و عرفاں کا تھا ابر بہمنی
نور حق سے ہو گیا تیرا سراپا روشنی تھا تو درویش خدامست اور دنیا سے غنی

تیرا سینہ تھا کہ تھا گنجینۂ علم و ہنر
جلوہ گاہ نورِ حق عرفان کی کان گہر

تجھ سے وابستہ تھیں دلّی کی روایات حسیں تیرا فردوسی تخیل اور جذبات حسین
تھے سلفؒ کے منکشف تجھ پہ خیالات حسیں تجھ کو ازبر تھی بزرگوں کی حکایات حسین

تھا خبیر نکتہ پرور نکتہ سنج و نکتہ داں
دہلی مرحوم کے علمی چمن کا پاسباں

آبروئے گلستاں گل کی بہاروں کے امیں سپہر علم و فن کا ماہ ستاروں کے امیں
اے سلف کے کاخ عظمت کے مناروں کے امیں اے وفا و مہر و الفت کی بہاروں کے امیں

اے ریاض علم و فن کے بلبل رنگیں بیاں
تیری رحلت سے مرتب درد و غم کی داستاں

تیری رحلت سے ہر پژمردہ نوا سنجِ چمن تیری رحلت سے تہی دامن ہوا گنجِ چمن
تیری رحلت سے ہوئے آپ سے کوہ و دمن تیری رحلت سے فسردہ نسترن سرو و چمن

تیری رحلت سے مرتب غم کے افسانے ہوئے
تیرے اپنے تیرے غم میں آہ دیوانے ہوئے

اے سلفؒ کی آرزو اے علم و فن کی آبرو ہند میں عربی ادب شعر و سخن کی آبرو
اے تو رعنائی گنگ و جمن کی آبرو خاک دلّی میں نہاں ارباب فن کی آبرو

تیرے بچوں کو دلاسا دیں کہ اپنے آپ کو
ہم نے جیون روپ کھویا ہے انہوں نے باپ کو

مولوی امام الدین صاحبؒ، مالب گوڑگانوہ

میوات کی موجودہ نسل میں آپ سب سے پہلے عالم دین ہیں، آپ ۱۳۲۹ھ میں مدرسہ عربیہ امینیہ دہلی میں داخل ہوئے اور ۱۳۳۴ھ میں فارغ ہوئے دہلی ہی میں آپ نے امامت و خطابت کے فرائض انجام دیئے۔ وعظ و نصیحت اور ارشاد و تذکیر آپ کا اہم مشغلہ تھا، میوات جب تشریف لے جاتے تو وہاں بھی آپ کا وعظ ضرور ہوتا جو بہت مؤثر ہوتا تھا، مدرسہ سبحانیہ کے بانی مولانا عبدالسبحانؒ صاحبؒ نے بھی کچھ آپ سے پڑھا ہے، آپ مدرسہ سبحانیہ کے بہت بڑے معاون تھے اہل ثروت کو اس طرف متوجہ کرتے، ان کی نیکیوں میں اور مدرسہ کے طلبہ کی خوراک میں اضافہ کے باعث بنتے، مولوی عبدالسبحانؒ کو آپ کی یہ ادا ایک آنکھ نہ بھاتی تھی مگر آپ خلوص سے جس کام کو اچھا سمجھتے تھے اس سے کسی کے ناراض ہونے سے رک نہ جاتے تھے، پیدائش پہاڑ گنج دہلی ۱۸۷۷ء وفات ۱۶ر مئی ۱۹۶۷ء گلی بھوجی مسجد شیخ گاموں والی جہاں آپ نے عرصہ دراز تک امامت و خطابت کے فرائض انجام دیئے۔ آپکے پسماندگان میں ایک صاحبزادے مولوی عبدالسلام ہیں جنکی پیدائش ۱۹۲۳ء میں ہوئی اور مسجد فتحپوری مدرسہ عالیہ سے ۱۹۴۷ء میں سند فراغت حاصل کی۔ مگر آپ کا ذہن علمی سے زیادہ صنعتی ہے چنانچہ ابھی شعور بھی پختہ نہ ہوا تھا کہ ٹوٹے ہوئے ریڈیو درست کر کے خبریں سننا پسندیدہ کام تھا البتہ آپکے داماد نے اپنے دادا خسر کی مسجد میں مدرسہ جاری کیا ہوا ہے اللہ تعالیٰ اسے پھلنے پھولنے کے مواقع عنایت فرمائیں۔

میاں جی محمد عمر عرف امراؤ خاں چلّیؒ

آپ موضع چلّی تحصیل ہتھین ضلع فرید آباد میں تقریباً ۱۸۸۰ء میں پیدا

ہوئے، فطرتاً بہت ذہین تھے، قرآن کریم آپ نے مولوی محمدؒ سے مدرسہ کاشف العلوم
مسجد بنگلہ والی بستی حضرت نظام الدین اولیاءؒ میں شروع کیا مگر پورا قرآن کریم نہ
پڑھ سکے۔ میاں جی امان اللہ ساکن ابہیت ضلع بھرتپور نے آپ کو علم دین کی طرف متوجہ
کیا ان کی وفات [illegible] میں ہوئی۔ اور میاں جی محمد عمر صاحبؒ بھی اسی سال
تک پہنچے ہوئے۔[1] آپ کی گفتگو معقول اور مؤثر ہوتی تھی، حافظہ کی قوت
بہت تھی سنی ہوئی بات مطلقاً بھولتے نہ تھے۔ علماء کرام کی محفلوں میں شرکت کے
بڑے شوقین تھے، جو کچھ وہاں سنتے اسے محفوظ کر لیتے اور ضرورت کے وقت اس سے
کام لیتے تھے۔ تبلیغی تحریک کے ابتدائی اور مخصوص کارکنوں میں آپ کا شمار ہوتا
تھا۔ حضرت مولانا محمد الیاس قدس سرہٗ کے عاشق تھے۔ ان کی اس اصلاحی
تحریک کی راہ ہموار کرنے میں آپ نے نمایاں کردار ادا کیا۔ بڑے باغ و بہار آدمی
تھے۔ آپ کی مجلس کارآمد لطیفوں، دلچسپ چٹکلوں اور نشاط افروز قہقہوں سے
معمور رہتی تھی۔ بانی دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ جیسے ہیں موصوف کا ہی ہاتھ
تھا۔ مہمانوں کو دیکھ کر خوش ہوتے تھے اور دل کھول کر ان کی میزبانی کرتے تھے،
بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔[2]

میاں جی منگل قصبہ اٹاوڑ

آپ حضرت مولانا محمدؒ کے شاگرد اور حضرت مولانا محمد الیاس قدس سرہٗ
کی اصلاحی تحریک کے ابتدائی کارکنوں میں تھے۔ آپ اولاً حضرت مولانا خلیل احمدؒ
صاحب سہارنپوری سے بیعت ہوئے ان کے وصال کے بعد میاں جی کلیم شاہ
سے بیعت کی اور ان کی ترغیب پر حضرت مولانا محمد صاحبؒ سے بیعت ہوگئے

1. بروایت میاں جی رحیم بخش
2. بروایت مولوی نور محمد اٹاوڑی

قصبہ اٹاوڑ میں جو علمی و دینی چہل پہل دکھائی دیتی ہے وہ آپ ہی کی محنت اور
جدوجہد کا نتیجہ ہے، حضرت مولانا عبدالسبحان قدس سرہ جب میوات تشریف
لاتے تو آپ بھی ان کے میزبانوں میں سے منجملہ ایک میزبان تھے، آپ کے صاحبزادے
مولوی نور محمد مدرسہ حسین بخش دہلی میں تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں، اور آپکے
قائم کردہ مکتب کی نگرانی بھی کرتے ہیں، ایک صاحبزادے میاں جی دین محمد پاکستان
چلے گئے۔ مولوی زکریا تیسرے صاحبزادے، موضع ذکوپور تحصیل بلب گڑھ میں
معلم الصبیانی کے فرائض انجام دینے میں مصروف ہیں۔ اور میاں جی قاسم سلمہ آپکے
گھر اور بیٹھک کو آباد کئے ہوئے ہیں۔

مولانا حکیم عبدالسلام گوروال، مالب

آپ قصبہ مالب تحصیل نوح کے باشندے تھے، اور پیدائشی نام حرمت
خاں تھا اور باپ کا نام دلیر خاں، اکہرا بدن، کتابی چہرہ، وجیہہ و باوقار بود و باش
اور منحنی قد و قامت تھی، زیرک و فہیم اور ذہین و طباع، آپ کے احوال و کوائف
آپ کے فرزندوں مولوی عبدالوحید و مولوی محمد سعید امینی کے ذریعہ جو معلوم ہوسکے:
بچپن ہی میں آپ کے والدین فوت ہوگئے تھے، آپ کے چچا نے
آپ کی پرورش کی اور حسب دستور آپ کو گائے بھینسوں کا چرواہا بنا دیا، یتیم
بچہ کی کفالت بڑا کٹھن مسئلہ ہے، اگر فطرت اسے فکر رسا بخشدے تو کچھ عرصہ بعد
وہ خود اپنا کفیل بنجاتا ہے، ورنہ پھر اس کی زندگی یوں ہی گذر جاتی ہے اور وہ کچھ
نہیں کر پاتا۔ کرنا کیا وہ اپنے کو سنبھال بھی نہیں سکتا، آپ صبح جانوروں کو لیکر
جنگل میں نکل جاتے اور اندھیرے منہ گھر لوٹتے، کھانے کو ملا ملا نہ ملا، نہ ڈھنگ
کے کپڑے، نہ وقت پر کھانا اور دن بھر بجائے آدمیوں کے جانوروں میں رہنا سہنا

آپ کو عجیب سا لگا، اور آپ اس طرح سوچتے سوچتے اس نتیجہ پر پہنچے کہ یہ کوئی زندگی نہیں، اس سے بھاگو، جب یہ خیال پختہ ہوگیا تو ایک دن آپ نے جانوروں کو جنگل میں چھوڑ کر شہر دہلی کی راہ لی، اس وقت الور دہلی روڈ کچا تھا جہاں تہاں کنکر بچھے ہوئے تھے، اور کسی سواری کا بھی بندوبست نہ تھا، پورا سفر پیدل ہی ہوا، شام کو جب آپ گھر نہ پہنچے اور آپ کے کچھ ساتھیوں کی زبانی آپ کے چچا کو معلوم ہوا کہ آپ دہلی چلے گئے ہیں تو اس نے گاڑی بیل جوڑ کر دلی کا رخ کیا اور کوشش کرکے آپ کو ڈھونڈ نکالا اور وہیں سے آپ کو پکڑ کر زبردستی بیل گاڑی میں ڈالکر گھر لے آئے اور پھر تادیباً کچھ سزا بھی آپ کو دی کہ ایک دو وقت کا کھانا بند رکھا، اور پھر محبت و پیار سے چارپایوں کی گلہ بانی آپ کے سپرد کردی گئی علم کا شوق آپ کو ہوگیا تھا اور تکمیل شوق کی راہ دیکھ لی تھی، پھر کسی دن چل نکلے اور اس بار یہ ہوشیاری کی کہ سیدھے دہلی نہیں پہنچے بلکہ میوات ہی میں اپنی پھوپی کے یہاں گئے، اس نے بھی ایک دو دن میہمانی کھلا کر وہی کام آپ کو سونپ دیا جس سے بھاگ کر آئے تھے، یہ دیکھکر آپ پریشان تو ہوئے مگر صبر کیا کیونکہ یہ منزل مقصود نہیں راہ منزل تھی اور چچا کو مغالطہ دینا بھی تھا تاکہ وہ آپ کا پیچھا کرے جب آپ کو یقین ہوگیا کہ چچا جان اب تو ڈھونڈ تھکے ہوں گے تب آپ نے دہلی کی راہ لی، یہاں آپ کے گاؤں کے مولوی امام الدینؒ ایک مسجد میں امام تھے، انکے پاس ٹھہر گئے، مولوی صاحبؒ نے آپ کے ذمہ یہ خدمت لگائی کہ روزانہ شاہدرہ سے پیدل جاکر کھانا لایا کرے اور آپ کو پڑھانا بھی شروع کیا۔ یہاں آپ کو اس طرح دو سال ہوگئے اور آپ صرف پاؤ پارہ پڑھ سکے۔ ایک دن آپ نے مولوی صاحب سے کہا: "مولوی صاحب دو سال ہوگئے آپ مجھے صرف پاؤ پارہ پڑھا سکے ہیں، آپ مجھے چھٹی دیجئے، میں کہیں اور جاکر پڑھوں"۔

مولوی صاحب نے آپ کو سمجھایا بھی کہ کہیں نہ جاؤ، یہیں رہو آہستہ آہستہ پورا قرآن پڑھ لے گا، مگر آپ نے ان سے علیحدگی میں ہی عافیت سمجھی اور مولوی صاحب کو بھی مجبوراً آپ کو رخصت دینی پڑی؛ وہاں سے چل کر آپ شہر میں مزدوری کرنے لگے۔ ہفتہ میں تین دن مزدوری کرتے اور تین دن قرآن کریم پڑھنے میں لگاتے اس طرح سلسلۂ تعلیم شروع کیا۔ پھر آپ مسجد بنگلہ بستی حضرت نظام الدین اولیاؒ میں داخل ہوئے اور حضرت مولانا محمد الیاس قدس سرہ م ۱۳۶۴ھ سے پڑھنا شروع کیا، قرآن کریم ختم کیا، اردو فارسی اور عربی کی ابتدائی کتب یہیں پڑھیں ۱۳۳۹ھ میں آپ مدرسہ حسین بخش کے طالب علم بن گئے، اور دورۂ حدیث تک جملہ تعلیم یہاں حاصل کی، اس درمیان میں کچھ عرصہ مدرسہ حسینیہ سے بھی آپ نے استفادہ کیا، جو مولانا محمد ابراہیمؒ واعظ دہلوی اور آپ کے بھائیوں نے اپنے والد مرحوم مولانا محمد حسین فقیرؒ کی یاد میں جاری کیا تھا[1] —— علوم دینیہ و فنون ادبیہ سے فارغ ہوکر آپ نے طب کی طرف توجہ کی، طبیہ کالج قرولباغ میں داخلہ لیا اور ۱۹۳۱ء میں وہاں سے سند فراغت حاصل کی اور وہاں کے فاضل حکماء کی طرف سے خصوصی سندیں بھی آپ کی فنی حذاقت و تجرباتی لیاقت کی بدولت آپ کو دی گئیں —— مزید استفادہ کی خاطر حکیم نابینا مرحوم انصاری کی خدمت میں زانوئے تلمذ طے کیا اور حکیم صاحب کی شفقت و عنایت سے بھرپور استفادہ کیا، طبی شغل آپ کو راس آیا، علاج و معالجہ میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہمہ جہتی فنی بصیرت اور حذاقت و قابلیت عطا فرمائی تھی، ہر طرح کے مریض آپ کے علاج سے شفایاب ہوتے تھے امراض خبیثہ کے علاج کے خصوصی ماہر تھے، شاید اسی وجہ سے مختلف رجواڑوں کے خصوصی معالج تھے، اس طرح

---

[1] دہلی کے قدیم مدارس اور علماء ص ۲۱۰

اللہ نے ابتدائی ضیق معاش کو یسر و وسعت سے بدل دیا۔ فطرتاً آپ خوش خوراک و خوش پوشاک تھے، اچھا کھانا اچھا پہننا۔ کہتے ہیں کہ اس دور میں دہلی کی عمدہ ترین پوشاک آپ کے بدن پر ہوتی تھی، علم دین کے حصول اور معیشت سے فارغ البالی کے شکرانے میں مدرسہ سبحانیہ دہلی کے طلبا کو پڑھانا شروع کیا۔ تاکہ آپ کی علم و فن سے وابستگی برقرار رہے اور قوم کے جوان فکر طلباً کو آپ سے استفادہ کا موقع ملے اور مذہبی مناظروں کی ایک کمیٹی مرتب ہوئی جس کے آپ صدر تھے آریاؤں، عیسائیوں اور قادیانیوں وغیرہ سے مناظرے ہوتے تھے، آپ عملاً بھی ان میں شریک ہوتے اور انکی مالی اعانت بھی فرماتے تھے آپ کی دوکان اور مکان دونوں قریب قریب تھے، دوکان پر ہر طرح کے آدمی آتے اور آپ کے پاس کچھ دیر ٹھہر کر چلے جاتے، ایک مرتبہ عبدالستار۔ دلی کا مشہور انارکسٹ۔ آپ کے پاس آیا آپ نے گھر اطلاع بھیجی کہ مرغ بناؤ۔ تھوڑی دیر میں مرغ تیار ہوگیا اور عبدالستار کو خوب کھلایا اور بہت تکلفی سے اس کے ساتھ گفتگو کرتے رہے جب وہ چلے گئے تو آپ سے پوچھا گیا، جناب حکیم یہ کون صاحب تھے، آپ نے حیرت سے فرمایا: ارے انہیں نہیں جانتا یہ تھے عبدالستار[1] حضرت مولانا عبدالسبحانؒ آپ پر بہت شفقت فرماتے تھے اور حضرت مولانا محمد الیاس صاحب بھی، مولانا فرماتے تھے حرمت خاں سونے کی چڑیا ہے، بڑے حضرت جی مرحوم نے ہی آپ کا نام حرمت خاں سے بدل کر عبدالسلام رکھا تھا۔ عمر نے وفا نہ کی ورنہ طبیعت کے جوہر اور کھلتے، چالیس سال کی عمر تھی کہ آپ بس کے ایک حادثہ میں شہادت سے سرفراز ہوئے

[1] روایت مولوی محمد اسحٰق قریشی اٹاوڑی

۲۵ محرم الحرام[1]۔ آپ کے پسماندگان میں آپ کے دو فرزند۔ مولوی عبدالوحید اور مولوی محمد سعید ہیں۔ اول الذکر نے اپنے گاؤں مالب میں ہی ایک مکتب جاری کیا ہوا ہے جس میں قرآن کریم حفظ و ناظرہ کی اچھی تعلیم ہوتی ہے۔ اور دوسرے صاحبزادے نے مختلف مدرسوں میں اہم دینی و تعلیمی خدمات انجام دیں ——— آج کل مدرسہ افضل العلوم محلہ تاج گنج آگرہ میں صدر مدرسی کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

مولوی محمد مرید صاحبؒ فیروز پور جھرکہ

آپ آفریدی النسل ہیں، جہاد آزادی، جسے انگریزوں نے غدر کے نام سے موسوم کرکے آزادی کے متوالوں کو بدنام کرنے کی سعی مذموم کی اس دور میں آپ میوات تشریف لائے، ڈاکٹر نذر محمد بادشاہ پوری کا بیان ہے کہ آپ نے مجھسے جولائی ۱۸۵۸ء میں ملاقات فرمائی، آپ کے پیر میں گولی کا زخم تھا، میں نے آلات ڈاکٹری سے صاف کیا، چندے میرے پاس قیام کیا اور پھر تبلیغ دین میں مشغول ہوگئے، فیروز پور جھرکہ میں مرزا صاحب کے یہاں آپ کی شادی ہوئی آپ نے میوات میں دین و مذہب کی ترویج و اشاعت کے سلسلہ میں وہ کام کیا جو احاطہ تحریر سے باہر ہے[2] آپ کی شخصیت بڑی پرکشش اور جاذب تھی، دل آپ کی طرف کھنچتے تھے، آپ نے شریعت کے فریم میں کس طرح اپنے آپ کو ڈھال لیا تھا اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے: ایک دفعہ آپ گھوڑی

[1] روایت مولوی عبدالوحید و مولوی محمد سعید امینی۔

[2] تاریخ میوات، ص ۸۸

پر سوار ہو کر قصبہ بیواں تشریف لے گئے، وہاں آپ کی نشست ہوئی وعظ و ارشاد کی مجلس جمی، آپ کی گھوڑی کو گھاس ڈالی گئی تو گھوڑی نے سونگھ کر چھوڑ دی، جب آپ کے سامنے اس کا تذکرہ کیا گیا تو آپ نے فرمایا: بھائی گھاس مشکوک ہوگی، جس کے گھر گھوڑی بندھی تھی وہ بڑا گھرا نا تھا، کہنے لگے حضرت اپنے کھیت کی گھاس ہے آپ خاموش رہے، مگر جب تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ اپنے کھیت میں سے گھاس کاٹی تھی مگر جب دیر ہونے لگی اور گھاس کم رہی تو دو چار مٹھے پڑوسی کے کھیت میں سے بھی لے لئے[1] اس سے آپ کے فیض و تاثیر کی وسعت بھی معلوم ہوتی ہے

ایک مرتبہ قصبہ بیواں ہی میں ایک شخص نے آپ کی دعوت کی اور کوئی چیز تل کر آپکو کھلائی، جب آپ کھا چکے تو مالک مکان نے اپنی بیوی سے کہا: لا کچھ مجھے بھی کھانے کو دیدے کر میں مولانا کو چھوڑ آؤں، اس نے کہا روٹی کس سے کھاؤ گے سالن چٹنی وغیرہ تو کچھ نہیں اس نے کہا لاؤ میں ہنڈیا ہی میں روٹی لگا کر کھالوں گا، جب پہلا لقمہ منہ میں ڈالا تو فوراً نکال باہر کیا کیونکہ نمک زیادہ پڑنے کی وجہ سے بالکل زہر ہوگیا اور مولانا نے اس طرح کھانا کھایا گویا بہت لذیذ تھا۔ مالک مکان نے آپ سے معذرت کی آپ نے فرمایا: کیا حرج ہے میرا پیٹ بھر گیا، دعوت بہت شاندار رہی[2] سبحان اللہ کیا کہئے اس خرد نوازی و چشم پوشی کے، اس طرح آپ نے مصائب جھیل جھیل کر اپنی شخصیت کو کندن بنا لیا تھا، آپ کی دعوت کا اصلی میدان قصبہ فیروز پور جھرکہ اور اس کے ماحول کے قریہ جات ہیں۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں آپ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، اسی کا شاخسانہ تھا پیر میں گولی کا زخم، جامع مسجد قصبہ فیروز پور جھرکہ کی جانب جنوب جو مدرسہ

---

[1] ، [2] روایت منشی محمد یعقوب مرحوم بیواں۔

حافظ الاسلام ہے قائم شدہ ۱۳۰۰ھ وہ اولاً آپ نے ہی جاری فرمایا تھا۔ تاریخ وفات اور آخری دور کے حالات کوشش کے باوجود نہ مل سکے۔ بیواں کو جانے والی سڑک کے دائیں جانب فیروز پور و موضع کامیڈہ کے درمیان آپ کا مزار ہے رحمہ اللہ تعالے۔

مولوی نور علی صاحبؒ

آپ کا سلسلۂ نسب بھی آفریدی نسل سے جا ملتا ہے، آپ مولانا محمد مرید کے ہمراہ میوات تشریف لائے، اور ریواڑی میں قیام فرمایا، آپ نے میو قوم کی فضول رسموں کی بہت کچھ اصلاح فرمائی، تقریباً ساری میوات کو اپنی جولانگہ عمل بنایا۔ اسی سلسلہ میں موضع منڈانہ پرگنہ تاوڑو تحصیل نوح بھی آپ کی آمد ہوئی اور وہیں ۱۹۰۰ء میں تہجد کی نماز پڑھتے وقت بحالت سجدہ آپ نے جان شیریں جان آفریں کے سپرد کی انا للہ وانا الیہ راجعون۔[1]

علامہ مولانا محمد حسن صاحب فیروز پوریؒ

آپ مولانا محمد مریدؒ کے فرزند ارجمند اور شاگرد رشید حضرت شیخ الہندؒ تھے قدس اللہ اسرارہم۔ اپنے والد ماجد کی وفات کے بعد ان کے شروع کئے ہوئے کاموں کی نگرانی و سرپرستی آپ ہی کے ذمہ تھی دیہات میں جا کر عوام کو وعظ و نصیحت کرنا، آپ کا وعظ اتنا پر اثر ہوتا تھا کہ ان پڑھ عوام کی کایا پلٹ کر دیتا تھا۔ آپکا اہم کارنامہ جامع مسجد فیروز پور جھرکہ کو پورے علاقہ کا اساسی مرکز قرار دینا تھا،

---

[1] تاریخ میوات ص ۸۸

آپ چاہتے تھے کہ یہ مسجد حرم نبوی کا نمونہ بنے، پورے علاقہ کے مسلمان جمعہ کے روز ملاقات کریں، دکھ سکھ کی بتلائیں، کئے ہوئے کاموں کا جائزہ لیں مستقبل کا پروگرام اور نظام عمل مرتب کریں۔ بلا کسی تشدد و تعصب آپ نے آس پاس ہونے والے نماز جمعہ کے اجتماعات کو یک قلم موقوف کر کے فیروز پور میں عظیم اجتماع جمعہ کی بنا ڈالی، جو کسی نہ کسی صورت میں ابھی تک بحمد اللہ باقی ہے۔ ۱۸۵۷ء کو آپ نے دیکھا نہیں مگر آپ کے والد ماجد اس جنگ آزادی کے پرجوش مبلغ و سپاہی تھے اس دور کے حالات کا جن لوگوں نے صحیح تجزیہ کیا ہے ان پر یہ حقیقت بالکل واضح ہو چکی تھی کہ یہ شکست و ریخت، تخت کی بجائے دار و رسن اقبال و شوکت کی جگہ ادبار و مسکنت مسلم قوم کی انتشار پسندی، فرقہ بندی اور گروہی عصبیت میں تشدد کا ثمرۂ تلخ تھا، اجتماعیت کے فقدان نے نئے نئے مسائل پیدا کر دیئے، مزاجوں میں الفت و یگانگی کی جگہ دوری و مہجوری پیدا کی ——— مولانا محمد حسن صاحبؒ جو شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن قدس سرہٗ کے ارشد تلامذہ میں تھے یہ بات پا چکے تھے کہ قوم و ملت کی شیرازہ بندی اور اس میں مذہبی ذوق و شوق کی بیداری اجتماعی شعور و احساس کی بیداری کے بغیر ایسا خواب ہے جو شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے ——— آپ نے اپنی اصلاحی جد و جہد کے لئے جو میدان عمل پسند فرمایا اس میں اللہ کے فضل و کرم سے نمایاں کامیابی ہوئی۔ علوم دینیہ خصوصاً فقہ میں آپ کا مقام بہت بلند تھا مستشرقین کی دسیسہ کاریوں کا اب تو عام چرچا ہے مگر آپ بہت پہلے اس خطرہ سے آگاہ ہو گئے تھے چنانچہ نفس مسئلہ ہی آپ کے لئے کافی نہ تھا بلکہ حوالہ کی کتب کا دیکھنا ضروری تھا، فرمایا کرتے تھے: بھائی ۱۸۵۷ء سے پہلے دور کی مطبوعہ و غیر مطبوعہ کتاب دکھاؤ بعد میں انگریز بہادر نے گڑبڑ کر دی[1]

[1] روایت حافظ عبد الرحمن مرحوم۔ ماحولی

بہت کم گفتگو کرتے تھے، نہایت شرمیلے، باحیا اور غیرت مند طبیعت کے مالک تھے۔ میوات کے قصبات میں فیروز پور جھرکہ جیسا بازار نہیں ہے، باقاعدہ منصوبہ سے بنایا گیا تھا سڑک بہت کشادہ، سیدھی اور متوازن، دوکانیں خوبصورت، آرام دہ کہ خواہ مخواہ اس میں جانے کو طبیعت مچل جاتی ہے مگر حضرت مولاناؒ کے متعلق مشہور ہے کہ آپ دو مرتبہ اس بازار سے گذرے ایک دفعہ جب آپ فارغ ہو کر دیوبند سے تشریف لائے اور یہیں کے ہو رہے، دوسری مرتبہ آپ کے جنازہ کو بازار سے لیجایا گیا، ورع و تقوی، احتیاط و پرہیزگاری، متانت و سنجیدگی، وقار و طمانیت اور جلال و جمال کا حسین امتزاج آپ کی بھاری بھرکم شخصیت کے گویا اجزائے ترکیبی تھے، معاصرانہ چشمک سے بالکل علیحدہ، جہاں کہیں بھی کسی اہل دل، اہل علم اور مشائخ اہل اللہ کی خبر سنتے وہیں ان سے ملاقات کرنے تشریف لے جاتے، آپ کی حیات طیبہ کے کوائف جن لوگوں کو معلوم تھے وہ خدا کو پیارے ہو گئے راقم کوشش بسیار کے باوجود وہ نوادر حاصل نہ کر سکا، ممکن ہے کہ کوئی اور صاحب یہ خدمت انجام دیں وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ۔

آپ کے ایک لڑکا جس کا نام معلوم نہیں اور ایک لڑکی تھی، لڑکی مولوی حافظ محمد مشتاق کے عقد میں تھیں جو مدرسہ حافظ الاسلام کے ناظم اعلیٰ تھے ۱۹۴۷ء میں پاکستان تشریف لے گئے اور حضرت مولانا مرحوم کا نادر و نایاب کتاب خانہ بھی اپنے ساتھ لے گئے ——— آپ کا وصال ۱۹۴۳ء میں ہوا اور اپنے والد ماجد کے جوار میں دفن ہوئے رحمہم اللہ رحمۃ الابرار۔

مولوی میر محبوب علی دھلویؒ

مولوی محبوب علی بن مصاحب علی بن حسن علی بن روشن علی بن حلیم الدین

بن فہیم الدین الحسینی الجعفری رحمہم اللہ تعالیٰ سادات کبار سے ہیں، علم حدیث، فقہ میں اقران و امثال میں ممیز و ممتاز، تحصیل علوم عقلیہ و نقلیہ جناب مولوی شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے خاندان رفیع الارکان سے کی، ان فنون میں ایسی مہارت رکھتے تھے کہ تمام مستحفظ و مستحضر تھے[1] ان کی توجہ زیادہ تر حدیث اور تفسیر پر ہے اور ان کی ہمت حتی المقدور علم کے مطابق عمل میں مصروف ہے، ہر معاملہ میں ذہن رسا اور فکر درست رکھتے ہیں، طرز مباحثہ اور طریق مناظرہ کو مختصر تقریر میں عمدہ ادا کرتے ہیں[2] علم حدیث و فقہ میں اقران و امثال سے جہاندیدہ، سفر کردہ، تحصیل علوم عقلیہ و نقلیہ جناب مولوی شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ اور انکے خاندان رفیع الارکان سے کی، ان فنون میں اس قدر مہارت کہ مسائل جزئیہ مثل لوح محفوظ کے ان کے تختۂ حافظہ پر منقوش ہیں[3]

آپ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی قدس سرہٗ کے لائق و نامور شاگرد تھے، سلسلۂ نسب آپ کا سید شمس الدین گردیزی سبزواری سے ملتا ہے جو عہد التمش میں ہندوستان آئے اور جن کی اولاد میوات کے مختلف قصبات میں آباد ہوئی منجملہ ان کے قصبہ بیواں تحصیل فیروز پور جھرکہ ہے جہاں میر صاحب کا خاندان حکومتِ وقت کی طرف سے فرائض منصبی ادا کرنے میں مصروف تھا۔ آپ کے دادا حسن علیؒ کی پیدائش قصبہ بیواں میں ہی ہوئی، اور آپ کے والد ماجد سید صاحب علیؒ ریواڑی میں پیدا ہوئے اور میر صاحب کی سسرال قصبہ بھونکر ضلع الور راجستھان میں تھی جسے سید بہاء الدین کے نام پر آباد

[1] واقعات دارالحکومت (ج ۲/ ۲۱۲) [2] مولوی عبدالقادر رام پوری۔
[3] آثار الصنادید۔

کیا گیا، شروع میں بہاء الدین نگر تھا بگڑتے بگڑتے بھونکر ہو گیا۔

سید احمد شہید ۱۲۴۶ھ کی تحریک جہاد میں سرگرمی سے حصہ لیا۔ میوات سے جسقدر بھی مجاہد اس تحریک میں شریک ہوئے وہ آپ کی ترغیب اور آپکی لگاتار محنت کا نتیجہ ہے، معرکۂ بالاکوٹ سے پہلے بہت سے معرکوں میں شریک رہے، سید احمد شہیدؒ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے تربیت یافتہ تھے، اور آپ شاہ صاحبؒ کے چہیتے شاگرد۔ میدان جہاد میں کسی بات پر سید صاحبؒ سے علمی اختلاف ہوا اور جب تسلی نہ ہوئی تو واپس تشریف لے آئے۔ آپ فرماتے تھے کہ اس تحریک میں منامی بشرات نے زیادہ بار پالیا ہے حالانکہ قرآن و سنت میں اس سلسلہ کی محکم آیات و بینات موجود ہیں۔ اور مشورہ جو اجتماعی تحریکات خصوصاً تجدید و اصلاح کے بارے میں زبردست اہمیت رکھتا ہے، اسے وہ مقام نہ دیا گیا جس کا وہ متقاضی تھا[4] میدان جہاد سے واپس آکر آپ نے اصلاحی جدوجہد فرمائی۔ میوات کو جو آپکے آباد و اجداد رحمہم اللہ کی فرودگاہ اور مسکن و ماوی، آپ کی سسرال اور آپ کے عزیز و اقارب کی رہائش گاہ تھی۔ اپنی اصلاحی مساعی کا میدان بنایا۔ بہلی۔ رتھ۔ سے کچھ چھوٹی مگر اسی طرح کی پردہ دار بیل گاڑی۔ کرایہ پر لیتے اور میوات کے دیہات کا دورہ فرماتے آپکے وعظ میں بے انتہا کشش، تاثیر اور دلچسپی ہوتی تھی، عوام بڑے شوق سے سنتے اور دنیا و آخرت سنوارتے پیدائش دہلی بھوجلہ پہاڑی یکم محرم ۱۲۰۰ھ وفات ذی الحجہ ۱۲۷۱ھ۔ چوسٹھ کھمبہ بیرون ترکمان گیٹ بوچڑ خانہ سے آگے سڑک کے بائیں طرف آپ کا مزار ہے[5] ترکمان دروازہ سے نکل کر اس

[4] تاریخ الائمہ فی ذکر خلفاء الامۃ (مخطوطہ) [5] مزارات اولیائے دہلی ص ۱۵

اس سڑک پر سر راہ واقع ہے، سامنے سیدھی سڑک بوچڑ خانے کو جاتی ہے دائیں بائیں دو قبرستان پڑتے ہیں، بائیں طرف چونسٹھ کھمبہ ہے اور ایک مسجد اور ایک پرانی عمارت ہے، یہاں شاہ فدا حسین رسول شاہی علیہ الرحمۃ بیٹھے تھے اور اس خاندان کے لوگ یہاں دفن ہیں۔ یہاں سے آگے سڑک کے بائیں جانب تقریباً ۵۰۰ قدم کے فاصلہ پر مولانا سید محبوب علی علیہ الرحمۃ کا قبرستان واقع ہے[۶]

میر محبوب علی کا خاندانی قبرستان تھا یا آپ نے نجی طور پر قبرستان کے لئے جگہ وقف فرمائی، بہر حال جو بھی ہو چودہویں صدی کے شروع میں آپ کا قبرستان مشہور تھا۔ چنانچہ نواب محمد نجف خاں (نواب احمد علی خاں صاحب رئیس اعظم کرنال کے حقیقی بھانجے) کا جب ۱۳۱۹ھ میں انتقال ہوا تو لکھا ہے: مولوی سید محبوب علیؒ کے قبرستان میں مدفون ہوئے[۷]

آپ کی ایک اہم یادگار ایک مسجد ہے جو چھتہ شیخ منگلو میں تعمیر کرائی ۱۰۹۔ محبوب علی مولوی، چھتہ شیخ منگلو قدیم۔ شمال سے جنوب ۲۸ ف مشرق سے مغرب ۱۳ ف، محبوب علی دلی کے ایک مشہور مولوی تھے جو مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے شاگرد تھے[۸]

ولد بغرۃ محرم الحرام ۱۲۰۰ھ وتوفی ۱۰ ذی الحجہ ۱۲۸۰ھ[۹]

---

[۶] یادگار دہلی ص ۹۲

[۷] 〃 〃 ۸۱ 〃 [۸] واقعات دارالحکومت ۳۰۳/۲

[۹] نزہۃ الخواطر ۴۰۰/۷۔

حضرت مولانا عبداللہؒ مالپوری

آپ موضع دھیزنکا تحصیل تھین ضلع فرید آباد کے ایک غیر مسلم گھرانے میں پیدا ہوئے، کچھ بڑے ہو کر اپنے گاؤں کے ایک رئیس چودھری گل خاں کے یہاں گائے بھینسوں کے چرواہے رہے، جوان ہوتے ہوتے آپ کا فطری شعور و وجدان بیدار ہوا اور اپنے گھرانے کی مشرکانہ رسم و رواج سے وحشت سی ہونے لگی چودھری گل خاں اور دوسرے مسلمانوں کے اخلاق کا آپ کی طبیعت پر گہرا اثر پڑا، رفتہ رفتہ آپ نے علمائے کرام کے وعظ وارشاد کی محفلوں میں جانا شروع کیا، وعظ و نصیحت سنکر آپ ان پر عمل کرنے کی کوشش کرتے۔ پنجاب کے کسی عالم کے ہاتھ پر موضع ملائی تحصیل تھین میں آپ نے باقاعدہ اسلام قبول کیا اور پھر ابتدائی تعلیم مولانا محمد رحمۃ اللہ علیہ سے مدرسہ مسجد بنگلہ والی بستی حضرت نظام الدین میں حاصل کی، یہاں سے فارغ ہو کر مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور میں مسلسل آٹھ برس سلسلۂ تعلیم جاری رکھا، دورہ حدیث دارالعلوم دیوبند میں حضرت علامہ محمد انور شاہ کاشمیری سے پڑھا اور دورۂ تفسیر مولانا احمد علی لاہوری قدس سرہ کی خدمت میں حاضر ہو کر پورا کیا ــــ حضرت مولانا محمدؒ کے وصال کے بعد مولانا محمد الیاسؒ نے ہر طرح سے آپ کی کفالت فرمائی۔ حاجی عبدالرحمن اٹاوڑیؒ، میانجی محمد عمرؒ آپ کے احباب میں تھے تبلیغی نقل و حرکت میں ان سب حضرات نے مل کر کام کیا۔ اس کے راستہ کی رکاوٹیں دور کیں، راہیں ہموار کیں اور جماعتوں کی بھرپور نصرت فرمائی ــــ آپ نے موضع رودپڑاکا کی جامع مسجد کی امامت و خطابت کے فرائض انجام دیئے۔ اور موضع مالپوری میں مستقل سکونت اختیار کی، اور تعلیم بالغان

کا سلسلہ شروع فرمایا اور مسلسل محنت سے ایک اچھا خاصا حلقہ بنالیا جن کی پوری زندگی میں ایمان واسلام کی جلوہ گری تھی ان کے عقائد درست کرائے، رسم ورواج کی پابندی سے آزاد کیا، مسائل حیات یاد کرائے، عملی مشقیں کرائیں، اصلاحی ورفاہی کام آپنے سنجیدہ طریقہ پر کئے، سب سے اہم کمزوری عوام میں علمی کمی ہوتی ہے اسے آپنے مذاکرہ ومباحثہ کے ذریعہ دور کیا، جس قدر علمی مسائل مذاکرہ میں آتے انکی عملی تشکیل بھی فوراً کی جاتی، آپنے گو اپنے مدرسہ وتربیت گاہ کو خانقاہ کا نام نہ دیا مگر کام وہی کئے جو خانقاہوں میں انجام پاتے ہیں۔ ایک مومن قانت، روشن ضمیر مربی، ہمدرد استاد اور باوقار مولوی وباعمل عالم کے روپ میں مسلسل چالیس سال علم ودین کی نشر واشاعت فرمائی، اسرار خودی کے رمز آشنا، رموز بیخودی کے سرمایہ دار بنکر رہے حد یہ ہے کہ نذرانۂ امامت و خطابت بھی قبول کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس فرماتے، مطالعہ کتب کے شوقین اور علمی مسائل پر مباحثہ ومذاکرہ کے دلدادہ تھے، فرماتے تھے: اس طرح مسئلہ نکھر جاتا ہے، جس نہج پر آپ نے کام کیا اگر میوات کا ہر مولوی اسی طرح کام کو اپنا شعار بنالے تو قوم کی کایا پلٹ ہوجائے، گفتگو دوٹوک، سادہ اور بے ہچکچاہٹ فرماتے، ہمیشہ وقت کی زبان میں خطاب فرماتے، آپ کی پسندیدہ زبان "ہندوستانی" تھی۔ ضروری اور معیاری کتب کا اچھا خاصا ذخیرہ آپ کے پاس تھا جو آپ کی اہم یادگار ہے، قصبہ تہنگین میں ایک مکتب کا اجرا کیا جسے آپ کے فرزندوں نے اچھا خاصا معیاری مکتب بنالیا ہے حفظ قرآن کا معقول انتظام ہے ۱۹۳۳ء میں آپ کا وصال ہوا اور موضع مالپوری کے جنوب مغرب میں اپنی خریدکردہ پلاٹ میں آپ کی آخری آرامگاہ ہے۔ فرحمہ اللہ تعالیٰ۔

مولوی منیر الدینؒ مجاز شیخ الحدیثؒ کاندھلویؒ

مولوی عبدالکریم کے بعد آپ مدرسہ معین الاسلام کے صدر مدرس ہوئے۔ فارسی اور عربی ابتدائی صرف ونحو وغیرہ میں آپ کی بڑی ٹھوس اور پختہ تھی پنج گنج پوری حاشیہ سمیت طلبہ کو پڑھاتے اور یاد کرادیتے تھے۔ یہاں سے پھر آپ مرکز تبلیغ مدرسہ کاشف العلوم چلے گئے۔ وہاں آپ کو عربی کی ابتدائی کتب پڑھانے کو ملیں جن میں آپ قابل رشک مہارت رکھتے تھے، مولانا محمد یوسفؒ اور مولوی انعام الحسن امیر جماعت تبلیغ آپ کے شاگرد ہیں مرکز سے پھر آپ کو نوح مدرسہ معین الاسلام بھیجدیا گیا۔ آخری عمر تک اسی مدرسہ سے منسلک رہے اب کی مرتبہ یہاں آپ نے درس حدیث دیا، دورۂ حدیث کی کتابیں پڑھائیں۔ آپ موضع کلینجر تحصیل نوح کے باسی تھے، نوح منشی نصر اللہ خاںؒ کے ہاں آپ کی سسرال تھی، جو قصبہ کے بااثر ومعزز اور نمبردار نصیب خاں مرحوم کے فرزند ارجمند تھے۔ مدرسہ معین الاسلام آپ کی موقوفہ زمین میں ہے۔ سسرال آدھا وطن تو ویسے ہی ہوتا ہے۔ آپ نے اسے پورا وطن بنالیا۔ ۴ رجون ۱۹۷۶ء کو وفات ہوئی اور یہیں دفن ہوئے۔ رحمہ اللہ۔

پہونچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

مولوی جمیل احمدؒ مرنجاں مرنج، صلح کل، امن پسند، امکانی حد تک طبقاتی کشمکش سے گریزاں، خوش الحان قاری، جماعتی اور جمعیتی دونوں میدانوں کے ذوق آشنا وسراپا شوق، عمر بھر معلم الصبیانی کی آخری عمر میں آپ موضع بھادس ضلع گوڑگانوہ میں خطیب وامام اور ایک مکتب کے معلم تھے یہیں بروز ہفتہ مورخہ ۱۱ رجون ۱۹۷۷ء جان جاں آفریں کے سپرد کی۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمدؒ م ۱۳۷۷ھ کے مجاز تھے۔ فرحمہم اللہ۔

مولوی محمد یونسؒ نیک، ملنسار اور متواضع بزرگ تھے۔ راقم نے کریما شیخ سعدیؒ آپ سے ہی پڑھی۔ آخری عمر میں قرآن کریم حفظ کیا، تلفظ بہت صاف بلکہ شیریں تھا۔ مدرسہ معین الاسلام میں مدرس تھے۔ مولانا محمد الیاس قدس سرہٗ آپ کے تلفظ و قرأت قرآن کریم کو بہت پسند فرماتے تھے۔ ۱۹۶۱ء میں وفات پائی۔

حاجی نبی خاںؒ قصبہ گھاسیڑہ قرآن کریم کے سلسلے میں آپ کا مرہون منت ہے۔ آپ نے قصبہ ریواڑی میں جاکر قرآن مجید ناظرہ پڑھا حفظ قرآن کا بھی ارادہ کیا مگر حالات سازگار نہ ہوسکے اور آپ نے گاؤں میں آکر مدرسہ معین القرآن کے نام سے ایک مکتب جاری فرمایا۔ عمر زیادہ نہ پائی مگر آپ کے شاگردوں نے آپ کے نصب العین کو اختیار کرکے آپ کی روح کے لئے بالیدگی مہیا کی۔ چالیس سال کی عمر میں وفات پائی اور اپنے گاؤں میں دفن ہوئے۔ فرحمۃ اللہ۔ مشہور شاگرد، میاں جی موسیٰؒ مولوی ایوبؒ، مولوی جمیلؒ، مولوی محمد یونسؒ، میاں جی رحمٰن بخش صاحب وغیرہ

میاں جی موسیٰؒ گھاسیڑہ

آپ اپنی بستی کے بانکے جوانوں میں تھے۔ آپ کے ہم عمر لوگوں کا بیان ہے کہ رتوائی مقامی زبان میں غزل یا واسوخت جیسی شاعری کی ایک قسم۔ بڑی عمدہ گاتے تھے۔ اوّل اوّل شوق علم و ذوق دین ایک صاحب کی تقریر سے پیدا ہوا جو دہلی سے آپ کی بستی میں آتے تھے، علمی و دینی شوق و ذوق آپ کو ایسے وقت ہوا جب کہ آپ کی اولاد بھی پڑھنے کی عمر کو پہنچ چکی تھی۔ چنانچہ آپ کے بڑے صاحبزادے مولوی ایوبؒ نے آپ کے ساتھ پڑھنا شروع کیا حاجی نبی خاں مرحوم اور ان کے شاگرد رشید میاں جی رحمٰن بخشؒ سے آپ نے پڑھنا شروع کیا، مگر قرآن کریم آپ پورا نہ پڑھ سکے،

پھر آپ راج شاہی سلسلہ کے ایک بزرگ صوفی عبداللہ ساکن موضع باولہ سے بیعت ہوئے، ان کی وفات کے بعد انہی کے اشارہ سے حضرت مولانا محمد الیاسؒ سے بیعت ہوئے ابھی زندگی میں کوئی اہم تبدیلی نہ ہو پائی تھی۔ ایک مرتبہ مولانا محمد الیاسؒ کے نام ایک خط آیا جس میں لکھا تھا۔ ہم لوگ ایک بارات میں تھے وہاں کچھ احباب نے جماعت بناکر گشت کیا۔ ہماری تھوڑی سی محنت سے مسجد نمازیوں سے بھر گئی۔ حضرت جیؒ اس سے بہت خوش ہوئے اور جی کھول کر دعائیں دیں۔ میاں جی موسیٰؒ وہیں تھے۔ جب انھوں نے دیکھا کر بزرگوں کی دعائیں لینے کا یہ بھی ایک طریقہ ہے تب انھوں نے "مقامی کام" کی بنیاد رکھی پنج کوسہ گشت شروع کیا۔ اور اپنے ماحول سے کچھ آدمیوں کو لے کر دینی تعلیم و ایمانی زندگی کی تلاش و جستجو میں بستی حضرت نظام الدین اولیاءؒ دہلی آئے اور حضرت مولانا محمد الیاسؒ کی خدمت میں حاضری دی۔ حضرت جیؒ اس عمل سے بہت خوش ہوئے اور دعائیں دیں۔[1] تبلیغی سلسلہ میں پنج کوسہ گشت کی یہ ابتدا تھی جو میاں جی موسیٰؒ کے ذریعہ ظاہر ہوئی۔ خلوص وللّٰہیت اور ذوق و شوق سے چونکہ ابتدا ہوئی تھی اس لئے اس عمل کی اس قدر پذیرائی ہوئی کہ اب یہ گشت تبلیغی نقل و حرکت کے لئے قلب و جگر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے بعد آپ نے اتنے دورے اور گشت کئے کہ ان کی صحیح تعداد بجز خدائے علیم و خبیر کسی کو معلوم نہیں۔ آپ کو بس ایک دھن تھی کہ لوگ کسی طرح صحیح معنوں میں انسان، مسلمان اور مومن بن جائیں، اور یہ معمورۂ ارضی امن کا گہوارہ ہوجائے۔

ٹھیٹ ہندوستانی زبان میں بڑی اچھی تقریر کرتے۔ واقعات سے اور درمیان میں میواتی دوہوں، ضرب الامثال اور کہاوتوں سے مزید دلچسپ بنا دیتے۔ بڑی دلکش اور دل گداز ہوتی تھی آپ کی تقریر، اور بہت نتیجہ خیز۔

---

[1] روایت مولوی عبدالکریم ابن میاں جی موسیٰؒ، استاذ حدیث و ادب مدرسہ عالیہ فتحپوری و جامع رحیمیہ دہلی۔

ایک دن کہنے لگے: میں نے خدا تعالیٰ سے دعا مانگی ہے کہ میری وجہ سے کسی کو تکلیف نہ پہونچے، اور بارگاہِ ایزدی کے انعامات کے پیشِ نظر امید ہے کہ وہ منظور ہو گی۔ چنانچہ رمضان المبارک کے مقدس مہینہ میں جمعرات کی رات میں دس بجے بالو ایاز کے ہوٹل کے سامنے کرسی پر بیٹھے ہوئے، چہرہ پر کچھ اجنبی سے تاثرات دیکھ کر خادم نے پوچھا کیا بات ہے؟ جواب دیا: کچھ نہیں۔ خادم کسی ضرورت سے کہیں گئے، فوراً ہی واپس آ کر جو اس نے دیکھا تو آپ کرسی سے گر کر اپنے مولیٰ سے جا ملے۔ رات کے دس بجے تھے۔ ۱۶ر رمضان المبارک مطابق ۷ر اکتوبر ۱۹۷۲ء/۱۳۹۲ھ۔ بستی کے عام قبرستان میں محو استراحت ہیں۔ فرحمہُ اللہ۔

مولانا عبدالکریم گمتھلویؒ

آپ مدرسہ معین الاسلام قصبہ نوح کے پہلے مہتمم اور صدر مدرس تھے۔ مدرسہ کے بانی و سرپرست مولانا محمد الیاسؒ آپ کو تھانہ بھون سے لائے تھے۔ جہاں وہ خانقاہِ اشرفیہ کے مفتی بھی تھے اور معتمد خاص بھی۔ آپ ایک جید عالمِ دین، تجربہ کار مدرس، پختہ کار مربیّ اور نظم و نسق کے سلسلے کی بڑی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ علم و فن، فکر و عمل، تحمل و احتیاط، اور اپنے بے نظیر و مثالی تقویٰ کے باعث حکیم الامتؒ کے معتمد خاص تھے۔ بڑی سمجھ بوجھ، شفقت و محبت اور دیانت داری کے ساتھ اپنے منصبی فرائض کی انجام دہی میں مصروف رہتے تھے۔ ابھی آپ اپنا یہاں پر پورا کام نہ کر پائے تھے کہ تھانہ بھون آپ کو بلا لیا گیا، مگر آپ کے شاگردوں نے آپ کے نظامِ کار کی تکمیل کی اور میوات میں اہم دینی و علمی خدمات انجام دیں۔ آپ کے مخصوص تلامذہ میں:

مولوی عبدالغفورؒ آپ امیر جماعت تبلیغ مولانا محمد یوسف م ۱۳۸۵ھ اور موجودہ

امیر جماعت مولانا محمد انعام الحسنؒ کے رفیق درس حدیث و تفسیر تھے، تعلیم سے فارغ ہو کر مدرسہ کاشف العلوم بستی حضرت نظام الدین اولیاءؒ نئی دہلی میں مولانا محمد الیاسؒ م ۱۳۶۴ھ کے یہاں تربیت کی خاطر مقیم ہوئے، کچھ دن بھی آپ سے متعلق رہے، عمدہ مدرس تھے۔ بلیغ پیرائے میں کتاب اور فن سمجھاتے۔ مولانا محمد الیاسؒ انہیں میوات کا مفتی فرمایا کرتے تھے۔ عمدہ عالم، متقی اور محتاط و پرہیزگار تھے۔ عربی و فارسی تعلیم کا آپ کی شخصیت پر گہرا اثر پڑا تھا۔ ذہنی طور پر متمدن تھے، رہن سہن، گفتگو، معاشرت ہر شئے پر اسلامی چھاپ تھی، تہذیب و ثقافت کا رکھ رکھاؤ بہت کرتے، گفتگو بڑی نستعلیق ہوتی تھی، طبیعت میں نفاست، مزاج میں لطافت و نزاکت، ذوق کی پاکیزگی اور عصری ضروریات کے ادراک سے بھی وافر حصہ پایا تھا۔ والد صاحب، میاں جی رحمٰن بخش کے رفیق درس ہونے کی وجہ سے راقم پر بہت شفقت فرماتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ انگریزی کا قاعدہ آپ نے مجھے یوں کہہ کر دیا۔ لو، انگریزی سیکھنا، کام آئے گی۔ افسوس کہ میں آپ کا لطیف اشارہ نہ سمجھ پایا۔ ۱۹۲۶ء میں مدرسہ معین الاسلام قصبہ نوح کے صدر مدرس رہے، طبیعت کچھ علیل تھی، مگر یہی بالآخر ۱۹۴۶ء آپ کی وفات کا سبب ہوئی۔ قصبہ نوح آخری آرام گاہ ہوا۔ فرحمہ اللہ تعالیٰ۔

میاں جیو رحمٰن بخش آپ کا مولانا عبدالکریم گمتھلویؒ کے ارشد تلامذہ میں شمار ہوتا ہے قدرت نے آپ کو ذہن رسا، عقلِ سلیم اور فکرِ ارجمند مرحمت فرمایا، مزاج سادہ، اپنے والد مرحوم کی وفات کے باعث تعلیم پوری نہ کر سکے، مگر دینی شعور اور علمی ذوق قابلِ رشک ہے۔ کافیہ تک عربی پڑھی مگر قرآن و حدیث کا بڑی آسانی سے مطالعہ بھی کر لیتے ہیں اور اسی بنیاد پر عمدہ تقریر بھی۔ اب تو اہلِ زمانہ کا ذوقِ فقہ کچھ مضمحل سا ہو رہا ہے، مگر اب سے چالیس پینتالیس سال پیشتر مسلم معاشرہ میں فقہ کی بہت پذیرائی تھی، عموماً دینی مسائل کی پوچھ تاچھ کا سلسلہ تھا۔ جب آپ

کھیت پر ہوتے تو لوگ جنگل میں آپ سے مسئلے دریافت کرنے جاتے اور مطمئن ہو کر واپس لوٹتے۔ اس طرح فقہی مسائل نوادر آپ کے ذہن نشین ہو گئے۔ "بیان القرآن" حکیم الامت تھانویؒ کی مختصر مگر جامع تفسیر قرآن کریم آپ نے کھیت میں ہل چلانے کے دوران مری کی مرکد سستانے کے وقفہ میں پوری پڑھ ڈالی، اور آپ کے ذہن نے اس کی پوری چھاپ قبول کر لی حضرت تھانویؒ کی دوسری کتب بھی آپ نے نہایت توجہ اور انہماک سے پڑھیں۔ اور ان کتابوں میں دین و شریعت کی جو محتاط متین اور نہایت دلچسپ تشریح و توضیح کی گئی ہے۔ وہ آدمی کو دین دار مومن بنانے کو کافی ہے۔ مولانا محمد الیاسؒ نے آپ کو اپنی اصلاحی تحریک کے ابتدائی دور میں ایک مکتب میں بٹھایا۔ جسے آپ کے اُستاذ محترم حاجی نبی خاں مرحوم نے قائم کیا تھا، جو میاں جی موسیٰؒ کے استاذ تھے۔ اور روپیہ سوا روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر فرمایا۔ ایک دفعہ مجتبائی دہلی والوں نے مکتب کا امتحان لیا۔ بہت خوش ہوئے اور دو روپیہ ماہانہ آپ کا وظیفہ طے کیا۔ مگر آپ نے یہ کہہ کر یہ فرمائش قبول نہ فرمائی کہ میں پہلے سے مُوظّف ہوں، مجھے مدرسہ کاشف العلوم سے باقاعدہ تنخواہ ملتی ہے۔ قرآن کریم آپ نے حفظ یاد نہیں کیا مگر بلا مبالغہ سینکڑوں حافظ آپؒ نے بنا دیئے۔ قرآن کریم سے آپ کو قابل صد رشک شغف و محبت ہے۔ ناظرہ پڑھا ہے مگر محراب میں حافظ کی غلطی پر فوراً متنبہ ہو جاتے ہیں۔ ایک دفعہ قاری محمد رضا حسنؒ مدرسہ کاشف العلوم کو سامع دستیاب نہ ہوا آپ بھی اس رمضان میں مرکز آئے ہوئے تھے، کسی نے قاری صاحب کو آپ کا پتہ دیا کہ گو وہ حافظ نہیں مگر آپ کا قرآن کریم ضرور سن لیں گے، قاری صاحب نے آپ کے سامنے اپنی پریشانی بیان کی۔ آپ نے کہا حضرت! میں ناظرہ خواں آپ کا قرآن کیسے سن سکتا ہوں؟ اگر آپ کی یہی خواہش و فرمائش ہے تو دن میں دو تین بار آپ مجھے پارہ سنا دیا کریں، تراویح میں آپ کو ان شاء اللہ غلط نہ پڑھنے دوں گا مگر آپ کو بتانا کہ صحیح کیا ہے میری طاقت سے باہر ہے۔ اس طرح

آپ نے ان کا پورا قرآن کریم سنا، غلطی پر آپ اسے متنبہ کر دیتے۔ یہ راز جب آپ سے پوچھا گیا تو آپ نے جواب دیا کہ کثرت تلاوت اور معانی قرآن ذہن نشین ہونے کے باعث غلطی کا احساس ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم کی تعلیم آپ کی رگ و پے میں سرایت کر گئی اور آپؒ کا یہ ذوق تعلیم قرآن اس حد کو پہنچ گیا کہ اس کے بغیر آپ کو چین نہیں۔ ۱۹۴۷ء میں جب برصغیر کی تقسیم عمل میں آئی، میوات کا اچھا خاصا حصہ پاکستان ہجرت کر گیا، قصبہ گھاسیڑہ میں ایک آپ تھے جنہوں نے پوری بستی کو پاکستان جانے سے روکا، اور پھر یہی بستی پورے میوات کے یہاں ٹھہرنے کا سبب بن گئی۔ فضا میں قدرے سکون ہوا تو آپ نے اپنے چمن مکتب کو سنوارنا شروع کیا اور پھر بحمد اللہ سنورتا ہی چلا گیا۔ مقامی مکاتب کی تاریخ میں شاید ہی کوئی دوسرا مکتب اس مکتب کی ہمسری کا دعویٰ کر سکے۔ کبھی آپ نے علم و دین کو مدارِ معیشت نہیں بنایا، بیس پچیس ایکڑ زمین آپ کے پاس ہے اس کی خود کاشت کرتے ہیں اور یہی آپ کا ذریعہ معاش ہے۔ اسی ذریعہ سے دو دفعہ آپ نے حج کر لیا اور اپنی اہلیہ اور بڑے بیٹے کو حج کی سعادت سے بہرہ ور کر دیا۔ حکمت و طبابت بھی آپ کر لیتے ہیں۔ صبح سویرے اپنے مکتب میں بیٹھے، مریض آتے ہیں، نبض دیکھ کر دوائی نہیں دیتے بلکہ لکھ دیتے، مریض بازار سے خرید کر علاج کرتے ہیں اور اکثر شفایاب ہو جاتے ہیں۔ نبض کی شناخت بڑی خوبی اور عمدگی سے کرتے ہیں۔ راہ میں پڑے ہوئے کاغذ کے ٹکڑوں کو پیر سے نہیں روندتے بلکہ انہیں اٹھا کر صاف کر کے پڑھتے ہیں اس طرح انہیں بہت کچھ ملا اور اَلْحِکْمَۃُ ضَالَّۃُ الْمُؤمِنِ پر عمل پیرا ہو کر بامراد ہوئے۔ آپ بیک وقت معلم الصبیان بھی ہیں اور طبیب بھی، مفتی بھی ہیں اور امام بھی، اپنی بستی اور اس کے مضافاتی دیہات کے الجھے ہوئے مسائل و معاملات کے حکم و فیصل بھی، اور بڑے کسان اور کاشتکار بھی، رفاہی کام بلا معاوضہ کرنے کے عادی، صابر و شاکر، بیعت و سلوک کا سلسلہ مولانا محمد الیاسؒ سے ہے۔ یہ سب کچھ آپ کو اپنے والد ماجد میاں جی سعدی مرحوم کی تربیت و شفقت اور دعاؤں

سے میسر ہوا۔ وہ بڑی اونچی نسبت رکھتے تھے۔ مولانا خلیل احمد سہارنپوری ؒ سے بیعت تھے، ان کی دینداری، ورع و تقویٰ اور احتیاط و تدین کا اندازہ کرنے کیلئے حسب ذیل واقعہ کافی ہوگا۔

ایک دفعہ کوئی "صاحب خدمت" آپکے گاؤں میں تشریف فرما ہوئے۔ آپ نے ان کی دعوت کی، انہوں نے نہایت بشاشت کے ساتھ آپکے گھر کھانا تناول فرمایا۔ یہ جمعرات کا دن تھا۔ جمعہ کی صبح یہ انہیں رخصت کرنے گئے۔ وہ فیروزپور جھرکہ مولانا محمد حسن ؒ کے پیچھے جمعہ پڑھنا چاہتے تھے۔ کچھ دور جاکر انہوں نے مڑکر دیکھا تو فرمایا۔ ارے بھائی تم کیوں...؟ آپکو وداع کرنے! اچھا اچھا بس اب تم جاؤ، اور دیکھنا، پیچھے کی طرف مت دیکھنا۔ یہ بزرگوں کے قدرداں اطاعت و وفاکیشی کے انداز میں سر خم کئے، واپس گھر آگئے۔ جمعہ کے دن دس گیارہ بجے کی بات ہے، موٹر گاڑیاں نہ تھیں اور فیروزپور جھرکہ تقریباً پینتالیس کلومیٹر تھا۔ چلتے وقت اپنے میزبان کو ایک چونی عنایت کی، جو عرصہ تک ذریعہ خیر و برکت بنی رہی۔ وہ بزرگ فیروزپور جھرکہ پہنچے اور نماز جمعہ ادا کی حضرت مولانا محمد حسن ؒ نے، جو جلیل القدر عالم عارف اور بلند نسبت رکھتے تھے، انکی دعوت کرنی چاہی مگر اس بزرگ نے قبول نہ کی۔ مولانا ؒ کو جب کسی ذریعہ سے یہ معلوم ہوا کہ قصبہ گھاسیڑہ میں کسی کے یہاں انہوں نے کھانا تناول کیا ہے تو بڑا تعجب ہوا اور اس میزبان سے ملنے کی خواہش ظاہر فرمائی جنکی رشتہ داریاں فیروزپور جھرکہ کے ماحول میں بہت تھیں۔ مولانا مرحوم نے ان لوگوں سے پوچھا کہ گھاسیڑہ میں اسطرح کا آدمی کون ہے جسکے ہاں اس قسم کے لوگ بخوشی دعوت کھائیں تو میانجی محمد حنیفؒ وغیرہ نے اسکی شہادت دی کہ ہمارے ایک رشتہ دار ہیں۔ میانجی سعدیؒ بڑے دیندار، بڑے پارسا، ایسے والد کے زیر سایہ تربیت کی سعادت خوش بختی و فیروزمندی کی علامت ہے۔ دینی فہم و ادراک، مذہبی شعور و وجدان اور اخلاقی حس اپنا وظیفہ جاری رکھیں تو یہ سب کچھ میسر ہوتا ہے۔ ربّ العزت ہمیں بھی اس نعمت سے نوازیں اور حق تعالیٰ آپکو اپنی عافیت میں رکھے۔ یہ تھے مولانا عبدالکریم گمتھلوی ؒ کے ہونہار شاگرد، جو خود تھانوی خانقاہ کے گل سرسبد تھے۔ فرحمہ اللہ۔

سلسلۂ مداریہ

سلطان العارفین زبدۃ الواصلین

خواجہ سیّد بدیع الدین قطب مدار قدس سرہٗ

ہندوستان کا کون سا فرقہ ہے جو شاہ مدار کو جانتا نہ ہو، مسلمانوں کی عورتوں میں تو جس مہینہ میں آپ کا عرس ہوتا ہے اس کا نام بھی مدار کے ہی مہینہ سے مشہور ہے۔ آپ اس وقت ہندوستان تشریف لائے جبکہ یہاں اسلام کی روشنی بہت کم پھیلی تھی۔ ایک طرف سلطان الہند خواجہ غریب نواز قدس سرہ نے اپنے روحانی تصرفات سے بہت سے دلوں کو اسلامی نور سے منور کیا تھا، دوسری طرف شاہ مدار رحمۃ اللہ علیہ نے ہر پہلو سے ہر طبقہ میں اسلام کے نور سے فیضانِ عام فرمایا، آپ کے خلفاء نے اشاعتِ اسلام میں پورا پورا حصہ لیا، غرض شاہ مدارؒ نے اسلام کی وہ خدمت کی ہے کہ اب تک برابر آپ کا فیض جاری ہے۔ جتنی مقبولیت آپکی عوام میں تھی، اس سے زیادہ خواص میں تھی۔

حضرت شاہ مدار رحمۃ اللہ علیہ جس زمانے میں ہندوستان تشریف لائے اس وقت گو ہندوستان کی سرزمین اسلام کے ابر گوہربار کے فیوض سے محروم نہ تھی مگر ابھی تک بہت کم استفادہ کا موقع ملا تھا۔ ایک طرف تو خواجہ غریبؒ نواز اجمیری علیہ الرحمۃ اپنے روحانی تصرفات و مجاہدات سے ہر طبقہ کے لوگوں کو فیضیاب فرما رہے تھے، دوسری طرف حضرت شاہ مدار قدس سرہ نے مختلف طبقات پر اثر انداز ہونا شروع کیا، یوں اس گنگا جمنا کے دیس میں اسلام کا نور پھیلا ہے۔

آپ نے اول گجرات کالنجر وغیرہ میں چند روز قیام فرما کر خلق خدا کو انوار محمدی سے روشناس کرایا، بعدازاں اور شہروں میں گئے۔ جہاں جاتے

تھے لوگ آپ سے ہدایت و روشنی حاصل کرتے تھے ، اسی سفر میں ریاست الور میں بھی آپ کا گذر ہوا ہوگا چونکہ خواجہ عبدالرحمٰن عرف چوہڑ سدھ اسی دور میں آپ کے مرید ہوئے اور پھر مرتبہ کمال کو پہنچے ، چنانچہ اپنے ماموں سے کہہ دیا تھا ۔

"لے یہ لاٹھی ، لوگڑی .....

ہم پہ مہر مدار کی ہم کس کی چراواں گائے ۔

مگر اس سفر کا صحیح وقت معلوم نہ ہوسکا ، پھر آپ پر حج کا شوق غالب آیا اور آپ حج کے لئے تشریف لے گئے ۔ حج کیا ، مدینہ منورہ حاضری دی اس کے بعد کاظمین ہوتے ہوئے بغداد تشریف لے گئے اور پھر ہندوستان تشریف فرما ہوئے ۔ یہاں آنے سے پہلے اکثر روئے زمین کی سیر فرما چکے تھے ، اب کی مرتبہ ہندوستان تشریف لاکر اجمیر شریف پہنچے اور کوکلا پہاڑی پر قیام فرمایا ۔ خواجۂ خواجگان حضرت اجمیری قدس سرہٗ سے ملاقات ہوئی ۔ دو بزرگوں کی ملاقات کی کیفیت کیا بیان کی جائے اس کے لئے جس شے کی ضرورت ہے وہ ہر ایک کے پاس کہاں ؟؟ بہر حال خاصانِ خدا کی ملاقات کسی امر دنیاوی کے لئے تو ہونے سے رہی دینی علوم اور سلوک و معرفت کے رموز و اسرار ہی زیر بحث آئے ہونگے ، پھر حج کا شوق ہوا اور حج و عمرہ سے فارغ ہوکر جب مدینہ منورہ حاضری دی تو دربار رسالت سے فرمان جاری ہوا :

"بدیع الدین ہم نے تمہارے قیام کے لئے ہندوستان تجویز کیا ہے وہیں تم جاؤ اور رہو سہو اور دین محمدی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کو خوب پھیلاؤ اور اس کی کوشش میں کسی طرح کی کمی نہ ہو"۔

یہ ارشاد سنکر آپ ہندوستان کے ارادے سے چل پڑے چلتے ہوئے حضورؐ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ ہندوستان میں ایک شہر قنوج ہے اس کے میدان

میں جنوب کی طرف ایک تالاب ہے اس کی لہروں سے یا عزیز کی آواز آتی ہے ، وہاں کی زمین تمہارے قیام کے لئے مخصوص کردی گئی ہے تمہارا مسکن وہیں ہوگا اور قبر بھی ۔ اور وہ جگہ مرجع خاص و عام ہوگی ۔ المختصر آپ ممالک عرب کی سیر کرتے ہوئے عجم میں پہنچے ، متفرق ملکوں میں دین محمدی کی اشاعت کرتے ہوئے اجمیر میں کوکلا پہاڑی پر سید جمال الدینؒ اور سید احمدؒ کو چلّہ میں بٹھاکر کالپی تشریف لے گئے یہاں قاضی سید صدر الدین محمد کو بیعت فرمایا اور کچھ دوسرے مشہور و معزز حضرات کو مختلف مقامات پر اپنے حلقۂ ارادت میں داخل کیا ۔ محض مرید بنانے کی خاطر نہیں بلکہ اشاعت اسلام کے واسطے چنانچہ مختلف مقامات پر اپنے خلفاء مقرر فرمادیئے تاکہ اشاعت دین و مذہب کی صحیح نگرانی ہوتی رہے اور کام میں کوئی فرق نہ آئے ۔

آخری دور میں آپ پھر میوات تشریف لائے اور میاں چاند شاہ متوفی ۹۰۰ھ ساکن گھانسولی ضلع الور کو اپنا مرید بنایا اور ان کی تربیت فرمائی وہیں ان کی مسجد وغیرہ بنوائی اور ساتھ ساتھ پیتھول لاڈ کو بھی آپ نے فیضیاب فرمایا ، اور اس کی جائے سکونت بھی مقرر فرمادی ۔

آپ کے حالات بڑے عجیب و غریب ہیں یہ مختصر خاکہ ہے ۔ آپ کی پیدائش شام کے شہر حلب میں بتاریخ یکم شوال ۲۴۲ھ کو ہوئی اور مکن پور صوبہ یوپی میں ، ۱۷ جمادی الاول ۸۳۸ھ کو وصال ہوا ۔

ساکن بہشت تاریخ وصال ہے ۔ فرحمہم اللہ وادخلہم فی الخیر [1]
۸۳۸ھ

---

[1] مدار اعظم ۔

حضرت میاں چاند خاں عرف چاند شاہ مداری

گھانسولی، تحصیل کشن گڑھ، ضلع الور

حضرت خواجہ سید بدیع الدین شاہ مدار م ۸۳۸ھ جب ہندوستان تشریف لائے تو آپ نے پورے ملک میں تبلیغ دین فرمائی۔ علاقہ میوات آپ کی خصوصی توجہات کا مرکز رہا، اس سرزمین میں آپ کے تبلیغی دورے اس کثرت سے ہوئے ہیں کہ پورے میوات میں آپ کے فیض یافتہ مریدین پھیلے ہوئے ہیں، منجملہ ان کے حضرت میاں چاند خاں عرف چاند شاہ مداری رحمہ اللہ ہیں۔

موضع گھانسولی پہلے پہاڑ کی کھوہ میں آباد تھا، وہاں ایک بنیا مسمی پیتھول چھوٹی سی دکان کرتا تھا، مختصر سی دکان کے لئے روزانہ شہر کہاں جانا ہوتا ہے، ہفتہ عشرہ میں ہوتا ہوگا۔ ایک مرتبہ وہ سودا سلف کے لئے بازار جارہا تھا، اس دور میں قصبہ تجارہ کا بازار لگتا تھا یا ممکن ہے قصبہ بہادر پور سادات کا بازار ہو، یہ بھی پہلے دور میں اچھا خاصا قصبہ تھا۔ بہرحال پیتھول کی حضرت شاہ مدار سے مٹ بھیڑ ہوگئی۔ شاہ مدار نے پوچھا، کہاں جارہے ہو؟۔ بنئے نے جواب دیا کہ سودا سلف کے لئے بازار جارہا ہوں۔ شاہ مدار نے اسے محبت بھرے انداز میں جھڑکا اور تھوڑی روئی عنایت فرمائی اور یہ ہدایت کردی کہ کوٹھی (غلہ رکھنے کا مختصر سا گرمحفوظ مکان) میں رکھکر اس کے دروازے پر پہان (کوٹھی کے دروازہ کے لئے مٹی کا بناہوا کواڑ) لگاکر اسے مٹی سے اچھی طرح لیپ دینا، اور نواہنے (کوٹھی میں سے غلہ نکالنے کے دروازے سے بالکل نیچے دیوار میں چھوٹا سا سوراخ) میں سے نکالتے رہنا اور اسے دیکھنے کی

فکر مت کرنا۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ اللہ تعالیٰ کی شانِ بندہ نوازی اور شاہ مدار کی دعا کہ اس روئی میں وہ بنیا نہال ہوگیا، ایک ایک دن میں پانچ پانچ سو اونٹ روئی کے بیچے مگر روئی ختم نہ ہوئی ؎

خدا کی شان یکتائی، جو چاہے برملا کردے
گدا کو شہ بنائے بادشاہوں کو گدا کردے

ایک دن بنئے کی بیوی نے جبکہ بنیا کہیں باہر گیا ہوا تھا کوٹھی کے دروازہ کو کھول کر دیکھا کہ اس میں کیا چیز ہے جو ختم ہونے کا نام نہیں لیتی؟۔ اس کے اندر روئی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا پڑا دیکھا۔ اس کے بعد کوٹھی اسی طرح بند کردی جیسے پہلے تھی جب بنیا آیا تو اس کا تذکرہ کیا، وہ سنتے ہی گھبراگیا، اس کی برکت ختم ہوچکی تھی وہ گھر سے نکل کر اسی جگہ آبیٹھا جہاں آج کل مسجد اور تالاب بنا ہوا ہے، اور اللہ کا میلہ لگتا ہے۔

حضرت شاہ مدار ان دنوں اپنے کسی مرید سے ملنے ریاست نرور گڑھ میں تشریف فرما تھے، آپ نے اس مرید سے فرمایا کہ وہ کافر گاؤں سے باہر بیٹھا ہوا ہے چلو اسے مسلمان بنائیں۔ یہ کہہ کر آپ نے اس مرید کو ساتھ لیا اور موضع گھانسولی پہنچے دیکھا کہ بنیا مبہوت اور پریشان بیٹھا ہوا ہے، آپ نے اسے مسلمان بنایا۔ اتنے میں گھانسولی کا ایک اور شخص مسمی چاند خاں وہاں آگیا اور شاہ مدار سے نظرِ عنایت کا طالب ہوا۔ سچی طلب کو ٹھکرایا نہیں جاتا، اور حقیقی جستجو کبھی بیکار نہیں جاتی۔ شاہ مدار نے اسے بیعت فرماکر اس پر توجہ کی اور آناً فاناً مالا مال کردیا۔

آپ مع اپنے مریدوں کے ابھی وہیں تشریف فرما تھے کہ اولوں کی بارش شروع ہوگئی، اور اولے بھی موٹے موٹے، یہاں کوئی سائبان بھی نہ تھا، آپ نے فرمایا، اب کیا کیا جائے؟ اللہ تعالیٰ نے اپنے برگزیدہ بندوں پر ترس کھایا اور

جنوں کے ذریعہ سے وہاں فوراً چھوٹی سی مسجد تیار ہوگئی ، آپ مریدوں سمیت اسمیں تشریف فرما ہوئے ۔ بارش تھمنے پر آپؒ تو تشریف لے گئے ، اور بنئے کو تالاب کے جنوب مغرب میں رہنے کی جگہ دیدی گئی جہاں اس کا خاندان اب بھی آباد ہے اور میاں چاندشاہ قدس سرہٗ اس مسجد میں بیٹھ کر فیض رسانی کرنے لگے ۔

جب بھی آپ کے پاس کوئی ضرورت مند آتا آپ اسے ہدایت فرماتے کہ بھائی سائیں (اللہ تعالیٰ) سے لو لگاؤ ، اسے یاد کرو ، نماز پڑھو اور جو کچھ نذرونیاز خدا کے لئے لایا ہے وہ مسجد میں دے دے ، یہیں سے وہ تمہاری ضرورت پوری کرے گا ۔

چونکہ مسجد اللہ کا گھر ہے اس لئے اس کا چڑھاوا بھی خالص گھی کا ہوتا ہے اسی باعث یہاں کے عرس کو 'اللہ کا میلہ' کہتے ہیں ۔

مسجد بہت مختصر سی ہے بغیر گردن جھکائے داخل ہونا ممکن نہیں ، کہتے ہیں یہ مسجد کچی ہے اور تقریباً چھ سو سال پرانی ہے ۔ شاہ مدارؒ نے آخری سفر ہند اپنی وفات سے چند سال پہلے کیا تھا اس لئے قرین قیاس یہ ہے کہ شاہ مدار کے آخری سفر ہی میں یہ واقعہ پیش آیا ۔ واللہ اعلم بالصواب[1]۔

---

[1] روایت از نصیب خاں سابق سجادہ نشین درگاہ گھانسولی الور (۱۰ ر صفر ۱۴۰۲ھ مطابق ۹ ر دسمبر ۱۹۸۱ء)

خواجہ عبدالرحمٰن عرف چوہڑسدھ

چاند ولی ۔ الور

چوہڑسدھ سوجا میو کا پسر تھا موضع دھولی دھوپ پرگنہ الور اس کا گھر تھا ، ماں اس کی موسوم بہ امیری تھی ، بہ مفلسی سے حاصل اسے فقیری تھی ۔ سوجا میو پدر چوہڑسدھ کا زراعت کرتا تھا اور جمع سرکاری بقدر کاشت اراضی بھرتا تھا ۔ ایک سال تہی بختی سے کشتِ امید اس کی بار ور نہ ہوئی یعنی پیداوار غلہ بقدر ادائے زر نہ ہوئی ۔ دانہ دانہ اس نے مالگذاری میں دے دیا بلکہ چارہ تک کے دینے میں بھی صرفہ نہ کیا تاہم باقی دار رہا اور بسبیل باقی میں عاجز ولاچار رہا ۔ حاکم نے بعلت باقی داری اس کو قید کر دیا اور شکنجہ تکلیف حوالات میں اٹھا کر دھر دیا ۔ چوہڑسدھ اس وقت میں نادان تھا اور گرفتاری پدر سے بدگمان تھا کہ ایسا نہ ہو کہ میری بھی کوئی خبر پہنچائے اور سپاہی حاکم آکر مجھے پکڑ لیجائے ، پس اس وہم میں پابند افکار ہوا کہ پاؤں اس کا اٹھ گیا اور گھر سے فرار ہوا اور موضع سونٹھ کھریڑہ کی سیدھی راہ لی وہاں اس کا ماموں رہتا تھا اس کے پاس پناہ لی ، اس کے ماموں نے اس کی بہت سی آؤ بھگت کی اور سپرد اس کے کھیت جوار کی حفاظت کی اس نے بچوں کی طرح کھیل کود میں لاابالی کی اور ہر طرح سے فوت خدمت رکھوالی کی ، اس کی اس غفلت میں جانوروں نے اپنا کام کر لیا یعنی غلہ جوار کو چند ہی روز میں چر لیا ، بھٹیا تو کھی رہ گئیں گا یٹھہ چڑیوں میں سب کہہ گئیں ۔ جب مامی چوہڑسدھ کھیت کاٹنے آئی اس نے ہر بھٹی دانوں سے خالی پائی ، یہ دیکھتے ہی وہ مشت غم سے دل کو مسوسنے لگی اور غصہ میں بھر کر چوہڑسدھ کو کوسنے لگی ، جو وہ بدکلامی کا اس کے منہ سے راگ نکلا سنتے ہی چوہڑسدھ رنجیدہ

وہاں سے بھاگ نکلا اور موضع ساہوڑی پرگنہ الور براہ راست آیا، ساہو گوجری نے اس کو اپنے گھر ٹھہرایا، وہ دولت فرزندی سے بے نصیب تھی اور اس غم سے مرنے کے قریب تھی چوہڑسدھ کو عطیہ خداداد سمجھ کر اپنی فرزندی میں لائی اور مرض روحانی رنج سے اس نے صحت پائی۔ چوہڑسدھ متبنی ہوکر مادہ گاواں ساہو کی چرانے لگا اور پہاڑ میں مویشی لے کر ہر روز جانے لگا۔ ایک دن کوئی فقیر صاحب کشف و کمال اس پہاڑ میں چلا آیا اور چوہڑسدھ کو مویشی چراتا جو اُسنے پایا دل اس کا طرف شیر کے مائل ہوا برآں چوڑسدھ سے اس کا سائل ہوا چوہڑسدھ نے کچھ بھی انکار نہ کیا اور شیر مادہ گاؤ فقیر صاحب کو نکال دیا۔ فقیر صاحب اوس کے حسن خدمت پر نہایت شاد ہوئے اور اوس کور چشم کو ہادی ارشاد ہوئے اور بیک نگاہ اپنے رنگ میں اوسکو ایسا شرابور کیا کہ ظاہر و باطن سب ربانی معرفت میں بوند کر دیا اور یہ بھی مشہور ہے کہ وہ فقیر صاحب شاہ مدار تھے لیکن تحقیق نہیں کہ کون بزرگوار تھے، انھوں نے چوڑسدھ کو ولی بنا کر راستہ لیا اور چوڑسدھ نے سووے کرامات کو سستا کیا، مویشی کو چوڑسدھ نے ساہو گوجری کے گھر پہنچایا اور آپ اس پہاڑ میں کہ جہاں اب ان کا مکان ہے چلا آیا؛ یہاں گروا نامی ایک جوگی اقامت پذیر تھا اور سحر سامری میں وہ بے مثل و بے نظیر تھا۔ چوہڑسدھ کا وہاں رہنا اس کو ناگوار ہوا اعمال سحر سے وہ اوس کے درپے آزار ہوا، گاہے جادو کے اژدھاؤں سے ڈرایا کبھی شیرانِ سحر کا لشکر اس پر چڑھایا، الغرض تہدید و تخویف چوہڑسدھ میں کوئی امر اوس نے باقی نہ چھوڑا جب سب ترکی تمام ہوئی جوگی نے عاجز ہوکر کان اپنا مروڑا اعنی چوڑسدھ پر اس کے عمل ناپاک نے کچھ تاثیر نہ کی جوگی نے زبوں ہوکر پھر جادو کی کوئی تدبیر نہ کی چوڑسدھ کی ہیبت و کرامت ایسی اوس کے دل میں سمائی کہ کسی طرح اوس پہاڑ میں اوس کو نیند نہ آئی گروا سامری علیہ اللعنۃ کو گالیاں دیتا ہوا وہاں سے چلدیا اور بدھنا بوریہ اوٹھا کر ایسا بھاگا کہ پھر

اوس طرف منہ بھی نہ کیا افضال الٰہی چوڑسدھ کے ساتھ رہا کہ کھیت اوس معرکہ کا اوس کے ہاتھ رہا پھر تو سب چوڑسدھ کو پوجنے لگے اور دور دور سے آکر آدمی اوس کو پوچھنے لگے، ہندو اور مسلمانوں کا وہ پیر ہوا اور مسکن اوس کا کعبۂ حاجات غریب و امیر ہوا یہاں تک اس نے نام پایا کہ تمام ملک اوس پر اعتقاد لایا، جب اس نے راہ عدم کی لی لوگوں نے وہیں قبر اس کی بنائی۔ پھاگن بدی چودس کو اوس جگہ میلہ بڑی دھوم دھام سے ہوتا ہے اور وہ میدان اس درجہ تنگ کثرت ہجوم سے ہوتا ہے کہ تل رکھنے کو جگہ نہیں ملتی ہے اس قدر دنیا آکر ملتی ہے۔

دو پیسے کو بھی ایک مشک ہاتھ نہیں آتی ہے، وجہ یہ کہ چاہ کا وہاں نشان نہیں یعنی اوس ویرانہ میں کہیں کنواں نہیں پہاڑ کچھ کچھ جھرتا ہے تھوڑی سی جگہ وہ پانی بھر ہے اوس سے آدمی جیتے ہیں اور وہی پانی سب پیتے ہیں اور جو بکرے چڑھاوہ چوہڑسدھ کے ہوتے ہیں گوشت ان کا اسی پانی میں دھوتے ہیں، اسی باعث وہ پانی بھی لال رہتا ہے اور ہندو مسلمان کو وہ حلال رہتا ہے اس مسئلہ میں سب سے زیادہ یہ عمدہ بات ہے اور بظاہر وہ نقد کرامات ہے کہ کوئی مرد کسی عورت سے نہیں بولتا بلکہ نگاہ بد سے طرف مستورات کے آنکھ بھی نہیں کھولتا چنانچہ ابھی تک اوس پر عمل ہے اور خلق میں وہ بات ضرب المثل ہے[1]

---

[1] مرقع الور ص ۲، ۳، ۴، ۵

شاہ عبداللطیف ارغونی

مشائخ متاخرین میں ایک بزرگ تھے ۔ یہ ایک بار سیاحت کرتے ہوئے گوڑگاؤں کے مضافات میں ایک موضع میں پہنچے اور اقامت پذیر ہوئے ان کے مرید خدمت میں حاضر نہیں ہوئے اور کوئی خاص التفات نہیں کیا ، انکی سادہ وضعی کو دیکھ کر کوئی بزرگ آدمی نہ سمجھے اور کسی دوسرے کے مرید ہوگئے ۔ یہ بزرگ ان کی کج روی سے مکدر ہوئے اور دریافت کیا کہ اس موضع کا نام کیا ہے ؟ کسی نے کہا: 'کھور' ۔ تو آپ نے فرمایا: "یاں ناچیں مور" ۔ اور وہاں سے چل پڑے ان سیف زبان کے یہ فرمانے کے بعد یہ گاؤں برباد ہوگیا اور مور بکثرت پیدا ہوگئے ۔ یہ گاؤں اپنی ویرانی میں ضرب المثل ہوگیا ، گاؤں کے رہنے والے دوسری جگہوں پر چلے گئے ۔

مریدوں نے جب یہ حال دیکھا تو آپس میں مشورہ کیا تو اس نتیجہ پر پہنچے کہ چونکہ ہم نے اپنے پیر و مرشد کے ساتھ بے ادبی کی ہے ، اس لئے ہمیں انکی خدمت میں پہنچکر عفو تقصیر کی درخواست کرنا چاہئے ۔

ان مریدوں میں سے اکثر سفر کرکے کمن پور پہنچے اور ان کے قدموں میں گر پڑے ، پیر صاحب راضی ہوگئے اور انھیں مریدوں کے ساتھ اس موضع میں واپس آگئے ۔ واپس آکر پیر صاحب نے پھر پوچھا کہ اس موضع کا کیا نام ہے ؟ کسی نے کہا: 'کھور' ۔ فرمایا: "بسے گھنگور" اور یہیں قیام کرلیا ۔ اس کے بعد سے یہ موضع آباد ہوگیا ۔ اور یہاں کے رہنے والے مالدار ہوگئے ۔ یہ موضع اب تک آباد ہے اور یہ حکایت وہاں کے لوگوں کی زبان پر ہے ۔ ان کی وفات کی تاریخ ۱۲ر رجب المرجب ـــــــہ ہے [1]

[1] تذکرۃ ج ۲ ص ۶۶ - ۶۷ فصل چہارم

غازی گدن رح

مشہور اسی نام سے ہیں مگر گدن کسی اجنبی زبان کا لفظ ہے ۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ آپ کا اصلی نام غضنفر علی ہے ، عوام کی زبان پر یہی غازی گدن ہوگیا ۔ مزار مقدس آپ کا قریب مسجد نو محلہ کے ہے ۔ عہد محمد اکبر شاہ میں خرقہ کرامت در بر رکھتے تھے ، اگرچہ خاندان آپ کا مدار یہ تھا مگر بہ نیت حصول نعمت دربار حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمہ میں زیر موری کہ ہنوز آپ کے نام سے مشہور ہے ، پڑے رہتے تھے

براحت نرسید آنکہ زحمت نکشید

آخر محنت شاقہ اٹھا کر دولت نعمت سے مالامال ہوئے ، بر اں خدمت ولایت تجارہ حاصل کرکے مریدوں کے ساتھ تجارہ کو تشریف لاتے تھے موضع کانگرہ پرگنہ کشن گڑھ میں پہنچکر رفع حاجت کو ٹھہرے تھے ، قضارا کسی ہمراہی نے خوشہ ہائے باجرہ ایک کھیت سے توڑ لئے ، مالک کھیت کی عورت حفاظت پر تھی اس نے جو دیکھا کہ کوئی بال توڑ کر لئے جاتا ہے دشنام دہی کرتی پیچھے چلی آئی ۔ جب قریب میانہ شاہ گدن صاحب کے پہنچی اور شاہ صاحب نے اس کا غوغا سنا ، پوچھا کون ہے ساتھیوں نے کہا: عورت ہے ۔ آپ نے فرمایا کہ اس کا کیا نام ہے کسی نے عورت سے پوچھا کہ شاہ صاحب تیرا نام پوچھتے ہیں ۔ اس نے شاہ صاحب کو بھی برا بھلا کہا ۔ جب آپ کے مریدوں نے اس کے نام معلوم کرنے میں اصرار کیا تو اس نے "مان بی بی" نام بتلایا ۔ آپ نے ارشاد فرمایا: "مان بی بی کیا ہے 'مان بابا' ہے" ۔ آپ کی زبان سے اس کلمہ کے نکلتے ہی اس عورت میں علامات مردمی ظاہر ہونے لگیں ۔

پائے مردانگی کے پرتو دامن میں سے چراغ نے دی لو

یہ ماجرا دیکھکر وہ گھر دوڑی ہوئی گئی اور اپنے شوہر سے سارا واقعہ تبلا دیا۔ وہ بیہودہ تیر و کمان اٹھاکر دوڑا آیا۔ اس عرصہ میں شاہ صاحب سکھ پال میں سوار ہوکر تھوڑی دور چلے تھے کہ اس مردود نے قریب پہنچکر ایسا تیر مارا کہ دوسار ہوگیا۔ حضرت نے وقت نزع مریدوں کو وصیت کی کہ جس جگہ سے ہمارا سکھ پال۔ رکھنے کے بعد۔ نہ اٹھ سکے وہیں ہمکو دفن کرنا، چنانچہ جائے مزار مقدس پر پہنچکر مریدوں نے دم لینے کو میانہ رکھا تھا، پھر جو اٹھانے لگے میانہ نہیں اٹھا اس لئے حسب وصیت تجہیز و تکفین عمل میں لاکر اسی جگہ دفن کردیا۔ دیوان عیدی میں تاریخ شہادت حضرت شاہ گدن تسع والف۔ ایکہزار نو تحریر ہے۔ عہد شاہجہانی کے خلیل اللہ خاں حاکم تجارہ نے آپکی خانقاہ تعمیر کرائی اور خواجہ محمد شعیب تجاروی نے یہ قطعہ تصنیف کرکے دروازہ گنبد پر ارقام فرمایا۔

از طفیل لطف حضرت شہ گدن نیکو سیر یافتہ بانی ایں گنبد خلیل اللہ بود
گرچہ در "دیوان عیدی" آمدہ تسع والف لیکن ایں گہ شعیب ہم گفت ظل اللہ بود

درگاہ غازی گدن کے سجادہ نشین آپ کے ان مریدوں کی اولاد میں سے ہیں جو آپ کے ساتھ ساتھ تھے، واسطے مصارف درگاہ ڈیڑھ سو بیگھ زمین واقع سواد قصبہ تجارہ عہد اکبر شاہ سے معافی صیغۂ عطا اور روشنی درگاہ کو سوا پیسہ سا بر چبوترہ سے روپیہ ملتا ہے عرس آپ کا ۸ شوال کو ہوتا ہے۔[1] تاریخ وفات ۸/۱۰/۱۰۰۸ھ ہے۔

---

[1] از رنگ تجارہ ص ۳۰، ۳۲

شیخ کپور مجذوب گوالیاری

حسینی سادات میں سے تھے، شروع میں فوجی ملازمت کی، مگر ایک دم اسے چھوڑکر پانی پلانے کا شغل اختیار کیا، پردہ نشین بیوہ عورتوں کے گھر رات میں پانی پہنچاتے اور مخلوق کو بغیر اجرت پانی پلاتے، اور اس میں اس قدر منہمک ہوئے کہ ہر کاروبار سے علیحدگی اختیار کی، گویا ایک قسم کا جذب طاری ہوگیا، عام انداز میں بات نہ کرتے، ضعف و بے چارگی کے طور طریق اپناتے اور اپنے آپ میں گم رہتے۔

می شدم دست بدیوار ز ضعف از کویت
آمدی جلوہ کناں صورت دیوار شدم

آخری عمر میں گوالیار کے ایک گوشہ میں سکونت اختیار کرلی، پھر وہیں کے ہو رہے وہ اس جگہ اکثر سر جھکائے مراقبہ میں دکھائی دیتے تھے، حاضرین مجلس میں کسی کے دل میں اگر کچھ پوچھنے کا خیال آجاتا تو مجذوبوں کے انداز میں ہذیانی کیفیت سے بڑبڑاتے ہوئے اس کا جواب دے دیتے جس سے اس کی مشکل حل ہوجاتی، پوشیدہ اور ان دیکھی باتوں کی خبریں بیان کرتے رہتے، کبھی ایسا ہوتا کہ پوری پوری رات قیام میں گذر جاتی۔

میں نے معتبر لوگوں سے سنا ہے کہ ایک سید ولایت سے آیا، اور آپ سے آپ کی سیادت کی دلیل پوچھی۔ آپ نے فرمایا: لکڑی جمع کی جائیں اور ان میں خوب آگ بھڑکائی جائے۔ پھر آپ نے اس ولایتی کا ہاتھ پکڑکے فرمایا: "آیئے ہم دونوں اس آگ میں داخل ہوں"

تا سیہ رو شود ہر کہ در وغش باشد

ولایتی سیّد آگ میں گھسنے سے جھجکا اور آپ آگ میں کود پڑے اور بسلامت واپس تشریف لائے۔ اس جیسی بہت سی کرامات آپ کی منقول و مشہور ہیں ۹۷۹ھ کے کسی مہینہ میں رات کو آپ کی یہ کیفیت ہوئی کہ دوڑتے بھاگتے اور سانپ کہتے جاتے تھے اسی حال میں ایک بلند دروازہ پر چڑھے اور گر گئے۔ گرتے ہی جان جان آفریں کے سپرد فرمائی۔

علامہ فیضی نے تاریخ وفات نکالی "کپور مجذوب"۔ گوالیار میں آپ کی خانقاہ اور مزار ہے[1]

شیخ عبدالحق محدث دہلوی (۹۵۸ھ ۱۰۵۲) [2] نے آپ کے ذکر خیر کا عنوان بلانسبت تحریر فرمایا ہے: "بابا کپور مجذوب" پھر فرماتے ہیں:

"کالپی کے رہنے والے تھے، ابتدا میں سلوک کا طریق بہت طے کر چکے تھے، سقائی پیشہ کرتے تھے، راتوں کو ضعیفوں کے گھروں میں پانی بھرا کرتے تھے، آخر ایک شب جو حالتِ جذب ان کو نصیب ہوئی، فتوحات کے دروازے کشادہ اور اہل علم کے دل ان کی طرف رجوع ہوئے۔ گوالیار میں رہتے تھے۔"

نقل ہے کہ وہ اکثر حالتِ سکر میں رہتے تھے، مگر بعض طبعی حاجتوں کے وقت ان کو افاقہ ہو جاتا اور کئی کئی روز بعد تھوڑا سا کھاتے تھے اور کپڑا فقط سترِ عورت کے موافق استعمال کرتے تھے، اور اکثر اوقات وہ بھی نہ ہوتا تھا۔

---

[1] منتخب التواریخ ج ۳ ص ۵۰، ۵۱ [2] اردو دائرۃ المعارف ج ۱۲ ص ۸۳۰

لوگ عمدہ عمدہ کپڑے ان کے پاس لاتے اور وہ دوسرے لوگوں کو بخش دیتے، اور امیروں کو اپنے پاس کم آنے دیتے تھے، ان سے خوارق بہت نقل کرتے ہیں۔ ان کا سلسلہ شاہ مدار متوفی ۸۳۰ھ پر منتہی ہوتا ہے۔ عمر بہت بڑی ہو گئی تھی، اور بہت اسرار سے خبر دیتے تھے، ان کی تاریخ وفات بعض فضلاءِ عصر نے

کپور مجذوب کہی ہے[1]

۹۷۹ھ

میوات کے مشہور گاؤں "اٹاوڑ" میں ایک خانقاہ اور مزار ہے تعمیر مزار شاہی طرز کی ہے، کہتے ہیں اکبر نے بنوایا تھا، اوپر سے کھلا ہوا ہے۔ صاحب مزار "کودر کپٹ" کے نام سے مشہور ہیں۔ دیہات میں مجذوب کپور کو کور کپٹ بنا لینا نادر نہیں ہے۔ شیخ محدث دہلوی نے جائے وفات و مدفن تحریر نہیں فرمایا اس لئے اگر کپور مجذوب کو اٹاوڑ میں تسلیم کر لیں تو کیا حرج ہے؟ جبکہ مداری سلسلہ بڑی کثرت سے میوات میں پھیلا ہوا ہے۔ میانجی منگل مرحوم کے متعلق سُنا ہے کہ وہ فرماتے تھے: "اس مزار میں کوئی دفن نہیں"۔ مگر اس قدر کہنا تو کافی نہیں، ثبوت میں کچھ دلائل بھی تو چاہئیں۔

مزار کے ماحول میں جہاں میاں صاحب آباد ہیں وہیں سقّے بھی رہتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

صاحب "تذکرۃ المتقین فی ذکر خلفاء السیّد بدیع الدین" نے بڑی تفصیل سے بابا کپور مجذوب کا ذکر خیر کیا ہے:-

ترجمہ و خلاصہ: ذکر حضرت سید شاہ عبدالغفور عرف بابا کپور قدس اللہ سرہٗ

بابا صاحب سیّد شاہ راجی کے مرید و خلیفہ تھے اور وہ حضرت قاضی حمید

---

[1] اخبار الاخیار اردو ترجمہ۔ برہان ص ۳۰۵

کے مرید و خلیفہ اور وہ حضرت سلطان التارکین، برہان العاشقین مولانا قاضی مطہروی کے اور وہ مرید و خلیفۂ اجل حضرت سید الموحدین عمدۃ الاطہار سیدنا سید بدیع قطب الاقطاب قطب المدار قدس اللہ اسرارہم کے تھے۔

آپ کا وطن کالپی تھا۔ تحصیل علم ظاہری کے بعد علم باطن اور لقاء الٰہی کا شوق جو آپ کے گوشۂ دل میں مکنون تھا، ابھرا، اور پیر کی تلاش میں سفر اختیار کیا۔

اس زمانہ میں حضرت سید راجی کے فیض و کرم کا شہرہ عالمگیر تھا۔ آپ بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا ازلی حصہ جو سینہ بہ سینہ چلا آرہا تھا، حاصل کیا۔

بیعت کے بعد اوائل حال میں آپ نے ریاضت شاقہ اختیار کی اور سالہا سال سقائی کرتے رہے۔ ضعیفوں اور مسکینوں کے مکانوں پر پہنچتے اور ان کے مٹکے اور گھڑے پانی سے بھر دیتے۔ صاحب جذبہ قویہ تھے۔ استغراق کی حالت میں رہتے تھے۔ کھانے پینے کی طرف کچھ توجہ نہ کرتے۔ جس وقت جذب اور استغراقی کیفیت میں کچھ کمی ہوتی تو غلے کی قسم میں سے کسی چیز کے کچھ دانے تناول فرمالیتے۔ آپ نے طویل عمر پائی اور لباس میں ستر عورت پر اکتفا کرتے تھے۔

آپ امراء کو اپنے پاس بہت کم آنے دیتے تھے اور جو کچھ روپیہ پیسہ اور لباس امیر لوگ بھیجتے تھے، وہ فقیروں اور مسکینوں کو دیدیتے۔ آپ سے بہت سی کرامتیں ظاہر ہوئیں جن سے محظوظ ہو کر حضرت سید راجی شاہ نے آپ کو خرقۂ خلافت پہنایا اور اپنا جانشین مقرر کیا۔ آپ نے خلافت اور جانشینی کا کام اس خوش اسلوبی سے انجام دیا کہ سید شاہ راجی کے تمام مرید تاحیات

پروانہ وار ان کے گرویدہ اور فدائی رہے۔

آپ کے سات بڑے خلیفہ صاحب سلسلہ اور اہل ارشاد ہوئے ہیں اور ان میں سے ہر ایک سے ایک جداگانہ گروہ جاری ہوا اور ایک لقب خاص سے ملقب ہوا۔ ان سات کے علاوہ دو سلسلے اور بھی آپ کے خلفاء سے جاری ہوئے اور اس حساب سے نو شعبے ہو گئے۔ تفصیل ان کی اس طرح ہے:-

۱	گروہ اول	عاشقان امام نوروزی
۲	گروہ دوم	عاشقان سوختہ شاہی
۳	گروہ سوم	عاشقانِ کمربستہ
۴	گروہ چہارم	عاشقان لعل شہبازی
۵	گروہ پنجم	عاشقان باباگوپالی
۶	گروہ ششم	عاشقان مکھا شاہی
۷	گروہ ہفتم	عاشقان کلامی
۸	گروہ ہشتم	عاشقان کمال قادری
۹	گروہ نہم	عاشقان کریم شاہی

ذکر امام نوروز

آپ ہندوستان میں شاہی تزک و احتشام کے ساتھ جہاد کے ارادہ سے آئے تھے مجاہدین کی جماعت کثیر آپ کے ساتھ تھی۔ جب حضرت باباکپور کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ارادہ بدل گیا اور تمام نقد و جنس اور شاہی سکے مسکینوں اور مریدوں میں تقسیم کر دیئے۔

ان امام نوروز سے جو لوگ منسلک ہوئے وہ بہ لقب امام نوروزی مشہور

وئے اور تجرد و تنہائی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔

عاشقان سوختہ شاہی

سیّد عابد خاکسار خاکہ مالی "عاشقان سوختہ شاہی" کے سرگروہ تھے حضرت باباصاحب کی جانب سے "عاشقان سوختہ شاہی" کا خطاب ملا تھا۔ اکثر اوقات حالت جذب میں یہ نوبت پہنچتی تھی کہ جل جائیں۔ اس صورت میں آب افشانی گلاب پاشی اور خوشبو وعطر وغیرہ سنگھانا کچھ کارگر نہیں ہوتا تھا۔ لوگ سمجھتے کہ روح جسم سے پرواز کر گئی لیکن خود بخود کچھ دیر کے بعد افاقہ ہو جاتا۔

سیّد عابد قدس سرہٗ کے اکثر مرید اسی حالت میں جاں بحق تسلیم ہوئے ان کے مرید دنیوی آگ سے بالکل نہیں ڈرتے بلکہ اس کو پھولوں کا انبار سمجھتے ہیں۔ یہ آگ ان کو نہیں جلا سکتی بلکہ وہ اس کو پامال کر دیتے ہیں۔ اس گروہ کے فقراء کہتے ہیں کہ حالتِ جذب میں اگر آتشِ سوزاں ان کے ہاتھ میں آجاتی تو وہ کھا لیتے ان کو کوئی ضرر نہ پہنچتا۔ سوختۂ عشقِ الٰہی کا خطاب ان کو ان کے پیر و مرشد نے عنایت کیا تھا۔ اور جس نے ان سے توسّل ڈھونڈا" وہ "سوختہ شاہی" کے نام سے مشہور ہوا۔

عاشقانِ کمربستہ

حضرت شاہ عبدالحیٔ الملقب بہ شاہ درگاہی کمربستہ حضرت شاہ عبدالغفور کے جانباز مریدوں میں سے تھے، آپ بڑے مستعد اور عبادت گزار بزرگ تھے۔ آپ مرتبۂ ولایت پر فائز تھے۔ خواب و خور اور حوائج ضروریہ سے بے تعلق تھے اور ہمہ اوقات ریاضت و عبادات میں کمربستہ تھے۔ باباصاحب نے

اسی وجہ سے آپ کو "عاشقانِ کمربستہ" کے نام سے ملقب فرمایا۔ آپ سے بہت سی کرامات کا ظہور ہوا۔

عاشقان لعل شہبازی

شاہ امان اللہ درویش دہلوی، باباصاحب کے خلفاء میں سے تھے، "لعل شہباز" آپ کا خطاب تھا۔ چنانچہ آپ نے خود فرمایا ہے کہ جس طرح اکسیر کے ڈالنے سے تانبا سونا بن جاتا ہے اور آفتاب کی نظر سے پتھر لعل بے بہا بن جاتا ہے۔ اسی طرح پیر بے نظیر کی نظر فیض اثر نے مجھے طلائے خالص اور لعل بے بہا بنا دیا۔ اور اپنی زبان فیض ترجمان سے "لعل" کو جو جمادات سے تعلق رکھتا تھا شہباز فرما کر انتہائی لطف و کرم فرمایا ہے۔"

اسی لئے جو گروہ آپ سے تعلق رکھتا ہے وہ "لعل شہبازی" کے لقب سے ملقب ہے۔

عاشقان باباگوپالی

باباگوپال ہندوستان کے امراء میں سے تھے۔ شوق فقر میں تمام ثروت و حکومت چھوڑ دی اور ہندوستان کے اہل استدراج فقیروں میں سے ہو گئے۔ جب باباصاحب سے دوچار ہوئے تو ان کا استدراج سلب ہو گیا اور باباصاحب کے قدموں میں گر گئے اور اسلام قبول کیا۔ حضرت باباصاحب نے آپ کی صلاحیتوں کے پیش نظر اپنی آغوش عاطفت میں لے لیا اور اس طرح باباگوپال کے تمام چیلے بھی داخل اسلام ہو کر حضرت باباصاحب (باباکپور) کی اسلامی تعلیمات اور طریق ریاضت و عبادت سے مستفید ہوئے آپ صاحب تصرف بزرگ

تھے اور جو سلسلہ آپ سے جاری ہوا وہ "عاشقان باباگوپالی" کے لقب سے ملقب ہوا۔

عاشقان لکھا شاہی

میراں لکھا شاہ ولی قدس سرہٗ مرید اور خلیفہ سید شاہ عبدالغفور کے تھے اولیائے زمانہ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ آپ کا مزار شریف ریاست ناندیڑ (حیدرآباد دکن) میں زیارت گاہ خلائق ہے۔ جو گروہ آپ سے وابستہ ہے وہ "عاشقان لکھا شاہی" کے لقب سے مشہور ہوا۔

عاشقان کلامی

حضرت شاہ معروف کلامی، امام نوروز کے خلفاء میں سے تھے اور حضرت شاہ فتان درویش کے بھی خلیفہ ثانی تھے۔ شاہ فتان کا مزار کراولی میں واقع ہے اور سلسلۂ نوروز جاری ہے۔

حضرت شاہ معروف علمائے متکلمین میں سے تھے، چونکہ منطق اور کلام میں بہت ماہر تھے اس لئے "کلامی" کے لقب سے ملقب ہوئے۔ پیر و مرشد کی آپ پر خاص نظر تھی ایک دن فرمایا کہ "اے کلامی جو سلسلہ تجھ سے جاری ہوگا وہ بھی میرے بھائیوں کے القاب سے ملقب ہوگا" چنانچہ نو گروہوں میں "عاشقان کلامی" کا سلسلہ بھی جاری ہے اور یہ پیر و مرشد کے فضل و فیض کا نتیجہ ہے۔

عاشقان کمال قادری

یہ گروہ حضرت مولانا شیخ کمال الدین قریشی سے متعلق ہے۔ آپ اوّلاً خاندانِ عالیہ قادریہ سے وابستہ تھے جب حضرت شاہ عبدالغفور سے ملے تو تمام

تعلقات کو ترک کر کے بیعت ہوئے اور ظاہری و باطنی تجرید و تفرید میں پوری عمر بسر کی آخر کار اجازت و خلافت حاصل کر کے ولی کامل ہوئے۔ "سیر الفقراء" و "ریاض الفقراء" آپ کی تصنیف ہیں۔

میاں تہور حسین شاہ سجادہ نشین اور میاں دھونسہ شاہ اسی سلسلہ میں ہیں۔ ان کے بھائی میاں رحیم شاہ اور ان کے مرید جہانگیر مرزا تیموری بھی اہل کمال میں سے ہیں۔

عاشقان کریم شاہی

یہ شعبہ شیخ کریم الدین خلیفہ شیخ کمال الدین قریشی سے جاری ہے۔ اس سلسلہ کے "فقرا کریم شاہی" کہلاتے ہیں۔ آپ بڑے بافیض اور کریم النفس بزرگ تھے۔ تلقین و ارشاد آپ کی زندگی کا محبوب مشغلہ تھا۔ آپ کا مزار شریف گوالیار میں ہے اور زیارت گاہ عام ہے۔

۱۳ ذی قعدہ ۹۸۹ھ کو وصال ہوا۔ بہت سے شعراء نے آپ کی تاریخ وفات کہی ہے۔ یہاں صرف ایک تاریخی قطعہ لکھا جاتا ہے:-

رفت از دنیا چو در خلد بریں — مستِ الفت عاشق صادق کپور
سال تاریخ وصال آں جناب — ہست صادق پاک ہیں عاشق کپور

---

[1] تذکرۃ المتقین حصہ دوم از صفحہ ۹۱: ذکر حضرت شاہ سید عبدالغفور عرف باباکپور قدس سرہٗ.... ..... تا صفحہ ۹۷

شیخ شمس خاں رحمۃ اللہ علیہ

گوڑگانوہ بستی

کالے خاں	بھورے خاں	چھوٹے سید صاحب
(مرید)	(مرید)	(مرید)

شیخ شمس خاں رح کے متعلق بسمبرہ میں کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ رمزو شاہ نے صرف اس قدر بتلایا جو شاہ ولایت طبقاتی کے ذیل میں مذکور ہوا۔

گوڑگانوہ گاؤں کے شمالی جانب ایک خانقاہ ہے اور اس کی معافی میں ملی ہوئی کچھ جائداد بھی ہے۔ اس مزار کی آمد تقریباً آٹھ دس ہزار روپیہ سالانہ ہے۔ پہلے یہ وقف بورڈ پنجاب کے زیر انتظام تھا، چودھری طیب حسن (ایم پی) اس وقت پنجاب بورڈ کے چیرمین تھے۔ وہ گوڑگانوہ شہر میں قیام پذیر تھے وہیں ان کی کوٹھی ہے۔ جب ان کا ٹرم ختم ہونے کو آیا تو انھوں نے گوڑ گانوہ میں فی الحال آباد مسلمانوں سے کہا کہ تم اس مزار کی آمد سے اپنے یہاں مدرسہ قائم کر لو۔ ایک انجمن بناکر اس کی دیکھ بھال کر لیا کرنا۔ اس مزار پر جب پہلی مرتبہ آزادانہ عرس ہوا تو مجھے بھی اس میں شرکت کا موقع ملا۔ صاحب مزار کا نام پوچھا تو جواب ملا: "شمس خاں" میں نے یہ نام اپنی یادداشت میں لکھ کر رکھ لیا۔ ۱۹۷۰ء میں جب بسمبرہ جانے کا اتفاق ہوا اور رمزو شاہ سے شمس خاں کا نام اور بزرگوں سے ان کا تعلق سنا فوراً ذہن ادھر منتقل ہوا، اب قیاس یہ ہے کہ:- شمس خاں کسی ضرورت سے گوڑگانوہ تشریف لے گئے۔ وہاں ان کی وفات ہوگئی وہاں کے باشندوں نے ان کی تدفین اپنے یہاں ہی کی۔ ممکن ہے کہ

کہ ان کی وصیت بھی ہو کہ جہاں ان کا انتقال ہو وہیں ان کی تدفین عمل میں آئے۔

اس قیاس کی کچھ وجوہ ہیں:-

۱۔ شاہ ولایت جنھیں شمس خاں بسمبرہ لائے ان کی تو اس قدر پذیرائی کہ مزار پختہ اور گاؤں کے چاروں طرف ان کیلئے معافیات اور شاہ شیث کا مزار بھی پختہ پھر شمس خاں کا مزار کہاں ہے! بسمبرہ میں بہت کچھ تلاش کے بعد بھی کوئی مزار پختہ نہ ملا۔

۲۔ میو قوم عام طور پر مسنون طریقہ پر تدفین کی عادی ہے، اگر کوئی بہت بڑی شخصیت ہو اور اس سے فیضان عام بھی ہو تو اس کی قبر پختہ بنا دیتے ہیں۔

۳۔ شمس خاں کی شخصیت اس قدر اہم تو یقیناً تھی کہ ایک چشمۂ فیض کو بسمبرہ منتقل کر دیا اور خود بھی اس سے سیراب ہوئے اور اپنی بستی، اپنی قوم اور اپنے ماحول کو بھی اس سے محروم کرنا انھیں گوارا نہیں ہوا۔

۴۔ ایک دور میں گوڑگانوہ ضلع بہت وسیع تھا ممکن ہے بسمبرہ سے کسی رشتہ دار کے ہمراہ شمس خاں گوڑگانوہ تشریف لائے ہوں اور یہیں ان کی وفات ہوئی ہو۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حضرت ولایت علی شاہ طبقاتی مداری رحمۃ اللہ علیہ

آپ کریم النفس، سلیم الطبع بزرگ تھے۔ ایک مرتبہ حضرت سید بدیع الدین قطب المدار قدس سرہٗ کے عرس شریف میں حاضر تھے، تکیہ شیر علی شاہ میں قیام تھا، ایک رات موقع پاکر ان کی سواری کا بیش قیمت گھوڑا چور لے گئے۔ اور چاہا کہ راتوں رات کسی ایسی جگہ لے جائیں کہ کوئی سراغ نہ لگا سکے۔ اس گھوڑے کو ہر چند دوڑاتے اور طرارہ دیتے تھے لیکن اپنے آپ کو مکن پور آبادی میں ہی پاتے تھے۔ جب رات تمام ہونے کے قریب آگئی تو انھوں نے گرفتار ہو جانے کے ڈر سے اس گھوڑے کو چھوڑ کر فرار ہو جانا چاہا لیکن ان پر ایسی تکان (تھکن) سوار ہوئی کہ قدم نہ اٹھا سکے اور نابینا ہو گئے۔ آخر انھیں خیال آیا کہ یہ سب اس کا اثر اور نتیجہ ہے کہ آنجناب (ولایت علی شاہ) کے گھوڑے کو ہم نے چرایا ہے۔ لہٰذا اس شائستہ گھوڑے کی لگام پکڑ کر گرتے پڑتے حضرت کی خدمت میں پہنچے اور آپ کے قدموں میں گر پڑے اور گناہ کی معافی چاہی۔ آپ نے سب سے توبہ کرائی کہ آئندہ کبھی چوری نہیں کریں گے۔ توبہ کے بعد فرمایا کہ یہ گھوڑا تمہارے حوالے کیا جاتا ہے، اس لئے کہ تم نے اس کی وجہ سے بہت تکلیف اٹھائی ہے۔ آپ کے اس ارشاد سے چوروں کی بینائی واپس آگئی، لیکن گھوڑا لینے سے انکار کیا اور معذرت چاہی لیکن ان کی یہ معذرت آپ نے قبول نہیں فرمائی اور گھوڑا انھیں کو دیدیا۔ آپ کا آستانہ بسمبرہ[1] ملک میوات میں زیارت گاہ بن گیا ہے۔

رمزو شاہ ۔ موجودہ سجادہ نشین درگاہ بسمبرہ کا بیان ہے کہ حضرت شاہ ولایت

[1] تذکرۃ المتقین ج ۲ ص ۱۰۳

طبقاتی نے تربیت موضع سرولی تحصیل بلب گڈھ میں اس وقت وہاں کے سرخیل قلندراں سے پائی اس کے بعد وہ موضع دھلاوٹ تحصیل نوح ضلع گوڑگانوہ چھوٹے شاہ کے یہاں حاضر ہوئے، جو حضرت میاں راج شاہ سوندھہ متوفی ۱۳۰۶ھ کے تربیت یافتہ تھے، ان کی خدمت گزاری کی، شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ کا جب وصال ہوا تو انھیں خیال ہوا کہ شاید انھیں کو شاہ جیؒ کا جانشین بنایا جائے گا۔ مگر ایسا نہ ہو سکا۔ یہ وہاں سے استنجار کے ارادے سے لوٹانے کر نکلے اور کوہ اراولی ہی میں رہائش اختیار فرمائی۔

شمس خاں بسمبرہ کا باشندہ کوہ اراولی کھوڑ لیسی کسی کام سے آیا، انھیں ایک وجیہہ اور بارعب بزرگ دکھائی دیئے۔ ان کی خدمت میں حاضری دی، خیر و عافیت کے بعد اِدھر اُدھر کی باتیں ہوئیں، اب شمس خاں وہ نہیں رہا تھا جو بسمبرہ سے چل کر آیا تھا بلکہ اس کی کایا پلٹ ہو چکی تھی، اس نے بے تابی سے ان بزرگ کی خدمت میں یہ درخواست پیش کی:

"حضرت آپ ہمارے گاؤں چلیں وہاں مجھے بھی فائدہ ہوگا اور میرے ساتھ ساتھ اہلِ بستی اور اس کا ماحول بھی مستفید ہوگا۔"

یہی تھے شاہ ولایت طبقاتی ـــــ شمس خاں کی گذارش رائیگاں نہ گئی بلکہ شاہ صاحب نے وعدہ فرمالیا۔ اچھا ہم وہیں چلیں گے جہاں تم چاہتے ہو، شمس خاں نے کہا: حضور یہ اونٹنی حاضر ہے آپ نے فرمایا: تم چلو میں آجاؤں گا، اس وقت آپ ایک بڑے پتھر پر تشریف فرما تھے، جو تقریباً ڈیڑھ گز لمبا اور ایک گز چوڑا اور ایک فٹ سے زیادہ موٹا تھا، آپ اس پر سوار ہو کر بسمبرہ شمس خاں سے پہلے پہنچ گئے۔ بسمبرہ کے شمالی جانب ایک تالاب ہے وہاں رہائش پسند کی وہ پتھر جس پر سوار ہو کر آپ بسمبرہ پہنچے اب بھی آپ کی خانقاہ میں مزار سے مغربی جانب ایک

واژن میں زمین پر بچھا ہوا ہے، ایک بھاری بھرکم شخص باطمینان اس پر نماز پڑھ سکتا ہے۔

حضرت شاہ ولایت طبقاتی جب بسمبرہ[1] پہنچے تو جس تالاب کے جانب شرق آپ نے رہائش فرمائی اس کے جانب غرب ایک غار تھا اس میں ایک بزرگ تھے، آپ نے انھیں اس غار میں سے نکالا۔ یہ شاہ شیت علیہ الرحمۃ تھے، وہیں ان کی وفات ہوئی، مزار بھی اسی جگہ ہے یعنی تالاب کے جانب غرب تاریخ وفات معلوم نہ ہو سکی۔

حضرت شاہ ولایت طبقاتی کی تاریخ وفات بھی مجہول ہے مگر اس قدر طے ہے کہ آپ کی وفات اپنے روحانی مرکز خانقاہ مداریہ مکن پور میں ہوئی[2] اور تدفین موضع بسمبرہ میں واقع ہوئی۔

آپ کے فیوض و برکات سے بسمبرہ کا ماحول بقعۂ نور بن گیا۔ آپ کی خانقاہ آپ کے بعد مندرجہ ذیل بزرگوں کے ذریعہ آباد رہی۔

(۱) غربت شاہ (۲) گلاب شاہ (۳) حیدر شاہ (۴) حسین شاہ متوفی ۱۲۹۹ھ و ۱۳۰۳ھ (۵) روشن شاہ (۶) محبت شاہ متوفی ۱۹۲۹ء سروئی (۷) رمز دشاہ ولادت اندازاً ۱۳۳۰ھ موضع گانوڑی ضلع بھرتپور میں ہوئی (موجودہ سجادہ نشین۔ گو تعلیم یافتہ نہیں مگر محنت و ریاضت کی ہے۔ راقم کو ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہے جون ۱۹۷۰ء)

---

[1] قصبۂ شبیرہ تذکرۃ المتقین میں اسے شین معجمہ کے ساتھ لکھا ہے مگر عوام میں سین مہملہ کے ساتھ ہی رائج ہے۔ یہ جگہ کوسی کلاں ضلع متھرا کے شمال مشرق میں تقریباً ۱۰ میل کے فاصلے پر ہے بہت بارونق اور خوشحال اور برج میں ہونے کے باعث بڑا سندر گاؤں ہے۔ جی لگتا ہے۔ شاہ ولایت رحمۃ اللہ علیہ جب یہاں تشریف لائے تو یہاں کے لوگوں نے بارہ سو بیگہ زمین ان کے مصارف خانقاہ کے لیے وقف کر دی۔ اب بھی اس کی آمد مختلف گاؤں سے آتی ہے۔ [2] تذکرۃ المتقین فی ذکر خلفاء سید بدیع الدین مدار جلد ۲ ص ۱۰۳ ایضاً

سید حیدر علی شاہ طبقاتی مداری رحمۃ اللہ علیہ

آپ شب بیدار اور تہجد گزار تھے۔ حضرت قطب علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ تھے۔ تجرید و تفرید میں عمر بسر کی۔ آپ کا سلسلہ تیرہ ۱۳ واسطوں سے حضرت مصباح العاشقین شیخ الاسلام والمسلمین مولانا قاضی مطہر قلہ شیر قدس سرہٗ سے ملتا ہے پنجاب آپ کا مولد ہے۔ آپ نے پاپیادہ بیت اللہ شریف کا حج کیا اور بہت زیادہ سیر و سیاحت فرمائی۔

سفر سے واپس آکر مکن پور کی جامع مسجد میں مقیم ہو گئے۔ راقم السطور نے اکثر دیکھا کہ جو کچھ ان کے پاس ہوتا ہر سال مسکینوں پر خرچ کر دیتے اور بدن کے کپڑوں کے علاوہ اپنے پاس کچھ نہ رکھتے۔ مہمانداری اور مسافر نوازی ہمیشہ ملحوظ رہتی آپ کی عمر سو سال سے زیادہ تھی ۱۲۹۹ھ میں اللہ کو پیارے ہوئے۔ آپ کی قبر جامع مسجد عالمگیری کے مینار کے نیچے جانب جنوب واقع ہے۔

قطعہ تاریخ وفات

آشنائے قلزم فقر و فنا حیدر علی — رفت از دار البقا جو جانب خلد بریں
ہاتف غیبی بگفتہ مصرعہ تاریخ او — شد ز دنیا اہل باطن اہل دیں حلت گزیں[1]

۱۲۹۹ھ

---

[1] تذکرۃ المتقین جلد ۲ ص ۱۰۳

حضرت خاکی شاہ رحمۃ اللہ علیہ ساکرس

حضرت خاکی شاہ ابنی رحمۃ اللہ کا روضۂ مبارک بلند زیارت گاہ خلائق قصبہ ساکرس تحصیل فیروز پور جھرکہ ضلع گوڑگانوہ میں موجود ہے، سالانہ آپ کا عرس ہوتا ہے جائیداد جاگیر وقف کردہ سلاطین دہلی تاہنوز ان کے خلفاء کے قبضہ و تصرف میں ہے اور چند مقامات پر جاگیرات موجود ہیں؛ موضع مُرودڑہ، رنیالہ، اولیڑہ وغیرہ میں اہل تجرید آپ کے خلفاء و مریدین ہنوز اس پر قابض و متصرف ہیں، سجادۂ تلقین ہدایت معمور ہے۔

حرم محترم باب جنوبی کے باہر جانب مشرق بلند چبوترہ پر حضرت سید شاہ معین الحق ابن علی بابا ابن صدرنشین نبیرۂ خاص سجادہ نشین موصوف آسودہ ہیں، یہ شاہ صاحب موصوف صاحب سلسلہ ہیں۔ پانچ گروہ فقراء مجردین ملنگان مدار کے آپ سے نافذ و جاری ہوئے ہیں:

۱۔ ابنی، ۲۔ نقدار غونی، ۳۔ سلوتری، ۴۔ سرموری، ۵۔ سکندری،

ان پانچوں شعبوں کی باعث آپ کی ذات والا صفات ہے۔ اور ان پانچوں شعبوں کی ملقب خادماں سے شہرت ہے۔

نقدار غونی حضرت سید ابو محمد ارغون سجادہ نشین قدس سرہٗ کی ذات سے مخاطب ہے۔ چونکہ شاہ ابنؔ صاحب مذکور چوتھی پشت میں سجادہ صاحب موصوف کے نبیرۂ خاص ہیں لہذا نقدار غونی تو بذات خود ہی تھے اور عالم تجرید میں سو سال تک جو آپ کے خلفاء و مریدین مجردین گذرے ہیں ان کی تشریح کی یہاں گنجائش نہیں دیگر کتب میں مرقوم ہے، لیکن دو خلیفۂ اجل روزگار ہیں:-

یکے صاحب شاہ اللہ بخش رحمۃ اللہ علیہ جن کے خلفاء و مریدین تاہنوز خادمان اپنے مشہور و معروف ہیں، اس گروہ میں ہزارہا بزرگ کاملین وقت اور عارف باللہ گذرے ہیں، انھیں میں سے حضرت خاکی قدس سرہٗ ہیں۔

شاہ محمد مراد رحمۃ اللہ علیہ حسن پور بارہ تجارہ الور

حضرت شاہ ابنؔ صاحب صدرنشین کے خلیفۂ ثانی سید جمال شاہ صاحب سلسلہ ہیں جن کا مزار پختہ مع دیگر عمارت مکن پور شریف میں ملحق چاہ میرٹھ موجود ہے اور شاہ جمال موصوف کے خلیفہ حضرت سید شاہ سلوتری شہید صاحب سلسلہ ہیں۔ آپ کے خلفاء مریدین ملقب "خادمان صلوتری" مشہور ہیں۔ اس گروہ میں بڑے بڑے بزرگ، عارف باللہ، صاحب نسبت ولی کامل گذرے ہیں رحمھم اللہ تعالیٰ اجمعین

منجملہ ان کے حضرت شاہ محمد مراد صاحب ولی کامل جن کی بارگاہ بلند موضع حسن پور بارہ پرگنہ تجارہ ریاست الور میں ہے حضرت شاہ مراد صاحب سنہ ۱۱۱۱ھ میں بقید حیات تھے، تین موضع مسلم بجمیع حقوق معافی و داخلی و خارجی وقف کردہ و نذر کردہ شاہ عالمگیر ثانی تاہنوز موجود ہیں اور الور ریاست سے تین سو روپیہ سالانہ نقد وظیفۂ نذر حاصل ہوتا ہے اور ہزارہا بیگہ اراضی معافی جا بجا مواضعات معافی کے ہیں۔

خلاصۂ حال آپ کا یہ ہے کہ موضع باٹھور جیٹ کے راجپوت باغی غارتگر

تھے ، ان کی شکست کو فوج شاہی نے ایک پہاڑ پر متصل موضع نیملی قریب کالا پہاڑ قیام کیا تھا ، راجپوتوں کا موضع پہاڑ پر معمور تھا ، مصاحبین شاہی وسپہ سالار شاہی مع افواج مدت دراز تک بغرض گرفتاری غارت گراں مقیم رہے ، بعد فتح کرنے اس مقام لشکر وغیرہ تو دہلی کو واپس ہوگیا ، لیکن مصاحبین میں سے یہ تین برادر یعنی محمد حسن خاں محمد حسین خاں اور محمد اسمٰعیل خاں نے تین مواضع اس جنگل میں اپنے ناموں سے آباد کئے جو تا ہنوز موجود ہیں ۔ محمد حسن خاں کے فرزند اکبر محمد مراد خاں مالک و زمیندار موضع حسن پور کے تھے ۔

موضع مالیرجٹ میں شاہ انور علی مداری مجذوب سے آپ بیعت ہوئے ، مدت دراز تک خدمت میں مقیم وحاضر رہے ، حسن پور سے وہ موضع قریب دو میل کے ہے ۔

شاہ انور علیؒ

شاہ انور علیؒ کا شجرۂ مرشدیہ یہ ہے :

"شاہ انور علی طبقات مرید وخلیفہ شاہ حاضر علی طبقات ، وہ مرید وخلیفہ شاہ گوہر گلزار مداری ، وہ فرزند وخلیفہ شاہ صلوتر موصوف الصدر باعث گروہ صلوتری خادمان مداری ذات حضرت شاہ صلوتر قدس سرہٗ کی ہے ۔ حضرت سید شاہ جمالؒ سے آپ بیعت طریقت وخلافت حاصل کر کے مکن پور شریف سے اجازت مرشد پاک سے لے کر ہدایت خلق اللہ فرماتے ہوئے موضع مستمناکب دریائے جمن ضلع بلند شہر تک آ پہنچے تھے کہ اہل موضع نے کمال عقیدت وخدمت کے ساتھ ٹھہرایا ایک مدت دراز تک موضع مذکور میں آپ کا قیام رہا ، بہت سی خلقت کو فیضان برکت سے مستفید فرمایا ، یہیں آپ کا وصال ہوا آپ کا مزار اسی موضع

میں ہے ، سالانہ عرس ہوتا ہے" ۔

منجملہ آپ کے خلفاء مریدین کے چار خلیفہ زبردست ، صاحب سلسلہ اور اجلۂ روزگار گذرے ہیں :

شاہ نور محمد رحمۃ اللہ

آپ کا مزار فیروز پور جھرکہ ضلع گوڑگانوہ میں ہے ۔

شاہ تاج محمد رحمۃ اللہ

آپ کا مزار موضع پالی ضلع بھرتپور میں ہے ۔

شاہ حاجی مدح مستؒ مجذوب رحمۃ اللہ

آپ کی آخری آرام گاہ موضع دھولیٹ ضلع بھرتپور میں ہے ۔

حضرت شاہ گوہر علی المشہور گوہر گلزار مست دیدار رحمۃ اللہ

آپ کی زیارت گاہ موضع نوگانوہ خانزادگان پرگنہ تجارہ ریاست الور میں ہے ۔ چوتھے بزرگ کے خلیفہ شاہ حاضر علی طبقات موضع مذکور میں آسودہ ہیں ، اس موضع میں پچاس بیگہ اراضی وقف کردہ بادشاہ دہلی تا ہنوز موجود ہے ۔ یہ شاہ حاضر علی رحمۃ اللہ حضرت شاہ انور علی رحمۃ اللہ مالیرجٹی کے مرشد ہیں[1] ۔

شاہ محمد مرادؒ بیعت ہونے کے بعد ترک تعلق فرما کر بجوش عشق الٰہی مرشد پاک کی خدمت میں معروف رہے ، بعد وصال مرشدؒ کے اپنے موضع میں مقیم ہوئے ، اور حالت تجرید میں مشغول تھے ، اسی زمانے میں عالمگیر ثانی نے یہ ہر سہ موضع آپ کے نام معافی وقف کئے ہیں ۔ آپ کی بارگاہ بلند پختہ مع جامع مسجد پختہ قلعہ کی مانند تا ہنوز موجود ہے ۔

---

[1] قطب المدار ۔ مرقع درگاہ شریف مکن پور ۔

مہاراجہ سورج مل والئی بھرتپور نے عزم میوات فرمایا اور بھرت پور سے روانہ ہوکر خیمہ ان کا جانب فیروزپور جھرکہ آیا، وہاں سے سوئے تجارہ نہضت کی، اور نیملی سے آگے بڑھ کر کمالات صوری و معنوی میاں مراد شاہ کی اصغائے حقیقت کی، واقعی اس وقت میں خرق عادات ان کے جوں مہر درخشاں تھے، ہر کس و ناکس کرامات باہرۂ میاں صاحبؒ کے ثنا خواں تھے،

مہاراج سورج مل نے جو حال ان کا گوش زد فرمایا، بے اعتقادی سے اس کا باور نہ آیا، بر آں چاہا کہ ان کا امتحان لے اور حقیقت ان کی پہچان لے وہ کہ ہمراہ مہاراج صاحب ایک ہاتھی مست تھا، اور سب ہاتھیوں میں وہ زبردست، اسکے فیل بان کو مہاراج نے بلایا اور یوں ارشاد فرمایا کہ اس فیل کو لے جاکر مہاراج پر ہول دے، اور اس کی خرطوم ایذار سے ان کی دوکانداری کو دھول دے، فیل بان بے ایمان نے بھی مطابق حکم عمل کیا کہ فیل مست و دیو سرشت کو میاں صاحبؒ پر ہلہ کردیا۔ بھلا شیران حق پرست پر کوئی حملہ کرسکتا ہے، ہاتھی کیا دیو بھی طرف ان کے قدم نہیں دھر سکتا ہے، جب میاں صاحبؒ تھوڑی دور رہے، فیل نے ان کو سجدہ کو سر جھکایا، فیلبان نے ہر چند ہر چند گجباک سے دباغت دی لیکن اس نے قدم بھی آگے نہ اٹھایا، بمشاہدہ اس کے طائر ہوش مہاراج صاحب اڑگئے اور کوچہ بدگمانی سے اسی وقت جانب شاہراہ اعتقاد مڑگئے، یعنی ہودج سے پیادہ پا خدمت میاں صاحب میں آئے اور تقصیر کے عذر خواہ ہوکر عذرات درمیان لائے چونکہ دل فقیروں کا بے کینہ ہے اور گرد و غبار سے پاک سینہ ہے، میاں صاحب نے اس حرکت ناشائستہ کا کچھ ملال نہ فرمایا، اور ساتھ مہربانی کے مہاراج صاحب کو پاس بٹھلایا، مہاراج صاحب تھوڑی دیر بیٹھ کر اٹھ آئے۔ اور دل سے کرامت میاں صاحب پر یقین کامل لائے، بر ایں حکم تیاری مکان میاں صاحب صادر کیا (ر)

موضع حسن پور سے مصارف ان کے معافی میں دیا، ہنوز وہ گاؤں معافی میں چلا آتا ہے، محاصل اس کا خرچ میں فقیران درگاہ میاں صاحب کے آتا ہے۔

اور پوشیدہ نہ رہے کہ سہارنپور میاں صاحب کا اصلی مکان تھا، اور مداریہ آپ کا خاندان تھا، مرشد سے فیض کمال پاکر موضع حسن پور ہی آئے تھے، اور اہل میوات کو اپنے حلقۂ اطاعت میں لائے تھے[1]

درگاہ شاہ مرادؒ کے سجادہ نشین خواجہ محمد کمال الدین المشہور میاں گلشن شاہ نہایت مرد نیک بخت، صالح، عابد، شاغل اور کاسب ہیں، تمام اشیاء محرمات سے مثل گانجا، بھنگ اور چرس وغیرہ سے آپ کو سخت نفرت ہے، آپ کے مرید و دیگر پیر بھائی اور خانقاہ کے سب باشندے پابند نماز روزہ وغیرہ کے ہیں پان کھانے کے علاوہ آپ حقہ بھی نوش نہیں کرتے، بیشتر اوقات اشغال میں مصروف رہتے ہیں، اوقات متعینہ پر کچھ جائیداد کے تعلقات کو ملاحظہ فرماتے ہیں، اور جو علماء، مسافرین وغیرہ میہمان مکان ہوتے ہیں۔ ان کی نہایت خاطر داری کی جاتی ہے، بلکہ علماء و مشائخ کو زاد راہ بھی دیا کرتے ہیں۔ ایک مکان مہمانخانہ علیحدہ تعمیر ہے روزانہ مسافر مہمان جس میں قیام کرتے ہیں، ان کو بلا تکلف دو وقت کھانا کھلایا جاتا ہے اور جو میہمان جب تک بخوشی خاطر خود نہ جائے وہ اٹھایا نہیں جاتا، آپ کا مکان (خانقاہ) دو قصبوں کے یعنی فیروز پور جھرکہ و قصبہ تجارہ کے درمیان لب سڑک واقع ہے۔ بلا ناغہ روزانہ میہمان مسافر چند در چند آکر مقیم ہوتے ہیں اور ہر فرد بشر۔ غریب و امیر کو کھانا دیا جاتا ہے، آپ مجرّد ملنگان مدار سے ہیں۔ شجرۂ مرشدیہ آپ کا یہ ہے۔ خواجہ محمد کمال الدین میاں گلشن شاہ

[1] مرقع الور۔ منشی محمد مخدوم تھانوی؟

مداری مرید و خلیفہ میاں گلاب شاہ طبقات، وہ مرید و خلیفہ شاہ پیر علی طبقات
وہ مرید و خلیفہ جمعہ شاہ مجذوب طبقات، وہ مرید و خلیفہ شاہ جمعیت علی طبقات
وہ مرید و خلیفہ شاہ دائم علی طبقات، وہ مرید و خلیفہ شاہ محمد مراد مجذوب ممدوح الصدر
زمیندار و معافی دار موضع حسن پور وغیرہ۔

۱۰، ۱۱ رجب المرجب کو حضرت شاہ محمد مراد رحمۃ اللہ کا عرس ہوتا ہے۔ ،
ہر چہار جانب سے مخلوق زائرین حاضر ہوتے ہیں اور تین شبانہ روز مقیم رہتے ہیں۔
بذریعہ تنور طعام پختہ ہوتا ہے اور تمام حاضرین کو متواتر کھلایا جاتا ہے، کنوؤں سے مسلسل
چلاکر حوض کو، جو مکان کے درمیان ہے، بھرا جاتا ہے، تمام مصارف عرس کے آپ
ذمہ دار ہیں، اور نذر و فتوح کے بھی آپ کے مریدین کی صحیح تعداد بیان نہیں کر سکتا
جن میں نہایت لائق و فائق قاضی سید محمد مبین و قاضی شیخ محمد اسحق ہیں۔

اور اس سلسلے یعنی گروہ صلوتری کے صدہا مقامات مملکت ہند (غیر منقسم)
میں موجود ہیں، جن کی تشریح کی یہاں گنجائش نہیں۔ موضع نوگانوہ خانزادگان مذکور الصدر
میں سجادہ نشین گوہر علی شاہ طبقات ملنگ مجرد ہیں قصبہ تجارہ کے مکاندار سجادہ
نشین میاں برکت علی شاہ نوجوان نیک بخت ہیں[1]۔

---

[1] یہ مسلسل مضمون قطب المدار۔ مرقع درگاہ شریف مؤلفہ سید علی شکوہ سے ماخوذ
ہے کچھ تبدیلی کے ساتھ۔

قاضی مغیث الدین بیانوی

شیخ عالم، فقیہہ صالح، علامہ مغیث الدین بیانوی، ہندی فقہائے احناف
کے جلیل القدر راہنما، علاء الدین خلجی کے عہد میں وہ علم و عمل کے منتہائے کمال پر فائز
تھے، اسی وجہ سے انھیں سلطان خلجی نے اپنا قاضی القضاۃ بنایا تھا یعنی عدالت
عالیہ کا سربراہ، سپریم کورٹ کے چیف جسٹس، بادشاہ کو ان کا قرب بہت
مرغوب اور پسند تھا، تنہائی میں اہم معاملات میں ان سے گفتگو کرتا تھا۔ بادشاہ
انھیں اپنے خاص دسترخوان پر بھی بلاتا رہتا تھا۔ دیگر علمائے عہد کی بہ نسبت
ان کے ساتھ زیادہ حسن ظن رکھتا تھا، اللہ تعالیٰ نے قاضی القضاۃ کو صلاح و تقوی سے
اس قدر آراستہ فرمایا تھا کہ وہ حق بات کہنے میں بادشاہ وقت سے بالکل خوف
نہ کھاتا تھا[1]۔

یہ قاضی صاحب کی بلند مرتبتگی اور علمی جاہ و جلال ہی کی کرشمہ سازی
تھی کہ علاء الدین خلجی نے ان کے فضل و ہنر اور علم و عمل کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں
اپنی قلمرو ہند کا قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) بنایا، ورنہ وہ، بقول شیخ محمد
اکرام، مذہبی عالموں اور قاضیوں کی کوئی قدر نہ کرتا تھا اور کہتا تھا کہ انھیں اتنی
لیاقت نہیں ہوتی کہ رموز مملکت داری سمجھ سکیں، یہ بادشاہ کا کام ہے کہ سلطنت
کے لئے قواعد و ضوابط نافذ کرے۔ شرع اور اہل شرع کو اس سے کوئی تعلق نہیں،
البتہ جھگڑوں اور مقدموں کا تصفیہ اور طریق عبادت بتانا قاضیوں اور علماء کا کام ہے

---

[1] نزہۃ الخواطر ج ۲ ص ۱۶۶ نمبر اعلام ۲۶۶

چنانچہ اصلاح ملک کے لئے جس چیز کو وہ مناسب سمجھتا اسس پر عمل کر گذرتا۔ برنی لکھتا ہے :۔

"چوں در بادشاہی رسید، در دل او ہمچنیں نقش بستہ کہ ملک داری وجہانبانی علیحدہ کاریست، و روایت واحکام شریعت علیحدہ امریست واحکام بادشاہی بہ بادشاہ متعلق است، واحکام شریعت بہ روایت قاضیان ومفتیان مفوض است و برحکم اعتقاد مذکور ہرچہ در کار ملک داری او ہم فراہم آمدے، وصلاح ملک دراں دیدے آں کار خواہ مشروع وخواہ نامشروع بکردے، و ہرگز در امور جہانداری خود مسئلہ وروایتے نپرسیدے۔"

قاضی صاحب کو جب بڑا عہدہ سونپ دیا تو پھر گاہ بگاہ اہم معاملات میں گفتگو بھی ان کے ساتھ کرنا ضروری اور ناگزیر تھا۔ گو بقول شیخ محمد اکرام:

"بادشاہ نے اپنی اصلاحیں اور ملکی قاعدے اہل شرع کا فتوی لئے بغیر جاری کئے، لیکن ایک دن پتہ نہیں اس کے دل میں کیا خیال آیا کہ اس نے قاضی مغیث الدین بیانوی سے، جو اس زمانے کے مشہور عالم تھے، بعض اہم اور پیچیدہ مسئلوں کے متعلق شرع کا حکم پوچھنا شروع کیا، چونکہ بادشاہ نے تمام عمر شریعت کی طرف توجہ نہ کی تھی اسلئے قاضی صاحب ڈرتے اور بادشاہ سے کہنے لگے : "بظاہر میری اجل نزدیک آگئی ہے"۔ بادشاہ نے وضاحت چاہی تو قاضی صاحب نے کہا: "میں بادشاہ کے سوالات کا جواب صحیح صحیح عرض کروں گا۔ اور

---

[1] تاریخ فیروز شاہی، برنی، ص ۲۰۹ - بحوالہ آب کوثر ص ۱۰۰

چونکہ وہ بادشاہ کی مرضی کے خلاف ہوگا اس لئے میرے قتل کا حکم نافذ ہو جائیگا بادشاہ نے جواب دیا کہ تم شریعت محمدی کے مطابق سچ سچ کہو اور سانچ کو آنچ نہ ہوگی"۔

پہلا مسئلہ سلطان علاء الدین نے قاضی مغیث سے یہ پوچھا کہ شرع کے مطابق کس ہندو کو خراج گذار کہا جائے گا اور کس ہندو کو خراج دہ؟" قاضی نے جواب دیا کہ شرع کے مطابق اسس ہندو کو خراج گذار کہا جائے گا جو اس وقت، جبکہ محصل دیوانی اس سے چاندی طلب کرے تو وہ بغیر کسی تامل کے اور پوری تعظیم اور عاجزی کے ساتھ سونا پیش کرے۔ واگر محصل خوے در دہن او اندازد، او بے ہیچ تنفرے دہن بازکند تا محصل خوے در دہن اندازد۔ و دراں حالت محصل را خدمت کند۔ مقصد ذمی کی انتہائی اطاعت وفرماں برداری نمایاں کرنا اور دین اسلام وحق کی سربلندی اور کفر کی خواری ہے اور یہ تفسیر ہے عَنْ يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُوْنَ کی۔ .... سوائے امام اعظم رحمہ اللہ کے ہم جن کے پیرو ہیں، دوسرے ائمہ کے مذاہب میں ہندوؤں سے جزیہ قبول کرنا جائز نہیں، اسس سلسلہ میں وہ یہ حکم پیش کرتے ہیں :۔

"اَمَّا الْقَتْلُ وَ اَمَّا الْاِسْلَامُ (یا یہ اسلام لائیں یا انہیں قتل کردو) یہ ذرا تفصیل سے قاضی مغیث نے بتلایا، سلطان علاء الدین قاضی کے جواب پر بہت ہنسا اور کہا کہ یہ جو تم نے باتیں کہیں، میں نہیں جانتا۔ مجھے صرف اتنا پتہ ہے کہ خوط اور مقدم یعنی دیہات کے ہندو نمبردار وغیرہ اچھے اچھے کپڑے پہنتے ہیں، ولایتی کمانوں سے تیر اندازی کرتے ہیں، ایک دوسرے کے ساتھ محاربہ کرتے اور شکار کھیلتے ہیں

خراج، جزیہ، کری (مکانوں کا ٹیکس) اور چرائی وغیرہ میں سے کچھ بھی نہیں دیتے اور پھر تفصیل سے اپنی حکومتی پالیسیوں کو وضاحت سے بیان کیا اور یوں مخاطب ہوا:-

"مولانا مغیث! آپ پڑھے لکھے آدمی ہیں مگر تجربہ نہیں رکھتے ہیں ناخواندہ مگر تجربہ وسیع ہے"۔

کئی ایک سوال کرکے ایک سوال یہ کیا کہ ایام بادشاہی سے پہلے جو زرومال میں نے دیوگری سے بزورِ شمشیر حاصل کیا تھا وہ میرا ہے یا بیت المال کا ہے؟ قاضی نے کہا کہ چونکہ بادشاہ نے یہ مال لشکر اسلام کی مدد سے حاصل کیا ہے اس لئے یہ مال بیت المال کا ہے فقط بادشاہ کا نہیں" اس پر بادشاہ برہم ہوا اور کہا: "جو مال میں نے اپنی گورنری کے زمانے میں بڑی مشقت سے ان ہندوؤں سے حاصل کیا ہے جن کا نام و نشان بھی دہلی میں کوئی نہیں جانتا تھا، اور وہ خزانۂ شاہی میں کبھی داخل نہیں ہوا وہ بیت المال کا حصہ کیسے ہوا"؟

قاضی نے کہا: "جو مال بادشاہ نے بنفس نفیس حاصل کیا وہ اسکا اپنا ہے، اور جو مال فوج کی مدد سے حاصل ہوا اس میں سب شریک ہیں"

پھر بادشاہ نے پوچھا کہ "اچھا بیت المال میں میرا اور میرے متعلقین کا کس قدر حصہ ہے"؟ قاضی نے کہا: "اب ضرور میری موت آگئی، چونکہ بادشاہ سلامت پہلے سوال کے جواب سے ہی آزردہ خاطر ہو چکے ہیں اس لئے اس سوال کا جواب تو اور بھی ناگوار خاطر ہوگا"۔

بادشاہ نے اس کی تشفی کی تو قاضی نے عرض کیا:

"اس میں تین طریق کار ہو سکتے ہیں۔ اول یہ کہ بادشاہ راہ تقویٰ

اختیار کرے اور خلفاء راشدین کے نقش قدم پر چلے، اس صورت میں اس مال میں سے فقط اس قدر لینا چاہئے جس قدر اس کے چاکروں کو ملتا ہے اور جس طرح خداوند عالم نے تمام سپاہیوں کے لئے دو سو چونتیس تنکے مقرر کئے ہیں، اسی طرح اپنے اور اپنے حرم کے لئے اتنی ہی رقم حضور خود بیت المال میں سے لیں، دوسرے اگر میانہ روی منظور ہو تو امراء و اراکین سلطنت کے برابر اپنے تصرف میں لائیں۔ یہ دونوں نہیں تو ان علمائے دنیا کی رائے پر عمل کریں جو بادشاہ کی عظمت پر نظر کرکے کہتے ہیں کہ بادشاہ بیت المال سے اس قدر لے سکتا ہے جس سے امراء اور اس کے درمیان امتیاز ظاہر ہو جائے لیکن اس سے زیادہ لینا کسی طرح بھی جائز نہیں"

اس پر بادشاہ غضبناک ہوا اور کہنے لگا کہ تم میری تلوار سے نہیں ڈرتے جو یہ کہتے ہو کہ وہ زرومال جو میرے محل میں جاتا ہے اور بطریق انعام اور دوسرے کاموں پر صرف ہوتا ہے سب ناجائز ہے"؟ قاضی نے کہا کہ "جب حضرت بادشاہ مجھ سے شرعی مسئلہ پوچھیں تو میرا فرض ہے کہ میں شریعت کی کتابوں کے مطابق عرض کروں۔ لیکن آپ اگر مجھ سے ملکی مصلحت کے لحاظ سے سوال کریں تو میں یہی کہوں گا کہ جو بادشاہ کرتا ہے، جائز اور قوانین مملکت داری کے عین مطابق ہے بلکہ اگر اس سے بھی زیادہ کرے تو بادشاہ کی شان و شوکت کا باعث ہوگا اور اس سے کئی ملکی فائدے ظاہر ہوں گے"!

اس کے بعد بادشاہ نے پوچھا کہ میں جو ہر اس سوار سے جو لڑائی کے وقت حاضر نہیں ہوتا، گذشتہ تین سال کی تنخواہ وصول

کر لیتا ہوں، اور باغیوں اور فتنہ پردازوں کی اولاد اور متعلقین کو تہہ تیغ کرتا ہوں، ان کے مال کو خزانے میں داخل کرتا ہوں ..... اور دوسری سزائیں، جو میں نے چوروں، شراب خوروں اور اہل زنا کے بارے میں اختراع کی ہیں۔ تمہارے نزدیک تو یہ سبھی نامشروع ہوں گی؟"
اس پر قاضی مجلس سے اٹھا اور پائے مجلس میں جا کر زمین بوسی کر کے کہنے لگا کہ "ہاں حضور یہ سب باتیں نامشروع ہیں"۔
بادشاہ غضب ناک ہو کر حرم سرائے میں چلا گیا اور قاضی بھی جلدی سے اپنے گھر گیا اور اہل خانہ کو الوداع کہہ کر اپنی موت کی تیاری کی، صدقہ دیا، بلکہ غسل میت بھی کر لیا۔ لیکن مثل مشہور ہے 'سچ کا خدا نگہبان'، بادشاہ نے قاضی کو بلا کر اس پر بڑی مہربانی کی اپنا خلعت خاص اتار کر اسے پہنایا اور ہزار تنکہ انعام دے کر کہ تم نے جو کچھ کہا وہ سچ ہے لیکن میں جو کرتا ہوں مصلحت ملکی اور رفاہ عام کے لئے ہے اور اس کے بغیر اس ملک میں چارہ نہیں[1]"

مطلق العنان بادشاہوں کے یہاں حق گوئی، صداقت پسندی اور حقیقت پژوہی جس قدر دشوار ہے وہ ان لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں، جو بادشاہوں کی تاریخ سے واقف ہیں، جہاں شعلہ و شبنم کی اس قدر موہوم اور یقینی درآمد ہوتی ہے کہ وقت کا تعین نہ صرف دشوار بلکہ ناممکن، ہر وقت بیم و رجا کے دو پاٹوں کے بیچ حیات و موت اور بقا و فنا کی کشمکش ہوتی رہتی ہے۔

[1] آب کوثر۔ از محمد اکرام مطبوعہ لاہور ۱۹۵۰ء (ص ۱۶۳-۱۶۴)

قاضی مغیث الدین، اپنے دور کے مشہور اور زبردست عالم تھے اور علماء ہی خدا تعالیٰ سے ڈرتے ہیں، اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا۔ اور جب خوف خدا کسی قلب کو اپنا مسکن بنا لے تو وہاں پھر اور کوئی خوف نہیں ہو سکتا۔ اور میو قوم جیسی جری اور بہادر، دلاور و سخت کوش اور نڈر قوم کے ماحول میں قاضی صاحب پیدا ہوئے اسی فضا میں پروان چڑھے، بہر حال آپ علائی دور کے جید عالم، قاضی القضاۃ اور صاحب نسبت بزرگ تھے۔

شیخ احمد کھٹوی

شیخ احمد بن عبداللہ کھٹوی سرکھیجی کا لقب شہاب الدین تھا، عابد و زاہد اور فقیہ تھے، اور ہندوستان کے ان خوش نصیب حضرات میں تھے جو علم فقہ سے بھی مزین اور تصوف و طریقت سے بھی بہرہ مند تھے، ۷۳۷ھ میں موضع کھٹو میں پیدا ہوئے جو ہندوستان کے مشہور شہر اجمیر کے قریب تھا، ان کے آباء و اجداد دہلی میں رہتے تھے ایک روایت مشہور ہے کہ بچپن میں ایک گاؤں گئے، وہاں کے بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے کہ نہایت تیز آندھی آئی اور انھیں اڑا کر کسی اور جگہ لے گئی، اس طرح یہ اپنے وطن سے بہت دور چلے گئے اور بے یار و مددگار پردیسیوں کی طرح ادھر ادھر گھومنے لگے۔ ایک دن کہیں جا رہے تھے کہ اتفاقاً ایک درویش کامل بابا اسحٰق مغربی کا ادھر سے گذر ہوا انھوں نے انھیں لاوارث سمجھ کر اپنے ساتھ لیا اور اپنی قیام گاہ موضع کھٹو - آپ کی جائے پیدائش - لے گئے، اب آپ بابا اسحٰق مغربی کے پاس رہنے لگے، انھیں سے پرورش پائی انھیں کے فیض صحبت کی بدولت آپ روحانی تعلیم و تربیت سے بہرہ ور ہوئے اور پھر ایک کامل ولی کی حیثیت سے دنیا کے سامنے نمودار ہو کر اپنے مربی اور مشفق استاذ کی خلافت و اجازت کا شرف حاصل کیا۔

ان کے شیخ و مرشد شیخ اسحٰق مغربی کا سلسلۂ نسب شیخ ابو مدین مغربی سے ملتا ہے، شیخ اسحاق نے بڑی لمبی عمر پائی، منقول ہے (باصطلاح تصوف) انکے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان چند ہی مشائخ کا واسطہ ہے۔ کہتے ہیں کہ صرف پانچ واسطے ہیں۔ کہ آپ کا سلسلۂ مشیخت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ جاتا ہے،

یہ ۶۸۱ھ میں پیدا ہوئے اور ۸۱۹ھ میں وفات پائی، اس طرح ان کی عمر ایک سو اڑتیس سال ہوئی، انکے مشائخ میں ہر ایک کی عمر تقریباً ڈیڑھ سو سال ہوتی ہے۔

شیخ اسحٰق مغربی کے وصال کے بعد شیخ احمد کھٹو سے دہلی آئے اور ظاہری علوم کی تحصیل کی، فارغ ہو کر مسجد خانجہاں میں ڈیرے ڈال لئے اور عبادت و ریاضت میں مشغول ہو گئے، کھانے پینے کی چیزوں سے اس قدر بے نیازی تھی کہ سوکھی اور باسی روٹی کا ایک ٹکڑا کھاتے اور اسی سے روزہ افطار کرتے، چلّے کے دوران تو یہ حال ہوتا کہ صرف ایک کھجور روزانہ کھاتے، شادی نہیں کی، حج و زیارت سے مشرف ہوئے۔ سلطان مظفر شاہ والئ گجرات آپ سے متعارف تھا، اس نے آپ کو گجرات بلایا اور آپ موضع کھٹو سے گجرات کے ایک مقام کھیج منتقل ہوئے، یہاں کے لوگوں نے آپ سے خوب فیض حاصل کیا، ان کے دسترخوان پر شاہ و گدا کے لئے صلائے عام تھی، آپ کے ایک مرید تھے محمود بن سعید ایرجی، جنھوں نے "تحفۃ المجالس" کے نام سے آپ کے ملفوظات جمع کئے ہیں، ساتھ ساتھ سوانح و کوائف بھی اس کتاب میں آپکی نیکی، دینداری کشف و کرامت اور تبحر علمی کے بہت سے واقعات مرقوم ہیں، چند واقعات درج ذیل ہیں:-

ایک مرتبہ ایک بڑا تاجر تیس سیر مصری اور کستوری کا بڑا نافہ لے کر مسجد خانجہاں میں آپ کے پاس آیا، آپ نے اس سے پوچھا کہاں سے آئے ہیں اور کہیں کب سے جاتے ہیں؟ اس نے کہا: میں شیخ نور کا شاگرد ہوں جو پنڈوہ میں مقیم ہیں اور میں اس وقت وہیں سے آ رہا ہوں۔ اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ دہلی آ چکا ہوں، گذشتہ دنوں دہلی سے سامان تجارت کی خرید و فروخت کے بعد شیخ نور کی خدمت میں پنڈوہ حاضر ہوا تو انھوں نے پوچھا: دہلی میں کن کن مشائخ سے ملاقات کی ہے؟ میں نے ان مشائخ کا نام لیا جن سے نیاز حاصل کیا تھا۔ فرمایا: شیخ احمد کھٹو سے ملے؟ یہ سنکر

میں چپ ہوگیا، فرمایا: تم دہلی گئے اور شیخ احمد کھٹو سے نہیں ملے تو تمہارا سفر ضائع ہوگیا اور قیام و سعی بے سود۔ مرشد کے اس فرمان سے سخت پریشان ہوا اور بے قراری کے عالم میں وہاں سے چل کر آپ کی خدمت میں حاضری دی، تاجر کی یہ بات سنکر آپ نے ارشاد فرمایا: شیخ نور سے ہماری کوئی ملاقات و شناسائی نہیں انھوں نے بذریعہ کشف ہم کو پہچان لیا۔ یہ اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے۔

.... ہم بہت سے لوگ حج کے لئے روانہ ہوئے، ہمارا جہاز سمندر میں جا رہا تھا، میں ایک دفعہ وضو کرنے لگا، اچانک میرا پاؤں پھسلا اور میں سمندر جا گرا گرتے ہی "یا حفیظُ، یا رقیبُ، یا وکیلُ، یا اللہ" پڑھنا شروع کیا، میں پانی کی سطح پر تیرتا جا رہا تھا اور یہ وظیفہ ورد زبان تھا، اتنے میں مجھے اپنے پاؤں کے نیچے پتھر سا معلوم ہوا اور میں اس پر کھڑا ہوگیا، پانی کمر تک تھا، اور میں برابر یہ وظیفہ پڑھ رہا تھا اس کے بعد ملّاح اور جہاز کے کپتان نے مجھکو مچھلی کی طرح اوپر اٹھا لیا ــــ اس کے ساتھ ہی شیخ فرماتے ہیں کہ

مکہ مکرمہ پہنچا، حج کیا اور مدینہ منورہ کو روانہ ہوا، مدینہ منورہ میں امام خانجہاں شیخ تاج الدین سرہیبی اور کچھ اور لوگ بھی ہمارے ساتھ تھے۔ ہم مسجد نبوی میں مقیم تھے، ساتھیوں نے کہا: کھانے کا انتظام کرنا چاہیئے، میں نے کہا: ہم تو نہیں کریں گے، ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے میہمان ہیں، اس کے بعد وہ لوگ کھانا کھا کر واپس آئے، ہم نے ایک ساتھ عشاء کی نماز پڑھی، نماز کے بعد وہ سو گئے، اور میں ہاتھ دھو کر تسبیح پڑھنے لگا، ناگہاں آواز آئی: رسول اللہؐ کا میہمان کون ہے؟ میں نے خیال کیا کہ دوسرے آدمی کو آواز دی جارہی ہے، دوبارہ پھر یہی آواز فضاء میں گونجی اور میرے کانوں سے ٹکرائی مگر میں اب بھی خاموش رہا، تیسری مرتبہ پھر یہی آواز بلند ہوئی اور میں نے سنی، اب میں سمجھا کہ یہ آواز مجھے دی جارہی ہے، اور رسول اللہ کا میہمان میں ہی ہوں۔ چنانچہ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور آواز دینے والے کے پاس پہنچا جو اپنے ہاتھ میں ایک خوان لئے کھڑا تھا، اس نے کہا:

مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیجا ہے، میں نے دامن پھیلایا اور اس نے کھجوریں میرے دامن میں ڈال دیں، اور خالی خوان لے کر واپس چلا گیا، وہ کھجوریں میں نے منہ میں ڈالیں تو وہ اتنی لذیذ اور میٹھی تھیں کہ میں نے آج تک اس قسم کی کھجوریں نہیں کھائیں کھجوریں کھا کر میں سو گیا، رات کو ایک خواب دیکھا، اور وہی خواب میرے ساتھیوں نے دیکھا:-

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہوادار اور روشن مقام میں تشریف فرما ہیں، چند کبار صحابہؓ بھی وہاں کھڑے ہیں اور ایک عورت مختلف زیور سے آراستہ، وہاں موجود ہے، آنحضرتؐ نے مجھے فرمایا: اسے قبول کرلو۔ میں نے عرض کیا:- "ہمارے بزرگوں نے قبول نہیں کیا" پھر آنحضرتؐ نے حضرت علیؓ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھے فرمایا: "یہ تمہارے والد ہیں"۔ میں نے دیکھا تو حضرت علیؓ اپنی انگلی دانتوں میں دبائے کھڑے ہیں اور کہہ رہے ہیں: "بابا احمد، رسول اکرمؐ کے حکم کی تعمیل کرو اور اس عورت کو قبول کرلو۔ چنانچہ میں نے اس عورت کو قبول کرلیا"۔ اور فوراً ہی میرے دل میں آیا کہ عورت کی صورت میں جو چیز سامنے کھڑی ہے وہ دنیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کا مطلب یہ ہے کہ مجھے پوری دنیا مل گئی"۔

مدینہ منورہ سے واپسی کے وقت ہم تینوں ساتھی آخری سلام کے لئے آنحضرتؐ کے روضۂ اقدس پر حاضر ہوئے، روضۂ مبارک کے خدام دس گز کے فاصلے پر ہاتھوں میں کالے دستانے چڑھائے کھڑے تھے، مجھ سے کہا: "یہ عمامہ لو"، میں نے جواب دیا: "ہمارے مرشد نے عمامہ نہیں باندھا، وہ ٹوپی پہنتے تھے"۔ اس پر خدام نے کہا: "رات خواب میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم دیا ہے کہ آپ کو دس گز کپڑا عمامہ باندھنے کے لئے دیا جائے، اور ساتھ ارشاد فرمایا ہے کہ احمد کو ہمارا حکم ہے کہ یہ عمامہ اپنے سر پر باندھ لے،

... مخلوق خدا کو اسلام کی دعوت دے۔ چنانچہ وہ کپڑا جو آنحضرت ﷺ سے عطیہ تھا میں نے ہاتھ میں لیا، اس کو چوما اور سر پر باندھ لیا، اس کے بعد آنحضرت کی زیارت کا شرف حاصل ہوا، اور آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: دہلی کی مسجد خانجہاں میں رہ کر پہلے سے زیادہ ریاضت و عبادت اور مجاہدہ کیا جائے۔ اسی اثناء میں سید جلال الدین بخاری مخدوم جہانیاں کو بھی یہ ندائے غیبی سنائی دی کہ ایک جوان صالح دہلی کی مسجد خانجہاں میں مشغول عبادت ہے اور بہت ہی ریاضت کر رہا ہے، چنانچہ ہم حج سے واپس آئے تو مسجد خانجہاں میں سیّد جلال الدین بخاری میری ملاقات کو تشریف لائے، وہ مسجد کے قریب پہنچے تو ان کے ایک معتقد نے آکر مجھے اطلاع دی کہ مخدوم جہانیاں آپ سے ملنے کے لئے آرہے ہیں، میں فوراً اٹھا اور مسجد کے دروازہ پر پہنچا، وہ پالکی پر سوار تھے، پالکی سے اترے اور نہایت شفقت و پیار سے مجھے گلے لگایا اور دیر تک سینے سے چمٹائے رکھا، پھر پالکی میں بیٹھ کر واپس تشریف لے گئے اور میں مسجد میں آکر عبادت و ریاضت میں مشغول و منہمک ہو گیا۔

ایک جگہ سفر کا تذکرہ ہے، فرماتے ہیں: "اس فقیر نے بلا کسی رفیق اور سامان کے تنہا سفر کیا ہے اور پورے گیارہ سال تک برہنہ پا، جس شہر اور قصبہ میں جاتا وہاں کی مسجد میں رات بسر کرتا ۔۔ یہ سفر اعلاء کلمۃ اللہ کی خاطر اور ریاضت و مجاہدہ کے سلسلہ میں ہوتے تھے ۔۔ ایک دن فرمایا: فقیروں کی مجلس میں آنا آسان ہے مگر وہاں سے اپنے آپ کو صحیح و سالم واپس لے جانا مشکل ہے۔

ایک مرتبہ سمرقند کی ایک مسجد میں پہنچا، وہاں ایک فقیہہ طلباء کو پڑھا رہا تھا میں فقیروں کی سی ٹوپی اور درویشوں کے لباس میں تھا، طلباء سے دور ہو کر بیٹھ گیا ایک طالب علم حسامی پڑھ رہا تھا مگر غلط، میں نے آواز سے کہا: "اعراب غلط میخوانی" اعراب غلط پڑھ رہے ہو، میری آواز سنتے ہی فقیہہ اپنی جگہ سے اٹھا اور مجھ سے ملا، مجھے وہاں سے اٹھا کر اپنی مسند درس کے قریب لے گیا، علم اصول کے بارے میں مجھ سے کچھ سوالات

پوچھے، میں نے صحیح جواب دیا، میری علمی جانچ کر کے مجھ سے بولا: اس علم کے باوجود یہ معمولی کپڑے اور فقیروں کی سی ٹوپی کیوں پہن رکھی ہے؟ میں نے جواب دیا: ایک تو میں علم کی نعمت سے بہرہ ور ہوں، اگر عمدہ لباس زیب تن کروں گا تو نفس شرارت و بدخوئی کرے گا اور میں پندار میں پھنس جاؤں گا، اس لئے یہ لباس مخصوص کر کے اپنے آپ کو اس میں چھپا رکھا ہے۔

وفات آپ نے ایک سو گیارہ سال کی عمر میں بروز جمعرات ۱۴ ربیع شوال ۸۴۹ھ کو مقام سرکھیج میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

چوں شیخ احمد امام دین و دنیا	سوئے فردوس می شد خرم و شاد
فلک می گفت بہر تاریخ آں سال	شہ عالم محمد را بقا باد[۱]

---

[۱] اخبار الاخیار، نزہۃ الخواطر ج ۳ بحوالہ فقہاء ہند ج ۲ ص ۱۱۳ - ۱۰۳ ملخصاً۔

مفتی رکن الدین ناگوری رحمۃ اللہ علیہ

علامہ مفتی رکن الدین ناگوری بن حسام الدین ناگوری کا شمار ان فقہاء میں ہوتا ہے جو فقہ واصول میں پوری مہارت وبصیرت رکھتے تھے یہ علاقہ گجرات کاٹھیاواڑ کے ایک معروف شہر نہروالہ میں مسند افتاء پر متمکن وفائز تھے، فتاوی حمادیہ انکی تصنیف ہے، جو ضخیم کتاب ہے یہ کتاب قاضی حماد الدین بن محمد اکرم گجراتی کی فرمائش پر تصنیف فرمائی، جو نہروالہ کے قاضی القضاۃ اور اپنے زمانے کے نامور فاضل اور مشہور فقیہ تھے، اس کی تصنیف وتالیف کے مراحل مفتی رکن الدین نے اپنے فرزند مفتی داؤد کی اعانت واشتراک سے طے کئے۔ یہ فقہ کی مشہور کتاب ہے جو ان دو جلیل القدر فقہاء ــــ مفتی رکن الدین ومفتی داؤد ــــ نے تفسیر، حدیث فقہ، اور اصول فقہ کی دوسوسولہ[219] کتابوں سے استفادہ کرکے مرتب ومکمل کی، یہ پوری تفصیل کتاب کے مقدمہ میں بیان کی گئی ہے، کتاب کی ابتدا اس طرح ہے:

الحمد للہ الذی نور قلوب الموحدین بنور التوحید والایمان ...... الخ تصنیفی ضابطہ کے تحت اس کے مآخذ ومصادر مقدمۂ کتاب میں ذکر کردئے گئے ہیں، ان میں ھدایۃ، الکافی، شرح مجمع البحرین، شرح وقایۃ، شرح طحاوی، تحفۃ الفقہاء المحیط، الواقعات حسامی؟، فتاوی البرھانی، فتاوی تاتار خانی جواھر الفتاوی، جامع الفتاوی، فتاوی ولوالجی، الخلاصۃ، خزانۃ الفقۃ، فتاوی سمرقند، فتاوی قراخانی، فتاوی النوازلی، فتاوی الصیرفی، زاد الفقہاء، دستور الفقہاء، الذخیرۃ، المبسوط، فتاوی الابانۃ،

حاشیۃ بزودی، فتاوی الناطفی وغیرہ کتب فقہ کے علاوہ مشکوۃ المصابیح اور تفاسیر میں سے معالم التنزیل، تفسیر کبیر، تفسیر شیخ شہاب الدین سہروردی اور تفسیر کشاف وغیرہ شامل ہیں ــــ یہ کتاب اگرچہ حنفی فقہ سے متعلق ہے تاہم فقہ شافعی کی کتب سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

مفتی رکن الدین کا اصل وطن ناگور تھا، اسی بنا پر ناگوری مشہور ہیں، ناگور کسی خاندان یا قبیلہ کا نام نہیں، ناگور میوات کا ایک مردم خیز شہر تھا، التمش عہد سلطنت میں میوات کی جغرافیائی حدود ناگور، اجمیر، آگرہ، بیانہ، دہلی اور دوآب تک پھیلی ہوئی تھیں، یہ اہل علم کے بھی مراکز تھے اور اصحاب باطن کے فیوض باطنی کے بھی سرچشمہ تھے۔

مفتی صاحب جب نہروالہ تشریف فرما ہوئے تو اہل شہر سے بہت متاثر ہوئے۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں: جب میں نہروالہ میں گیا تو دیکھا کہ یوں تو اس شہر کے تمام لوگ بہترین عادات واطوار کے حامل ہیں مگر وہاں کے قاضی القضاۃ حماد الدین بن محمد اکرم نہایت نیک، شعور ومعرفت سے بہرہ ور، مہارت وتجربہ میں یگانہ اور دل ودماغ کے اعتبار سے سراپا خلوص ہیں، وہ پینتیس[35] سال سے نہروالہ کی کرسی قضا پر فائز ہیں، ان کے رعب ودبدبہ، اور ذاتی وعلمی وجاہت کا یہ عالم ہے کہ سامنے کوئی شخص جھوٹی شہادت دینے اور غلط بیانی کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا وہ تنفیذ احکام میں بے نظیر کردار کے حامل ہیں اور دعاوی ومقدمات کے فیصلے جمہور فقہاء کے اقوال اور فتاوی کے مطابق کرتے ہیں، ان کے والد قاضی محمد اکرم بھی عالم وفقیہ اور متورع ومتقی ہیں۔

ان ہی قاضی حماد الدین نے مفتی رکن الدین اور ان کے بیٹے مفتی داؤد کو یہ خدمت علمی انجام دینے کی مہم سپرد کی اور کہا کہ ایک ایسی کتاب مرتب

کریں جو ایسے مسائل فقہ پر مشتمل ہو جن پر جمہور فقہا کا اجماع ہے اور عقل و درایت کی میزان پر بھی پوری اترے چنانچہ بڑی محنت اور تلاش و جستجو کے بعد یہ کتاب مرتب کی اور قاضی حماد الدین چونکہ اس کے سببِ تالیف بنے اس لئے انھیں کی طرف منسوب کرکے اس کا نام "فتاوی حمادیہ" رکھا اور خلوص و للّٰہیت بھی تسمیۂ کتاب میں کارفرما رہی - اپنی محنت دوسروں کے نام نسبت دینا خلوص ہی تو ہے -

نویں صدی ہجری کی یہ فقہی کتاب جو ارض ہند میں، سرزمین میوات کے ایک لائق اور ہونہار سپوت کے ہاتھوں مرتب کی گئی اب بھی دنیا کے مختلف کتب خانوں میں مخطوطہ کی صورت میں موجود ہے - اور ۱۲۴۱ھ میں کلکتہ سے شائع بھی ہو چکی ہے[1]

۸- شیخ علی بن حمید ناگوری

شیخ علی بن حمید بن احمد سعیدی سورتی ناگوری، شیخ عبدالعزیز بن حمید الدین ناگوری سے بھی موسوم ہیں، سلسلۂ چشتیہ کے مشہور بزرگ تھے، اپنے پدرِ بزرگوار سے علم حاصل کیا اور عرصہ تک ان کی صحبت میں رہے اور درجۂ کمال کو پہنچے -، ان کے والد نے ان کی استعداد و لیاقت دیکھ کر دعوت و ارشاد اور اجازۂ حدیث سے سرفراز فرمایا - والد کی وفات کے بعد ان کی مسند مشیخت و ارشاد کو رونق بخشی - ان کے لڑکے کا نام فریدالدین تھا، اس نے اپنے والد سے علم حاصل کیا اور ۸۲۰ھ میں آپ نے اپنے فرزند کو علم حدیث کی اجازت مرحمت فرمائی

---

[1] فقہائے ہند ج ۲ ص ۱۸۴-۱۸۰

خزینۃ الاصفیا میں ان کی وفات سنہ ۶۸۱ھ لکھا ہے، مگر یہ معتبر نہیں[1]

قاضی ضیاء الدین بیانوی

عہد علاء الدین خلجی کے صدر جہاں (قاضی) تھے، اولاً یہ دہلی کے قاضی تھے پھر قاضی القضاۃ، سپریم کورٹ کے چیف جسٹس مقرر کئے گئے، اور مدت تک اس اہم اور جلیل القدر عہدہ پر سرفراز رہے - زبردست عالم و فاضل تھے[2] برنی کی روایت ہے کہ علمی وقار و دبدبہ سے محروم تھے[3]

مولانا شیخ وجیہ الدین بیانوی

شیخ وجیہ الدین بیانوی مشہور عالم و فقیہ اور صاحب فضل و کمال بزرگ تھے، ابن بطوطہ مشہور مغربی سیاح نے چندیری شہر میں امیر عزالدین بتانی کے یہاں حضرت مولانا وجیہ الدین سے ملاقات کی، امیر بتانی آپ کو اپنے ساتھ رکھتے تھے اور بہت ہی عزت و احترام کا معاملہ کرتے تھے[4]

آخری عمر میں سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیا قدس سرہٗ (م ۷۲۵) سے بیعت ہوئے، دہلی میں ہی آپ کا وصال ہوا اور حوض شمسی کے قریب قاضی کمال الدین حیدر خاں و قتلغ کے حظیرہ میں مدفون ہوئے، یہ دونوں حضرات آپ کے شاگرد تھے[5]

---

[1] نزہۃ الخواطر ج ۲ ص ۸۶ - [2] نزہۃ الخواطر ج ۲ ص ۶۵ (تذکرہ علمائے ہند ص ۲۰۷)
[3] فقہائے ہند ج ۱ ص ۲۳۱ - [4] نزہۃ الخواطر ج ۲ ص ۱۹۷
[5] تذکرہ علماء ہند ص ۵۲۱

شیخ فتح اللہ راج گڑھی

متصل الور شہر راجستھان

آپ یگانۂ وقت شیخ نظام امیٹھی کے مرید ہیں، جب سماع میں آپ گرم ہو جاتے تھے تو حیرت اس قدر غالب ہوتی تھی کہ زمین پر گر پڑتے تھے یہاں تک کہ ہاتھ پاؤں مارنے کی بھی طاقت نہیں رہتی تھی۔

ایک دفعہ راجگڑھ سے سیر کے واسطے فتح پور کو آئے تھے جو آگرہ سے بارہ کوس کے فاصلہ پر ہے اور انھیں ایام میں قاضی ابراہیم بھی نیواری سے وہاں جا پہنچے، اور آپ کے دیدار کے واسطے بھی گئے، اندر گھسنے سے پہلے ہی گانے والوں کو شیخ نے گانے سے روک دیا۔ خود زرنگار جامہ پہنا جس پر بہت سا عطر چھڑکا تھا۔ اور کہا اے جمالِ بیعت شرع اپنی خواہشیں چھوڑ دینا اور بے خودانہ مشیت الٰہی میں رہنا یہ بندگی ہے کبھی خسروانہ لباس سے آراستہ کر کے عزت کے صدر مقام پر بٹھاتا ہے اور کبھی پرانے بالوں کی میلی کچیلی آستین و گریبان کی کفنی گردن میں ڈال کر خاکِ ذلت پر بٹھاتا ہے ہم تماشائی ہونے اور حیرت کرنے کے سوا کیا فائدہ اٹھا سکتے ہیں اس کے بعد آیہ لایسال عما یفعل پڑھی اور آنکھوں سے آنسو نکالے۔ اسی دفعہ آپ شیخ عبدالنبی صدر کی ملاقات کے لئے بھی گئے تھے شیخ عبدالنبی درس حدیث میں مشغول تھے، آپ کی طرف متوجہ نہیں ہوئے۔ فارغ ہونے کے بعد فرمایا: درس نے رسمی تواضع سے مجھکو باز رکھا۔ آپ نے جواب دیا کہ درویش مخدوم سے باعتبار حالات چھوٹا ہے مخدوم کی طرف سے بس مہربانی ہی کافی ہے اور یہ حدیث پڑھی من لم یرحم صغیرنا۔ صدر الصدور یہ سنکر بہت خوش ہوئے اور دعا کی خدائے مہربانش مہربان باد[1]

---

[1] ... اردو ترجمہ ص ۳۳ - ۳۳۴

سید تاج الدین شیر سوارؒ

آپ کا مزار نارنول میں ہے، شیخ قطب الدین منورؒ۔ ابن شیخ برہان الدین ابن شیخ جمال الدین ہانسویؒ از اولاد حضرت امام اعظم ابو حنیفہ قدس سرہ العزیز کے مرید ہیں نارنول کے پہاڑوں میں اس قدر سخت ریاضتیں اور مجاہدے کئے کہ جنگل کے جانور درندہ و گزندہ و حوش و طیور آپ سے مانوس ہو گئے تھے کہتے ہیں کہ جب پیر کی خدمت میں ان کا حاضری کا ارادہ ہوتا جنگل کے ایک شیر کو پکڑ کے سوار ہو جاتے اور ایک سانپ ہاتھ میں لے لیتے، جب شہر ہانسی کے قریب پہنچتے اس شیر اور سانپ کو چھوڑ دیتے اور پیدل شہر میں آتے۔

نقل ہے ایک روز شیخ قطب الدین منور ایک دیوار پر بیٹھے تھے، اور سید تاج الدین کو اس وقت حالت تھی، اسی حالت میں شیر پر سوار شیخ کے سامنے آگئے۔ شیخ کی جوان پر نگاہ پڑی۔ فرمایا: سید یہ حیوان تو جان رکھتا ہے۔ اگر مردان خدا دیوار کو حکم دیں تو چلنے لگے"۔ حضرت کے یہ فرماتے ہی وہ دیوار جس پر حضرت تشریف رکھتے تھے جنبش کر کے چلنے لگی۔

آپ نے فرمایا:— "اے دیوار میں نے تو یہ بات بطور مثال کہی تھی تو اپنی جگہ برقرار رہ"۔

قبر آپ کی شہر نارنول کے باہر ہے۔ اسی شہر میں پیدا ہوئے تھے، اور وہیں مدفون ہوئے رحمۃ اللہ علیہ۔

سید تاج الدین کے ایک فرزند تھے جن کو شیخ ابدال کہتے تھے بالکل تارک الدنیا تھے، اسباب دنیا بقدر ضرورت لیتے اور ہر وقت یاد خدا

میں مشغول رہتے تھے، ان کے گھر کے دروازہ پر ایک پتھر پڑا ہوا تھا، چنانچہ اب بھی وہ گھر کی دہلیز کے باہر موجود ہے، اس پتھر پر ایک کاسۂ چوبیں رکھا رہتا تھا آنے جانے والے اس میں کچھ ڈالدیتے تھے جس سے ان کی قوت یومیہ ہوتی تھی اور اس سے زیادہ نہ آتا تھا، اگر غلہ گراں ہوتا تو فتوح بہت آتیں اور اگر ارزاں ہوتا تو کم آتیں رحمۃ اللہ علیہ[1]

شیخ علم الدین حاجیؒ

ایک مرد بزرگوار تھے، تارک دنیا۔ علائق سے مجرد، رزق اپنے کسب سے کرتے تھے اور بیچتے کھاتے پیتے چلے گئے، نہ گدائی کی اور نہ نذر کسی سے قبول کی اور نہ اپنے تئیں بزرگوں کی طرح رکھتے تھے بلکہ کاحد من الناس (عام لوگوں کی سی) زندگی بسر کرتے تھے۔

کہتے ہیں کہ یہ سب کچھ تھے مگر لوگوں سے ظاہر نہ کرتے تھے۔ عالم خاں میواتی ان کے مرید تھے، انھوں نے چاہا کہ ان کے واسطے گھر اور خانقاہ بنائیں مگر انھوں نے منظور نہ کیا اور کہا شیخ محمد ترک صاحب ولایت ہیں، جو عمارت میرے واسطے بنانی چاہتے ہو ان کے روضہ پر بناؤ۔ پہلے شیخ محمد ترک کے مقبرہ کی چار دیواری پست تھی، عالم خاں نے اس پر گنبد بنوایا جو اب تک موجود ہے ملا محمد نارنولیؒ شیخ حمزہ دھرسوئیؒ سے نقل کرتے ہیں کہ وہ کہتے تھے کہ:۔

"میرے دادا اور شیخ صدرالدین کہرولی اور شیخ علم الدین حاجی تینوں کعبۂ شریف کی زیارت کو گئے، جب دریا پر پہنچے کشتی بانوں نے تحقیق کیا کہ اگر کوئی شخص اپنے خویش واقارب کو چھوڑ آیا ہو وہ جاکر صلۂ رحم بجالائے۔ شیخ علم الدین نے اپنا کلہاڑا اور ہتھوڑا جو کمر سے باندھے ہوئے تھے ہلا کر کہا میرے خویش واقارب یہ

[1] اخبار الاخیار ص ۲۱۷

ہیں، کشتی بانوں نے تبسم کیا اور کشتی پر بٹھالیا۔ وہ دونوں بزرگ وطن کو واپس چلے گئے، مقبرہ ان کا شہر نارنول کے باہر ہے دھرسو کے راستے کے قریب۔ رحمہ اللہ تعالیٰ[1]

مولانا قاسم حسینی بیانوی

مولانا شیخ قاسم بن ابوالقاسم حسینی بیانوی، محدث اور فاضل تھے، حدیث وفقہ اور علوم عربیہ کے ماہر کامل تھے، شیخ ابراہیم بن داؤد مانکپوری اکبرآبادی کے شاگرد تھے، تمام عمر اپنے استاد مکرم سے وابستہ رہے، شیخ ابراہیم کی وفات کے بعد ان کی جگہ درس وافادہ کی مسند کو رونق بخشی[2]

قاضی عبداللہ بیانوی

قاضی عبداللہ بیانوی حنفی المسلک اور اپنے دور کے مشہور علماء میں سے تھے، شہر بیانہ کے قاضی تھے، ساتھ ساتھ تدریسی خدمات بھی انجام دیتے تھے۔ ان کے تلامذہ بہت تھے، شیخ دانیال بن حسن عباسی ستر کھی ان کے عزیز شاگرد تھے، ان سے درسی کتب بھی پڑھیں اور سلوک وتصوف بھی حاصل کیا[3]

ہونہار شاگرد کی لیاقت دیکھکر اپنی بیٹی انھیں دیکر شرف دامادی بخشا جیساکہ اسی کتاب کے ص ۴۲ پر مرقوم ہے:۔

"شیخ دانیال بیانہ آئے اور قاضی عبداللہ بیانوی سے علم حاصل کیا، پھر ان کی عفت مآب دختر سے شادی کی، پھر دہلی کا سفر کیا اور شیخ نصیرالدین چراغ دہلی سے سلوک وتصوف کی تربیت کیلئے

[1] اخبار الاخیار ص ۲۹۰ - [2] نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۳۱۰ - [3] نزہۃ الخواطر ج ۲ ص ۷۰

انکی خدمت میں عرصہ تک رہے، عرفان و یقین کے منازل طے کئے پھر بیانہ آئے، اور اپنی بیوی کو لیکر ستر کھہ چلے گئے، صالح بزرگ اور علم و معرفت میں نمایاں مقام رکھتے جب اپنے شہر کے قریب پہنچے تو رہزنوں کے چنگل میں پھنس گئے انھوں نے انھیں موت کے گھاٹ اتار دیئے، یہ حادثہ ۸۲۸ھ میں پیش آیا۔ وہاں سے انکی نعش ستر کھہ لے جائی گئی اور وہیں دفن ہوئے۔ رحمہ اللہ رحمۃ الابرار [1]

مفتی داؤد ناگوری رحمہ اللہ

باوقار شیخ، بلند مرتبہ عالم دین مفتی داؤد بن رکن الدین بن حسام الدین حنفی ناگوری رحمہ اللہ تعالیٰ جلیل القدر علماء میں آپ کا شمار ہوتا تھا فقہ و اصول فقہ میں خصوصی مہارت اور امتیازی شان تھی، نہروالہ صوبہ گجرات کے مفتی اعظم تھے۔ فتاویٰ حمادیہ کی تدوین و ترتیب میں اپنے والد ماجد مفتی رکن الدینؒ کی بھرپور معاونت کی اور پوری طرح انکا ہاتھ بٹایا۔ جیسا کہ مفتی رکن الدینؒ نے کتاب کے شروع میں اسکی صراحت فرمائی ہے [2]

مولانا ناصح الدین ناگوری

نیک سیر عالم و فاضل شیخ ناصح الدین بن قاضی حمید الدین ناگوری سلسلہ سہروردیہ کے اہم بزرگ، علم و معرفت کے گھرانے میں پرورش پائی، باپ کی صحبت اختیار کی اور سب کچھ انھیں سے حاصل کیا، پھر ان کی مسند ارشاد و سلوک کو آباد کیا [3]

---

[1] نزہۃ الخواطر ج ۳ ص ۵۸ ۔ [2] نزہۃ الخواطر ج ۲ ص ۱۴۳ ۔
[3] نزہۃ الخواطر ج ۲ ص ۴۲ ۔

شیخ کمال الدین ناگوری

عالم و فقیہ، شیخ کمال الدین بن قوام الدین ناگوری ثم پٹنی، سلسلۂ چشتیہ کے مشہور بزرگ ہیں۔ شیخ یعقوب پٹنی سے کسب فیض کیا، فصوص الحکم ان کے یہاں پڑھی۔ مدت دراز تک ان کی خدمت میں حاضر رہے، گجرات میں آپ کو قبول عام حاصل تھا، شیخ برہان الدین عبداللہ بن محمود حسینی بخاری نے آپ سے فیض حاصل کیا، اور بھی بہت سے علماء و مشائخ آپ سے سیراب و بہرہ ور ہوتے، رحمہم اللہ تعالیٰ [1]

شیخ اسمٰعیل بن حسن ناگوری

شیخ صالح اسمٰعیل بن حسن سالار ناگوری، چشتیہ سلسلہ کی ایک اہم شخصیت ہیں۔ اپنے باپ اور دادا شیخ اختیار الدین عمر الایرجی کی خدمت میں رہ کر علم و تصوف حاصل کیا۔ آپ سے فیض یاب ہونے والوں میں شیخ خانو۔ خانون ؟ بن العلا ناگوری رحمہ اللہ ہیں جیسا کہ گلزار ابرار میں تحریر ہے [2]

شیخ بایزید اجمیری

عالم صالح شیخ بایزید بن طاہر بن بایزید بن قیام الدین اجمیری، جو "صغیر" کے نام سے مشہور ہیں، قاضی احمد مجد شیبانی رحمہ اللہ اور دیگر علماء عصر سے

---

[1] نزہۃ الخواطر ج ۳ ص ۱۰۳ [2] نزہۃ الخواطر ج ۳ ص ۳۰

علم حاصل کیا اور درجۂ کمال کو پہنچے۔ فتویٰ نویسی اور درس وتدریس کی اہلیت واستعداد کامل تھی۔ ایک سے زائد علماء نے آپ کی خدمت میں رہ کر کسب علم وفضل کیا، جیساکہ بحر زخار میں لکھا ہے۔[1]

شیخ حسن بن حسام نارنولی

عالم وفقیہ شیخ حسن بن حسام نارنولی رحمہ اللہ، قاضی تاج الدین ہروی کی اولاد میں سے ہیں۔ پیدائش و پرورش نارنول میں ہوئی۔ درسی کتب اپنے والد محترم سے پڑھیں، طریقت وتصوف قاضی شمس الدین، قاضی احمد مجد شیبانی کے جد امجد سے حاصل کئے۔ پھر شیخ نظام الدینؒ کی خدمت میں طویل مدت تک قیام کر کے فیض حاصل کیا۔ اپنے وطن میں ہی کامل ہو کر لاہور تشریف لے گئے اور وہاں چالیس سال درس وتدریس کی خدمت انجام دی ۹۹۰ھ میں وفات ہوئی۔[2]

شیخ کبیر الدین ناگوری

عالم، بزرگ، زاہد، شیخ کبیر الدین بن فرید الدین ... مشہور عالم ربانی گذرے ہیں، ان کی یادگار ان کی تصانیف ہیں، منجملہ ان کے ایک بہت اہم شرح ہے المصباح فی النحو کی جس کا نام "دھن" ہے آخری عمر میں گجرات تشریف لے گئے، وہیں اقامت فرمائی اور درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا اور عرصہ دراز تک اپنے چشمۂ فیض کو جاری رکھا۔ بہت سے لوگوں نے آپ سے نفع حاصل کیا اور آپ سے فیض یاب ہوئے، اہم ترین شخصیت آپ کے مستفیدین میں شیخ حسین بن خالد ناگوری کی ہے۔

۱۰ ذی قعدہ ۸۳۵ھ یا ۸۵۶ھ میں بمقام احمد آباد گجرات، وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے جیساکہ مجمع الابرار میں مذکور ہے۔[3]

---

(۱) نزہۃ الخواطر ج ۴

شیخ نعمت اللہ فیروزپوری

عالم کبیر وفاضل وقت علامہ سید نعمت اللہ بن عطاء اللہ۔ جلال الدین لقب۔ نارنولی فیروزپوری قادری سلسلہ کے مشہور بزرگ تھے، نارنول میں پیدا ہوئے وہیں پرورش پائی، بڑے ہو کر حصول علم کے لئے دور دراز شہروں کا سفر کیا، جونپور بھی پہنچے اور شیخ محمد افضل عثمانی جونپوری سے علم ہیئت پڑھا، پھر رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو کر فیروزپور میں مقیم ہو گئے اور اسے وطن بنالیا، فیروزپور میں سیف خاں نے خراجی زمین سے چار سو ایکڑ زمین دی۔ شاہزادہ شجاع بن شاہجہانؒ جب اپنے باپ کی طرف سے بنگال کا حاکم بنا تو ان کے حلقۂ بیعت میں داخل ہو گیا اور شہزادے کی بیعت اور خود اپنے زہد وتقویٰ کے باعث لوگوں میں انھیں بے حد مقبولیت اور شہرت حاصل ہوگئی، جب پھر عالمگیر کے مقابلہ میں شجاع کو شکست ہوئی اور وہ ہندوستان کے دور دراز علاقوں میں بھاگ گیا تو حکومت کی باگ ہاتھ میں لینے کے بعد اورنگ زیب رحمۃ اللہ علیہ نے انھیں پانچ ہزار نقد ادا کئے۔

شیخ نعمت اللہؒ مختلف کتابوں کے مصنف تھے منجملہ ان کے ایک تفسیر قرآن کریم بطرز جلالین ہے، اسے صرف چھ ماہ میں تصنیف کیا اور [illegible] میں مکمل کیا۔ اور ایک ترجمہ قرآن کریم بھی ہے جو جہانگیر (۹۷۷–۱۰۳۷) کے عہد میں جہانگیر ہی کے لئے لکھا جبکہ وہ دہلی میں تھے، اس کا نام "تفسیر جہانگیری" ہے ـــ میں نے ان کا ایک خلافت نامہ دیکھا ہے، جو وہ اپنے مریدوں اور خلفاء کو مرحمت فرماتے تھے اس میں لکھا ہے: سلسلۂ قادریہ انھوں نے شیخ شمس الدین ابوالفتح محمد شریف سے لیا جو شیخ بہاء الدین انصاری کے خلیفہ ہیں، اور چشتیہ

سلسلۂ محمدیہ لیا جو سلسلۂ خواجہ محمد بن یوسف حسینی گلبرگی کے بزرگ ہیں، اور نقشبندیہ محمد بن جلال گجراتی سے حاصل کیا جو سلسلۂ شیخ برہان الدین عبد اللہ بن محمود حسینی کے سلسلہ میں منسلک ہیں ـــــ نیز میں نے شیخ محمد یحییٰ عباسی الہ آبادی کی کتاب "وفیات الاعلام" میں دیکھا ہے کہ علامہ محمود بن محمد جونپوری نے سلوک و طریقت شیخ نعمت اللہ فیروزپوری سے لیا آپ نے انھیں ذکر کی تلقین فرمائی الخ گنج ارشدی میں لکھا ہے کہ وہ فیروز پور میں جب اقامت گزیں ہو گئے تو انکی عمر چالیس سال تھی، وہاں وہ تقریباً پچاس سال تک زندہ رہے سنہ ۱۰۴۲ھ میں انتقال فرمایا جیسا کہ "مراۃ عالم" میں مرقوم ہے۔[1]

شیخ ولی محمد نارنولی

شیخ عالم و فاضل خواجہ ولی محمد نارنولی ــــ مشہور صاحب فضل و صلاح بزرگ ــــ سلوک و طریقت امیر ابو العلاء الحسینی۔ آگرہ سے لیا اور ان سے شیخ ابو القاسم اور دوسری مشہور شخصیتوں نے یہ دولت گرانمایہ حاصل کی۔

ان کی تصنیفات میں مثنوی مولانا رومؒ کی ایک تفصیلی شرح ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے انفاس العارفین میں لکھا ہے کہ شیخ ولی محمد قدس سرہٗ کا امیر ابو العلاءؒ قدس سرہ سے ایسا ہی تعلق تھا جیسا کہ خواجہ نصیر الدین چراغ دہلوی کو محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین قدس سرہما کے ساتھ تھا اور ان کا سلوک و عرفان شریعت محمدیہ کا اتباع اور سنت سنیہ

[1] نزہۃ الخواطر ص ۲۲۴

کی پابندی، قول و فعل میں بال برابر بھی ان سے انحراف ناقابل برداشت تھا۔
۱۵ رشوال سنہ ۱۰۸۱ھ کو اکبر آباد میں وصال ہوا اور وہیں دفن ہوئے۔[2]
(مرتبہ [illegible])

شیخ فرخ نارنولی

شیخ فرخ نارنولی ــــ مشہور عالم و فقیہ اور بلند مرتبت عارف باللہ حضرت شیخ نظام الدین چشتی نارنولی کے پوتے تھے، نارنول میں پیدا ہوئے، اور وہیں پرورش پائی اپنے والد اور دادا سے علم حاصل کیا، پھر وہ خود عالم و فاضل بن کر اپنے دادا اور والد کے جانشین ہوئے، اور اپنے آبائی مسند مشیخت کو زینت بخشی نہایت بارعب اور عالی مرتبت شیخ تھے، معارف الٰہیہ کی توضیح و تشریح میں یگانہ تھے۔ وجد و سماع میں شغف تھا ــــ سنہ ۱۰۳۰ھ کو نارنول میں وصال ہوا۔[3] (اسراریہ)

[2] نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۲۲۳-۲
[3] 〃 〃 ۵ ص ۳۰۵

نظمِ در احوال سید جمال اللہ الرضوی المشہدی

۱	میر تیمور عادل سرور	کرد چوں از دیارِ ہند سفر
۲	خضر خاں بود حاکم ملتاں	یافت شاہی بملک ہندوستاں
۳	آں زماں سید جمال اللہ	رخ ز کتم عدم نمود چوں ماہ
۴	سالِ ہجرت وراں زمانہ غیب	فہم کن - عاشق رسول مجیب
۵	لیک شرط است چونکہ ہشیاری	روئے اخلاص ہم بردآری
۶	بود امروہہ مولد والا	سی و سہ سال شد مقیم آنجا
۷	در پہاڑی رسید بعد ازاں	آں حمیدہ صفات و صاحب شاں
۸	بعد از نسل پشت خضر زماں	گشت چوں بادشاہ محمد خاں
۹	بعد ازاں پور خواندہ اش خوش کام	بود بہلول خاں لودی نام
۱۰	چوں بہ تخت شہنشہی بنہاد قدم	شد مسجد شریف از او قدم
۱۱	روئے بہجت بسوئے او آری	صحن بیت الحرام پنداری
۱۲	بعد بہلول خاں سکندر نام	بر سریر شہنشہی چوں یافت مقام
۱۳	در زمان خلافت آں شاہ	فوت شد سید جمال اللہ
۱۴	سال از ہجرتِ رسولِ خدا	داد ہاتف بگوش ہوش ندا
۱۵	قد وفات حاجی الحرمین	غم بصد آہ کن تو نور العین
۱	چوں بامروہہ تولد شد جمال	واں جمال خاص ہم سال آں
۲	در پہاڑی گشت چوں رونق فزا	آں گرامی گوہر عالی مکاں
۳	کوہ رشک طور باد از جہاں	با دعا آمد ندا از آسماں
۴	ہست سالِ فوت خلد آرامگاہ	خانہ باری ہمیں مسجد بداں[1]

[1] مکتوب پروفیسر سلیم بنام مؤلف - [illegible]

ترجمہ نظم در احوال سید جمال اللہ الرضوی

۱ ۔ انصاف پسند تیمور نے ۔ جب ہندوستان سے سفر کیا

۲ ۔ تو خضر خاں حاکم ملتان ۔ ہندوستان کے بادشاہ ہوگئے

۳ ۔ اس وقت سید جمال اللہ نے اپنے روئے زیبا کو پردۂ عدم سے چاند کی طرح نکالا۔

۴ ۔ ہجری سن اس وقت ذرا غور کرو عاشق رسول مجیب یعنی ۸۲۲ھ تھا۔

۵ ۔ مگر گنتے وقت روئے اخلاص یعنی الف اور بڑھا لینا

۶ ۔ آپ کی جائے پیدائش امروہہ ہے تینتیس سال آپ وہیں رہے۔

۷ ۔ اس کے بعد آپ پہاڑی ۔ بہادر پور اور پہنچے ۔ آپ اچھی عادات اور بڑی شان والے تھے۔

۸ ۔ پھر خضر خاں کی اولاد میں محمد خاں تخت شاہی پر بیٹھا۔

۹ ۔ پھر ان کے فرزند خوش خصال بنام بہلول خاں لودی نے

۱۰ ۔ جب تخت شاہی پر قدم رکھا تو پہلے انھوں نے ایک مسجد پہاڑی پر تعمیر کرائی۔

۱۱ ۔ اگر تو تر و تازہ رو ہو کر اس منظر کا مشاہدہ کرے تو بیت الحرام کے صحن کا خیال کرے

۱۲ ۔ بہلول کے بعد جب سکندر لودی تخت نشین ہوا

۱۳ ۔ اس بادشاہ کے زمانے میں سید جمال نے وفات پائی ۔ رحمہ اللہ

۱۴ ۔ سالِ وفات کے متعلق ہجری سن کے حساب سے ہاتف نے کان میں کہا:

۱۵ ۔ افسوس کہ حاجی الحرمین وفات پا گئے اے نور العین تو صد ہوں کے غم سے نڈھال ہو۔

۱ ۔ امروہہ میں جب سید جمال پیدا ہوئے تو ۔ واں جمال خاص سے وقت پیدائش ظاہر ہوا۔

۲ ۔ جب پہاڑی پر وہ گرامی قدر بزرگ رونق افروز ہوئے تو آسمان سے

۳ ۔ دعا کے ساتھ ندا آئی ۔ یہ پہاڑی طور کی طرح مرکز رشد و ہدایت ہو۔

۴ ۔ تاریخ وفات "خلد آرامگاہ" (۹۰۲) سے نکلتی ہے اور مسجد کی تاریخ بنا خانہ باری (۸۶۹) ہے[1]

[1] مکتوب پروفیسر محمد سلیم سندھ بنام مولف۔

سلسلۂ قادریہ

شیخ المشائخ حضرت شاہ جلال قادری قدس سرہٗ العزیز

آپ قصبہ فیروز پور جھرکہ میں تغلق عہد سلطنت میں تشریف لائے، جو ماضی میں بھی میوات کی مرکزی جگہ تھی اور اب بھی ہے۔ تاریخ وفات ۷۹۰ھ ہے اور کچھ آپ کے متعلق معلوم نہ ہوسکا۔

حضرت شاہ محمد رمضان شہیدؒ

ولادت : ۱۱۸۳ھ ۱۷۶۹ء قصبہ مہم ضلع روہتک۔
شہادت : ۲۸ رجمادی الاول ۱۲۴۰ھ ۱۸ ر جنوری ۱۸۲۵ء مندسور وسط ہند (گجرات)
مرقد : خانقاہ مہم ضلع روہتک۔

محمد رمضان نام تاریخ پیدائش کا مظہر ہے، آپ کی تصنیف آخر گت[1] کا شعر ہے ؎

محمد اور رمضان دونوں ملیں ہزار اور یک صد تراسی نہیں

بچپن آپ شاہ عبدالعظیم مجذوب بن شاہ عبدالحکیم مہمی بن شاہ لطف اللہ الملقب بہ عطا محمد خاں سہ ہزاری اور نائب صوبے دار لاہور کے فرزند اکبر تھے، ابھی آپ چار سال کے تھے کہ درویش منش فاضل دادا کا انتقال ہوگیا، والد مجذوب تھے، چنانچہ آپ کی تربیت کا بار تمام تر آپکی والدہ ماجدہ پر پڑا۔ خاندان کے معمول کے مطابق آپ نے ابتدائی تعلیم

[1] حیات الابرار مخطوطہ

اپنی والدہ سے پائی، آپ کی والدہ آپ کو اور اپنے مجذوب شوہر کو لیکر ہر سال چند ماہ کے لئے موضع کانپور چلی جایا کرتی تھیں، مسلم راجپوتوں کا یہ قصبہ مہم سے پندرہ میل کے فاصلہ پر ضلع رہتک میں واقع ہے۔ اُن دنوں یہ راجپوت ٹولیاں بنا کر لوٹ مار کیا کرتے تھے جو کچھ لوٹ کر لایا کرتے اس کا دسواں حصہ شاہ عبدالعظیم مجذوب کی خدمت میں پیش کر دیتے۔

حضرت ہادیٔ ہریانہؒ چودہ سال کے تھے کہ ایک واقعہ پیش آیا، ایک روز کاہنور میں اپنے ہم عمروں کے ساتھ کھیل رہے تھے آپنے ایک پتھر اٹھا کر پھینکا کہ درخت سے اوپر ہوتا ہوا دوسری طرف چلا جائے تین دفعہ کوشش کے بعد ناکام رہے، ایک ہمجولی نے کہا: "اگر میں پھینکدوں تو کیا انعام دوگے؟" - آپ نے فرمایا: "پاس تو کچھ نہیں البتہ تمہارے مرنے کے بعد دو رکعت نفل نماز پڑھکر تمہاری روح کو بخش دوں گا۔" وہ ہمجولی پتھر پھینکنے میں کامیاب ہوگیا اور واہ واہ کے بعد بات آئی گئی ہوگئی قضاء الٰہی کچھ روز بعد وہ لڑکا فوت ہوگیا، آپ نے وعدہ پورا کیا، مگر رات کو خواب میں دیکھا کہ مرحوم ایفاء وعدہ کا مطالبہ کر رہا ہے، بیدار ہوکر آپنے دوگانہ پڑھا اور اس کا ثواب روح کو بخشدیا، مگر رات کو پھر مطالبہ ہوا غرض کئی مرتبہ ایصال ثواب کیا اور ہر مرتبہ مرحوم کو مطالبہ کرتے ہوئے پایا، آپ نے اس کے سبب پر غور کیا تو اس نتیجہ پر پہنچے کہ نذرانوں میں دھاڑ کی لوٹ کا مال آتا ہے اور وہ شرعاً حرام ہے، اور یہی رزق حرام قبولِ دعا میں حارج ہے۔ والدہ کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا: "ہم جو کچھ کھا رہے ہیں وہ جائز نہیں"، اس بے سہارا خاتون نے جواب دیا: "یہاں تو یہی ہے اگر ہمت ہے تو کہیں حلال روزی تلاش کرو"، آپ اسی وقت والدہ سے

اجازت لے کر بغیر کچھ کھائے پیئے چل کھڑے ہوئے اور پاپیادہ دہلی جا پہنچے[1]

حصول تعلیم | ان دنوں آپ کے خاندان کے ایک بزرگ حضرت شاہ سلام اللہ، جو بعد میں ہادیٔ ہریانہ کے خسر ہوئے۔ قلعۂ معلی دہلی میں شہزادیوں کی تعلیم پر مامور تھے، ان کی وساطت سے آپ شاہ عبدالقادر دہلویؒ کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے اور چودہ سال تک علوم ظاہری و باطنی سے فیض یاب ہوتے رہے، ہفتہ میں دو بار، منگل اور جمعہ کو، شاہ عبدالقادر دہلویؒ کے برادر بزرگ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ سے استفادہ کرتے رہے اور آپ سے سبقاً سبقاً آپ کے والد ماجد امام الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی تصانیف، قول الجمیل اور کتاب انتباہ پڑھیں، اور دونوں کی اجازت پائی، دہلی میں یہ سلسلہ تعلیم ۱۱۹۷ھ سے ۱۲۱۱ھ (۱۷۸۳ء سے ۱۷۹۶ء) تک چودہ سال جاری رہا، شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ اور شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ کے علاوہ آپ نے مندرجہ ذیل سے بزرگوں سے کسب فیض کیا:۔

(۱) حکیم غلام حسین عرف حکیم سکھوا گوبانویؒ (۲) میر فتح علی شاہ دہلویؒ (۳) حضرت شائستہ خاں دہلویؒ (۴) حضرت شاہ غلام جیلانی صدیقی رہتکیؒ (۵) سید غلام قطب الدین فرخ آبادیؒ (۶) شاہ ارادت اللہ دہلویؒ (قصبہ بگڑ اسلام علاقہ مارواڑ کے رہنے والے تھے) (۷) شاہ محمد عبدالعظیم گیلانی لاہوری ثم پانی پتیؒ متوفی ۱۲۲۷ھ۔

---

[1] روضۃ الرضواں ص ۴۴ تا ۹۴

شاہ محمد رمضانؒ نے آپ کے سلسلۂ قادریہ کا اجرا کیا، قادریہ سلسلۂ طریقت اس طرح ہے: ہادیٔ ہریانہ حضرت شاہ محمد رمضان شہیدؒ، شاہ محمد عبدالعظیم گیلانی ثم پانی پتیؒ، سید حفیظ اللہ قادریؒ متوفی ۱۱۸۸ھ سکنہ بڑی کھاٹو علاقہ مارواڑ، شاہ عبداللطیفؒ، شیخ بدعاؒ، شیخ فتح محمدؒ، شیخ اللہ دادؒ، شیخ عبدالقادر ثالثؒ، سید محمد غوثؒ، شیخ زین العابدینؒ، سید عبدالقادر ثانیؒ، میر شمس الدینؒ، مخدوم سید شاہ میرؒ، سید ببر علیؒ، سید مسعودؒ، سید صوفیؒ، سید ابو نصرؒ، سید سیف الدین عبدالوہابؒ، حضرت عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ۔

شخصیت | آپ کا قد میانہ تھا، بازوؤں کے اعتبار سے ساونت تھے، یعنی بازو اس قدر طویل تھے کہ ہاتھ کی انگلیاں گھٹنوں کے قریب پہنچ جاتی تھیں، جسم بھرواں تھا، رنگ گندمی سرخی مائل، پیشانی چوڑی، ابرو کشادہ، سینہ فراخ، اور ریش قطع تھی، حضرت شاہ غلام جیلانی رہتکیؒ فرمایا کرتے تھے کہ: "ہزاروں کوس کا سفر کیا، اچھی سے اچھی مخلوق الٰہی نظر سے گزری مگر آپ کی ظاہری صورت کا بھی کوئی انسان نہ دیکھا، باطنی اوصاف تو کجا" (روضۃ الرضواں) سفر حج کے لئے تشریف لے گئے، آپ کے رفقاء سفر جو واپس آئے بیان کرتے تھے کہ آپ کی وجاہت اور شباہت کو دیکھ کر بعض عرب سرگوشیاں کر رہے تھے کہ ہندوستان کا بادشاہ ہے جو درویشوں کے بھیس میں آیا ہے۔

صاحب روضۃ الرضواں کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ مسٹر ولیم فریزر اور دہلی کے ریزیڈنٹ مسٹر آکٹر لونی کو حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ

کا وعظ سننے کا شوق ہوا، حضرت دہلویؒ نے اپنے وعظ میں خلفاء راشدین رضؓ اور دیگر صحابۂ کرامؓ کے فضائل و مناقب بیان فرمائے اختتام وعظ پر آکٹرلونی نے دریافت کیا کہ کیا اب بھی مسلمانوں میں کوئی ایسا ہے جو صحابہؓ کے مشابہ ہو؟ آپ نے فرمایا: ہاں ہے، انھوں نے شوق زیارت کا اظہار کیا، تاریخ مقرر ہوگئی، مہم سے شاہ رمضانؒ کو بلا کر اندر بٹھالیا مگر انھیں بتایا کچھ نہیں، اس روز مدرسہ میں ایک جمِ غفیر تھا، مسٹر آکٹرلونی بھی آئے تھے حضرت شاہ صاحب دہلویؒ شاہ محمد رمضان کا ہاتھ پکڑے باہر نکلے اور فرمایا:

"میں اپنا وعدہ پورا کرتا ہوں، مثل اصحاب کرامؓ یہ صاحب میاں محمد رمضان صدیقی بھی ہیں"۔

مجمع میں سے کسی نے پوچھا کہ مثل اصحاب کرامؓ، در سیرت یا در صورت؟

آپ نے فرمایا: "ہم در صورت و ہم در سیرت"۔

اس وقت شاہ محمد رمضان پر رقت طاری ہوگئی اور روتے ہوئے فرمایا: ہاتھی کا بوجھ گھوڑے پر رکھا جا رہا ہے[1]

ہادیٔ ہریانہ آپ کی زندگی کے سیکڑوں واقعات نقیب الاولیاءؒ اور روضۃ الرضواں میں درج ہیں، اگر ان کے ساتھ ان روایات کا ذکر کیا جائے جو اَب تک لوگوں کی زبانوں پر ہیں تو ایک ضخیم کتاب بن جائے۔ بزرگان دین سے متعلق روایات سینہ بہ سینہ چل کر کیا سے کیا بن جاتی ہیں

[1] روضۃ الرضواں ص ۶۷، ۶۸۔

مگر اس میں حیرت ہے کہ آپ سے متعلق روایات نہ محیر العقول بنیں اور نہ انھوں نے آپ کو ایک افسانوی شخصیت بنایا، یہ زبانی روایات بنیادی طور پر آپ کی تعلیمات سے ہم آہنگ ہیں تاہم زبانی ہیں اس لئے کسی تاریخ کی کتاب کیلئے مستند شمار نہیں ہو سکتیں۔ آپ کے اتنے ٹھوس کارہائے نمایاں موجود ہیں کہ زبانی روایات کا سہارا لئے بغیر آپ کی سوانح عمری مرتب ہو سکتی ہے، آپنے معاشرہ میں اتنی زیادہ اور ایسی خوشگوار تبدیلیاں کی ہیں جن کے اثرات اب تک محسوس کئے جا سکتے ہیں، بقول نقیب الاولیاءؒ:-

"ہریانہ، میوات اور سوتر کے ہزاروں کافر آپ کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے اور بلا مبالغہ لاکھوں نے کفر و شرک سے آپ کے ہاتھ پر توبۃ النصوح کی" (ج ۲، دفتر ۲ ص ۵)

اور بقول حافظ محمود شیرانی:-

"وہ ہریانہ دیس کے صحیح معنوں میں مصلح اور ہادی ہیں، انکی عملی زندگی کے کئی پہلو ہیں یعنی فقہی، روحانی، اصلاحی اور ادبی"[1]

خان بہادر پیرزادہ ڈپٹی مظفر احمد فضلی حضرت ہادی ہریانہ کی شہادت کے ساٹھ پینسٹھ سال بعد ضلع حصار میں ضلع دار تھے، وہاں کے معمر راجپوتوں کی زبانی روایات اور ہادی ہریانہؒ کے زمانہ کی تحریروں اور نظموں وغیرہ کو سامنے رکھ کر اپنی تصنیف نقیب الاولیاء میں ضلع حصار کے علاقہ سوتر کے مسلم راجپوتوں کی حالت یوں بیان کی ہے:-

"عرب جاہلیت میں جیسا کہ قبیلہ قبیلہ کا بت جدا تھا،

[1] ص ۹، بحوالہ لاہور اورینٹل کالج میگزین بابت فروری ۱۹۳۲ء

اسی طرح سوتر میں ہر کام کے لئے نئی بدعت اور نیا
شرک قوم کا مسلمہ آئین ہو رہا تھا، کیا مرد کیا عورتیں، کھلے
بندوں کفار کی رسوم کے پابند تھے، دھڑلے سے مسلمان
دیوی کو پوجتے تھے، پیپل، جنڈ، کیکر کی پرستش کرتے
تھے، آگ کو دیوی، چراغ کو دیوتا مانتے تھے..... ان کا
عقیدہ تھا کہ جس گھر میں آٹھوں پہر آگ موجود رکھی جائیگی
وہ گھر نہ صرف افلاس کی تاریکیوں سے محفوظ رہے گا، بلکہ
آگ کی جوت سے نعمتوں کی برکات کا نور اس گھر کے
در و دیوار پر سورج بنکر چمکے گا۔"

یہی مصنف اپنی تصنیف 'سیمرغ' میں ہریانہ کے مسلم راجپوتوں
کی معاشرتی حالت کا اس طرح نقشہ کھینچتے ہیں:۔

ہے جو ہریانہ میں قوم راجپوت — سر بسر ہے میرے دعوی کا ثبوت
ان کا یہ آئین، یہ دستور تھا — ہر کوئی اس رسم پر مجبور تھا
لڑکی جب ہوتی تھی پیدا الاکلام — زندہ در گور اس کو کرتے تھے تمام
جانتے تھے کسر شان داماد کو — قتل کرتے دختر ناشاد کو
ہر قبیلہ میں یہ رسم عام تھی — زندگانی موت کا پیغام تھی
لڑکیوں ہی کی نہ تھی کچھ گت بری — شرک سے تھی ملک کی حالت بری
سیتلا کو پوجتے تھے جا بجا — یہ مرض گویا کہ اک معبود تھا
ہولی، دیوالی مناتے تھے تمام — کافروں کی رسم پہ تھے خاص و عام
مانتے تھے بھوت کی پریوں کی ناز — جانتے تھے ان کو اپنا کارساز
زین خاں کی منتوں کا زور تھا — شرک میں کفار کا سب طور تھا

ہر گلی، کوچہ میں باشور و فغاں — تھا علم گوگا کی چھڑیوں کا نشاں
تھا کوئی لونا چماری کا غلام — ٹونکوں میں جاتا تھا اپنا کام
شیخ سدو کی نیازوں کا تھا شور — مول تھا بکروں کا بس کچھ تو کچھ اور
ہر بشر کے شرک سے لیل و نہار — تھا زباں پر نعرۂ یا دم مدار
ٹھاکروں کی بھینٹ چڑھتی تھی ہیں — غیر کے سجدے میں گھستے تھے جبیں
گودتے تھے نیل سے اپنا بدن — اک نئی تصویر تھا ہر عضو تن
میتوں پر سوگ کرتے سال بھر — بین کرتے ان کے حال و قال پر
جانتے تھے دست بردی کو کمال — شیر مادر تھا انھیں غیروں کا مال

ان ابیات میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ محض شاعری نہیں بلکہ اس وقت
کے ایک ہریانوی مصنف حافظ رحمت خاں کی کتاب 'تحفۂ ایمانی' اور
حضرت ہادئ ہریانہ کی تصانیف سے اس کے حرف حرف کی تصدیق و
تائید ہوتی ہے۔ اس میں آگے ہادئ ہریانہؒ کی تحریک کا کارنامہ بیان
کرتے ہیں کہ اس نے ہر مذموم رسم کا خاتمہ کیا اور پوری طرح اس کا
استیصال کر دیا۔

غیب سے ظاہر ہوا ابر کرم — جس کا سر مرکز تھا نیسان ہم
حضرت رمضانؒ نے باعزم درست — وعظ پر باندھی کمر ہمت کی چست
قوم کو تعلیم کی تلقین کی — قوم کو باتیں سکھائیں دین کی
ان کو سمجھایا مفصل کھول کر — ٹھیٹ موٹی ان کی بولی بول کر
ہو گئی اک آن میں کایا پلٹ — شرک و بدعت کا گیا دفتر الٹ
گل ہوا رسم جہالت کا چراغ — ہو گیا سرسبز پیغمبر کا باغ
لڑکیاں لڑکوں سے پیاری ہو گئیں — باغ میں پھولوں کی کیاری ہو گئیں

شرک میں ڈنکا بجا اسلام کا — راجپوتوں کا فلک پر غل ہوا
اوندھے چولھے دیوتاؤں کے ہوئے — ڈیڑھ پونے ماسواؤں کے ہوئے
زین خاں نے کی رہِ ملک فرار — لب کو بھولا نعرۂ یارم مدار
کفر پر غالب ہوا حق کا چلن — شیخ سدو کا ہوا بگرا ہرن
گل ہوا دیبی کی منت کا چراغ — ہے دلِ شیطاں میں حسرت کا یہ داغ
سرنگوں گوگا کا جھنڈا ہوگیا — جوشِ نارِ جہل ٹھنڈا ہوگیا

اگر اس وقت ان قبائل کو ان کی حالت پر چھوڑ دیا جاتا تو اس کا قوی امکان تھا کہ ۱۸۰۳ء میں مسلمانوں کے ہاتھ سے زمام حکومت جانے بعد یہ اپنی قدیم حالتِ کفر پر لوٹ جاتے اس طرح خود بھی خسارے میں رہتے اور مسلمان بھی ان لاکھوں جری بہادروں سے محروم رہ جاتے مگر خدا کو یہ منظور نہ تھا یہ حقیقت ہے کہ شاہ محمد رمضانؒ کی اصلاحی تحریک کی بدولت دولتِ ایمان سے مالا مال ہونے کے علاوہ اب یہی قبائل تمدنی، معاشی اور اخلاقی اعتبار سے اپنے ہم نسل ہندو راجپوتوں سے بدرجہا بہتر ہیں۔

کارکنوں کی تربیت

ہر مصلح کو تحریک چلانے کے لئے کارکن درکار ہوتے ہیں۔ آپ نے مسلم راجپوتوں ہی میں سے چُن چُن کر ان لوگوں کو تربیت دی جو فطرتاً نیک اور اپنے گھناؤنے ماحول سے بیزار تھے، تحریک کے ارکان میں ایسے کارکن بھی پائے جاتے ہیں جو پہلے ہندو یا عیسائی تھے اور آپکے دست حق پرست پر اسلام لاکر ایک نو مسلم کے سے جوش اور ولولہ سے کام کرتے تھے، آپ ہر طالب کو بیعت نہیں کرتے تھے مگر جسے بیعت کر لیتے وہ آپ کے رنگ میں رنگ جاتا۔ گرمی میں اپنے آبائی محل کے تہ خانے میں

قیام ہوتا تھا، وہیں بیسیوں درویش آپ کے زیر تربیت رہتے تھے، باقی درویش محلہ اور شہر کی مساجد میں ذکر الٰہی میں مشغول رہتے، درویشوں کی یہ جماعت خود کھیتی کیاری کر کے اپنے اور مسافروں کے لئے غلہ مہیا کرتی، کھیتی کیلئے زمین مسلم راجپوتوں نے دے رکھی تھی جسے دوہلی کہتے تھے، ان دوہلیوں کے سرکاری واجبات اہل دہ ادا کرتے، اور آمدنی تحریک کا سرمایہ ہوتی تھی۔ ان میں سے مہم، کاہنی، پوٹھی، دانگ اور خانک کی دوہلیاں ۱۹۴۷ء تک شاہ محمد رمضانؒ کے ورثاء کے پاس تھیں۔ مسافر خانے میں ایک ایک وقت سو سو درویش مسافر روز طعام پاتے اور آپ روکھی سوکھی پر بسر اوقات کرتے، صبح چنے کی روٹی چھاچھ کے ساتھ اور شام کو نمکین دلیہ یا گڑ کا دلیہ آپکی عام خوراک تھی، آپکی اہلیہ خود چکی میں اناج پیسا کرتی اور سوت کاتا کرتی تھیں، حالانکہ ان خاتون کے والد ماجد حضرت شاہ سلام اللہ کا شمار دہلی کے روٴسا میں ہوتا تھا۔

درویشوں کی جماعت میں احمد نامی ایک گاڑی بان تھا جو ہندو یوگی سے مسلمان ہوکر آپکی خدمت میں رہتا، اور آپکی رتھ چلایا کرتا تھا۔ اس کی ناز برداریاں دیکھکر ایک بار آپکے پیرو مرشد سید محمد عبدالعظیم لاہوری ثم پانی پتی نے فرمایا: "میں نے بارہا سوچا کہ تمہارے پاس سیکڑوں آدمی کیونکر کھنچے چلے آتے ہیں اور آکر جانے کا نام نہیں لیتے اور جو جاتے ہیں تو روتے ہوئے جاتے ہیں، آج معلوم ہوا کہ تمہارا حلم سب کو کھینچ لیتا ہے۔ (روضۃ الرضوان ص ۸۵)

ان درویشوں میں ایک انگریز یا فرانسیسی بھی تھا جو دہلی میں آپ کا وعظ سنکر مسلمان ہوا (نقیب الاولیاء نیز سہ حرفی حافظ رحمت خاں)

❀ ❀ ❀

ایک تبلیغی دورہ

اپنے درویشوں کی معیت میں آپ سال کے گیارہ مہینے وطن سے باہر رہتے، ایک تبلیغی دورے کا تذکرہ روضۃ الرضوان میں ہوا ہے اور تفصیل نقیب الاولیاء جلد دوم دفتر دوم میں دی ہوئی ہے اقتباسات آخر الذکر کتاب سے ہیں :-

"ایک مرتبہ آپ ہانسی حضرت قطب جمال ہانسوی کی درگاہ میں قیام فرما تھے، عرس کا موقع تھا، علاقہ علاقہ کے لوگ حصولِ فیض کے لئے آپکی خدمت میں حاضر ہو رہے تھے، ضلع حصار کے علاقہ سوتر کا ایک وفد آیا، اس وفد میں شاہ محمد بودلہ، مولوی نور محمد سکنہ رانیہ، حافظ رحمت خاں سکنہ موسی کھیڑہ۔ اور قاضی غلام محمد فتح آبادی بھی تھے، انھوں نے عرض کیا: آپ کے فیض برکات سے ہریانہ اور تمام ملک ایسی سوئے حصار رسوم قبیحہ سے نجات پاچکا ہے، لوگ فسق وفجور سے تائب ہو چکے ہیں، دختر کشی کی دیرینہ رسم مفقود ہو چکی ہے، لیکن سوتر اور بھٹانہ میں ھنوز خاص وعام اسی بلا میں گرفتار ہیں" (ص ۹۴)

یہ باتیں سُنکر آپ بہت ملول ہوئے اور بارگاہِ ایزدی میں دست بدعا ہوئے۔ اگلے روز اپنے درویشوں کو لے کر ہانسی سے چل پڑے، راستے میں بستی بستی وعظ وتلقین فرماتے ہوئے بیگھڑ پہنچ گئے، یہ مسلم راجپوتوں کا قصبہ اور حصار کی تحصیل فتح آباد سے چار پانچ میل کے فاصلہ پر واقع پر تھا، یہاں آپ نے کئی روز قیام کیا، پہلے روز وعظ فرما رہے تھے، سارنگ نامی نمبردار نے اٹھ کر کہا کہ ہمیں شریعت کے احکام ماننے میں کوئی عذر نہیں، مگر

اپنی لڑکیوں کو زندہ رکھ کر کسی کا سالا یا سُسر بننا ہمیں گوارا نہیں اور اپنے بزرگوں کی طرح ہمیں یہ بھی برداشت نہیں کہ چچازاد بہن کو نکاح میں لائیں۔ سارنگ اس علاقہ میں بااثر تھا اور اس کے ہمخیالوں کی بھی کمی نہ تھی، تاہم آپ کی شخصیت اور آپ کے وعظ کا کچھ ایسا اثر ہوا کہ وہاں کی اکثریت آپکے ہاتھ پر ان دونوں برائیوں اور دوسری مشرکانہ رسوم سے تائب ہو گئی۔ وہاں کے پڑھے لکھے لوگوں میں اپنی مصنّفات تقسیم کرائیں اور ہدایت فرمائی کہ انھیں محلہ محلہ اور گھر گھر پڑھ کر سُنایا جائے۔ دورانِ قیام گرد و نواح کے دیہات کے لوگ آکر آپ کے ہاتھ پر تائب ہوتے رہے یہاں آپ نے حافظ مستقیم کو اپنا خلیفہ بنایا اور پھر فتح آباد کا عزم کیا۔

اس تمام سفر میں ایک دیندار راجپوت حافظ رحمت خاں سکنہ موسی کھیڑہ آپ کے ہمراہ تھے، انھوں نے ایک سہ حرفی میں حضرت شاہ محمد رمضان کے فضائل اور کام کا ذکر کیا ہے، یہ سہ حرفی نقیب الاولیاء جلد دوم دفتر دوم میں نقل ہوئی ہے، حروف تہجی کے اعتبار سے کل اٹھائیس بند ہیں جن میں سے ہم صرف تین یہاں نقل کرتے ہیں :-

(ع) عین عجائب تیرا سایا جان تہہ دلی وعظ سنایا
ہک فرنگی دوڑا آیا ترت فرت ایماں لے آیا
ہور میں کی کراں بیان
حضرت ہادی شاہ رمضانؒ

(غ) غرور تکبر والے پیندے جیڑے خمر پیالے
دیکھ تینوں ہوئے خوشحالے تائب ہو چھڈن بد چالے
تابع تیرے جن وانساں
حضرت ہادی شاہ رمضان

(ق) قصۂ ستّ دھیاں والا — قتل اولاد اونہا دا چالا
ماردھیاں کرے منہہ کالا — اوتھے گیوں توکڈھو کنسالا
دیکھ تینوں ہوئے حیراں
حضرت ہادی شاہ رمضانؒ

ضلع حصار کے ایک علاقہ میں پنجابی زبان بولی جاتی ہے۔ بند (ع) میں اسس فرنگی کا حوالہ ہے جو آپ کے درویشوں کی جماعت میں شامل ہوگیا تھا۔ بند (غ) میں مسلم راجپوتوں کی کثرت شراب نوشی کی طرف اشارہ ہے آج بھی ہریانہ کے ہندو راجپوتوں کے ہر گھر میں شراب کی بھٹی ہے۔ بند (ق) میں موضع جھنڈا علاقہ پٹیالہ کا وہ واقعہ بیان ہوا ہے جس کے خود حافظ رحمت خاں عینی شاہد تھے، رواج سے مجبور ہوکر ایک بدنصیب باپ اپنی چھ لڑکیوں کو پہلے دفن کرچکا تھا، اور اب ساتویں لڑکی کو دفن کرکے آرہا تھا، حضرت ہادی ہریانہؒ ایک جگہ وعظ فرما رہے تھے اور لوگ آ آکر آپکے ہاتھ پر رسم دختر کشی سے تائب ہو رہے تھے، یہ شخص بھی روتا ہوا آیا اور تمام ماجرا بیان کیا، آپ اسی وقت قبرستان تشریف لے گئے، قبر کھدوائی تو لڑکی ایک مٹی کے برتن میں زندہ پائی گئی، اسے باپ اپنے گھر لے گیا۔

حکیمانہ تبلیغ کے اثرات

بچپن میں آپ کا قیام مسلمان راجپوتوں کے قصبہ کاہنور میں اکثر رہا، یہاں رہ کر آپ نے ان قبائل کی زندگی کا ہر پہلو دیکھا ان کی نفسیات سے واقف ہوئے۔ ان کی زبان پر بھی قدرت حاصل کی، اسس ہریانوی زبان کا کرخت لہجہ عوام کی فطرت سے ہم آہنگ تھا، اسس لئے تبلیغ بھی مؤثر ثابت ہوئی۔

علاقہ کے قریہ قریہ میں جاکر آپ نے اسلام کا پیغام پھیلایا، علاوہ ازیں اسس پیغام کی بیسیوں کتابوں میں تشریح کی، ان کتابوں میں سے بیشتر کی زبان ہریانوی ہے، اس طرح آپ نے اسس بولی (زبان) کو اسس قابل بنادیا کہ اسمیں طریقت اور شریعت کے بیان کرنے کی صلاحیت پیدا ہوگئی، ساتھ ہی تحریک کے لیۓ مذہبی ادب کا ذخیرہ پیدا کرکے اسے دیرپا بنادیا۔ لیکن جن کے لئے یہ کتابیں لکھی گئیں وہ باستثنار چند حرف شناسی سے نابلد تھے، اسس لئے آپنے شعر کو وسیلۂ اظہار بنایا، جس کا اثر یہ ہوا کہ اسس تحریک کے کارکنوں اور ائمہ مساجد کے ذریعے یہ اشعار ان پڑھ عوام تک پہنچ گئے، شعر کی اثر آفرینی مسلّمہ ہے اسطرح احکامِ قرآنی، احادیث، سیرِ نبویؐ، ضروری مسائل فقہ، آپ کی حیات ہی میں ہر ڈرمہ کی زبان پر جاری ہوگئے، آج ہزاروں ابجد ناشناس ایسے ہیں جنھیں کبھی علمار کی صحبت میسر نہیں ہوئی مگر ان اشعار کی بدولت ضروری مسائل فقہ اور دوسری ضروریات دین سے واقف ہیں۔

طب میں آپ کو دسترس حاصل تھی جس گاؤں میں جاتے وہاں مریضوں کا معائنہ فرماتے اور اسس میں مسلم وغیر مسلم کی کوئی تمیز نہیں تھی، پاس دوا ہوتی تو وہ بھی مفت دیتے، بنی نوع انسان کے ساتھ اس قسم کی ہمدردی ہمیشہ اور ہر جگہ تبلیغی مساعی میں ممد و معاون رہی ہے۔

دورانِ سفر جہاں مسجد نہ ہوتی وہاں مسجد بنواتے ورنہ تعمیر مسجد کی تحریک کرتے، .... رہتک میں بیوپاریوں کی مسجد آپ کی ترغیب سے بنی، اس کی بنیاد بھی آپ کے ہاتھ سے رکھوائی گئی، انھیں بیوپاریوں نے پاکستان آکر ملتان کی گرمنڈی میں جو عالیشان مسجد تعمیر کرائی ہے اسس سے متعلق مدرسہ کا نام "مدرسہ رمضانیہ" رکھا ہے، رہتک کی عیدگاہ بھی آپ ہی کی تحریک کا نتیجہ ہے،

جہاں جاتے ہر جگہ مسجد تعمیر کرانے کی سعی فرماتے اسطرح مسلم راجپوتوں میں تعمیر مساجد کا شوق پیدا ہوا تو وہ رفتہ رفتہ اسلام سے قریب تر ہوتے گئے۔۔۔ اس سے پہلے ان برائے نام مسلمانوں کے جذبۂ عبودیت کی تسکین کسی ٹھاکر دوارے یا دیبی کے مندر میں ہوتی تھی، ان کا کوئی الگ معبد نہ تھا نہ مرکز، ان مساجد کو مرکز بناکر آپ نے اصل کام شروع کیا، یعنی اصلاح عقیدہ وعمل، ان کے بن جانے سے مسلم راجپوتوں کو پہلی بار احساس ہوا کہ ہم اپنے ہم نسل ہندو راجپوتوں سے جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں، یہ احساس پیدا کرنے کے بعد آپنے حکیمانہ طریق سے انکی خوئے غارت گری اور ایک ایک کرکے ہر رسم شرک و بدعت ختم کردی۔

کسی مشرکانہ رسم سے معاشرہ کو کسی حتمی علاج کی غیر موجودگی میں نکالنا کارے دارد ہے، آپ نے سالہا سال کی کوششوں کے بعد سیتلا دیوی کے کریہہ المنظر بت پر گلگلے اور پوڑوں کے نذرانے کو ایک میٹھے روزے کا اجراء کرکے اس طرف پھیر دیا، اس دن لڑکیاں بڑی بڑی اور میٹھی روٹی پکاتیں اور عورتیں ان روٹیوں سے افطار کرتیں، اور مسلم راجپوتوں کے دلوں سے احترام گاؤ کم کرنے کی خاطر بی بی مریم کے روزے کا اجراء کیا۔ یہ روزہ بعض لوگ اب تک ستره رجب کو رکھتے ہیں، عوام اس رسم کو روٹ بوٹ کہتے ہیں۔ اس روز گائے کا بھنا ہوا گوشت ایک ایک پاؤ کی بوٹی روغنی روٹی پر رکھ کر عزیز و اقارب میں تقسیم کیا جاتا، اس طرح رسوم و توہمات سے بھی چھٹکارہ میسر ہو جاتا، طمانیت قلب بھی مل جاتی اور لذتِ کام و دہن بھی، غرض جس قدر اور جتنی بھی غیر شرعی باتیں راجپوتوں کے مسلم معاشرہ میں سرایت کیے ہوئے تھیں ختم ہو گئیں، یہاں آپ کی ایک تصنیف "عقائد عظیم" سے ایک اقتباس

پیش کیا جاتا ہے اس سے اندازہ ہوگا کہ ہریانہ کی نو مسلم اقوام میں اس وقت کون کون سی مشرکانہ رسوم تھیں:-

"۔۔۔ طاغوت اسے کہتے ہیں، جیسے کوئی ایک زبردست کو ڈرتا ہوا پوجے جیسے بھوت یا پریت کا اوتار یا اوتاری، جیسے شیخ سدو کا بھوگ، باؤلی ہونے کے ڈر سے بکرا یا بکری، یا سرور سلطان کے ڈر سے، کہ کوڑھی کردے گا پرائے کو سجدہ کرے یا پوجے یا بھڈر یعنی کالی گائے یا گوگا کے ڈر سے کہ سانپ سے کٹوا دے گا رت جگا کرے، سیتلا کے ڈر سے خوشامد کا مارا بت خانہ میں جاکر بت پوجنے لگے تو کفر میں پڑے۔

اور دوسری وہ چیز ہوتی ہے کہ اللہ تعالٰے نے ایک چیز کو عجائب یا خوبصورت پیدا کیا اور کوئی اسے پوجنے لگ جائے، یا پتھر میں آگ نکلنے لگے کوئی دیبی نام رکھ کر کوئی حاجت مانگنے لگے یا سجدہ کرے یا کسی بزرگ کے مزار کا جاہ و جلال دیکھ کر سجدہ کرنے لگے، جیسے حویلی بنائے، ایک طاق اس میں پیر کا ٹھہرا دیا، یا ایک بت خانہ بناکر کسی بزرگ کا نام لے کر زمین کو لیپ دیا یا تعزیہ بناکر اس کی طرف سجدہ کرنے لگے یا طواف کرنے لگے، یہ سب شرک ہے"۔

(ص ۴۴ - ۴۵)

نو مسلموں اور ان کی اولاد کو ہندوؤں سے تمیز کرنا مشکل تھا، ہریانہ کے ہندو بھی داڑھی رکھ لیا کرتے تھے، آپ نے یہ نہایت ہی مفید کام کیا کہ مسلم راجپوت مردوں نے دھوتی چھوڑ کر تہ بند اختیار کیا، اور خواتین نے گھاگرا ترک کرکے پاجامہ و شلوار کا استعمال شروع کردیا۔

یہ اور بہت سی اور باتوں کا یہ اثر ہوا کہ معاشرتی اعتبار سے مسلم راجپوت اپنی قدیم ہندو برادریوں سے قطعی مختلف ہوگئے، رسمِ دختر کشی ختم ہوئی، رہزنی اور غارت گری چھوٹی، زراعت اور فوجی ملازمت کی طرف توجہ ہوئی، اخلاق و عادات میں ایک انقلاب برپا ہوگیا، جمود ٹوٹا اور ترقی پذیر معاشرہ وجود میں آیا، مسلم سماج کا ظہور ہوا، ہر طرف قال اللہ و قال الرسول کے چرچے ہونے اور سنائی دینے لگے، متعدد غیر مسلم اپنے عقائد اور رسم و رواج کے مقابلہ میں ایک بہتر اور ستھرا نظامِ حیات دیکھ کر حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے آپ کے دستِ حق پرست پر ہزاروں غیر مسلم ایمان لائے، پھر بھی کوئی تحریر ایسی نہ مل سکی جس سے یہ اندازہ ہو سکے کہ ہندو اپنے مذہب کے لئے آپ کو ایک خطرہ سمجھتے تھے، ایسا ہونا تو چاہیئے تھا ضرور، مگر تعجب ہے صورتِ حال اس سے مختلف ہے، دورانِ سفر وہ گاؤں بھی پڑتے تھے جہاں کل آبادی ہندوؤں کی تھی، آپ بستی سے باہر کسی درخت کے نیچے بیٹھ جاتے، ہندو بھی زیارت کے لئے آتے، اور جب آپ وہاں سے اٹھکر چلے جاتے تو توہم پرست ہندو جاٹ اس جگہ کو اتنا مقدس سمجھنے لگتے کہ وہاں ایک چبوترہ بنا دیتے۔ سنہ ۱۹۴۷ء تک کئی ہندو دیہاتوں کے باہر "شاہ رمجان کے چبوترے" موجود تھے۔ ممکن ہے اب بھی ہوں، اس نیک نفس پاک باز عظیم شخصیت کی ذات سے غیر مسلموں کی عقیدت کچھ ایسی غیر متزلزل تھی کہ آپ کی شہادت کے ڈیڑھ صدی بعد بھی، آپکے خاندان کے ہر فرد کو ہندو عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے یہاں تک سنہ ۱۹۴۷ء میں جب اور مقامات کی طرح ضلع رہتک میں میں بھی جنگل کا قانون رائج ہوا اور انسانوں نے درندوں سے زیادہ سفاکی دکھائی اور انیس ہزار بیگناہ مسلمانوں کو صرف ضلع رہتک میں شہید

کر دیا گیا۔ اس پر آشوب زمانے میں بھی ہم کا وہ محلہ محفوظ رہا جہاں ہادیٔ ہریانہؒ کا خاندان آباد تھا۔ یہی نہیں بلکہ ہندو جاٹ انخلاء کے وقت اپنی بیل گاڑیوں میں بٹھا کر ان میں سے بعض کو بحفاظت قصبہ کاہنور میں چھوڑ کر گئے جہاں سے وہ پاکستان گئے۔ یہ دراصل تفسیر ہے مَنْ كَانَ لِلّٰهِ كَانَ اللّٰهُ لَهٗ کی، یعنی جو خدا کا ہو جائے تو پھر کائنات کا ذرّہ ذرّہ اس کا خادم بن جاتا ہے۔

مخالفت اگر کسی مصلح کی مخالفت نہیں ہوئی تو سمجھ لیا جائے کہ اس نے معاشرہ میں کوئی اہم تبدیلی نہیں کی[1]۔ ہندوؤں کی مخالفت کا بیان تو کوئی نہیں ملا، البتہ حکومت نے آپ کی جاگیر ضبط کرلی، اور بعض مسلمان نمبردار آپکی تحریک کو ناکام بنانے میں اپنے تمام وسائل حرکت میں لے آئے، عوام کے بیداری اور دینداری سے اس طبقہ کے مفاد پر زد پڑتی تھی۔ تکلیف دہ مخالفت ان کی طرف سے ہوئی جن سے تعاون کی امید تھی۔

---

[1] یہاں مجھے ایک واقعہ یاد آیا، سنہ ۱۹۵۹ء میں ایک دوست سے ملنے کی خاطر پاکستان گیا، یہ بہت ذہین، باشعور اور سنجیدہ آدمی ہیں، نام ہے کمال الدین، کمال سالار پوری اردو کے بہت اچھے شاعر بلند پایہ ادیب۔ ایک دن باتوں باتوں میں کہنے لگے "اگر کسی جماعت کی مخالفت بھرپور نہ ہو تو سمجھئے جماعت باطل ہے اہل حق میں سے نہیں اور وضاحت کرتے ہوئے ایک خاص جماعت کا نام لیا کہ نصف صدی ہونے کو آئی مگر ابھی تک اس کی ہر طبقہ میں پذیرائی ہے"۔
میں نے کہا: "یہ اندازِ فکر مناسب نہیں، فکر کو وسیع، کشادہ، صاف اور سنجیدہ رکھنا چاہیئے، اس قسم کی باتوں سے کوئی دینی مہم سر نہیں ہوتی، بلکہ باہمی رنجشیں روابط کو ڈھیلا دیتی ہیں۔ مجھے اس وقت یہ بات نادر اور اجنبی سی لگی، مگر اس کے بعد جب بھی کبھی یہ تصوّر

آپ کے درویشوں کی جماعت میں ایک ممتاز بزرگ مولوی نور محمد صاحب تھے، رانیہ کے باشندے مگر رہائش بیگھڑ میں تھی، رام پور کے

(بقیہ حاشیہ)
ذہن میں آیا کچھ نقوش ضرور چھوڑ گیا، آخر کبھی نہ کبھی تو اس پر سنجیدگی سے غور کرنا ہی تھا۔ اب ایک دانش مند مفکر کا یہ مقولہ سامنے آگیا۔ جو چودہ صدیوں سے علم و عمل، اصلاح و تذکیر، احسان و معرفت، تصوف و سلوک اور قدیم و جدید علم و نظر سے بہرہ ور خانوادہ سے منسلک ہے گویا اجنبی اور مخالف ماحول کی پیداوار نہیں ـــــ دراصل انسان فطرتاً صالح پیدا ہوتا ہے، صالح افراد سے تشکیل یافتہ سماج بھی صالح ہوگا فطرت کے اس چمن کو سدا بہار بنانے کے لئے انبیاء کرام علیہم السّلام مبعوث ہوئے، حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اس چمن کی زیبائش و رعنائی کو منتہائے کمال پر پہنچا دیا بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْأَخْلَاقِ۔ اب اس چمن کی آبیاری یا بالفاظ دیگر صلاح و فلاح نام ہے انبیاء کرام علیہم السّلام کی مکمل اتباع و مطابقت کا، زندگی کا ہر گوشہ انکی تعلیمات سے شاداب، دل و دماغ ان کے انفاس قدسیہ سے معمور و گرم اور فکر و نظر ان کی تجلیات سے روشن و تابندہ۔ اب صلاح و فلاح کی ذمہ داری علماء کے سپرد ہے، اب جب بھی تذکیر و اصلاح کا کام موقوف ہوتا ہے یا مضمحل تو شر و فساد کے جراثیم انسانی فطرت کو متاثر کرکے آمادۂ معصیت کر دیتے ہیں، معصیت تمرد و سرکشی بن جاتی ہے، پھر انسان کا حریف ازلی اس تمرد و سرکشی اور اس معصیت کی تزئین کاری میں لگ جاتا ہے، اور اس میں اس قدر رنگ آمیزی کرتا ہے کہ انسانی قلوب اس کے گرویدہ ہو جاتے ہیں، یہ گرویدگی و شیفتگی انسانی دلوں کو ـــ جو تجلیات ربانی سے معمور تھے ـــ معصیت نگر بنا دیتی ہے، گناہ صغیرہ پر اصرار جہاں اسے کبیرہ بنا دیتا ہے وہاں وہ انسان کو اس کا عادی بھی کر دیتا ہے، پھر منکرات کا شیوع ہوتا ہے، اس ماحول میں حق کی آواز بلند ہو اور اس کے مخالف پیدا نہ ہوں سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے مطلوب و پسندیدہ اشیاء سے علیحدہ

فارغ التحصیل تھے، اپنے پیر و مرشد حضرت شاہ محمد رمضانؒ سے عقیدت میں اس قدر غلو کرتے کہ فرماتے: "جس شخص پر حضرت شاہ محمد رمضانؒ کی ہیلی کی خاک اڑ کر پڑ جائے وہ جنتی ہو جاتا ہے"۔ مگر جب آپنے حافظ مستقیم کو بیگھڑ میں اپنا خلیفہ مقرر کیا تو یہ بزرگ جماعت سے کنارہ کش ہو گئے۔ تحریک کے تمام اچھے پہلوؤں کو نظر انداز کرکے آپکے وحدت وجود کے نظریہ

(بقیہ حاشیہ) کرنا سہل نہیں، خواہشات پامال ہوتی ہیں، اثر و رسوخ پر اثر پڑتا ہے، اقتدار کی چادر تار تار ہوتی ہے، فسق و فجور کی اجارہ داری ختم ہوتی ہے، ان میں سے کسی نہ کسی مرحلے کا واسطہ پڑتا ہے اور پھر مخالفت ضروری و لابدی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم اعلان نبوت سے پیشتر نہ صرف ہر طبقہ میں مقبول و محبوب تھے بلکہ آپ کی پذیرائی اس سے بھی آگے تھی، آپ الامین الصادق تھے، مگر جیسے ہی آپنے "لاالٰہ الااللہ" کی دعوت دی مخالفتوں کا ایک طوفان امڈ کھڑا ہوا، کیوں؟ آپنے ان کے محبوب معبودوں کی نفی کرکے ان کے جذبۂ عبودیت کو ٹھیس پہنچائی، ان کے حیطۂ اقتدار کو ڈھیلا کر دیا، ان کے رگ و ریشہ میں سرایت کی ہوئی بدی (بت پرستی) کا استیصال فرمایا۔ یہ ہے مسنون طریقۂ اصلاح و تذکیر۔ دلوں کو آمادۂ صلاح کرنے کے لئے اولاً شجر معصیت کی بیخ کنی "لاالٰہ" پھر صلاح و فلاح کی کاشت "الااللہ"۔ یہ ہے کانٹوں کی سیج اور اگر صرف نیکی پھیلائی، برائی کو ہاتھ نہ لگایا، تو گو بظاہر بھلا معلوم ہوتا ہے مگر فطرت اور سنت کے عین ضد ہے۔ "نیکی اس قدر پھیلاؤ کہ برائی دب جائے"۔ اس راہ میں اگر تکلیف نہیں ہے تو باعث حیرت کیوں۔؟ انبیاء علیہم السلام کی راہ میں ہوتی ہیں تکلیفیں اور یہ راستہ نہ فطرت کے مطابق ہے نہ سنت کے موافق۔ اعاذنا اللہ منہا

کو خوب اچھالا، کفر کے فتوے حاصل کئے، حد یہ ہے کہ موصوف کی...
معتقدین خواتین اپلے تھاپتے وقت اس طرح گاتی تھیں "رومی کافر، جامی کافر، نبی کافر ہے"۔ حضرت بادی ہریانہؒ کی کتاب "بلبلِ باغِ نبی" کے مقابلہ میں پنجابی نظم میں "شہبازِ شریعت" لکھی، بلبل کے مقابلہ پر شہباز لانے سے دم خم کا اندازہ ہوتا ہے، انداز یہ ہے:-

"شہباز رسالہ شریعت والا پائے پیا پیچ دھاراں۔ سنو رنگیلی جیل ماری چڑیاں لکھو ہزاراں"۔

... بات یہاں تک بڑھی کہ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کو حکم بنایا گیا جنھوں نے بادیٔ ہریانہؒ کے حق میں فیصلہ دیا.....

(روضۃ الرضوان، نقیب الاولیاء)

تصانیف

اب سے نصف صدی پیشتر صاحب نقیب الاولیاء نے لکھا:-

"آپ کی تصانیف کی قبولیتِ عام کا بلا مبالغہ یہ حال ہے کہ میوات، ہریانہ، سوتر، نواح دہلی غرض ملک کے ہر حصہ میں کوئی گھر خالی نہیں جہاں عقائد عظیم، آخر گت، بلبل باغ نبی، موجود نہ ہوں"۔

ہمیں آپ کی مندرجہ ذیل تصانیف کا علم ہے:-

(۱) عقائد عظیم (۲) آخر گت
(۳) بلبل باغ نبی (۴) رنگیلی
(۵) وصیت نامہ (۶) ترجمہ قصیدہ امالی
(۷) ادب تجھو کرہ (۸) بوڑھی بیاض

(۹) فتاوی محمدی: ہریانی نظم (۱۰) رسالہ برق لامع
(۱۱) رسالہ رمضانی
(۱۲) رسالہ رد روافض: ایک شیعہ عالم کے سوالات اور فارسی نثر میں انکے جوابات۔
(۱۳) متفرقات: یہ کسی کتاب کا نام نہیں، اس میں منظوم شجرے، بعض بزرگوں کی شان میں فارسی قصائد، شاہ غلام جیلانی کے نام فارسی میں ایک خط، اوراد و اعمال وغیرہ ہیں

سفرِ حج

۱۸۲۳ء میں آپ ست مخلصین کو لے کر فریضہ حج ادا کرنے روانہ ہوئے، ساحل سمندر تک کچھ سفر پیدل اور کچھ بہلی میں کیا، راستہ میں ہر مقام پر وعظ و تذکیر کی مجالس گرم رہیں، مدھیہ پردیش کے شہر مندسور میں کئی روز قیام رہا، روزانہ وعظ ہوتا اور لوگ پروانہ وار وعظ میں شریک ہوتے کچھ بوہرے بھی آپ کے وعظ سے متاثر ہوئے تو بوہرہ جماعت نے آپ کے جلسوں میں گڑبڑ پیدا کرنے کی کوشش کی، حج قریب تھا اس لئے آپ جہاز پر سوار ہو گئے، جہاز میں بھی وعظ و تلقین کا سلسلہ بدستور جاری رہا آپ کے گرد ہمیشہ ہجوم لگا رہتا، حج بیت اللہ اور زیارت روضۂ اقدس کرکے آپ عازم ہندوستان ہوئے۔

شہادت

حج سے واپسی پر مندسور میں آپ کا شاندار استقبال ہوا، آپنے مسجد میں قیام فرمایا، اس مسجد کے پاس کچھ بوہروں کے مکان تھے، خلافِ معمول منگل کے دن آپنے کپڑے بدلے، خوشبو لگائی، آپ اور آپکے ہمراہی نماز کے بعد مسجد میں مراقب تھے اور معمولات و مشاغل میں مصروف

کہ بوہروں کی ایک جماعت شور و غل کرتی ہوئی مسجد میں آگھسی، اس وقت مسجد میں آپ کے پانچ ہمراہی حاجی رحمت خاں، حاجی گل محمد خاں ولایتی حاجی نور محمد کانپوری، حاجی قمرالدین سکنہ دانگ، حصار، اور سید عبدالقادر تھے، نیز سید احمد علی کرنالی، قاضی معین الدین مانڈل گڑھ والے اور پرتاپ گڈھ کے قاضی صاحب مصروف عبادت تھے، قاضی صاحب پرتاپ گڈھ والے پچاس آدمیوں کو ساتھ لائے تھے کہ حضرت ہادیٔ ہریانہ کو اپنے یہاں لے جائیں، یہ پچاس آدمی شہر میں کہیں اور جگہ مقیم تھے، مسجد میں مقیم ان حضرات نے بوہرہ بلڑ بازوں کو مسجد سے نکالنے کی کوشش کی، اسی اثنار میں ایک مسلح ٹولی نے مسجد پر بلہ بول دیا، حاجی رحمت خاں نے بندوق اٹھائی اور شست باندھی ہی تھی کہ آپ نے روک دیا اور فرمایا: "پہل کرکے ثواب گھٹاتے ہو"۔ ان سے بندوق چھین لینی چاہی، بندوق نیچے گر گئی اور اس کا کندہ ٹوٹ گیا، فوراً حملہ آوروں نے بندوقیں چلادیں، اس پر اجازت لے کر حاجی گل محمد خاں ولایتی اور حاجی رحمت خاں تلواریں میان سے سونت کر اٹھے، سات آٹھ بوہروں کو زخم آئے، باقی نے راہِ فرار اختیار کی، یہ بوہرے ساتھ کے مکان پر چڑھ کر گولیاں برسانے لگے، سب جاں نثاروں نے ہادیٔ ہریانہ کو بیچ میں لے لیا کہ آپ پر آنچ نہ آئے، اتنے میں بوہروں کی ایک جماعت مسلح مسجد کا دروازہ توڑ کر اندر آگھسی، یہ جمعیت بہت بڑی تھی ان میں چالیس تو فریدی عرب تھے جو نشانہ بازی میں مشہور تھے، اور بوہروں نے ایسے موقعوں پر استعمال کرنے کے لئے ملازم رکھے ہوئے تھے، انکے ساتھ سیکڑوں اور تھے، دست بدست لڑائی میں تو کچھ دیر مقابلہ رہا آخر "شجر ولایت" کے برگ و بار تھرتھرانے لگے، سب سے پہلے حاجی رحمت خاں نے

زیر ناف گولی کھائی اور شہید ہو کر زمین پر گر پڑے، ان کے بعد قاضی معین الدین مانڈل گڑھ والے کی باری آئی، پھر سید عبدالقادر نے جام شہادت پیا، بعد ازاں سید احمد علی جاں بحق تسلیم ہوئے، حاجی گل محمد کے دونوں پاؤں کٹ گئے اور حاجی نور محمد کے اوّل ایک کاری زخم تلوار لگا پھر ایک گولی ران میں ایسی لگی کہ بیتاب ہو کر گر پڑے، حاجی قمرالدین اور قاضی جی پرتاپ گڈھ والے بھی سخت مجروح ہوئے۔

قافلہ سالار حضرت شاہ محمد رمضانؒ ساتھیوں کی شہادت سے پہلے ہی بازو میں دو گولیاں کھا چکے تھے، ان بہادروں کے شہید ہونے کے بعد دو گولیاں اور آپ کے سینۂ مبارک میں آکر لگیں، ایک گولی جبینِ مبارک پر ایسی لگی کہ دماغ کو چیرتی ہوئی دوسری جانب نکل گئی، آپ معاً سجدے میں گرے اور طائرِ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گیا[1]۔ یہ واقعہ ۲۸ رجادی الاوّل ۱۲۴۰ھ مطابق ۱۸/۱/۱۸۲۵ء کا ہے۔ ابھی حملہ آوروں کا جوشِ انتقام ٹھنڈا نہ ہوا تھا، انھوں نے ہادیٔ ہریانہ کی نعش کو خنجر و تلوار کے پینتالیس زخم لگائے، آپ کا سامان اور قیمتی کتب خانہ لوٹ کر چلے گئے، ہادی شہیدؒ کے باقی ماندہ ساتھی جو کہ ناکہ بندی کے باعث پہلے نہ آسکے تھے اب آگئے، زخمیوں کو پانی پلایا، اور نعشوں پر آنسو بہا کر چادریں ڈال دیں۔

فوراً ہی ایک آدمی مہو چھاؤنی بھیجا گیا، جہاں الیگزانڈر کا رسالہ پڑا پڑا ہوا تھا اور جس میں ہادیٔ ہریانہؒ کے معتقد ہریانی سپاہی تھے، قاضی شہر حاکم مندسور کے پاس گئے اطلاع کی مگر وہ پہلے سے ہی فتنہ پردازوں سے ملے

---

[1] روضۃ الرضوان، ص ۱۰۸، ۱۰۹

(۱۵) میاں حاجی خدابخش سکنہ اہرداں ضلع حصار

(۱۶) مولوی خدابخش ڈسکوی : عسل پور کے باشندے ، سائیں رحمت شاہ کے والد ، راجپوت ، حافظ قرآن اور عالم فاضل تھے ۔

(۱۷) پیر امیر بخش رہتکی ۔

(۱۸) قاری محمد بیگ ہلوی : آپکے علاوہ ہادی ہریانہؒ نے اور کسی کو سلسلۂ نقشبندیہ میں بیعت نہیں کیا ۔

(۱۹) حافظ محمد ضیاء الدین : مولوی معین نارنولی کے فرزند تھے ، انھوں نے ہادی ہریانہؒ کے نظریۂ وحدۃ الوجود پر خیالات ایک رسالہ میں جمع کئے ہیں

(۲۰) میاں شاہ پیر محمد : نواحِ بھٹنڈہ کے رہنے والے مگر اوائل عمری ہی میں پٹیالہ کے نواح میں آبسے تھے ، سائیں رحمت شاہؒ ڈسکوی ، فتح محمد نابینا جیسے بزرگ آپکے مرید ہیں ۔

(۲۱) میاں معصوم علی : نارنول میں عریاں پھرا کرتے تھے ، ایک مرتبہ ہادی ہریانہؒ وہاں تشریف لے گئے تو اسی حال میں سامنے آ کھڑے ہوئے ، آپنے فرمایا : "جاؤ کپڑے پہنو ، ننگے مت پھرو" اسی وقت حالتِ جذب سے ہوش میں آ گئے ، انھوں نے عمر بھر انگریزوں کے متوسلین اور ملازمین کے یہاں کھانا نہیں کھایا ۔

(۲۲) میر حیدر علی نارنولی ۔

(۲۳) میاں عبداللہ شاہ درویش : موضع منگالہ کے کالستھ تھے ، ہادی ہریانہؒ کے ہاتھ پر مشرف باسلام ہوئے ، دہلی میں رہتے تھے ، ان کے مشہور خلفاء یہ ہیں : "میر اشرف علی ، میر ہاشم علی ، حاجی نور محمد کانپوری اور میاں لال شاہ ریواڑی والے"

(۲۴) میاں منور شاہ لاہوری : پہلے ہندو سادھو تھے ، ہادی ہریانہؒ کے ہاتھ پر مشرف باسلام ہوئے ۔[۱]

[۱] مآثر الاجداد ص ۹۳ ۔ ۱۰۰ حذف و اضافہ کیساتھ

شاہ محمد اسمٰعیل شہید رہتکیؒ

ولادت : ۱۳۰۰ھ ۱۸۸۳ء کاہنور ، ضلع رہتک

شہادت : ۲۸ رجمادی الثانی ۱۳۷۴ھ ۱۹۵۸ء ۱۲ رفروری جیل خانہ حصار ۔

آپ ہادی ہریانہ حضرت شاہ محمد رمضان شہیدؒ کے چھوٹے بھائی اور شاہ عبدالعظیم بن شاہ عبدالحکیم کے فرزند تھے راجپوتوں کے مشہور قصبہ کاہنور میں پیدا ہوئے جہاں آپکے والدین اپنے وطن بہم سے اکثر جاتے رہتے تھے وہیں ایک راجپوت خاتون کا دودھ پیا جسے آپ کی اولاد اب تک تعظیم کے ساتھ "دادی جھونہ" کے نام سے یاد کرتی ہے ۔

آپ فضلاء روزگار میں سے تھے ، فنِ موسیقی تک پر ایک رسالہ لکھا ، جس کے صرف چار صفحے ہمارے پاس رہ گئے ہیں ، علم طب کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی ، اس فن میں آپ کا مصنفہ یا نقل کردہ سولہ صفحات کا ایک رسالہ ہمارے پاس ہے ، شعر کا بھی اچھا ذوق تھا ، ہمارے پاس آپ کے تصنیف کردہ یا نقل کردہ بیس رسائل ہیں جن میں رسالہ "ریاض الادویہ" (تصنیف عہد ہمایونی) شاہ غلام جیلانی کے رسائل طریق الہدیٰ اور اطباء اخفاء شاہ شرف الدین یحییٰ منیریؒ کا رسالہ فناء ، حضرت ابو سعید بن فضل شاہ احمد المجددی الحسنی کے رسائل ، ہدایت الطالبین اور ارشاد السالکین ، اور مولانا عضد الدین کا رسالہ "فضل المتاخرین" قابلِ ذکر ہیں ، آپ کی تین بیاضیں بھی ہمارے پاس محفوظ ہیں ، ایک میں دعائیں ، عملیات ، اور کتاب "آئینہ احمدی" ہیں ، دوسری میں غزلیں ، نظمیں اور تیسری میں اپنے سفر لکھنو اور

الٰہ آباد ۱۲۲۴ھ کے حالات ہیں، اس بیاض کا نام آپ نے خود "بیاض حاصل السفر" رکھا ہے اور اس پر ہشت پہلو مہر "عظیم شریعلہ کے حکیم ہمائیل" لگی ہوئی ہے، آپ کی ایک بیاض مصلح الدین کے پاس ہے، اس بیاض میں دعائیں، عملیات، سفر الٰہ آباد کے حالات ہیں، اور صوفیائے کے بعض اقوال، حضرت شاہ محمد افضل الٰہ آبادی کی لکھی ہوئی ایک طویل تضمین، حضرت شاہ غلام جیلانی کے اس تعزیت نامے کی نقل جو انھوں نے محمد محفوظ خاں بہادر کی شہادت پر ان کے فرزند کو بھیجا ہے۔

آپ ایک عالم باعمل تھے، والد مجذوب تھے، بڑے بھائی حضرت ہادی ہریانہ سال میں گیارہ مہینے گھر سے باہر رہتے چنانچہ ہوش سنبھالتے ہی گھر اور جاگیر کا انتظام و بندوبست آپ کے کاندھوں پر آپڑا۔ نواب دوجانہ عبدالصمد خاں نے جو جاگیر ۱۸۰۸ء میں آپ کے والد محترم کو نذر کی تھی اس کی دیکھ بھال بھی آپ ہی کرتے، کمپنی کے ابتدائی دور حکومت میں اس جاگیر کی تصدیق و توثیق بھی آپ ہی کی مساعی سے ہوئی، حضرت جمال قطب ہانسوی کی خانقاہ کے میدان میں جو عمارت ہادی ہریانہ کی ترغیب سے بنی اس کی تعمیر آپ کی نگرانی میں ہوئی۔ ہادی ہریانہ کی نعش مبارک آپ ہی تیج چھاؤنی سے لائے اور آپ کے اہتمام ہی میں خانقاہ تعمیر ہوئی مگر آپ نے اپنی زندگی میں اس خانقاہ کو تکیہ نہیں بننے دیا حتیٰ کہ یہاں قوالی کی بھی اجازت نہ دی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خانقاہ شریف کے معاملات ہمیشہ شرک و بدعت سے پاک رہے۔

جب ہادی ہریانہ سے ناراض ہوکر ریزی ڈنٹ علاقہ دہلی مسٹر ولیم فریزر نے آپ کی جائیداد ضبط کرلی تو شاہ محمد اسمٰعیل کو والی ٹونک نے اپنے یہاں بلالیا، جب تک آپ ٹونک میں رہے آپ کو سات روپے ملتے رہے اور

جب وہاں سے بہم تشریف لائے تو تاحین حیات آپ کو ریاست سے تین روپیہ یومیہ ملتے رہے اس زمانے میں روپیہ کی قوت خرید آج سے کم و بیش بیس گنا تھی

آپ کا قد میانہ، گندمی گول چہرہ، اکثر انگرکھا پہنتے، دستار باندھتے، پاجامہ غرارے دار پہنتے اور زری کی پاپوش استعمال فرماتے، آپ نے بہت سے بزرگوں کی صحبت میں رہ کر راہ سلوک طے کی، تین ماہ کے لئے الٰہ آباد میں شاہ محمد فاخر ابن شاہ خوب اللہ کے خانوادے سے بھی استفادہ کیا۔ آپ مرید و خلیفہ حضرت شاہ غلام جیلانی کے تھے، جن کا سلسلۂ قادریہ چشتیہ آپ سے بھی جاری ہوا، ہمیں آپ کے صرف چار خلفاء کے نام معلوم ہو سکے: آپ کے فرزند مولوی سیف الرحمٰن شہید جنگ آزادی[1]، حافظ سراج الدین، حافظ لکھا ساکن موضع باہمن والا ضلع حصار اور حضرت راج شاہ۔ آخر الذکر کے حالات پر ایک کتاب "ملت راج شاہی" طبع ہوئی، ان کا مدفن سوندھ ضلع گوڑگانوہ میں ہے، صوفیائے میوات میں ان سے زیادہ محترم شخصیت کا ہمیں علم نہیں یہ بزرگ میواتی تھے[2]

اتباع سنت کا آپ کے یہاں خاص اہتمام تھا، خصائل حمیدہ اور شمائل پسندیدہ رکھتے، سلف صالحین کے طریقہ کی پابندی کا بہت خیال

---

[1] مولوی سیف الرحمٰن شہید یکم جمادی الثانی ۱۲۳۳ھ کو پیدا ہوئے اور ۱۸۵۷ء میں ۲۴ ربیع الثانی ۱۲۷۴ھ مصلوب ہوکر درجۂ شہادت پر فائز ہوئے حافظ سراج الدین صاحب ایک لائق نیکوکار اور نیکو اعمال بزرگ تھے اور سالک درویش تھا۔ لکھا صاحب بڑے پاک سیر اور خوش خصائل سالک تھے (ملت راج شاہی ص ۱۰۱)

[2] مآثر الاجداد، مطبوعہ اشرف پریس لاہور ۱۳۸۳ھ/۱۹۶۴ء ص ۹۵-۱۱۹ از منظور الحق صدیقی رتکی

رکھتے تھے چنانچہ ایک مرتبہ حاضرینِ مجلس سے ایک شخص نے آپ کی خدمت میں عرض کیا: حضرت آپ کے پیر و مرشدؒ اور برادر بزرگؒ تو محفل سماع میں شریک ہوا کرتے تھے مگر آپ کو کبھی مجلس سماع میں شامل نہیں دیکھا۔ فرمایا: بیٹا انکے ہم جنس اور ہم مشرب لوگ محفل میں موجود ہوتے تھے اسی لئے وہ شریک محفل سماع ہو جایا کرتے تھے، اب میرے ہم مشرب ہی نہیں رہے تو میں کہاں جاؤں؟ اور پھر اس کی تشریح اس طرح فرمائی کہ شریعت کا ایک مسئلہ ہے کہ جب اضطرار کی حالت ہو یعنی بھوک کی شدت سے جان پر آبنے تو اس حالت میں مُردار اور حرام بھی حلال ہو جاتا ہے، قرآن کریم کی آیت فَمَنِ اضْطُرَّ فِي مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِإِثْمٍ اس کی شاہد ہے، ظاہر ہے کہ یہ حکم نفس کو ہلاکت سے بچانے کے لئے ایک حکمت پر مبنی ہے، اور تمام علماء اس کو تسلیم کرتے ہیں، خاصانِ الٰہی بھی ایسی ہی بھوک اور شدت میں مبتلا ہو جاتے ہیں تو اس کا علاج رقص وجد اور سماع کے بغیر ناممکن ہوتا ہے، اگر خوش الحانی اور راگ کی آواز ان کے کان میں نہ پہنچے تو یہ لوگ حق سبحانہ وتعالیٰ کی تجلیات کے انوار اور اس کی ہیبت سے پگھل جائیں اور فنا ہو جائیں، اس واسطے ان کو سماع میں مشغول ہونا پڑتا ہے اگرچہ یہ داخل لہو ہے مگر اس لہو کی اباحت اور اجازت حدیث سے ثابت ہے اور اسی پر حضرات چشتیہ کا عمل ہے باقی رہا نقشبندیہ قادریہ وغیرہم کا اس سے پرہیز کرنا سو یہ عمل ان کا احتیاط میں داخل ہے کیونکہ گو مباح ہے مگر آخر لہو ہے، پس ان کا احتیاط کرنا افضل و اولیٰ ہے، اور حدیث ذیل اس کی موید ہے، حضرت محمد بن المنکدرؒ فرماتے ہیں کہ مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فرمائے گا وہ لوگ کہاں ہیں جو اپنے کانوں کو لہو مباح اور مزامیر شیطان یعنی لہو غیر مباح سے بچاتے تھے، ان کو مشک کے باغوں میں

داخل کرو اور پھر ملائکہ کو حکم ہوگا کہ ان کو میری حمد سناؤ اور ان سے کہہ دو کہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ

پس اہل طریقت کے ہر دو فریق میں کوئی اختلاف و نزاع نہ رہا، اب رہا معاملہ علمائے شریعت کا، سو وہ بھی سچے ہیں ان کا سماع کو حرام کہنا بھی حق ہے کیونکہ راگ سنکھیا کے مانند ہے، ایسا کون طبیب ہے جو اسے سمیات میں شمار نہ کرے اور ہر کسی کو کھانے کی عام اجازت دیدے، حالانکہ یہ سب حکما جانتے ہیں کہ یہ جاذب رطوبات انتہا درجہ کا مقوی ہے مگر جب تک کسی طبیب حاذق کی رائے کے مطابق سنکھیے کو استعمال نہ کیا جائے اس کی قوت سے کیا فائدہ اٹھا سکتے ہیں بجز اپنی ہلاکت اور فنا کے اور جس کو استعمال الغار سنکھیا۔ کی ضرورت ہی نہیں، یا ہے تو دیگر مقویات سے کام بن سکتا ہو اگر اسے اپنی رائے یا کسی اناڑی طبیب کے کہنے سے استعمال کرے تو اس کی ہلاکت یقینی ہے، یہی حالت راگ کی ہے جب تک اس کے بغیر کام چل سکے مرشد کامل سالک کو اس کی اجازت نہیں دیتا اور جب وہ دیکھتا ہے کہ سالک کا کوئی روحانی مرض بجز اس علاج کے زائل ہونا دشوار ہے تو خاص خاص آداب و شرائط کے ساتھ اجازت دیتا ہے اور وہ بھی مرض کے زائل ہونے تک، جب مرض جاتا رہا، سالک اگر اب بھی اس پر کاربند رہے گا یا اس دوا کو ہی غذا بنائے گا اور آداب و شرائط کا خیال نہ رکھے گا تو چونکہ دفتر شریعت کے درہم برہم ہو جانے کا اندیشہ اور عوام الناس کے گمراہ ہو جانے کا خوف ہے محکمہ شریعت کے عہدیدار ضرور شور مچائیں گے اور اس خرابی کا انسداد کریں گے خواہ وہ راگ سننے والا کیسا ہی کامل کیوں نہ ہو پروا نہ کریں گے کیونکہ ان کے پاس نظیر موجود ہے کہ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو

انجیل پڑھنے سے روک دیا تھا حالانکہ انجیل آسمانی کتاب ہے اور حضرت عمرؓ کے کامل ہونے میں بھی شبہ نہ تھا جو ان کے خاکم بدہن، گمراہ ہو جانے کا اندیشہ ہوتا لیکن چونکہ ان کی دیکھا دیکھی دیگر لوگ جو اس درجہ کامل الایمان اور سلیم الفہم نہ تھے انجیل خوانی کو ضروری سمجھ لیتے اور قرآن کریم اور اس کے احکام سے تساہل و تغافل ہونے لگتا سبحان اللہ کس قدر دل پذیر انداز میں یہ اہم مسئلہ حل فرمایا ہے فجزاھم اللہ احسن الجزا[1]

حضرت محبوب الٰہی سلطان نظام الدین اولیاء اگرچہ خود راگ سنتے تھے مگر ان کے مایۂ ناز خلیفہ حضرت شاہ نصیر الدین چراغ دہلویؒ راگ کے پاس بھی نہ جاتے تھے، حضرت محبوب الٰہی نے کبھی ان کو راگ سننے پر مجبور نہیں کیا بلکہ جب کبھی ہو رہا ہوتا اور آپ تشریف لے آتے تو حضرت محبوب الٰہی راگ رنگ سب موقوف کرا دیا کرتے اور فرماتے کہ اب مولوی آ گیا ہے اس شغل کو چھوڑ دو۔

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حضرات چشتیہ کا راگ سننا بھی کسی نہ کسی مصلحت اور معالجہ کی غرض سے تھا، یہ ضروری نہیں کہ جس طرح آج کل حضرات چشتیہ کے ہاں سماع کا معمول ہو گیا ہے گویا ان کی غذا بن گئی ہے، خواہ کسی کو اس کی ضرورت ہو یا نہ ہو سلسلہ میں داخل ہوتے ہی راگ سننا اور اچھلنا کودنا شروع کر دیتے ہیں، نہ طلب و شوق کا پتہ نہ عالم اضطرار کا، پس صوفیائے کرام کو بھی اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کرنی لازم ہے اور اہل شریعت کو بھی راہِ اعتدال اختیار کرنی چاہیئے، سالکین کو دونوں گروہ کے اہل کمال کے سامنے خاموش رہنا اور دم نہ مارنا لازم ہے۔ خوارق و کرامات کا ظہور بھی آپ سے بہت کچھ

---

[1] ملتِ راج شاہی ص ۹۸، ۹۹، ۱۰۰

ہوا، آپ کی دعا و تعویذ میں اللہ تعالیٰ نے خاص تاثیر رکھی تھی، ایک مرتبہ ایک راجپوت کو پھانسی کا حکم ہوا، آپ خود بھی اس وقت نظر بند تھے کیونکہ وہ دور ۱۸۵۷ء کے بعد کا تھا پُر از فتنہ و آشوب، جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا نقشہ، نہ کسی معاملہ کی تحقیق ہوتی تھی نہ سچ جھوٹ کی تفتیش ؎

جسے دیکھا حاکمِ وقت نے

کہا یہ بھی قابلِ دار ہے

جس پر ذرا بھی شبہ ہوتا محبوس و مصلوب کر دیا جاتا تھا، گویا ایک قسم کا مارشل لاء تھا، مخالفین نے آپ کی نسبت بھی باغی اور مفسد ہونے کی مخبری کر دی، انگریز سرکار نے آپ کو صدر ضلع حصار میں نظر بند کر دیا، آپ کے بڑے بھائی ہادیٔ برحق شاہ محمد رمضانؒ نے پہلے ہی بطور پیشین گوئی اس کی خبر دے رکھی تھی کہ برادرِ عزیز مولوی محمد اسماعیل شاہ کو اخیر عمر میں کچھ واردات پیش آئیں گی اور آزمائے جائینگے، چنانچہ وہی ہو کر رہا، اسی حالت میں اس راجپوت کو ایک تعویذ لکھ دیا اور زبان سے بھی فرما دیا: "بعون اللہ تعالیٰ تو رہائی پائے گا"۔ چنانچہ اس نے رہائی پائی ۔ داروغہ جیل کی بیوی ایک مرتبہ سخت بیمار ہو گئی، آپ نے دعا فرمائی، اُسے بھی شافیٔ مطلق نے شفا عنایت کی، لوگوں نے عرض کیا: "آپ دوسروں کے لئے دعا کو کام میں لاتے ہیں خود اپنی رہائی کے لئے کوشش کیوں نہیں فرماتے" فرمایا: "ہمارا وقت آن لگا ہے لہذا علاج معالجہ بے سود ہے"۔ رات ہی کو ہم نے برادر بزرگؒ کو خواب میں دیکھا ہے، فرماتے ہیں: "بھائی تکلیف کیوں اٹھاتے ہو، ہمارے پاس آ جاؤ"۔ چنانچہ پنج شنبہ کا دن آیا تو آپ نے حسب معمول دودھ چاول پر فاتحہ دلوائی، خود بھی کھائے اور دوسروں کو بھی کھلائے، اگلا دن جمعہ کا تھا جمادی الآخر کی ۲۸ تاریخ ۱۲۷۳ھ اور صبح کا سہانا وقت کہ آپ ہیضہ میں

مبتلا ہوئے اور اسی روز اسی ابتلا میں جان شیریں جان آفریں کے حوالہ کی انا للہ وانا الیہ راجعون

ہر کہ آمد بجہاں زاہل فنا خواہد بود آنکہ پائندہ و باقی ست خدا خواہد بود

جنگ آزادی کے وقت آپ کی عمر قمری حساب سے بہتر سال تھی

جنگ ضلع پر انگریزی اقتدار ختم ہو چکا تھا۔ سرفروشوں کا ایک پندرہ سو افراد پر مشتمل دستہ دہلی سے ہانسی جا رہا تھا۔ راہ میں مہم ٹھہر گیا۔ یہاں اس دستے کے سردار نے ایک ہندو بقال مسمی بابر اور اس کے کچھ ساتھیوں کو گرفتار کر لیا، یہ لوگ جنگ آزادی کی مساعی میں رکاوٹ ڈال رہے تھے۔ بابر بقال کے رشتہ دار اور تحصیلدار مہم کا باپ شہر کے بزرگ حضرت شاہ اسماعیل رح کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پاؤں پکڑ کر التجا کی کہ ان کی مدد کیجئے آپ نے ہم وطنوں کی ہمدردی کی اور آپ کی مساعی سے بابر بقال اور اس کے ساتھی رہا کر دیئے گئے۔

جنگ آزادی ناکام ہوئی۔ انگریزی فوج بھوانی سے مہم کی طرف آ رہی تھی، ابھی تین میل تھی کہ تحصیلدار مہم، بابر بقال اور بعض نمبرداروں نے اس کا استقبال کیا اور آفیسر کمانڈنگ کے کان بھرے کہ مہم میں شاہ اسماعیل رح اور اس کا خاندان شر و فساد کا بانی تھا، چنانچہ آفیسر نے عیدو خاں اور شہباز خاں نمبرداروں کو حضرت شاہ اسماعیل کو لینے کے لئے بھیجا۔ آپ اپنے فرزند مولوی ... سیف الرحمن کو لے کر موضع سیسر پہنچ گئے جہاں دونوں کو گرفتار کر لیا گیا، آپکو حصار اور آپکے فرزند کو رہتک بھیج دیا گیا۔ آپ کی جائیداد ضبط کر لی گئی اور گھر کا تمام اسباب نیلام کر دیا گیا۔ جنگ آزادی کے ۴۳ سال بعد آپ کے نامور قبیل پوتے خان بہادر پیرزادہ محمد حسین عارف ایم اے نے اپنی نظم "موتیوں کے ہار" میں ضمنی طور پر اس گرفتاری کا حال لکھا ہے:-

ؔ تذکرۂ راج شاہی ص ۱۰۰ تا ۱۰۱

اس کو گذرے تیس اوپر چالیس سال حق نے بھیجا ہند پر اپنا وبال
ایک لشکر یا کہوں قہر خدا ایک چھوٹے شہر سے ہو کر گیا
ایک ولی حق کا تھا اس جا قیام قطب وقت اور عہد کا اپنے امام
رحم آیا ان کو ان کے حال پر ہو لیا وہ ساتھ ان کے بے خطر
کچھ دنوں کے بعد پھر بدلی ہوا دور دورہ مخبروں کا ہو گیا
عقل چلدی حاکموں کو کر سلام سر چڑھا ان کے جنون انتقام
عقل اور تہذیب جب جاتی رہے آدمیت پھر کہاں باقی رہے
ایک مجرم کی جگہ سو بے خطا مار ڈالے پر نہ دل ٹھنڈا ہوا
باغ عرفاں کا گل صد برگ تر دشمنوں کو خار آتا تھا نظر
باغیوں کے ورغلیو جاتا وہ پاس اور انکو کیا پڑا تھا انکا پاس
تھی کسے فرصت بھلا تحقیق کی لگ رہی تھی ملک میں اک آگ سی
جن کے ہو کینے میں اک خلق خدا مصلحت رکھنا نہیں انکا بجا
اعتراض ان پر ہے اب کرنا فضول ہوں یہی شاید حکومت کے اصول
ہو گئیں کچھ بدگمانی دل نشیں کمپنی کی فوج بگڑی ہر کہیں
لوگ واں کے دیکھ کر ڈرنے لگے جستجو ہمدرد کی کرنے لگے
پاس آئے اسکے وہ سب دوڑتے التجا کی تا شفاعت وہ کرے
فوج سے کر کے سفارش برملا شہر اپنا لوٹ سے بچوا لیا
ہر جگہ پر ہو گیا شر و فساد خوب نکلے سب کے پھر ذاتی عناد
دعویٰ تہذیب سب نکلا دروغ عقل کو غصے کے آگے کیا فروغ

لہ مہم شریف۔ ۲ہ مراد شاہ اسماعیل مہمی رح

حاکموں کی ہو گئیں عقلیں خفیف	بے گنہ مارے گئے لاکھوں شریف
ایسے نازک وقت میں وہ باصفا	حاسدوں کی سعی سے پکڑا گیا
موذیوں نے یہ خبر حاکم کو دی	سازش اس کی باغیوں کے ساتھ تھی
یہ نہ کی تحقیق حاکم نے ذرا	کیوں گیا تھا کام اس نے کیا کیا
تھی یہی کافی انھیں بس اک دلیل	ہے یہی موقع ہوں بے بس سارے ذلیل
جو ہوا بازار میں ڈوڈا بلند	خود پسندوں کو نہیں آیا پسند
بے گنہ وہ تھا شوق حق میں تر زباں	مثنوی کا شعر یہ تھا بر زباں

دشمن طاؤس آمد پر او
اے بسا شہ را بکشتہ فر او

آپ کے ایک اور پوتے مولوی عبدالشکور روضۃ الرضوان میں لکھتے ہیں :-

"سرکار انگریزی نے آپ کو صدر ضلع حصار میں بند کر دیا....
پنجشنبہ کا دن تھا تو آپ نے حسب معمول دودھ چاول پر فاتحہ دلائی خود بھی کھائے اور دوسروں کو بھی کھلوائے اگلا دن جمعہ کا تھا، جمادی الآخر ۲۴ تاریخ [illegible] اور صبح کا وقت تھا کہ آپ ہیضہ میں مبتلا ہوئے، اور اسی میں اسی دن جان شیریں خدا کے سپرد کی" (ص ۴۳)

آپ کے ایک اور پوتے خان بہادر پیرزادہ ڈپٹی مظفر احمد فضلی نے آپ کی منقبت میں ایک قصیدہ کہا ہے جس کے ۲۷ شعروں میں سے صرف پانچ یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔ یہ قصیدہ گلبانگ سخن میں شائع ہو چکا ہے :

خدیو خطۂ فن تحفہ ہائے کمال	خدائے گان طریقت محمد اسمٰعیلؒ
شب بہ نقش نگینش بود بنام او	عظیم شد ز عطائے حکیم اسمٰعیلؒ
شہید تیغ رضا آنکہ فی سبیل اللہ	نمود از سر تسلیم خون خویش سبیل
چہ باک نعش ترا بعد مرگ از آتش	کہ ہست آتش نمرود گلستان خلیل
زمانہ بیں کہ چہ با روزگار با بر کرد	نہ برد جاں بسلامت ز روزگار بخیل

دوسرے شعر کا مصرعہ ثانی آپ کی مہر پر کندہ تھا، چوتھے شعر میں اس روایت کی طرف اشارہ ہے کہ جنون انتقام میں انگریزوں نے چاہا کہ آپ کی نعش غائب کر دی جائے تاکہ آپ کے معتقدین اسے دیکھ کر اور مشتعل نہ ہو جائیں بہت سی لکڑیاں جمع کرکے آگ دہکائی گئی اور آپکی نعش کو اس میں ڈال دیا مگر آگ نے بھی اس شہید ملت علیہ الرحمۃ کی نعش پر اثر نہ کیا، آخری شعر میں بابر سے مراد وہ بنیا ہے جس نے آپکے خلاف مخبری کی تھی، اس بنئے کو چھ سو اٹھارہ بیگھہ اراضی تین پشت کی معافی پر ملی ستّرہ سال بعد ۲۹ر اپریل ۱۸۷۵ء بابر ولد پترچند کو آپ کے کسی مرید نے قتل کر دیا اور پولیس کو قاتل کا سراغ نہ مل سکا

آپ کی شہادت کے متعلق تمام روایات اور تحریری مواد دیکھنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ محبس حصار میں آپ کو پھانسی دی گئی، مگر آپ کی ہر دلعزیزی کے پیش نظر یہ مشہور کر دیا کہ آپ نے دودھ اور چاول کھائے جس سے آپ کو ہیضہ ہو گیا اور جیل میں آپ وفات پا گئے۔

مہتاب خاں ساکن کرکری علاقہ کشن گنج راجپوتانہ نے آپکا قطعہ تاریخ شہادت کہا ہے :

جناب شاہ اسمٰعیل بھی	وہ تھے مقبول اور اللہ کے پیارے
اذیت اور سختی بہت دیکھی	سوا اسلام کے کچھ نہ پکارے
کیا اسلام پر جی کو فدا انہے	پکڑ کر لے گئے تھے جب نصارے
کہی ماہتاب نے تاریخ رحلت	شہید ہو جنت اعلیٰ میں سدھارے[1]

حضرت محراب شاہ قادری۔ مستان شاہ مداری میواتی رح

محراب شاہ کا سلسلہ قادریہ ہے۔ اور انکا مزار جیواجی گنج "میں اسٹیشن کے قریب آگرہ بمبئی روڈ پر ہے جو شہر سکر (گوالیار) سے تقریباً ایک میل کے فاصلہ پر ہے۔ سرکار گوالیار کی طرف سے اخراجات درگاہ کی خدمت کئے ملتے ہیں ــــــــ آپ ابتدا میں سپاہی تھے۔ ایک سردار "بڑے سیتو صاحب" کی سرکار میں بحیثیت ایک سپاہی ملازم تھے۔ ریاضی و مجاہدہ کا شغل برابر جاری تھا اور اپنی اس حیثیت کو حتی الامکان چھپانے کی کوشش فرماتے تھے جب راز فاش ہوا فوراً ترک ملازمت کر کے خلوت گزیں ہو گئے۔ اس سلسلہ میں یہ روایت مشہور ہے۔ ایک دفعہ سردار صاحب نے آپکو ایک خط دے کر فرمایا پونا جا کر اسکا جواب لے آؤ۔ یہ حکم دے کر سردار اپنے دوسرے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ کچھ دنوں کے بعد ایک روز سردار کو دفعتاً اس کا خیال آیا تو انہوں نے حضرت سے پوچھا۔ رئیس پونا کے نام ہم نے جو خط دیا تھا اسکا جواب لائے؟ آپ نے فرمایا گھر پر ہے آج شام کو لا کر دیدونگا۔ سردار یہ سنکر مسکرایا اور کہا۔ میاں جی تم روزانہ مجھکو یہیں نظر آتے ہو۔ پونا کب گئے اور جواب کب لائے۔ بیکار بات بنانے سے کیا فائدہ۔ آپکو اس کی اس بات سے صدمہ ہوا۔ وہ سمجھ کر نہیں بلکہ افشار راز کا باعث بنتے مکان پر گئے اور شام کو پونا کا جواب لاکر دیدیا۔ سردار کو نہ صرف حیرت ہوئی بلکہ وہ آپکی روحانی طاقت کا بھی قائل ہو گئے۔ ادھر افشار راز کا معاملہ تھا۔ یہ وقت انتہائی نازک تھا کیونکہ وہ راز جسے عرصے وہ چھپائے ہوئے تھے بہرحال اب فاش ہو گیا اس لئے یہ کہکر استعفا دیدیا بس ہم اب رخصت۔ ہمارا پردہ فاش ہو گیا۔

سردار نے بہت خوشامد کی مگر آپ کسی طرح آمادۂ خدمت نہ ہو سکے۔ یہاں سے ترک ملازمت کر کے مقلیا "نامی ایک مقام پر بیٹھکر یاد الٰہی میں مصروف ہو گئے جو اصل مقصد اور وظیفۂ زندگی تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ سلطان ٹیپو کی شہادت کا غلغلہ پورے ہندوستان کی فضاؤں میں گونج رہا تھا اور انگریزی ظلم و ستم کے واقعات عوام کے نوک زبان پر تھے۔ ان حالات سے آپ کو بیحد ملال تھا۔ اسکے بعد ذکر و فکر الٰہی میں جہاد فی سبیل اللہ کے عنصر کا اضافہ ہو گیا اور مریدوں کو انگریزوں کے خلاف جہاد کی دعوت دینے لگے۔ جہاد کی بیعت لیکر باقاعدہ اسکی جہاد تربیت کر کے اسے پختہ تر بناتے۔ مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی ان کے مرید و خلیفہ تھے۔

داتا گلاب شاہ قدس سرہ ملتھین

قصبہ ملتھین کے ماحول میں کھیڑی ایک گاؤں ہے اس کی رکھیا میں داتا گلاب شاہ مجذوب رہا کرتے تھے، یہ مجذوب بڑے صاحب فیض اور مستجاب الدعوات تھے حضرت میاں راج شاہ قدس سرہٗ کو آن سے بہت فیض حاصل ہوا اور چند روز میں داتا نے فیض باطن سے مالا مال کر دیا۔[1]

ایک دن حضرت میاں راج شاہ اور آپ کے فرزند حضرت مولانا عبداللہ قدس سرہما داتا گلاب شاہ رحمۃ اللہ علیہ مجذوب کی خدمت میں گئے، ایک پنجابی صاحب ہمرکاب تھے، مغرب کا وقت آگیا تو سب نے وضو کیا اور پنجابی کو امامت پر کھڑا کر دیا۔ دورانِ نماز داتا گلاب شاہ نے بڑ مارنی شروع کی:

"کہدو غوث الاعظم میں ہی ہوں، اللہ اکبر میں ہی ہوں" بعد الفراغ نماز میاں صاحب نے دریافت کیا کہ کیا امامت کی حالت میں تم کو کوئی وسوسہ ہوا تھا؟ عرض کیا کہ "یہ ہی خیال تھا"۔ پھر حضور قبلہ میاں صاحب مؤدب بیٹھ گئے اور داتا گلاب شاہ نے توجہ دی تو آپ پر ایک خاص حالت محویت کی طاری ہوئی اور اسی کیفیت میں آپ نے دولت خانہ پر مراجعت فرمائی۔ داتا گلاب شاہ مجذوب کو میاں صاحب سے بے انتہا محبت تھی۔[2]

حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو داتا گلاب شاہ مجذوب علیہ الرحمہ سے بہت زیادہ عشق تھا، بغیر دیدار کے بے چین رہتے تھے اور ہر شب کھیڑلی

---

[1] لمعت راج شاہی ص ۱۱۲

[2] " " " ۱۲۶

کے جنگل میں حاضر ہوتے۔

میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ قصبہ جھین سے نزدیک ایک موضع دھیرنکا میں گائیں چرایا کرتے تھے جہاں آپ کا ننھیال تھا، کھیڑلی وہاں سے قریب ہے۔ ایک دن داتا گلاب شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: "تم اتنی تکلیف کیوں اٹھایا کرتے ہو؟"

میاں صاحب نے عرض کیا کہ کیا کروں دل کو قرار نہیں پڑتا۔

فرمایا: "اب تم گھر سے چلتے وقت اپنی آنکھیں بند کر لیا کرو۔" چنانچہ جب حضور گھر سے چلتے تو آنکھ بند فرما لیتے اور پھر کھولتے تو اپنے کو داتا گلاب شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے پاس موجود پاتے، بارہ سال تک یہی ورد رہا بعد اس کے آپ ایک دفعہ دن کے وقت داتا گلاب شاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، پانی کی دولچی اور کچھ بتاشے بھی ہمراہ لئے ہوئے تھے۔ داتا گلاب شاہ حسب معمول رکھیا (جنگل) میں تھے آپ نے ان کے لئے اپنا کمبل بچھا دیا۔ داتا صاحب کمبل پر بیٹھ گئے، میاں صاحب نے شربت بنا کر پلایا، جو شربت بچا ہوا تھا وہ داتا نے آپ کو پلا دیا اور بغل میں دبا کر دبوچ دیا کر بھرپور کر دیا۔ بعد ازاں کچھ شغل بتائے اور فرمایا اب مت آیا کرو وہیں بیٹھے بیٹھے مخلوق کو فیض پہنچا۔

بخوبی ہمچو مہ تابندہ باشی
بملک دلبری تابندہ باشی [1]

---

[1] ملفوظات راج شاہی ص ۷۵، ۱۵۶

قطب الاقطاب
فرد وقت

حضرت میاں راج شاہ قدس اللہ سرہٗ سوندھی

پیدائش:- سنہ ۱۲۱۳ھ مطابق سنہ ۱۷۹۹ء میں آپ نے اس عالم ارضی کو اپنے گوہر چکاں وجود سے معطر فرمایا۔ والدین نے راج خاں نام رکھا، بعد میں جب فقر و تصوف کے بلند مقام پر فائز ہوئے تو راج شاہ سے مشہور ہوئے، سلسلہ نسب اس طرح ہے:- راج خاں عرف میاں راج شاہ ابن عبد السمیع عرف سمیع خاں بن عظمت اللہ عرف عظمت خاں ......)

آپ کا تعلق میو قوم کے مشہور قبیلے (پال) دہنگل سے ہے جو خاندان چندر بنسی سری مہاراج راجہ رام چندر جی سے جا ملتا ہے اس خاندان اور قبیلے کا نکاس اجودھیا سے ہے، وہاں سے منتقل ہو کر تاج پور آیا اور وہاں سے موضع رائسینہ Raesena تحصیل و ضلع گوڑگانوہ میں آکر آباد ہوا، یہاں سے پورے قبیلے کا نکاس ہے، پھر اس کی مختلف بڑی بڑی شاخیں ہوئیں جنھیں مقامی زبان میں تھانبہ (Thamba) کہا جاتا ہے، آپ تھانبہ سوندھیا سے تعلق رکھتے ہیں جو موضع سوندھ کے باعث مشہور ہوا آپ کے والد مولوی عبد السمیع عرف سمیع خاں یا شمیع خاں ذکر سبحان اللہ اس کثرت سے فرماتے تھے کہ زبان سے سوتے جاگتے یہ ذکر برابر جاری رہتا تھا، آپ کی بیوی نماز روزہ کی نہایت پابند تھیں، اور جب کوئی مہمان گھر آتا تو اس کی خاطر مدارات اس قدر کرتیں کہ کئی کئی دن ٹھہراتیں مولوی صاحب کے مزاج میں سخاوت، حلم و انکساری اس درجہ کی تھی کہ لوگ خود بخود گرویدہ ہو جاتے تھے، لوگوں کی تیمارداری کرتے اور ہر کس و ناکس کے گھر جاتے

تھے، فقرار و مساکین کو کھانا کھلانا آپ کی عادت میں داخل تھا در اصل ایسا ہی اسلام اسلام ہے۔ فرمایا رسول اللہ نے کہ کھانا کھلاؤ جسے جانتے ہو اور جسے نہیں جانتے [1]

اکثر ایسا اتفاق ہوتا کہ اپنا اور اپنی اہلیہ کا کھانا مہمانوں کی تواضع کر دیا جاتا اور خود روزہ رکھتے یا فاقہ کرتے اور کسی پر اس کا اظہار نہ کرتے، جہاں کہیں خبر پاتے علمار کی خدمت میں حاضر ہوتے، جب اپنے مویشی بہاڑ میں چرانے لے جاتے تو گوالوں کو اکٹھا کر لیتے اور اللہ اللہ کی ضربیں لگاتے، اپنے ہم عمروں کو نیک کاموں کی ترغیب دیتے، زبان سے گالی نہ دیتے اور جو گالی دیتے ان کو منع فرماتے تھے، کبھی کسی کے کھیت سے کوئی چیز نہ اکھاڑتے اور ایسا کرنے سے منع کرتے تھے، کھیت میں جب کسی کا جانور گھس جاتا تو اسے مار کر نہ نکالتے بلکہ باہر سے بغیر مارے نکالنے کی کوشش کرتے تھے، اس طرح اپنی ساری زندگی یاد الٰہی اور خدمت خلق میں بسر فرمائی، ایسے گہوارۂ خلوص و للہیت اور عرفان و یقین سے پُر گھرانے میں میاں راج شاہ نے آنکھیں کھولیں پرورش پائی، پڑھنے لکھنے کے وسائل مفقود ہونے کے باعث آپ ظاہری تعلیم سے گو بہرہ مند نہ ہو سکے مگر باطنی قوت اور نور ایمانی سے ہر دقیق مسئلہ کو حل فرما دیتے تھے، مدبر مستغنی المزاج، متوکل باللہ، صاحب زہد و ورع کمال منکسر المزاج، مسافر نواز، متصف بصفات حسنہ، نمونۂ سلف صالحین تھے، آخری زمانہ میں اس قدر استغراق کا غلو تھا کہ آپ رات دن مشاہدۂ جمال میں محو رہتے، گفتگو کم کرتے، مریدوں کو توجہ قلبی سے طریقۂ اذکار و اشغال تعین فرماتے خود عمل کر کے سمجھاتے، جو مرید ذکر الٰہی میں غلبہ حاصل کر لیتا اس سے مانوس اور خوش اور غیر مشرع لوگوں سے ناخوش ہوتے، اتباع شریعت اور حصول طریقت کی تعلیم و تاکید فرماتے، فارسی، اردو، ہندی کے دوہے اور

---

[1] صحیح بخاری اول ص ۶۶

معرفت میں ڈوبے ہوئے اشعار پڑھتے اور بار بار زبان مبارک سے فرماتے:- "اللہ فضل کر، اللہ تجھ سے تیری پناہ مانگتا ہوں"۔ سوتے جاگتے ہر وقت آپ کا عقد انامل جاری رہتا [1]

آپ کے ہم عصروں میں جناب سائیں توکل شاہ نقشبندی انبالوی،

حاجی امداد اللہ صاحب تھانوی مقیم و مہاجر بیت اللہ شریف مکہ مکرمہ ۱۲۳۳ھ / ۱۸۱۷ء — ۱۳۱۷ / ۱۸۹۹

مولانا شاہ فضل الرحمن نقشبندی گنج مراد آبادی ۱۲۰۸ھ / ۱۷۹۳ء — ۱۳۱۳ / ۱۸۹۵

حاجی سید وارث علی شاہ - دیوہ

شاہ جی شیر محمد میاں نقشبندی پیلی بھیت

مولانا غوث علی شاہ قلندری پانی پتی ۱۲۱۹ھ / ۱۸۰۴ء — ۱۲۹۷ / ۱۸۸۰

حضرت مولانا شاہ عبد العزیز محدث دہلوی ۱۱۵۹ھ / ۱۷۴۶ء — ۱۲۳۹ / ۱۸۲۳

حضرت شاہ ابو سعید نقشبندی مجددی دہلوی ۱۱۹۶ھ / ۱۷۸۲ء — ۱۲۵۰ / ۱۸۳۵

حضرت شاہ عبد القادر، مترجم قرآن کریم، دہلوی ۱۱۶۷ھ / ۱۷۵۳ء — ۱۲۳۰ / ۱۸۳۱

شاہ محمد اسحاق محدث نواسۂ حضرت شاہ عبد العزیز دہلوی - ۱۲۶۲ھ / ۱۸۴۵ء

شاہ رفیع الدین محدث دہلوی - مترجم قرآن کریم ۱۱۶۳ھ / ۱۷۴۹ء — ۱۲۳۳ / ۱۸۱۸

مولوی میر محبوب علی میواتی ثم الدہلوی مصنف "تاریخ الائمہ فی ذکر خلفار الامہ (مخطوطہ)" جیسے ارباب فضل و کمال، صوفیار و مشائخ اور علمار و دانشور تھے، رحمہم اللہ تعالیٰ اجمعین آپ ان تمام بزرگوں سے ملے ہیں اور حضرت شاہ عبد العزیز صاحب محدث دہلوی کے وعظوں میں برسوں شرکت کی ہے۔ ۱۲۰۰ھ ۱۲۷۰

---

[1] میاں راج شاہ کے کل حالات بلت راج شاہی، مصنفہ معین قادری سے منتخب کر کے لئے گئے ہیں (ص ۱۰۹ - ۱۱۱)

مندرجہ ذیل بزرگوں سے آپنے فیض باطن حاصل کیا ہے :-

(۱) — سائیں گلاب شاہ صاحب مجذوب قصبہ تھین ضلع گوڑگانوہ۔
(۲) — میاں دین علی شاہ مجذوب دہلوی
(۳) — میاں کلن شاہ مجذوب کوٹ پوتلی
(۴) — مولوی نور محمد کملی والے دہلوی۔
(۵) — حضرت میاں اسمٰعیل کمہار، حصار
(۶) — میاں نور محمد نقاش[1]

میاں صاحب بچوں میں کم کھیلا کرتے، اور اپنے کاموں سے فارغ ہوکر تنہا بیٹھ جاتے اور ذکر الٰہی میں مصروف ہوتے اور ہمیشہ ایک وقت تنہائی کا اس کام کے لئے ضرور نکالتے، یہ باپ کی صحبت کا اثر تھا، کھیتی باڑی کا کام خود اپنے ہاتھ سے کیا کرتے تھے، مویشی چراتے وقت خاموش رہتے اور کھڑے کھڑے کچھ پڑھا کرتے اور چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے یہ شغل برابر جاری رہتا، کوئی بولتا یا کچھ پوچھتا تو اس کا جواب دیتے ورنہ خاموش رہتے، پندرہ سولہ سال کی عمر میں آپ نے یہ دستور کرلیا تھا کہ رات کے وقت گاؤں سے باہر کبھی تالاب کے کنارے یا قبرستانوں میں یا کسی پہاڑ کی چٹان پر جہاں دل چاہتا چلے جاتے، اور رات بھر اللہ اللہ کرتے رہتے۔ گانے کی آواز سے آپ پر ایک حالت طاری ہوجاتی، اس وقت آپ چادر اوڑھ لیتے اور خاموش بیٹھ جاتے، بعض اوقات صبح تک آپ کا جسم کانپتا رہتا اور یہ حالت ہوتی جیسے لرزہ سے بخار چڑھ رہا ہو[2]

سید محسن شاہ کا بیان ہے کہ حضور قبلہ میاں صاحب دیگر بزرگان دین کی صحبت سے فیضیاب ہوکر تین چار مجذوب صاحبان کی خدمت میں رہے اور ان

[1] ص ۱۰۷ [2] ص ۱۱۱

ان سے فیض باطنی حاصل کیا، اور پھر پیر کامل کی تلاش ہوئی اسی خیال میں علاقہ ہریانہ کا گشت کیا رہتک میں پہنچ کر حضرت مولانا شاہ اسمٰعیل مہمی کی خدمت میں حاضر ہوئے، مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے از روئے مکاشفہ حالات معلوم فرماکر شرف بیعت بخشا اور اسی روز چاروں خاندانوں میں مجاز صحبت بناکر شجرۂ خلافت مرحمت فرمایا اور دستار خلافت اپنے دست مبارک سے آپ کے سر پر باندھی[1]

حیات خاں سکنہ سوندھ کا بیان ہے کہ میاں صاحب مجھ سے عمر میں کچھ بڑے تھے اور فقیر کے حال پر بہت مہربانی کرتے تھے نماز، روزہ انھیں سے سیکھا اور پھر انھیں کا مرید ہوگیا۔ موضع دھیر نکا متصل قصبہ تھین میاں صاحب کی ننھیال تھی ہر سال مویشی چرانے سوندھ سے وہاں جایا کرتے، اسی کے متصل کھیڑی ایک موضع ہے جس کی رکھیا (بنی) میں داتا گلاب شاہ مجذوب رہا کرتے تھے، یہ بزرگ بڑے صاحب فیض اور مستجاب الدعوات تھے، میاں صاحب کو ان سے بہت فیض حاصل ہوا، چند ہی دن میں آپ کو باطنی فیوض سے مالا مال کردیا، کوئی فقیر، سادھو، مولوی جہاں کہیں بھی ہوتا میاں صاحب اس کی خدمت میں حاضر ہوتے، سفر کی تکالیف اٹھاتے، اور کچھ پروا نہیں کرتے بعض اوقات برس دو برس گھر سے باہر رہتے اور بزرگوں کی زیارت کے لئے تشریف لے جاتے، ایک دن حضرت سے عرض کیا کہ میاں صاحب آپ کہاں تشریف لے جایا کرتے ہیں؟ فرمایا: "لالہم شریف میں میرے پیر مولوی شاہ اسمٰعیل صاحب ہیں ان سے ملنے جایا کرتا ہوں، اور دہلی میں ایک مست دین علی شاہ ہیں، اور کوٹ پوتلی میں ایک مست کلن شاہ ہیں ان سے ملنے کا زیادہ شوق رہتا ہے اور مولوی نور محمد صاحب کملی والے، جو مرزا مظہر جان جاناں کے

[1] ص ۱۱۲

خلیفہ تھے بارہ سال تک دہلی میں ایک کالستھ کے دروازہ کی صحنچی میں پڑے رہتے، یہ بھی مجھ پر بہت کرم فرماتے ہیں، اور میاں محمد اسمٰعیل کمہار حصار والے، اور مولوی محمد رمضان صاحب جہمی اور مولانا شاہ عبدالقادر صاحب برادر شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی ان سے میرا میل ہے اور یہ سب مردان راہِ خدا ہیں۔

کوئی چشمِ حقیقت کھول کر دیکھے تو اے بیدل تماشہ خاک کے پتے میں پنہاں ہے خدائی کا

اور بھائی ان کے علاوہ سو دو سو کوس تک بھی جہاں کہیں کسی بزرگ کو سنتا ہوں ان کی خدمت میں پہنچتا ہوں،

عَلَيْكُمْ بِمُجَالَسَةِ الْعُلَمَاءِ وَاسْتِمَاعِ كَلَامِ الْحُكَمَاءِ فَاِنَّ اللّٰهَ يُحْيِي الْقَلْبَ الْمَيِّتَ بِنُوْرِ الْحِكْمَةِ كَمَا يُحْيِي الْاَرْضَ الْمَيْتَةَ بِمَاءِ الْمَطَرِ.	علماء کے پاس بیٹھنا اور حکیموں کی بات سننا چاہیئے کیونکہ حق تعالیٰ مردہ دلوں کو حکمت کے نور سے اسی طرح زندگی بخشتا ہے جیسے غیر آباد اور بنجر زمین کو پانی سے سرسبز و شاداب فرماتا ہے۔

پھر میں نے عرض کیا: "میاں صاحب آپ نے اس وقت تک کتنے چلّے کئے؟" فرمایا: "بھائی چلّہ کشی تو میں نہیں جانتا ان پڑھ ہوں یہ تو بزرگوں کا کام ہے البتہ ڈومر والے تالاب کی سل پر بارہ سال تک عشاء سے لے کر صبح تک اللہ اللہ کی ہے اور دن کو روزہ رکھنا اور کاشتکاری کا کام کرنا، ایسے ہی گڑگج کے تالاب پر۔ جو غیاث پور پاس کے پہاڑ میں ہے اور تمہاری گھوڑ بسی کے تجرنوں میں، اور فیروز پور جھرکہ کے تجرنوں میں عرصے تک مختلف اوقات میں راتیں گزاری ہیں جے پور اور الور کی پہاڑیوں میں بہت پھرا ہوں اللہ کا شکر اور احسان ہے۔"

میاں صاحب کا حافظ ایسا تیز تھا کہ جس بزرگ سے ملتے اس کے ارشادات دوہے، اشعار اردو فارسی اور آیات قرآنی، علماء کے مواعظ، امّی ہونے کے باوجود جوں کے توں یاد تھے۔

ایک دن کسی نے عرض کیا، آپ کو اتنی باتیں کہاں سے یاد ہو گئیں؟

فرمایا: "تم کیا جانو جن سے میں نے یہ باتیں سیکھی ہیں"! پھر عرض کیا کہ ایک دو کے نام تو بتا دو ۔ ارشاد ہوا کہ شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اور مولوی اسحاق صاحب رحمۃ اللہ کے وعظوں میں برسوں شریک ہوا ہوں اور آپ کے پیچھے ایک عرصہ تک جمعہ کی نماز سوندھ سے چل کر دہلی میں پڑھی ہے اور بیسیوں طالبوں سے ملا ہوں، آگرہ، لکھنؤ، میرٹھ کی طرف سینکڑوں علماء سے باتیں سنی ہیں تم کو کس کس کا نام بتاؤں؟" پھر دریافت کیا گیا: "کیا گنگا بھی دیکھی ہے؟ فرمایا کہ گنگا اور جمنا کے کولوں میں برسوں اللہ اللہ کی ہے، اور رشی کیش بھی گیا ہوں اور بہت سے ہندو فقراء کو دیکھا ہے اور مسلم فقراء کو بھی"۔

پھر فرمایا: "بھائی اے خدا کو سچے دل سے دھا دے تو ہر ضرور مل جائے، یاد رکھو کہ خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکموں پر عمل کرنے سے سب کچھ مل جاتا ہے اور اس کے باہر کچھ نہیں ہے

خلاف پیمبر کسے رہ گزید که ہرگز بمنزل نخواہد رسید

مرشد وسیلہ ہے اللہ اور اس کے رسول کے راستہ بتانے کا، مرید کو پیر کی خدمت کرنے سے خدا کا قرب حاصل ہوتا ہے اور پھر سب اس پر مہربان ہو جاتے ہیں، ہم نے اپنے پیر کی خدمت کی، خدا واسطے سینکڑوں فقیروں سے ملے اور ان کی خدمت بجا لائے، سینہ سے لگایا، کرم کیا، سب کچھ دیا۔

محنت کر رے باورے بن محنت نہیں پان
بن محنت رتجے نہیں گور ودھنی بھگوان

یعنی او سادہ دل محنت کر کہ اس کے بغیر کچھ نہیں ملتا بغیر محنت نہ مرشد دستیاب ہوتا ہے اور نہ دیدار الٰہی"۔ (ص ۱۱۵)

ایک دفعہ آپ موضع الدھن ضلع میرٹھ میں فروکش تھے اپنے میزبان منشی عبدالحکیم صاحب سے ارشاد فرمایا کہ دالان صاف کر کے وہاں فرش بچھادو، حکم کی تعمیل کی گئی، آپ دالان میں تشریف لائے اور ایسے بیٹھے کہ جیسے کسی کے آنے کے انتظار میں کوئی شخص گوش بر آواز ہو، تھوڑی دیر بعد دروازہ پر کسی نے دستک دی اور آواز بھی۔ آپ نے فرمایا: "آجائیے"۔ اتنے میں مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ تشریف لائے سلام کے بعد مصافحہ کیا، نہایت احترام سے بٹھایا، حضرت مولانا نے کسی مشغلہ کی طرف اشارہ کیا، میاں صاحب نے اس شغل کی بابت ایسا بیان فرمایا کہ سامعین محو ہوگئے، پھر چپکے چپکے کچھ اور باتیں کرتے رہے جو سمجھ میں نہ آسکی تھوڑی دیر ٹھہر کر تشریف لے گئے۔[1]

ایک شخص حافظ احمد اللہ صاحب ذکر کرتے تھے کہ حضور میاں صاحب میرٹھ میں حکیم محمد مقرب حسین کے مکان میں مقیم تھے اور عقیدت مندوں کا ہجوم تھا، وہاں ایک فقیر راہ گیر رنگین کپڑے پہنے ہوئے بیٹھے تھے کہ اتنے میں جناب مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ تشریف لائے اور فروتنی سے پائنداز پر بیٹھنے لگے، حضور نے ہاتھ تھام لیا اور اپنی ردار مبارک مولانا کے نیچے بچھائی اور فرمایا کہ: "آپ عالم دین ہیں اس پر بیٹھیے"۔ مولانا نے چادر چوم کر سر پر رکھنا چاہا، حضرت قبلہ نے ہاتھ میں لے لی اور اپنے پاس بٹھالیا، دونوں حضرات میں آہستہ آہستہ باتیں ہونے لگیں، جو کسی کی سمجھ میں نہ آئیں۔ رنگین پوش فقیر باہمی گفتگو میں دخل در معقولات ہونے لگا۔ حضور قبلہ نے بار بار منع فرمایا اور مولانا کے ادب کی تاکید کی اس پر بھی وہ نہ مانے، آخر ناراض ہو کر فرمایا: "میاں دمڑی کے رنگ میں کپڑے رنگ لینے سے الوہیت کے رموز نہیں سمجھ سکتے۔ بانا شیر کا چال

[1] ص ۱۳۰

گیدڑ کی سادہ بنا، یا سانگ، جس مرتبے کی یہ باتیں ہیں پہلے اس تک تو پہنچو پھر دخل دینا — ع

"رموز مملکت خویش خسرواں دانند" — یہ حصہ تو خاص حضرت مولانا کا ہے"۔

سردی کے موسم میں ایک مرتبہ حضور سوندھ میں ہی سرس کے درخت کے سایہ میں آرام فرما رہے تھے، ایک نابینا حافظ بھی کہیں سے آگئے، ارشاد ہوا کہ ایک دفعہ مولانا شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ محدث دہلوی نے سورہ فاتحہ کی تفسیر سات روز تک بیان فرمائی اور بڑے بڑے نکات و معنی ارشاد فرمائے اور اخیر میں کہا کہ: "اگر سات سال تک اس کی تفسیر بیان کروں تب بھی ختم نہیں ہو سکتی"۔ حافظ نابینا بولے: "حضور! سات تو کل آیتیں ہیں سمجھ میں نہیں آتا کہ سات دن کیا بیان کیا ہوگا"، فرمایا: "بھائی خدا کا کلام ایسا ہی بحر ذخار ناپیدا کنار ہے کہ برسوں ختم نہیں ہوتا"، حافظ نابینا نے پھر وہی تکراری جملے کہے، آپ نے فرمایا "اسی واسطے خدا تعالیٰ نے تم کو اندھا کر دیا"۔[1]

منشی عصمت اللہ خاں صاحب، خادم حضرت فرد وقت، بیان کرتے ہیں: "ایک شخص مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی خدمت میں آیا اور ایک باریک اور غیر معروف مسئلہ پوچھا، مولانا ممدوح نے ارشاد فرمایا: تم ٹھہرو جمعہ کے دن میاں راج شاہ صاحب اپنے وطن میوات سے تشریف لائیں گے اس کا جواب وہ دیں گے۔ مولانا محمد اسحاق - نواسۂ شاہ صاحب - جو اس وقت تک حضور کے حالات سے واقف نہ تھے، بول اٹھے: "وہ دیہاتی جاہل کیا جانے؟" اس پر شاہ صاحب نے غصہ ہو کر ادب کی تاکید فرمائی اور کہا کہ تم کیا جانو؟ مولانا

[1] ص ۱۲۲

ایک دفعہ آپ موضع الدھن ضلع میرٹھ میں فروکش تھے اپنے میزبان منشی عبدالحکیم صاحب سے ارشاد فرمایا کہ دالان صاف کرکے وہاں فرش بچھادو۔ حکم کی تعمیل کی گئی، آپ دالان میں تشریف لائے اور ایسے بیٹھے کہ جیسے کسی کے آنے کے انتظار میں کوئی شخص گوش برآواز ہو۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ پر کسی نے دستک دی اور آواز بھی۔ آپ نے فرمایا: "آجائیے"۔ اتنے میں مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ تشریف لائے سلام کے بعد مصافحہ کیا، نہایت احترام سے بٹھایا، حضرت مولانا نے کسی شغل کی طرف اشارہ کیا، میاں صاحب نے اس شغل کی بابت ایسا بیان فرمایا کہ سامعین محو ہوگئے، پھر چپکے چپکے کچھ اور باتیں کرتے رہے جو سمجھ میں نہ آسکیں تھوڑی دیر بعد مولانا تشریف لے گئے۔[1]

ایک شخص حافظ احمد اللہ صاحب ذکر کرتے تھے کہ حضور میاں صاحب میرٹھ میں حکیم محمد مقرب حسین کے مکان میں مقیم تھے اور عقیدت مندوں کا ہجوم تھا۔ وہاں ایک نقیر رنگین کپڑے پہنے ہوئے بیٹھے تھے کہ اتنے میں جناب مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ تشریف لائے اور فروتنی سے پائنداز پر بیٹھنے لگے، حضور نے ہاتھ تھام لیا اور اپنی ردائے مبارک مولانا کے نیچے بچھائی اور فرمایا کہ: "آپ عالم دین ہیں اس پر بیٹھیے"۔ مولانا نے چادر چوم کر سر پر رکھنا چاہا، حضرت قبلہ نے ہاتھ میں لے لی اور اپنے پاس بٹھالیا، دونوں حضرات میں آہستہ آہستہ باتیں ہونے لگیں، جو کسی کی سمجھ میں نہ آئیں۔ رنگین پوش فقیر باہمی گفتگو میں دخل در معقولات ہونے لگا۔ حضور قبلہ نے بار بار منع فرمایا اور مولانا کے ادب کی تاکید کی اس پر بھی وہ نہ مانے، آخر ناراض ہوکر فرمایا: "میاں ومڑی کے رنگ میں کپڑے رنگ لینے سے الوہیت کے رموز نہیں سمجھ سکتے۔ بانا شیر کا چالے

[1] ص ۱۲۰

گیدڑ کی سادہ بنا، یا سانگ، جس مرتبے کی یہ باتیں ہیں پہلے اس تک تو پہنچو پھر دخل دینا۔ ع

"رموز مملکت خویش خسرواں دانند" — یہ حصہ تو خاص حضرت مولانا کا ہے"۔

سردی کے موسم میں ایک مرتبہ حضور سوندھ میں ہی سرس کے درخت کے سایہ میں آرام فرما رہے تھے، ایک نابینا حافظ بھی کہیں سے آگئے، ارشاد ہوا کہ ایک دفعہ مولانا شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ محدث دہلوی نے سورہ فاتحہ کی تفسیر سات روز تک بیان فرمائی اور بڑے بڑے نکات و معنی ارشاد فرمائے اور اخیر میں کہا کہ؛ "اگر سات سال تک اس کی تفسیر بیان کروں تب بھی ختم نہیں ہوسکتی"۔ حافظ نابینا بولے: "حضور! سات تو کل آیتیں ہیں سمجھ میں نہیں آتا کہ سات دن کیا بیان کیا ہوگا"، فرمایا: "بھائی خدا کا کلام ایسا ہی بحر ذخار ناپیدا کنار ہے کہ برسوں ختم نہیں ہوتا"، حافظ نابینا نے پھر وہی تکراری جملے کہے، آپ نے فرمایا "اسی واسطے خدا تعالیٰ نے تم کو اندھا کردیا"۔[1]

منشی عصمت اللہ خاں صاحب، خادم حضرت فرد وقت، بیان کرتے ہیں: "ایک شخص مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رح کی خدمت میں آیا اور ایک باریک اور غیر معروف مسئلہ پوچھا، مولانا ممدوح نے ارشاد فرمایا: تم ٹھہرو جمعہ کے دن میاں راج شاہ صاحب اپنے وطن میوات سے تشریف لائیں گے اس کا جواب وہ دیں گے۔ مولانا محمد اسحاق - نواسۂ شاہ صاحب رح - جو اس وقت تک حضور کے حالات سے واقف نہ تھے، بول اٹھے: "وہ دیہاتی جاہل کیا جانے؟" اس پر شاہ صاحب رح نے غصہ ہوکر ادب کی تاکید فرمائی اور کہا کہ تم کیا جانو؟ مولانا

[1] ص ۱۲۲

محمد اسحاق صاحبؒ نے سائل کو امتحان کرنے کے لئے جمعہ تک ٹھہرائے رکھا، جب جمعہ آیا تو مولوی صاحب اس سائل کے ہمراہ مسجد میں تشریف لائے اور سائل سے کہا: "دیکھو وہ حوض پر میاں صاحب وضو کر رہے ہیں، تو چل میں بھی آتا ہوں"۔ حضورؒ وضو کر چکے تھے کہ اتنے میں مولوی صاحب بھی تشریف لے آئے سائل نے مسئلہ پوچھا، آپ نے فرمایا کہ: "بھائی میں جاہل ہوں، دہقانی اور ان پڑھ ہوں، مسائل کو کیا جانوں؟ یہ باتیں کسی عالم سے پوچھنی چاہئیں"۔ مولوی صاحب یہ پتہ کی بات سنکر خاموش ہوئے، حضور مسجد کے اندر تشریف لے چلے اور فرمایا کہ "فلاں موقع پر فلاں فلاں صحابی رضی اللہ عنہما نے رسول کریم۔ روحی فداہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس مسئلہ کو دریافت کیا تھا اور حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا یوں جواب ارشاد فرمایا تھا"، مولانا محمد اسحاق صاحب نے تسلیم کیا اور سکتہ کے عالم میں آگئے۔[1]

مولانا ناظر حسین سہارنپوری کا بیان ہے کہ ان کے والد اور مولوی سرفراز علی صاحب مولانا محمد اسحاق صاحب محدث دہلوی سے حدیث شریف پڑھتے تھے، ایک روز سبق میں آیا کہ جب بندہ میرا خاص ہو جاتا ہے تو میں اس کے کان، زبان ہاتھ پاؤں بنجاتا ہوں، اس پر مولوی سرفراز علی نے حجت کی، مولانا محدث نے ہرچند سمجھایا، مگر قلب مضطر کی تسکین نہ ہوئی، پھر کچھ دیر بعد مولانا موصوف نے فرمایا کہ اس کا مطلب میاں راج شاہ صاحب بتلائیں گے انشاء اللہ وہ تمہیں اسطرح سمجھائیں گے کہ تمہیں اطمینان ہو جائے گا۔ مولوی سرفراز علی نے اجازت حاصل کی اور عرض کیا کہ کل سوندھ جاؤں گا، صبح کو مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپنے فرمایا: "گئے نہیں"؟ عرض کیا رات کو خواب میں ایک بزرگ کی زیارت ہوئی انھوں نے

[1] ص ۱۳۱

فرمایا ہے "تم حدیث شریف کا سبق چھوڑ کر نہ آؤ، یہ بے ادبی میں شامل ہے میں خود وہاں آجاؤں گا اور سمجھا دوں گا، حضرت مولانا محدث علیہ الرحمۃ کے فرمانے پر مولوی سرفراز علی نے ان کا حلیہ بیان کیا، اس عرصہ میں مولانا نے سُنا کہ حضرت میاں صاحب تشریف لا رہے ہیں اول ہی مولوی سرفراز علی نے دیکھکر کہا: "حضرت قبلہ وہ بزرگ یہی تھے جن کو میں نے خواب میں دیکھا تھا، میاں صاحب نے مولوی سرفراز علی کا ہاتھ پکڑا اور قریب ایک کھنڈر میں لے جاکر ان کا اطمینان کر دیا، جب واپس استاد کی خدمت میں حاضر ہوئے تو چشم پُرآب تھے اور فرماتے تھے کہ میں نے وہ دیکھا اور وہ سُنا کہ کبھی ان آنکھوں اور کانوں سے نہ دیکھا نہ سُنا ہوگا ؎

پوتھی سب تھوتھی بھئی پنڈت بھیا نہ کوئے
ڈھائی اچھر پریم کے پڑھے سوئی پنڈت ہوئے[1]

مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ الدھن میں آپ کے پاس تشریف لائے، حضور نے استدعا کی کچھ وعظ فرمائیے، جب سے علمائے دہلی کی صحبت ترک ہوئی ہے وعظ سُننے کا اتفاق نہیں ہوا، مولانا نے فرمایا کہ میں خود زبانِ مبارک سے سننے آیا تھا پھر دو تین شعر مثنوی کے پڑھے اور مطلب خاص کی بابت اشارہ فرمایا، میاں صاحبؒ نے ارشاد فرمایا کہ ان کا ترجمہ اور مطلب بھی بیان کرو۔ اس پر اس بحر زخار علم شریعت نے وہ وہ موجیں دکھلائیں کہ سُننے اور جاننے والے ہی کچھ اس کا لطف پا سکے۔ پھر حضور قبلہ نے ان کا ایک مطلب فرمایا وہ عام فہم تھا، پھر دوبارہ تقریر کی، اس کو صرف مولانا نے سمجھا، سہ بارہ جو کچھ بیان کیا وہ ایسے مطالب عجیب و غریب تھے کہ روح مولانا وجد میں آگئی اور تیسرا کوئی نہ سمجھ سکا، ان بیانات سے مجلس کے قلوب

[1] ص ۱۲۹ - ۱۳۰

پڑا ایک ایسا اثر پڑا کہ سب مرغِ نیم بسمل کی طرح تڑپنے لگے اور ارشاد فرمایا:
"سبحان اللہ وبحمدہٖ، میں اپنی مراد کو پہنچا" اور یہ شعر پڑھتے ہوئے رخصت ہوگئے

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود　　　گرچہ از حلقوم عبداللہ بود[1]

مرزا عنایت اللہ بیگ دہلوی فرماتے ہیں کہ: "میں اور میر عاشق علی نواحِ پورب میں ہم سفر تھے، جب گنج مرادآباد کے قریب پہنچے تو حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ سے قدم بوسی کا شوق پیدا ہوا، قریب ہی وہاں ایک بزرگ رہتے تھے، فرمایا کہ تم جیسے خلافِ شریعت سے وہ کیا ملیں گے، بہرحال ہم دونوں مرادآباد پہنچے اور مولانا صاحب کے یہاں حاضر ہوئے، آپ اس وقت حجرہ میں رونق افروز نہ تھے، کچھ مٹھائی لے کر ہم مکان پر پہنچے، آپ چارپائی پر بیٹھے انتظار میں تھے میر صاحب نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا اور چومنا چاہا، اس کشمکش میں دونوں صاحب جھک گئے، مولانا نے فرمایا کہ رسالدار میرے لئے دعا کرو۔ میر صاحب نے عرض کیا کہ میں دعا کے لئے نہیں بنایا گیا ہوں ع ہر کسے را بہر کارے ساختند۔

پھر دونوں حضرات نے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی پھر فرمایا کہ آپ ایسے بزرگ کے خادم ہیں جن کی تعریف نہیں ہوسکتی ہے، اور ایسے ہی صاحبزادے میاں مولوی عبداللہ شاہ ہیں ؎

یک چراغ است دریں خانہ کہ از پرتوِ آں　　　ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند[2]

نواب محمد شاہ خاں ساکن حسن پور ضلع مرادآباد نے بیان کیا کہ ایک مرتبہ حاضر خدمت ہوا، چند روز قیام کیا حضرت میاں صاحب نے ارشاد فرمایا: "محمد شاہ وقت آگیا ہے کمرِ ہمت باندھ لو اور بنگالہ کی راہ لو، باستماعِ ارشاد پیر راہیِ بنگالہ ہوا، جب نواحِ بنگالہ میں پہنچا تو ایک ساحرہ مجھ پر عاشق ہوگئی، یہ کیفیت میری سات ہفتوں

---

[1] ص ۱۳۲　[2] ص ۱۶۶

تک گذری کہ جب اس کے گاؤں سے صبح کو چلتا تو شام کو قطع سفر کرکے وہیں موجود ہوتا یہ کیفیت جب میرے میزبان نے دیکھی تو کہا کہ جب یہ عورت تم سے دریافت کرے کہ کدھر جاؤ گے تو جس طرف جانے کا قصد ہو اس کے خلاف سمت کا نام بتا دینا ورنہ تمام عمر اسی چکر میں رہو گے، چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا اس دن دوسری طرف کو گیا وہ یہی اور کہا مت جاؤ ورنہ پریشان ہوں گے، میں نے کہا: "مرشد کامل ہے تو کیا کرسکتی ہے" وہ گھر کو چلی گئی اور میں نے اپنی راہ لی اس کی سرحد پار تک بھاگا گیا، جب اس وبال سے پیچھا چھوٹا تو منزل دو منزل چلکر دیوہ شریف حاضری کا ارادہ کیا کہ میاں حاجی وارث علی شاہ سے مل کر چلیں گے۔ وہاں پہنچا تو ایک ہجوم پایا، لوگ آپ کو پالکی میں سوار کئے ہوئے لے جارہے تھے، بندہ نے بھی کندھا دیا اور مکان کے باہر ٹھہر گیا، کیونکہ اندر جانے کی ممانعت تھی۔ احقر نے عرض کیا کہ جاکر عرض کردو کہ ایک شخص خدمت میں نیاز حاصل کرنا چاہتا ہے، حضرت کا خادم بعد اطلاع واپس آیا اور کہا۔ بھائی بڑے قسمت والے ہو، آؤ، یاد فرمایا ہے، اور تمہیں کو سب سے پہلے پوچھا ہے۔ حاضر خدمت ہوا مصافحہ کیا ہاتھ چومے، حاجی صاحب نے فرمایا: "تم سے مل کر بہت جی خوش ہوا" پھر حاضرین کو مخاطب کرکے فرمایا: "یہ ایک زبردست شیخ، فردِ وقت کا خادم ہے، بھائی ہمارا بھی حضرت سے ملنے کو بہت جی چاہتا ہے" میں نے رخصت طلب کی، فرمایا: "ہمارے مہمان رہو" عرض کیا مجبور ہوں، صرف آپ کی زیارت کی خواہش تھی، سو الحمدللہ پوری ہوگئی" اس پر حضور نے خادم سے فرمایا کہ ایک تھان اور پچاس روپے لاؤ اور فرمایا کہ یہ ہدیہ میری جانب سے پیش کردینا، انشاء اللہ عنقریب نیاز حاصل کروں گا۔ جب میں سوندھو حاضر ہوا مجھکو محقق یاد ہے کہ حاجی وارث علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سوندھو تشریف لائے اور دو واصل اللہ نے باہمی ملاقات فرمائی ۔ راز و نیاز کی باتیں ہوئیں ۔۔۔۔۔

خوشا وقتے و خرم روزگارے — کہ یارے برخورد از وصل یارے[1]

سفر بنگالہ کی واپسی پر پہلی بیعت میں سشیر محمد میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا قدم بوس ہوا، آپ مکان سے جانب جنگل جا رہے تھے، میں نے حصول زیارت کے بعد اجازت چاہی، فرمایا: آج مہمان رہو، لوگوں نے حضرت سے پوچھا کہ یہ نو وارد کون ہے؟ فرمایا: "یہ بڑے زبردست شیر کا خادم ہے"، اور آپ ایک درخت کے سایہ میں ہمراہیوں سمیت بیٹھ گئے اور مجھ سے پوچھا: اب کہاں سے آرہے ہو؟ عرض کیا: بنگال سے، فرمایا: کہاں کا عزم ہے؟ میں نے کہا دربار مرشد۔ پھر آپ نے ایک آہ کھینچی اور فرمایا: سبحان اللہ فرمانبردار عاشق صادق ایسے ہی ہوتے ہیں خدا جزا دے، انشاء اللہ صبح کو میں بھی حاضری سے مشرف ہوؤں گا۔ جب سورج نکلا تو فرمایا: جنگل چلو اور صرف تنہا مجھکو ہمرکاب لیا اور میدان میں پہنچکر ایک ضرب اللہ لگائی اور رونا شروع کیا، منہہ سوندھ کی طرف کر لیا اور آن واحد میں آنکھیں کھول دیں اور ایک تھان اور کچھ روپیہ دیکر فرمایا: یہ پیش کر دینا، اور عنقریب حضوری میں حاضر ہوں گا، نیز یہ بھی کہدینا کہ وقت آگیا ہے، ذرا خیال رہے، وہاں سے رخصت ہو کر سوندھ حاضر ہوا اور نذرانہ و پیام پیش کیا، تبسم فرمایا، اور خاموش ہو گئے، پھر دعا کی اور دیر تک کچھ کلمات آہستہ آہستہ فرماتے رہے جو سمجھ میں نہ آئے ؎

پس از مدت کہ با من گفت از راہ وفا حرفے
چناں گشتم ز خوشحالی کہ آں را ہم نفہمیدم[2]

نواب صاحب ممدوح کو میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے چار سفر کرائے پہلا سفر بنگالہ، دوسرا سفر مدراس، تیسرا سفر پانی پت چوتھا رشی کیش کا سفر۔ پانی پت مولانا غوث علی شاہ صاحب کی زیارت کے لئے بھیجا گیا، ایک کوچہ میں ایک بزرگ سے

حضرت کا پتہ پوچھا، فرمایا: آپ جیسے خلاف شرع سے وہ کیوں ملیں گے؟ میں نے کہا: اس سے کیا حاصل، تم پتہ بتا دو، وہ ہنس کر چلے گئے، میں چند قدم چلا تھا کہ ایک شخص اور ملے، اور مجھ سے پوچھا کہاں جاتے ہو؟ میں نے کہا: مولانا غوث علی شاہ کی خدمت میں! فرمایا: میں ہی تو ہوں۔ میں نے مصافحہ کیا اور ہاتھ چومے، اور ہمرکاب ہوا، ایک مکان میں ٹھہرایا، اور کچھ دیر بعد ایک خادم حقہ لایا اور سیر بھر تمباکو رکھ گیا، شام کو کھانے کے لئے حضرت مولانا علیہ الرحمۃ خود بلا کر لے گئے میں نے عرض کیا: آپ نے کیوں تکلیف فرمائی؟ فرمایا: "عزیزم تم ایک زبردست فقیر کے خادم ہو، یہ انھیں کی خدمت ہے"، غرض کھانا کھایا اور معافی چاہی، کہ آپ یہیں تشریف رکھیئے، مولانا ٹھہر گئے اور میں دکان پر آگیا، دو یوم قیام کیا تیسرے دن رخصت طلب کی اجازت نہ دی، فرمایا: آج رہو، آخر بمحبت تمام رخصت ملی۔ چلتے وقت ارشاد فرمایا کہ سوندھ شریف کب تک پہنچو گے؟ عرض کیا پندرہ بیس یوم میں، فرمایا جب تک تم پہنچو گے میں بھی پہنچ جاؤں گا، کچھ نذرانہ حضور کے لئے دیا اور رخصت فرمایا۔ سوندھ حاضر ہو کر نذرانہ پیش کیا اور جو کچھ پیام تھا وہ دیا، دعا کی اور فرمایا کہ اچھا بھائی اچھوں سے ملنا اچھا ہے، یہی لوگ مردان راہ خدا ہیں[1]

میر حاجی احمد حسین ساکنہ گلاؤٹھی ضلع بلند شہر مشیر ریاست جودھپور، راجستھان، اپنے وقت کے ایسے بزرگوں میں سے تھے کہ ان کی نسبت یہ خیال تمام اطراف میں پھیلا ہوا تھا کہ خلاف شریعت انھوں نے تا زیست کوئی کام نہیں کیا ان کا یہ بیان ہے کہ یہ اثر مجھ میں حضرت میاں صاحب کی صحبت سے پیدا ہوا میاں صاحب شریعت کے اس قدر پابند تھے کہ ان کا کوئی فعل خلاف سنت نہیں تھا، رفتار، گفتار، نشست و برخاست سب سنت نبوی کے موافق

---

[1] ص ۱۵۴، [2] ص ۱۵۵

[1] ص ۱۵۶

نفیس، آپ تیز چلتے تھے اور پیروں کی چاپ چلنے میں سُنائی نہیں دیتی تھی، نیچی گردن کرکے چلتے اور بعض اوقات ردائے مبارک سر پر ڈال لیتے، گفتار میں خشونت بالکل نہیں تھی، اور تقریر نہایت شیریں اور ایسی مسلسل ہوتی کہ سامع کا جی بات سُننے سے نہیں گھبراتا، اکثر دوزانو یا چہار زانو پلنگ پر نشست رہتی، ہمیشہ باوضو رہتے، کبھی کھلکھلا کر نہیں ہنستے تھے، ہر کام بسم اللہ کے ساتھ شروع کرتے، بولنے میں انشاء اللہ کے ساتھ کلام فرماتے، اکثر وقت وعظ و نصیحت میں صرف ہوتا شریعت کی بابت پابندی سے تاکید فرماتے، گالی یا فحش کلام ان کی زبان سے بچپن سے لے کر ضعیفی تک کبھی نہیں سُنے گئے۔ رات دن میں اکثر یہ کلمات فرماتے،

"یا اللہ تجھ سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔ یا حفیظ، یا سلام، امان اللہ" بار بار کہتے، کوئی حافظ آجاتا تو اس سے قرآن پڑھواتے اور سُنتے سُنتے رقت طاری ہو جاتی تھی احادیث کی کتابیں سُنا کرتے تھے، لیلےٰ مجنوں اور ہیر رانجھا کے قصہ سُننے کا شوق تھا، آپ کے مرید اعظم شاہ ولایتی، اور محمد شاہ منصور کا قصہ پشتو میں پڑھتے تو میاں صاحب شوق سے فرماتے: "اعظم شاہ سُناؤ سُناؤ۔ اگر کوئی ہندی، پنجابی، پشتو اور فارسی زبان میں شعر یا کوئی دوہا یا چوپائی (رباعی) پڑھتا اور کسی لفظ کی اونچ نیچ ہو جاتی تو آپ فوراً بتا دیتے تھے۔ اکثر توحید و نعتیہ کلام سُنا کرتے اور خود بھی ہندی کے دوہرے اسی مضمون کے فرماتے، لوگوں کو تعجب ہوتا کہ باوجود ان پڑھ ہونے کے صحت الفاظ اور فہم مضامین کا یہ حال ہے:

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر
گرچہ باشد در نوشتن شیر و شیر

مؤلف "ملت پاک شاہی" کا بیان ہے کہ مولوی عبداللہ شاہ کی خدمت میں

عصر کے بعد حاضر تھا، بزرگان دین و صوفیائے کرام کے تذکرے ہو رہے تھے، غلام نے عرض کیا کہ "کیا کوئی بزرگ اپنے مرید کو کسی دوسرے بزرگ کی خدمت میں تکمیل مدارج کیلئے بھیجتا ہے؟" ارشاد فرمایا: "ہاں"۔ ایک دفعہ ایک شخص بعد الفراغ حج جو حضرت قبلہ حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مرید تھا اور ان کے ایماء سے سوندہ حاضر ہوا۔ دریافت پر معلوم ہوا کہ حاجی صاحب نے اپنے اس مرید سے یہ ارشاد فرمایا تھا کہ ہمارے ایک دوست میاں راج شاہ مردان خدا میں سے ہیں اور موضع سوندہ ضلع گوڑگانوہ، جو قصبہ تاوڑ کے پاس ہے رہتے ہیں تم ان کی خدمت میں حاضر ہو کر ہمارا سلام کہدینا اور بس چنانچہ اب میں حاضر ہوا ہوں۔ حضور فرد وقت نے فرمایا، اچھا بھائی کھانا دانا کھاؤ اور آرام کرو، بعد نماز تہجد وہ شخص حاضر ہوا، دو گھنٹہ برابر تخلیہ میں رہا، صبح کو رخصت فرماتے وقت سینہ سے لگا کر ارشاد کیا: کہو اللہ، اس نے اللہ کہا، پھر فرمایا: کہو اللہ، تیسری مرتبہ پھر اللہ کہلوایا، اس وقت یہ حالت تھی کہ ہر بُن مو سے پسینہ جاری تھا اور بے خودی طاری تھی، پھر کیا تھا رنگ بدل گیا، کندن ہو گیا اور اسی حالت میں دعا دیتا ہوا چل دیا، حضور نے فرمایا کہ بھائی اس کی تکمیل میں یہ کسر تھی اور اس کا حصہ ہمارے پاس تھا۔[1]

ایک مسافر زار و قطار روتا ہوا میاں مولوی محمد عظیم شاہ صاحب کے سامنے آیا اور اس شدت سے رویا کہ چیختے چیختے بے ہوش ہو گیا کچھ دیر بعد طبیعت سنبھلی، دریافت کیا کہاں سے آئے ہو؟ کہا بخارا سے حضور میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ملنے آیا تھا عرصہ پانچ ماہ کا ہوا کہ حضور مغفور کو میں نے خواب میں دیکھا تھا، ان سے طالب دعا ہوا، تسلی دیکر فرمایا: ہمارے پاس آؤ، نواح دہلی میں گوڑگانوہ ضلع اور اس میں ایک موضع سوندہ ہے ہمارا وہاں مکان ہے اور راج شاہ نام ہے، اس وقت حضور کے ہمراہ ایک لڑکا بھی تھا جس کی انگلی آپ نے پکڑ رکھی تھی، دریافت کیا کہ اس بچے کا نام کیا تھا، کہا محمد عظیم

اس کو آپ پیار کرتے تھے۔ خواب سے آنکھ کھلی، دل بے چین ہوا کہ چلوں۔ اس دن
سے سفر میں ہوں۔ یہاں پہنچ کر حضور کی خبرِ وصال سنی تو جگر چاک ہو گیا، اب کیا کروں
مولوی نجف علی صاحب نے فرمایا: جو لڑکا میاں صاحب کے ہمراہ تھا کیا اسے پہچانتے
ہو؟ کہا ہاں، چنانچہ چند لڑکوں میں میاں محمد عمر صاحب کو لا کر پیش کیا اس نے پہچان کر
کہا یہی لڑکا ہے اور یہی حلیہ ہے، پھر اس شخص کو حضرت مولانا محمد عبداللہ شاہ کی خدمت
میں پیش کیا، آپ نے دیکھتے ہی فرمایا کہ بھائی آ گئے اچھا کیا، کیوں گھبراتے ہو۔

زمن برسید راہ و رسم شبستان ہوائی
کہ چوں فرہاد مجنوں سیم کوہی و صحرائی

سینے سے لگایا اور بیعت کی، خدا کی مہربانی اللہ نے اس کا کام پورا کر دیا،
چند روز قیام کر کے کامیاب ہو کر اپنے وطن کو واپس چلا گیا[1]

ایک مرتبہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے وعظ میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم
اجمعین کی سیرت کا تذکرہ فرمایا، لوگوں پر ایک حالت طاری ہوئی ایک شخص نے بچشم پرآب
عرض کیا مولانا صاحب اس زمانے میں بھی کوئی انسان اس صفت کا ہے؟ مولانا
ممدوح نے ارشاد فرمایا: کیوں نہیں، خدا کی خدائی خالی نہیں۔ ایک شخص یہاں تشریف
لایا کرتے ہیں اس بار آئیں گے تم کو دکھا دیں گے۔ جب حضور میاں صاحب جمعہ کو
جامع مسجد دہلی میں تشریف لائے، حوض پر وضو کر رہے تھے، مولانا ممدوح نے آپ کو
دیکھ کر حوض کے قریب چادر مبارک بچھا دی، میاں صاحب نے مولانا صاحب سے
معانقہ کیا اور تعظیم دی، مولانا نے فرمایا: "یہاں چادر پر تشریف رکھئے، میاں صاحب
نے چادر اٹھا کر سر پر رکھ لیا اور فرمایا: مولانا صاحب! آپ ہادی دین متین، نائب نبی،
عالم فاضل ہیں، میں ایک گنہگار آدمی گنوار ہوں، کیوں مجھے اور گنہگار کرتے ہیں، بندہ

[1] ص ۱۵۶

عالموں کی پاپوش کی برابر بھی نہیں، یہ کلمات سنکر ایک بڑے مجمع کے روبرو - جو وہاں
موجود تھا - فرمایا:-

"اے لوگو! جن بزرگ کے بتانے کا وعدہ تم سے کیا تھا وہ یہی
ہیں، ہندوستان کی خوش قسمتی ہے کہ صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم
اجمعین کی سیرت کے حضرات اب بھی موجود ہیں اور وہ آپ کی ذات ہے
کہ قدرت نے ایسی مقدس روحوں کو پیدا کیا"۔

اس پر حاضرین پر ایک رقت طاری ہوئی، سب نے آپ سے مصافحہ
کیا، پھر جب آپ دہلی تشریف لے جاتے شائقین نیاز حاصل کرنے حاضر ہوتے؛

ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء[1]

حضرت مولانا محمد اسحاق صاحب محدث دہلوی جب بیت اللہ شریف گئے
تو وہاں کے فقراء اور اہل اللہ سے ملے، ایک روز خانہ کعبہ میں ایک بزرگ بزرگان دین کے
اوصاف بیان فرما رہے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے آدمیوں کے یہ یہ وصف
بیان کئے ہیں، مولانا ممدوح نے سنکر فرمایا کہ ان جمیع اوصاف سے متصف میں نے
ایک شخص کو پایا، لوگوں نے دریافت کیا کہ حضرت وہ کون بزرگ ہیں اور کہاں قیام پذیر
ہیں-؟ مولانا نے تمام پتہ اور نام حضرت میاں راج صاحب، فرد وقت علیہ الرحمۃ کا بیان
کیا- وہاں کانپور کے ایک مولوی صاحب بھی تھے، انھوں نے پتہ مفصل لکھ لیا، حج
کے بعد پہلے اپنے گھر کانپور آئے اور کچھ دن قیام کر کے براہ دہلی قصبہ جھنجھانہ پہنچے پھر
پہاڑی کا راستہ طے کر کے سوندہ کے جنگل میں آئے، دیکھا تو ایک بزرگ کھڑے ہیں،
مولوی صاحب نے بعد سلام مسنون ان سے دریافت کیا کہ جناب یہاں کوئی موضع
سوندہ ہے؟ اور کیا اس میں ایک بزرگ اس نام کے رہتے ہیں، فرمایا چلو سوندہ

[1] ص ۹۲-۱۹۳

میں بھی چلتا ہوں، ذرا آرام کر لو یہ کہہ کر کھیت کی مینڈ (ڈول) پر بیٹھ گئے اور وہ حدیث تلاوت کی جو مولوی صاحب نے کعبہ شریف میں بزرگانِ دین کے اوصاف میں بیان کی تھی، مولانا کانپوری یہ سنتے ہی مضطرب ہو گئے اور حضور کے قدموں پر گر کے بے اختیار ہو گئے اور رونے لگے، حضور نے اٹھا کر سینہ سے لگایا اور سوندھو لیجا کر بیعت کیا، پھر ایک شغل تعلیم فرما کر کہا کہ بھائی کہاں کہاں بھٹکتے پھرو گے، ممکن نہیں کہ چپہ چپہ زمین پر پھر جاؤ، اپنے ہی میں ڈھونڈو، یہیں مل جائے گا۔ نحن اقرب الیہ من حبل الورید۔ ؎

دور کہوں تو دور ہے اور پاس کہوں تو پاس
روم روم میں رم رہو جوں پھولن میں باس[1]

شاہ محمد خان حسن پوری کہتے ہیں، ایک دفعہ ٹونک میں اپنے بھائی سے ملنے گیا، جنگل میں ایک سادھو اور ان کے چند چیلوں کو دیکھا، خدا کی شان وہاں جا کر اپنے سب ذکر و اشغال بھول گیا، قلب میں یہ ذکر جاری ہوا۔ با۔ بے۔ بم۔ ہر چند اس وسوسے کو دفع کرنا چاہا نہیں ہوا، وہیں سوندہ شریف کو سیدھا ہو لیا، جس وقت قصبہ سے پہاڑی پر قدم رکھا بدستور پہلا شغل جاری ہو گیا، گرو جی کا شغل نہ اردو یاد کرتا ہوں تو یاد نہیں آتا، غرض حضرت قبلہ کی خدمت میں حاضر ہوا، گزشتہ قصہ بیان کیا حضور نے ارشاد فرمایا کہ دوسری زبان میں وہ بھی خدا ہی کا ذکر ہے، بہر نوعے کہ یادآری سر برآرد، بھائی اب کے جانا ہو تو اس کے چیلوں میں سے دو ایک کو مونڈ لینا ایک سال بعد پھر ٹونک پہنچا، اور اس سادھو کے پاس گیا خوب زور آزوری ہوئی کچھ اثر نہ ہوا صاف آیا، جب تھوڑی دور چلا تو راستہ میں آہٹ معلوم ہوئی، پھر کر دیکھا تو گرو جی کے دو چیلے چلے آ رہے ہیں۔ میں نے کہا بھائی خیر ہے، کیا مہاراج نے بلایا ہے

[1] ص ۲۲-۱۲۵

کہا: نہیں، پوچھا: پھر کیوں آئے ہو؟ کہاں جاؤ گے؟ کہا: جہاں تم جاؤ گے تمہارے ساتھ ہیں، ہر چند ٹالا نہ ٹلے اور کہا تم گرو ہم چیلے، میں نے کہا تم ہندو میں مسلمان، کہا سب ایکم کار۔ غالباً سب ایک۔ میں نے ٹالنے کا دوسرا بہانہ کیا ایک بکر قصاب کی دوکان پر بیٹھ گیا وہ بھی وہیں پہنچے، میں نے ایک ٹکڑا مول لے لیا وہ ایک چیلے نے اپنے کپڑے میں لے لیا، آگے چل کر ایک مچھلی خریدی وہ دوسرے چیلے نے سنبھال لی، چند یوم کے سفر کے بعد دونوں چیلوں سمیت حاضر ہوا، حضرت قبلہ نے التفات فرمایا اور اپنا چیلہ کیا اور مجو آنار کا بیچا چھڑایا کچھ یوم خدمت میں رکھا اور بعد تلقین اشغال و تکمیل مدارج ایک کو کسی جگہ کا صاحب خدمت کر کے بھیجا اور دوسرے کو ایک اور بزرگ کے سپرد فرمایا جو دامن کوہ میں استقامت رکھتے تھے وہ وہاں یادِ الٰہی میں مصروف ہوا، اس مقام پر اس ادب کو ملاحظہ فرمائیے کہ باوجود ارشاد حضور کہ دو کو تم مونڈ لینا پیر کے سامنے پیر بننا پسند نہ کیا، حضرت کو یہ کس قدر پسند آئی ہو گی؟

ادب تاجیست از لطفِ الٰہی
بنہ بر سر، برو ہر جا کہ خواہی[1]

مولوی عبدالغفور صاحب فرماتے تھے کہ جب آخری مرتبہ حضور نے مجھکو رخصت کیا تو فرمایا کہ ایک بزرگ نے اپنے مرید کو آخری دفعہ رخصت کے وقت وصیت کی کہ تو خدا اور رسول نہ بننا۔ عرض کیا کہ میں خدا اور رسول کیسے بن سکتا ہوں فرمایا کہ یہ دعویٰ کرنا کہ جو چاہے وہ ہو، یہ شانِ خدا ہے، ہوتا وہ ہے جو خدا چاہتا ہے، اور شانِ رسول محبوبیت کی ہے، یہ نہ خیال کرنا کہ میں بڑا زاہد و عابد ہوں اور اس لئے خدا کو پیارا ہوں، پس ان باتوں کو سوچ اور غور و فکر کر، اس کے بعد خدا حافظ و ناصر فرمایا، اور رخصت کیا، مجھ کو یہ کیا خبر تھی کہ یہ وقت حضرت قبلہ کا آخری ہے اور یہ تعلیم و ہدایت

[1] ص ۳۶-۱۳۷

سے بھرپور الفاظ میرے کان پھر نہ سنیں گے[1]

حبیب اللہ خیاط باپوڑی کا بیان ہے کہ قاری عبدالرحمٰن بریلوی حج کو گئے، نویں تاریخ شب حج کو خواب میں دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بشارت دی کہ تمہارا حج قبول ہوگیا، اور بعد انفراغ حج راج شاہ نامی سے جو ایک فقیر پابند سنت سکنہ سوندھ ضلع گوڑ گاؤں جو نواح دہلی میں ہے ملنا، جب وطن چلنے کے لئے جہاز پر سوار ہوئے تو باد مخالف سے جہاز طوفان کی زد میں آگیا اور پھٹ گیا ایک تختہ پر تین آدمی بچے پھر دوان میں سے بھی غریق رحمت ہوئے، وہ تختہ بہتا ہوا ایک پہاڑ سے جالگا، گھاس لکڑی پکڑتا ہوا اوپر چڑھا تو ایک دروازہ ملا، آواز دی کوئی نہ بولا، آخر اندر گیا صرف دو کوٹھری والا دالان تھا، بعد مغرب وہ دونوں کوٹھریاں کھلیں اور دو حضرات ان میں سے نکلے: ایک نے ذرا ترش روئی سے کہا: کون ہو؟ دوسرا بولا: خدا کا مہمان ہے مغرب کی نماز باصرار مجھ سے پڑھوائی پھر ایک خوان غیب سے اترا، ہم تینوں نے مل کر کھایا، تین روز بطور مہمان رہا، چوتھے روز کہا: "مکان کو جاؤ"۔ میں نے کہا کہ مکان میرا بریلی ہے کیسے پہنچوں گا؟ کہا: "اپنا ایک ایک پاؤں ہمارے کندھوں پر رکھو اور آنکھیں بند کرلو"۔ پھر کہا کھولدو تو بریلی کی سرحد میں موجود تھا چلتے وقت میں نے عرض کیا کہ اپنا نام تو بتادو فرمایا "ہم کو لیلیٰ مجنوں کہتے ہیں"، یہ کہتے ہوئے چلدیئے اور تاکید کی کہ ہمارا اسلام میاں صاحب کی خدمت میں کہنا[2]

ایک روز قصبہ سہنہ مسجد کنڈ میں نماز فجر پڑھ کر بیٹھے تھے، دو چار آدمی بھی صحبت میں حاضر تھے، فرمانے لگے: بھائیو، میں بے علم ہوں لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ بے علم کا مرید ہونا ٹھیک نہیں ہے، اور یہ بھی یہی کہ بے علم خدا کو بھی نہیں جانتا۔ پھر فرمایا: سنو، ایک بات کہتے ہیں، آدمی کا دل نیلوفر کے پھول کے مانند ہے۔

---

[1] ص ۱۳۸ [2] ص ۱۶۶

اور اس کے چار پہلو اور چار خانے ہوتے ہیں، ہر خانہ میں زمین و آسمان کی بہت بڑی ولایت ہے، ہر دل کے گڑھے یعنی نیچے کی طرف ایک خانہ ہے جو لامکاں کی جگہ ہے، اور پھر ہر خانہ میں اللہ پاک کا خزانہ ہے اور ہر خزانے پر پردہ ہے اور ہر پردہ پر شیطان کا ایک خادم وشاگرد ہے۔ پہلا پردہ غفلت کا ہے، دوسرا پردہ موت کو بھول جانے کا ہے اور اس پر حرص قابض ہے اور تیسرے پردہ پر حسد قابض ہے اور چوتھے پردہ پر غرور، اور ہر ایک کے ساتھ خناس وخرطوم وخطرات ووسوسے شامل ہیں اور ہر خانہ میں اللہ کے پہلے خزانے میں علم، دوسرے میں ذکر، تیسرے میں معرفت، چوتھے میں فقر۔ فنافی اللہ اور بقا باللہ۔ اور مرشد ہر ایک کے دفعیہ کا علاج بتاتا ہے، پہلے کے لئے شریعت، دوسرے کے لئے طریقت، تیسرے کے لئے حقیقت ومعرفت اور نفس کو مارنا، چوتھے کے لئے گناہوں سے ڈرنا اور دنیا کی صحبت چھوڑنا۔ پھر فرمایا کہ یہ پردہ اٹھ نہیں سکتا مگر مرشد کامل کی نظر سے۔ پھر فرمایا: "بندہ اور اللہ کے درمیان کیا چیز وسیلہ ہوتی ہے اور اس سے کیا ملتا ہے؟؟ فرمایا: "بندہ اور خدا کے درمیان مرشد وسیلہ ہوتا ہے اور اسی کے ذریعہ خدا کی محبت حاصل ہوتی ہے، خدا کے بھید اور ڈر (تقوی) اور موت، مرنے سے پہلے مرنا (موتوا قبل ان تموتوا) حاصل ہوتا ہے" —— پھر فرمایا: "اولیا اللہ مرتے نہیں ہیں (اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ) اور پیغمبر علیہم الصلوٰۃ والسلام تو مردوں کو زندہ کرتے تھے اور ان کو پھر موت آجاتی تھی، ہمارے پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم کی امت کے سرداروں کو وہ بات عطا کی کہ مردہ دلوں کو زندہ کرتے ہیں اور وہ قیامت تک نہیں مرتے، ان کی مٹی تک خراب نہیں ہوتی"۔ یہ فرما کر آپ بہت روئے اور کہا کہ میں بے علم ہوں خدا نے مجھے سہنہ میں ایک خاص کام کے واسطے رکھ رکھا ہے اللہ پاک کے حکم کا منتظر ہوں جب وہ کام پورا ہو جائیگا پھر نہیں معلوم کہاں جاؤں اور نہ یہ معلوم کہ وہ کیا کام ہے؟[1]

---

[1] ص ۱۴۲

میر عاشق علی سکنہ گلاؤٹھی رحمۃ اللہ علیہ حضور میاں صاحبؒ کے چہیتے مریدوں میں سے تھے اور قلندری طریقہ رکھتے، ان کے پیر بھائی خاں صاحب میاں غازی الدین حیدر شاہ خلیفہ حضرت میاں صاحبؒ نے میر صاحب سے بیان کیا کہ میاں صاحبؒ بارہ بارہ گھنٹے حبس دم کیا کرتے تھے۔ میاں صاحبؒ کے رونگٹے رونگٹے سے کلمہ کی آواز آتی تھی ؎

تن سوکھ پنجر بھلیو اور رگیں بھیں سب تار
روم روم باجت ہے، یہ ہے نام تہار

رات دن میں صرف ایک معمولی روٹی اور ایک کوزہ پانی پر گذر کرتے۔ پھر میر صاحب نے فرمایا، حضور میاں صاحب کے مجاہدہ کی آخر تک یہ کیفیت تھی کہ نوافل و ذکر الٰہی میں جوں شام سے بیٹھتے اگلے دن اسی وقت اٹھتے اور یہ حال تھا کہ غریبوں کے ساتھ محبت اور مروت سے پیش آتے، چھوٹوں اور بڑوں کو نصیحت فرماتے، جھوٹ دغابازی، چغلی اور ریاکاری بڑے گناہ ہیں، حسد و بغض، کینہ اور ریاکاری سے دل سیاہ ہو جاتا ہے۔ اللہ کے بندوں کی خدمت کرنا اور غریبوں کو مدد پہنچانا بہترین عبادت میں سے ہیں، اس طرح رضاء الٰہی حاصل ہوتی ہے۔ مومنین و صالحین کی صحبت سے نور ایمان میں زیادتی ہوتی ہے ؎

صحبت صالح ترا صالح کند　　　صحبت طالع ترا طالع کند

اچھے کی صحبت بیٹھ کے کسی جنی ستی کے ساتھ
سیوا کرے سمندر کی جا سونگان جواہر ہاتھ

فقیروں درویشوں اور اللہ والوں کی صحبت اور خدمت سے دل کی سیاہی دور ہوتی ہے، عبادت کا ذوق و شوق پیدا ہوتا ہے جو خالق کائنات اللہ جل شانہٗ اور فخر موجودات صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی اور رضاء کا ذریعہ ہے۔"

پھر ارشاد ہوا: "مخلوق کی خدمت کرو، خواہ کسی قوم کا ہو"، آپ خود بھی بیماروں کی خدمت کرتے، چمار بھنگی کوئی بلاتا اس کے چلے جاتے اور فرماتے: ؎

سبھی جات چمار کی بنا چام نہ کوئی
بنا چام وہ آپ ہی جسے لکھے نہ کوئی

اور فضول خرچی کو روکتے، حتیٰ کہ جو کوئی پانی کو بھی فضول خرچ کرتا اس کو منع فرماتے اور کہتے یہ اسراف بیجا ہے، خدا اس کا حساب لے گا، کھانا کھانے سے پیشتر جب ہاتھ دھوتے تو کسی درخت کی جڑ میں ہاتھ دھوتے اور فرماتے: "یہ پانی بھی کیوں ضائع جائے، خدا کی بنائی ہوئی نعمت ہے، پانی ایسی جگہ ڈالو جہاں کسی کو نفع پہنچائے"، یہ سنت رسولؐ ہے۔ لوگ ذرا ذرا سی نیکیاں یوں ہی نادانی سے ضائع کر دیتے ہیں[1]۔

اس طرح اس قدسی صفات بزرگ نے تقریباً پچاس سال میوات کی سرزمین کو بقعۂ نور بنائے رکھا۔ پورے علاقہ کی تنظیم کچھ اس طرح فرمائی کہ ہر علاقہ میں کئی کئی مراکز قائم ہو گئے۔ گو آپ نے اپنا فیض محدود نہیں رکھا مگر پھر بھی اپنا ماحول ہر وقت نگاہوں کے سامنے رہتا ہے اور وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ فرمان خداوندی ہے۔

وفات کون ایسا ہے جس نے اس دنیا میں آکر جام حیات سے شربت فنا نہیں پیا، رمضان المبارک کی ۱۰ تاریخ تھی اور تیرہ سو چھ سال ہجرت کے گذر گئے تھے کہ حضرت فرد وقت میاں راج شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس جہان فانی سے کوچ فرمایا: انا للہ و انا الیہ راجعون۔

ہاتف سبز پوش کرد رقم
شاہ عرفاں چو شد فنائی اللہ

[1] ص ۱۱۴، ۱۱۵

خلفاء و مجازین

آپ کے خلفاء کی فہرست گو طویل نہیں، مگر جس قدر بھی ہے مرتب اور بھرپور ہے۔

(۱) مولانا عبد اللہ شاہ :۔ آپکے خلف الصدق اور سجادہ نشین خانقاہ سوندھ تفصیلی تذکرہ آرہا ہے۔
(۲) حاجی حیدر شاہ :۔ خلف اصغر
(۳) غازی الدین حیدر شاہ سکنہ سہنہ ضلع گوڑگانوہ، آپکا وصال بھرتپور شہر میں ہوا، مہاراجہ بھرتپور نے آپکا مقبرہ بنوایا جو فصیل شہر سے باہر گراس کے متصل ہے۔
(۴) حاجی سید عابد حسین دیوبندی : بانی دارالعلوم دیوبند، ضلع سہارنپور
(۵) میر محمد تقی تھانہ بھون ضلع مظفر نگر

وہ حضرات جو قطب عالم کی توجہ سے مجذوب ہوکر صاحب خدمت ہوئے :۔

(۱) حافظ میر احمد علی آکیڑہ ضلع گوڑگانوہ
(۲) میاں زمان شاہ ولایتی خیر نگر دروازہ شہر میرٹھ
(۳) میاں خان محمد شاہ ولایتی متعینہ کابل
(۴) میاں جھجو شاہ صدر بازار میرٹھ
(۵) شاہ صاحب سیدم پور علاقہ بھرتپور
(۶) مسماۃ مینہ سکنہ بھی
(۷) مسماۃ والدہ سلطان سکنہ کھوڑیا، نارنول
(۸) صاحبزادی نوابی والدہ میاں ولی محمد جی، سانتھاواڑی
(۹) عبدالمجید شاہ۔ الدھن ضلع میرٹھ
(۱۰) ربی میو مجذوب فیروز پور جھرکہ
(۱۱) پیرجی فیاض علی میرٹھ [1]

---

[1] ص ۱۹۵-۱۹۶

حضرت غوث الصمد فرد الاحد میاں شاہ سراج خاں صاحب

خلیفۂ اعظم حضرت مولانا مولوی محمد اسماعیل مہمی قدس سرہٗ

★

تذکرۃ العابدین میں ہے :۔

آپ نے ابتدائی زمانے میں بہت بڑے مجاہدات کئے تھے ادنی مجاہدہ آپ کا یہ مشہور ہے کہ آپ نے چالیس برس جمعہ کی نماز بلا ناغہ دہلی میں پڑھی اور شاہ عبد العزیز صاحب و شاہ محمد اسحاق صاحب کے وعظ میں شریک ہوکر اسی روز اپنے مکان موضع سوندھ پرگنہ تاوڑو ضلع گوڑگانوہ واپس تشریف لے جاتے۔

آپ کی کرامتیں و فیض باطنی و مجاہدات مشہور ہیں۔ اس مختصر تحریر میں کیا گنجائش جو سما سکے، ادنی کرامت آپ کی یہ تھی کہ باوجود امّی ہونے کے کسی قسم کا مسائل میں کہیں رکاؤ اور عجز نہ تھا۔ دلائل عقلی و نقلی مع آیات و احادیث کے بیان فرمایا کرتے تھے۔ بات بات پر حدیث و قرآن کا ثبوت دیتے کہ عالم بھی سنکر دنگ ہو جاتے تھے۔ اور تمام ملک میوات آپ کا مطیع و منقاد تھا۔ فیض آپ کا وہ تھا کہ قریب پچاس ہزار آدمیوں کے آپ سے مستفیض ہوئے خصوصاً پانچ خلیفہ تو آپ کے بہت مشہور و معروف ہیں :

اوّل خلیفہ غازی الدین شاہ رحمۃ اللہ علیہ کہ ریاست بھرتپور اور دھول پور و قرب و جوار مثل ریاست قرولی و اکبرآباد وغیرہ میں ہزارہا اشخاص مستفیض ہوئے لیکن عمر زیادہ نہ ہوئی۔ پیر و مرشد کے سامنے ہی اصل بحق

ہو گئے۔

دوسرے خلیفہ | چھوٹے شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کہ جن سے ضلع مرادآباد و ضلع میرٹھ وغیرہ میں ہزارہا انسان ہو گئے اور بقوت جذبی و کمالی عقدۂ نی امروہہ دوبارہ بستی افغانان میں جاری کردیا ــــ (دھلاوٹ)

تیسرے خلیفہ | حضرت محمد عابد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کہ جو آج مثل آفتاب ہندوستان میں مشہور تھے۔

چوتھے خلیفہ | مولوی عبداللہ شاہ فرزند و جانشین۔

پانچویں خلیفہ | میاں حیدر شاہ فرزند دیگر۔

قطعۂ تاریخ وفات !!

پنجشنبہ ہشتم از ماہ صیام — یکبیک واشد چوں آب ز غفرت
بہر تاریخ وفاتش صدق گفت — ہائے ہائے آفتاب معرفت

۱۳۰۶ھ

ہاتف سبز ہوش کرد رقم — شاہ عرفاں چوں شد فنا فی اللہ[1]

۱۳۰۶ھ

---

[1] تذکرۃ العابدین ص ۱۹۲ ۔ دلی پرنٹنگ ورکس دہلی میں باہتمام لالہ رام کرداس پرنٹر چھپی ۱۳۳۳ھ۔

مجدد وقت

حضرت مولانا شاہ عبداللہ صاحب

سوندھ، ضلع گوڑگانوہ

(۱۲۴۷ھ ــــــــــ ۱۳۴۲ھ)

فرد وقت قطب عالم حضرت میاں راج شاہؒ (۱۲۱۶-۱۳۰۶ھ) سوندھ کے چار فرزند ارجمند تھے، ان میں بڑے فرزند حضرت مجدد وقت مولوی عبداللہ شاہ صاحب خلیفہ ومجاز اور سجادہ نشین تھے، قدرت کے اس انتخاب کا تماشہ دیکھو جس کو ازل سے اس کام کے لئے تیار کیا گیا اور جگہ جگہ کی ودیعتیں جو حضرت میاں راج شاہؒ نے اکٹھی کی تھیں خدا نے وہ حصہ حضرت کو پہنچایا، باقی امور باطنیہ کا تعلق براہ راست دربار غوث پاک رحمہ اللہ سے تھا، حضرت قبلہ کا کوئی سانس یاد الٰہی کے بغیر نہیں گذرتا تھا، مجدد وقت ہونے کے علاوہ عالم باعمل تھے، شب و روز مجاہدہ و ریاضت اور تزکیۂ نفس میں مشغول و مشاہدۂ جمال حق میں مستغرق رہتے تھے، بسا اوقات دو انگلیوں کے اشارے سے کچھ لکھتے رہتے اور یہ شغل سوتے جاگتے برابر جاری رہتا تھا۔ ؎

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایاں
بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہمچناں باقی

۱۲۴۷ھ میں آپ کی پیدائش ہوئی، باپ کا گھر پرنور ہوا اور ان کا دل اس جمال جہاں آرا کو دیکھ کر باغ باغ ہوا اور ماں کی گود ثمر مقصود سے لبریز ہوئی، کس قدر مبارک روح کہ ایسی ماں کی گود پرورش کے لئے اور ایسے باپ کی آغوش تربیت کیلئے میسر آئی، جب عمر چھ سات سال کی ہوئی تو اپنے ہم عمر لڑکوں کے ہمراہ گائیں اور بکریاں چرانے

پہاڑ پر جاتے اور بچے تو کھیل کود میں مصروف ہو جاتے اور آپ کسی سایہ دار درخت کی آڑ لے کر صاف سے پتھر پر بیٹھ کر 'اللہ اللہ' کیا کرتے ۔ نماز روزہ کا شوق بچپن سے تھا ہمیشہ نماز ٹھیک وقت پر۔ سفر ہو یا حضر۔ پڑھنا آپ کا معمول تھا ۔ ایک دن گھر والوں نے لکڑیوں کے لئے اور بچوں کے ہمراہ پہاڑ میں بھیجا، لڑکے لکڑیاں توڑنے میں لگ گئے اور آپ نے نفلیں پڑھنی شروع کیں اور شام تک پڑھتے رہے، جب واپس ہوئے تو سب کے پاس لکڑیاں تھیں اور آپ خالی ہاتھ تھے ساتھیوں نے آپس میں کچھ مشورہ کیا اور ہر ایک نے تھوڑی تھوڑی لکڑی دیکر آپ کو دیدی تاکہ گھر آپ پر ڈانٹ نہ پڑے

خدا خود میر سامان است ارباب توکل را

آپ کی تربیت باطنی آپ کے والد ماجد نے ہی فرمائی، جب باپ نے محسوس کیا کہ باطنی تربیت پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی تو علوم ظاہری سیکھنے کی خاطر الدھن ضلع میرٹھ جناب مولوی تبارک اللہ صاحب خلیفۂ شاہ محمد اسحٰق محدث دہلوی رحمہا اللہ کی خدمت میں بھیجا الدھن میں آپ نے منشی عبدالکریم کے پاس - جو میاں راج شاہؒ کے مریدین تھے قیام فرمایا۔ آپ کو مولانا موصوف نے سینہ سے لگایا اور علوم ظاہری کی تعلیم شروع فرما دی، آپ کو اور بچوں کے ساتھ نہیں پڑھاتے تھے بلکہ اس طرح پڑھانا شروع کیا کہ کتاب کے مضامین زبانی بتاتے، جب کل کتاب اس نہج پر ختم ہو جاتی تو ایک مرتبہ کتاب کی عبارت پر غور کروالیا جاتا پس وہ کتاب دل و دماغ میں نقش کالحجر کی طرح رچ بس جاتی، صرف دو سال میں اس قدر استعداد بہم پہنچالی کہ دوسرے لوگ آ آ کر استفادہ کرنے لگے ۔ دراصل یہ پڑھنا پڑھانا محض ایک ظاہر سبب و وسیلۂ حصول علم تھا، ورنہ ایسے نفوس کی تعلیم جنکو قدرت خود انتخاب کرتی ہے خود ہی اس کی تعلیم کی کفیل بن جاتی ہے، انبیاء کرام علیہم السلام کو بذریعہ وحی و رویا صادقہ تعلیم دی جاتی ہے اور اولیاء کو بذریعہ کشف و الہام - علوم و معرفت ان کے قلوب پر نقش

ہو جاتے ہیں، پھر جو کچھ وہ کہتے ہیں اس کی اصل عرش معلی سے ملی ہوئی ہوتی ہے، ایسی تعلیم کی طرف اس آیہ میں اشارہ ہے:

وَكَذٰلِكَ نُرِيٓ اِبرَاهِيمَ مَلَكُوتَ السَّمٰوٰتِ وَالاَرضِ —	اسی طرح دکھلانے لگے ہم ابراہیم کو سلطنت آسمانوں اور زمین کی ۔

ان دنوں الدھن میں شب برأت کا تہوار بڑے زور شور سے منایا جاتا تھا، آتش بازی کے سب رسیا کیا بوڑھے کیا جوان، اتفاق سے ایک فریق نے آپ کو انار دیا کہ تم ہماری طرف سے ہو کر دوسرے فریق کی جانب چھوڑ دو، چنانچہ آپ نے ایک انار سیدھا کر کے کسی شخص کی جانب چھوڑا، ہر چند اس کے روکنے کی کوشش کی گئی نہ رکا اور گھر پر جا کر پڑا، دونوں فریق جمع ہوئے اور بالاتفاق سب نے کہا کہ اس کھیل میں مولانا کو شریک نہ کرو، ان کا نشانہ خالی نہ جائے گا، پھر کسی نے آپ کو کھیل میں شرکت کی دعوت نہ دی۔

علوم سے فارغ ہونے کے بعد کچھ عرصہ تک الدھن اور نواح میرٹھ میں قیام کیا اور اکثر اسی عرصہ میں چھوٹے شاہ صاحب کے ہمراہ میرٹھ و آگرہ کے اطراف کی سیر کی، اتفاق سے ایک دفعہ امروہہ میں گذر ہوا، وہاں کسی صاحب کا عرس تھا، چھوٹے شاہ صاحب کو حال آیا اور ایسا آیا کہ شام سے کھڑے رہے اور اگلی صبح تک اسی حال میں گذری، یہ دیکھ کر اس جلسہ کے شرکاء تتر بتر ہو گئے اور اس عرس کے منتظمین بھی دم توڑ کر بھاگ نکلے ۔

آپ ۱۲۸۲ھ سے کچھ پہلے واپس اپنے گاؤں سوندہ پہنچے اس وقت آپکی عمر بائیس یا چوبیس سال کی تھی، سر پر پٹے، میرٹھی ٹوپی، آنگہ (شلوکا)، اور پاجامہ یہی اس وقت آپ کی پوشش ۔

حضرت شاہ فضل الدین احمد سجادہ نشین سید محمد کالپوری رحمۃ اللہ علیہ

حضور نو میاں صاحب کی زیارت کو آئے اور کچھ یوم ٹھہر کر چلے گئے، وہ اپنی کتاب "جمعہ ادھر توں" میں لکھتے ہیں:-

"مجھ کو سیر و سیاحت کے دوران اکثر بزرگان دین سے ملنے کا اتفاق
ہوا۔ اس زمانے میں حضرت قبلہ میاں راج شاہ صاحب جیسا بزرگ اور
صاحب تصرف نظر سے نہیں گزرا، اور مولوی عبد اللہ جیسا کاسب۔"

یہ دونوں حضرات کی ایسی شان تھی۔ مولانا ممدوح بعد وصال پدر بزرگوار تقریباً ۲۲ سال تک مسند ارشاد پر جلوہ افروز اور میاں صاحب کے حجرے میں مکین رہے۔ نہایت خلیق و منکسر المزاج تھے۔ پھر بھی آپ کے چہرے سے ایسا رعب ظاہر ہوتا تھا کہ کسی کو تاب تکلم نہ تھی۔ آپ اپنے والد بزرگوار کے مریدوں کے ساتھ نہایت محبت و لطف سے پیش آتے اور نظر عزت سے دیکھتے اور جس کو لائق اور قابل سمجھتے اجازت بیعت مرحمت فرماتے اور ہر ایک عرضداشت کا جواب اپنے قلم سے لکھتے۔ مستغنی المزاج، متوکل باللہ، صاحب تسلیم و رضا تھے۔ نظیر اکبر آبادی نے کیا خوب کہا ہے:-

جو فقر میں پورے ہیں وہ ہر حال میں خوش ہیں
ہر کام میں ہر دام میں ہر حال میں خوش ہیں

چتون پہ ملالت نہ جبیں پر کہیں خم | ماتھے پہ کہیں چین نہ ابرو پہ کہیں خم
شکوہ نہ زباں پر نہ کبھی چشم ہوئی نم | غم میں بھی وہی عیش، الم میں بھی وہی دم

ہر بات ہر اک وقت ہر اقوال میں خوش ہیں
پورے ہیں وہی مرد جو ہر حال میں خوش ہیں

ان کے تو جہاں میں عجب عالم ہیں نظیر آہ | اب ایسے تو دنیا میں ولی کم ہیں نظیر آہ
کیا جانیں غرض ہیں کہ وہ کیا ہیں نظیر آہ | ہر وقت میں، ہر حال میں خوش ہیں نظیر آہ

جس ڈھال میں رکھے وہ اسی ڈھال میں خوش ہیں
پورے ہیں وہی مرد جو ہر حال میں خوش ہیں[1]

مرزا نجف بیگ ساکن چونا کھیڑہ، جو حضور میاں راج شاہ سے بیعت تھے اور مولانا عبد اللہ شاہ صاحب ترجمہ نے دستار خلافت عطا فرمائی تھی... انھوں نے بیان کیا کہ ایک مرتبہ بحالت غربت تلاش روزگار میں گنج مرادآباد پہنچا اور بخدمت حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کی خدمت میں سلام کیلئے حاضر ہوا، اور کچھ اپنا حال عرض کیا۔ کچھ دیر تامل فرما کر ارشاد کیا: "مرزا جی بڑے شہر کے دیکھنے والوں میں سے ہو، جس سے میں بھی ملا ہوں، میاں راج شاہؒ فرد وقت کے صاحبزادہ ہیں، مولوی عبد اللہ شاہؒ نام ہے، مقبول الٰہی، رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم و مقبول غوث اعظمؒ ہیں... انھیں سے عرض کرو"، پھر مسکرا کر فرمایا کہ دعا کرتا ہوں اور بتاتا ہوں کہ تم کو سجادہ نے فقیر بنایا ہے، جاؤ کس خیال میں پھنسے ہو، مشیت ایزدی میں دخل نہیں، میرا سلام کہنا اور عرض کرنا کہ دعائے خیر کریں۔ چنانچہ واپس آیا اور سارا قصہ حضور میں سنایا۔ فرمایا: فقیر کو کیا چاہیئے؟ عجز ہو، بجز یاد مرشد، اور صحبت مرشد۔ سات روپے دیکر فرمایا: جا جلدی جا وقت تھوڑا ہے موضع ہرسرو میں خدا دے گا، کچھ دن موضع ہرسرو سے خبر آئی کہ ہمارے گاؤں کی مالگذاری وصول کیا کرو، خدا کا شکر اور احسان ہے کہ پیٹ بھر کر روٹی ملنے لگی۔ چند ماہ بعد انتقال ہوگیا انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یہ خبر حضور میں عرض کی فرمایا: بھائی مرزا صاحب بڑے سادہ لباس میں، سادہ چلن میں صابر و شاکر بزرگ تھے، ایک مرتبہ رات کو ان کے پاس سونے کا اتفاق ہوگیا جسم اذکار الٰہی کی آواز سے گونج رہا تھا، اور ذکر کی آواز قلب سے اس قدر تیز آرہی تھی کہ پاس والا تو عمدہ طور سے تمیز کر سکتا تھا، اور حالت

[1] لمعات راج شاہی مختصر ص ۱۹۷ - ۲۰۲

ان کی خود میں نے دیکھی ہے۔[1]

ایک صاحب مدرس اوّل مدرسہ عربیہ مانڈلے ملک برما کا خط لے کر منصورہ میں حاضر ہوا۔ اس میں تحریر تھا کہ یہاں ایک بزرگ نے میاں مولوی عبدالصمد شاہ صاحب خلف میاں راج شاہ رحمۃ اللہ علیہ کا پتہ دیا ہے کہ اس وقت کے قطب بزرگوار اور مجدد وقت ہیں سوندھ (Soondh) تحصیل نوح ضلع گوڑگانوہ ان کا مسکن ہے، یہ مسائل متعلقہ تصوف وہ سمجھا دیں گے اس خط کی عبارت بھی غیر اردو تھی۔ آپ نے فرمایا: بھائی ہندوستان میں بڑے بڑے عالم اور بزرگ ہیں ان کی خدمت میں رجوع کرو میں کیا جانوں ۔؟ عرض کیا کہ پتہ تو آپ کا بتایا گیا ہے، پھر آپ ایسا کیوں فرماتے ہیں ۔؟ کچھ دیر تامّل فرمایا، اور سب کے جواب مولوی صاحب کو لکھوا دیئے۔[2]

آپ بڑے فاضل، صاحب ورع و تقویٰ بزرگ تھے۔ آپ کی تعلیمات اور ارشادات اس بات کے شاہد عدل ہیں، اور بے تکلف محفلوں میں بزرگان دین کے ملفوظات دینی اور مذہبی نقطۂ نظر سے ان کی جو اہمیت ہے وہ تو اظہر من الشمس ہے، علمی و فکری حیثیت سے بھی یہ ملفوظات بڑے اہم ہوتے ہیں، آگے مولوی عبداللہ شاہ کی تعلیمات و ارشادات میں سے کچھ پیش کیا جا رہا ہے جو انشاء اللہ دین و دنیا کی فہم و ادراک کے ساتھ صاحب ملفوظات کی شخصیت بھی اس مختلف پہلو سے جلوہ گر ہوگی۔

ایک روز ارشاد ہوا:۔

"آج کل ساری دنیا دین دین پکار رہی ہے، اور اصل میں غور سے دیکھو تو خالص دین جس کا نام ہے اس کا کہیں پتہ نہیں، ہاں یہ ضرور ہے

[1] طت راج شاہی ص ۳۱۵ - ۳۱۶ ۔ [2] ص ۳۰۲ - ۳۰۳

کہ ہر ایک آدمی کا دل مع اس کی خواہشات کے دین نما بنا ہوا ہے، یعنی سوا ایچ پیچ لڑا کر اپنی خواہشات کے قالب میں دین کو ڈھالنا چاہتے ہیں، اور ڈھال لیتے ہیں، سو حجتیں، سو دلیلیں خود ساختہ اور دوسروں سے پوچھ پوچھ کر اکٹھی کر لیتا ہے، مدعی اور مدعا علیہ اور ان کے مابین کا جھگڑا دیکھو افسانہ کے بارے میں کیسی کیسی رنگ آمیزیاں کرتے ہیں اور اپنے اپنے مطلب کے مطابق جدا جدا جواب پیش کرتے ہیں، ورنہ سچ پوچھو تو دین تو ایک علیحدہ چیز ان سب چیزوں سے ہے، اس میں راستی ہے اور غرض کو دخل نہیں"[1]

ایک روز ارشاد ہوا:

"جب انسان درجۂ عبودیت میں پہنچتا ہے تو اس وقت جو طاعت و اطاعت اپنے مالک کی کرتا ہے وہ جنت کے لالچ یا دوزخ کے خوف سے نہیں ہوتی، بلکہ وہ محض محبت الٰہی میں اس کی رضا جوئی کا مشتاق ہوتا ہے اور کوئی فعل اس سے ایسا سرزد نہیں ہوتا جو اس کی رضا کے خلاف ہے اور یہ طاعت سب سے افضل مانی گئی ہے، یہ حالت جب پیدا ہوتی ہے جب قلب سلیم ہوتا ہے، وہ نماز جو فواحش سے روکتی ہے بندہ کو اس وقت میسر آتی ہے، اسی لئے صوفیائے کرام پہلے قلب کی حالت درست کرتے ہیں۔ اس کے سنوارنے کو خود سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ارشاد فرمایا ہے۔ صحیح بخاری شریف باب کیف کان بدء الوحی میں ہے:۔

أَلَا إنّ فی الجسد مُضْغَةً اذا صلحت خبردار ہو جاؤ کہ بدن میں ایک ٹکڑا

[1] طت راج شاہی ص ۳۰۵، ۳۰۴

صلح الجسد کله واذا فسدت فسد الجسد کله ۰ الا وھی القلب | گوشت کا ہے جب وہ سنور جاتا ہے تو تمام بدن سنور جاتا ہے اور جب وہ خراب ہو جاتا ہے تو تمام بدن خراب ہو جاتا ہے ۔ اور ۔ وہ ٹکڑا ۔ دل ہے ۔

موتڈ منڈائے کیا ہوا جو کیا گھوم گھوٹ
من وا تو موتڈا نہیں بھیک جی جس کا سگرا کھوٹ

فقراء خود جنت طلب نہیں کرتے خدا اپنے فضل سے انھیں جنت عطا کرتا ہے اور غور سے دیکھو تو اس میں بھی ایک لطیفۂ لطیف پوشیدہ ہے مانگے کی تو بھیک ہی کہلاتی ہے اور ویسے سرکاری عطا ہو تو انعام ہے ۔ اور سمجھ لو کہ بھیک اور انعام میں کونسی شے بہتر ہے اور خدا کو یہ خیال پسند معلوم ہوتا ہے ، فرمایا رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ میں نے جنت میں دیکھا تو وہاں کے لوگوں میں اکثر فقرا پائے ۔"[1]

مؤلف ملتِ راج شاہی کا بیان ہے کہ ایک دفعہ میں نے حضور میں عرض کیا کہ حضرت کچھ دنوں سے ایسا حال ہو گیا ہے کہ بہتیری اللہ اللہ کرتا ہوں کچھ دل نہیں لگتا خدا معلوم کیا بھید ہے ؟ ارشاد ہوا کہ عزیز دنیا میں ہر چیز کے آداب مقرر ہیں اگر اس کے خلاف کیا جائے تو لطف ہاتھ سے جاتا رہتا ہے اور محنت بھی ضائع ہو جاتی ہے ، کسی جگہ تو یہ ادب کی نگہداشت توازن کی صورت میں ہوتا ہے ، کہیں خاموشی کے عالم میں جلوہ گر ہے تو کہیں پر فخر گفتگو کی صورت میں زیبِ محفل ہے دیکھو گوشت کی ترکاری کیسی لذیذ چیز ہے کہ روٹی کو بھی خوش ذائقہ بنا دیتی ہے ۔ ذرا

---

[1] ملتِ راج شاہی ص ۳۰۷

گوشت کس مطلب اور کس مزے کا ؟ ایسے ہی ہر ایک مصالحہ تنہا کس کام کا ، اب اس کے آداب باورچی سے دریافت کرو تو وہ آپ کو بتائے گا کہ پاؤ بھر گوشت لو تو دو ماشہ اس میں ہلدی لو ، تولہ بھر دھنیا ، اس قدر مرچیں ، اتنا نمک ، اتنی دہی ، اتنا گرم مصالحہ اور یہ مقدار گھی کی ہے ، یوں مصالحہ پیسو ، اس طرح چڑھاؤ ، ایسے بھونو اتنا پانی ڈالو کہ گل جانے کے بعد اس قدر شوربا رہ جائے ۔ پھر دیکھو ہنڈیا کیسی لذیذ پکتی ہے ۔ اسی طرح سب چیزوں کا حال سمجھو ۔ روحی فداہ شارع علیہ السّلام نے ہر ایک معاملہ کو صاف کر کے بتا دیا ہے کہ اتنا پانی وضو کے لئے لو ، اس طرح بیٹھو ، یوں ہاتھ دھوؤ ، کپڑے پاک ہوں اور جگہ بھی ، رُو بہ قبلہ ہو کر اس طرح کھڑے ہو ، اور رکوع و سجود بجا لاؤ ۔ جب یہ سب کام سنتِ نبوی کے مطابق کرو گے تو پھر ممکن نہیں کہ اس عبادت میں لطف نہ آئے اور بھائی گڑ بڑ سڑ بڑ میں تو گڑ بڑ سڑ بڑ ہی ہوگی ۔"[1]

مولوی محمد صدیق کھٹوڑوی ، جو حاجی سید عابد حسین ، خلیفۂ حضرت فردوقت میاں راج شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے مسترشد ہیں کہتے ہیں کہ پیر مرشد حاجی سید عابد حسین دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد مجھکو یہ شوق پیدا ہوا کہ کسی پیر شریعت و طریقت سے بیعت ہو جاؤں ، ہر جگہ گھوما پھرا اور ارادۂ دلی اپنا ظاہر کیا لیکن مانع قوی پیش آئے اس حیرانی و پریشانی میں جناب حاجی عابد صاحب کو خواب میں دیکھا ، آپنے مجھے تسلّی و تشفی دی اور فرمایا : " عنقریب تیرا مطلب پورا ہو جائے گا " چنانچہ خواب میں ایک دن کسی نے آکر کہا کہ تو فلاں مولانا کو تلاش کرتا ہے وہ فلاں مکان میں موجود ہے ، یہ خاکسار تلاش کرتا ہوا جو پہنچا تو جناب حاجی عابد حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ بیٹھے

---

[1] ملتِ راج شاہی ص ۳۲۶

ہوئے ہیں۔ بیدار ہو کر دل میں کہا، اے خدا کیا ماجرا ہے، چنانچہ ایک روز صوفی محمد تسلین الدین والے میرے پاس کسی سرکاری کام کے واسطے گاؤں میں آئے، احقر نے ان سے دریافت کیا: "تمہارا سلسلۂ بیعت کہاں سے ہے؟" انھوں نے سلسلۂ راج شاہی ظاہر کیا تو دل میں ایک تازگی اور خوشی محسوس ہوئی تب میں نے ارادہ مصمم کرلیا کہ ضرور اس دربار گوہر بار میں حاضری دوں گا، مگر شوق نے ایسا غلبہ کیا کہ عرس سے پیشتر ہی صوفی صاحب موصوف نے سفر کا ارادہ کیا، سہنہ میں جاکر پہاڑ کو دیکھا خیال کیا کہ ایسی گھاٹی کبھی نہیں چڑھا۔ ؎

یہ پہاڑ اور کھنڈر ہیں راہ پل صراط
جلد طے ہوتی ہے اسکو جب ہو شفقت آپکی

قریب مغرب سوندہ پہنچا اور در دولت پر جاکر قدم بوسی جناب حضرت مجدد وقت کی حاصل کی تو ایک نور چہرۂ مبارک پر درخشاں تھا۔ ؎

مومن کامل کی پیشانی کا نور، کب چھپا رہتا ہے پیش ذی شعور

دل میں خیال پیدا ہوا کہ تو مبتلائے ہوا و ہوس اور اخلاق ذمیمہ میں غرقاب ہے۔ ؎

اے برادر چون ببینی قصر او	چونکہ در چشم دلت رست است مو
چشم دل از موئے علت پاک آر	وانگہان دیدار قصرش چشم دار
ہر کرا ہست از ہوسہا جان پاک	زود بیند حضرت ایوان پاک

بالآخر خلق محمدی سے پیش آئے۔ اس وقت اپنا راز دلی ظاہر کیا۔ حضور نے اپنی زبان گوہر فشاں سے ارشاد فرمایا کہ میں اس قابل کہاں ہوں، ہاں حاجی حامد حسین (رحمۃ اللہ علیہ) صاحب بیہں سے تعلق رکھتے تھے۔ بہت اصرار کے بعد بیعت سے مشرف فرمایا۔ ؎

خاطر ویران او آباد کرد آں دل از جا رفتہ را دلشاد کرد[1]

ایک دفعہ کسی نے سوال کیا: "حضور! غوث و قطب میں کیا فرق ہے؟"۔ ارشاد ہوا: "قطب بہت سے ہوتے ہیں اور غوث صرف ایک ہوتا ہے، اس کو خدا نے فرش سے عرش تک اختیار دیا ہے، سورج بھی بحکم خدا۔ غوث سے اجازت لے کر نکلتا ہے۔ غرض تمام امور دنیاوی وابستۂ حکم غوث منجانب اللہ ہوتے ہیں"۔

پھر پوچھا: "فرد کس کو کہتے ہیں؟" فرمایا: "فرد اس کو کہتے ہیں کہ وہ کسی کے ماتحت نہ ہو حتی کہ غوث کی ماتحتی سے بھی وہ آزاد ہوتا ہے"۔ اسی طرح ملفوظات شیخ عبدالرزاق خیا نحوی (جھنجانوی) میں لکھا ہے[2]

ایک دفعہ کسی نے سوال کیا کہ یا حضرت دنیا کی محبت قطعی دل سے جاتی رہے اور خوشی و غم ایک نظر آویں۔ فرمایا کہ بھائی دنیا کی محبت جگر میں ہوتی ہے اور خدا کی محبت دل میں، اس لئے بشریت تو جا ہی نہیں سکتی، البتہ خیال بڑھانے سے خدا کی محبت غالب آجاتی ہے، وہ کو دبالیتی ہے اور مغلوب کرلیتی ہے، انسان سب کاموں کو خدا کا سمجھ کر کرے تو وہ سب کام عبادت میں شامل ہوتے ہیں، کسی کام کو اپنا کام نہ سمجھے پیروئ شریعت کسی حال میں نہ چھوڑے۔ ؎

گر کار تو نیک است بہ تدبیر تو نیست	ور سر برود بہ تقصیر تو نیست
تسلیم و رضا پیش کن و شاد بری	چوں نیک و بد جہاں بہ تدبیر تو نیست

جب سب رشتہ و تعلق چھوڑ کر اپنے تئیں بالکل خدا کے قبضہ و اختیار میں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ خدائی امر و نواہی کا پابند۔ تو کچھ اور ہی لطف آنے لگ جاتا ہے

[1] ملت راج شاہی ص ۳۲۹
[2] 〃 〃 ص ۲۱۷

غور کرو ﴿وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا﴾ ؎

کرنال سے ایک شخص مسمی قاضی محمد عمر نامی حاضر خدمت ہو کر گویا ہوا کہ میری بیوی مرگئی ہے اور میں اس پر عاشق ہوں، میرا خیال ہے کہ وہ جادو سے ماری گئی ہے اب مجھے کسی پہلو چین نہیں، حضور یا مجھے بھی اس تک پہنچا دو یا کسی اور طرح مجھے اس سے ملا دو، بہرحال جیسے بھی ہو، اب صرف یہ تمنا ہے ع

یا جاں برسد بجاناں یا جاں زتن برآید

تا داشت دلم طاقت بودم بشکیبائی چوں کام بجاں آمد زیں پس من و رسوائی

میں نے وہ زمین میں امانت رکھی ہے، آپ نے اسے نصیحت کی کہ بھائی جس طرح بھی مری مرگئی تم صبر کرو، عرض کیا کیا کروں؟

در زاویۂ الفت دور از تو چوں مہجوراں

تنہا منم و آہے - آہ از غم تنہائی

آپ نے اسے ایک وظیفہ ارشاد فرمایا کہ مخدوم شاہ ولایت کرنال کے مزار پڑھو اور پھر آؤ۔ وہ گیا اور پڑھ کر دو تین ہفتے پھر آیا، عرض کیا: حضور کام نہ ہوا، پھر منت سماجت کی، پھر آپ نے اولاً قاضی مذکور کو بیعت کیا اور ایک شغل لفظ "اللہ" ارشاد فرمایا کہ بو علی شاہ قلندر کے مزار پر یہ عمل کرو، ہفتے کے بعد پھر آیا اور عرض کیا: حضور اول شاہ ولایت رحمۃ اللہ علیہ سامنے آئے اور یہ فرمایا: "جس کو وہ حکم دیں کر سکتا ہے اپنے وقت کے با مجاز مالک ہیں"۔ پھر حضرت بو علی قلندر علیہ الرحمۃ تشریف لائے اور یہی کہا: "جسے وہ حکم دیں کر سکتا ہے"۔ اور ایک مست حضرت شاہ ولایتؒ کے دروازے پر اور دوسرا مست حضرت قلندر کے یہاں بیٹھا ہوا تھا۔

ؔ لہ ملفوظات سراج شاہی ص ۳۱۸

انھوں نے بھی یہی کہا۔ ایک ہی جواب سب جگہ سے سنتا سنتا تھک گیا ہوں سب کا اشارہ آپ کی جانب ہے ؎

نیفتند کارسازاں را بجس درکار خود حاجت

بخاریدن نباشد احتیاجے پشت ناخن را

آپ کو خدا نے عالم مجاز کا عہدہ دیا ہے، میرا محبوب مجھ سے چھوٹ گیا ہے اس کے خلاف مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا، نصیحت بھی گوارا نہیں ؎

خیال ناز کم را نیست تاب ناخن دخلے

غنی ہرگز نباشد طاقت نشتر رگ گل را

چوٹ ایسی لگ گئی ہے جو بھولتی نہیں ہے وردِ زباں ہے ہر دم لے جان نام تیرا

دیوانہ وار نعرہ ہائے مستانہ لگاتا اور ادھر ادھر گھومتا رہتا اور یہ کہتا رہتا تھا: ؎

نہ کرتا کاش نالہ مجھکو کیا معلوم تھا ہمدم

کہ ہوگا باعث افزائش دردِ دروں یہ بھی

پھر وہ آپ کی خدمت میں آیا، آپ نے اسے روزانہ قرآن کریم کی ایک منزل تلاوت کرنے کا ارشاد کیا: ﴿وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَرَحْمَةٌ لِلْمُؤْمِنِينَ﴾ اور فرمایا کہ دن کو روزہ رکھو، پھر ایک اور شغل ارشاد کیا، وہ کرنال چلا گیا۔

تیسری مرتبہ پھر آیا اور یہ قصہ بیان کیا، میرا ایک دوست دہقانی زمیندار کا لڑکا ہے، نہ کبھی وہ سونڈھ آیا نہ حضرت کے نام سے واقف، ان دنوں میرے والد نواب گنج پورہ کے ملازم تھے ان کے پاس آنے سے میرا دوستانہ ہو گیا کاشتکار، مطلق جاہل، اس نے خواب دیکھا کہ ایک بڑا جلسہ ہو رہا ہے، ہزاروں اولیاء اللہ اس میں موجود، خواجۂ خواجگان اجمیری، بڑے پیر صاحب رحمہم اللہ اور

خود سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم رونق افروز ہیں، قاضی مذکور کا قضیہ اس میں پیش ہوا: سب بزرگوں میں چرچا ہوا کہ کون ہے؟ کچھ دیر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے پیر صاحب سے فرمایا کہ ان کو مجاز ہے کہہ دو، بڑے پیر صاحب نے فرمایا کہ تم کو حکم ملا ہے سب بزرگوں کی نظریں ان کی طرف اٹھیں، زمیندار کا لڑکا کہتا ہے کہ ان بزرگ کو میں نے دیکھا ہے آنکھ کھلی تو سارا حلیہ پیش نظر تھا دوسرے دن اس نے یہ حال مجھ سے بیان کیا اور ان بزرگ کا مفصل حلیہ بیان کیا، قاضی صاحب نے حلفیہ بیان کیا کہ یہ حلیہ حضرت مرشدی مولوی عبداللہ شاہ کا ہے۔ پھر یہ خواب آپ کے حضور میں پیش کیا گیا اور تصدیقاً وہ لڑکا بھی پیش ہوا، پھر کیا تھا، قاضی مذکور نے عرض کیا، حضور آج امانت قریب ہے اب نکالوں گا، آپ نے منع فرمایا، عشق کا بھوت سر پر سوار تھا نہ مانا تو آپ نے فرمایا: اچھا کھود لو، ... مگر تاریخ امانت نکل چکی تھی، آپ نے اسے نکاح کی فضیلت سمجھائی اور فرمایا اللہ تعالیٰ نعم البدل عطا فرمائے گا۔ إِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔ تم نکاح کا پیغام دو خدا مسبب الاسباب ہے وہی آجائے گی۔ پیغام نکاح کے بعد جھٹ پٹ ان کے باپ نے نکاح کر دیا۔ نکاح کے بعد قاضی سوندھ پہنچے اور بہت سے لوگوں کے سامنے بیان کیا کہ لو گو میری وہی سابقہ بیوی مل گئی، رفتار، گفتار، شکل وصورت بعینہٖ اس جیسی ہے، گزشتہ امور اور راز کی سب باتیں اس نے مجھے بتا دیں، وہی پیار، وہی اخلاص ہے۔ حضور نے مجھے اس قدر پریشان کر کے عنایت فرمائی۔

ایک دفعہ آپ نے خود ارشاد فرمایا کہ میاں صاحب رح کے تو سب ملنے والے بہترین آدمی تھے، میں اپنے ملنے والوں میں سے کس کو بتاؤں، میرے قاضی کو دیکھو میرے پاس تو یہ ایک صورت ہے۔ قاضی صاحب بڑے ذاکر و شاغل اور فنا فی اللہ تھے[1]

---

[1] ملت راج شاہی ص ۲۳۰ - ۲۲۷

ملا احمد خان رح اپنے پوتے مصطفیٰ کو آپکی خدمت میں ایک خط دے کر پیش کیا، اس میں لکھا تھا: غلام پیش کرتا ہوں قبول فرما کر ممنون کریں آپ نے مصطفےٰ کو مرید کر لیا اور توجہ دی وہ گھر پہنچکر بے ہوش ہوگیا اور مدہوشی کے عالم میں اکثر دریائے گنگا پر چلا جاتا اور کئی کئی دن تک نہ لوٹتا، جذب نے زور پکڑا، دو ماہ بعد ملا جی نے مصطفےٰ ایک شخص کے ہمراہ بایں گذارش آپ کی خدمت میں روانہ کیا: میں ضعیف ہوں گھر پر کوئی ہاتھ بٹانے والا نہیں کم از کم مصطفیٰ ایسا ہو جائے کہ گھر کا سودا سلف لا دیا کرے۔ آپ نے مصطفےٰ سے فرمایا: بھائی کام کاج کیا کر، کچھ دیر روبرو بٹھایا، پھر فرمایا: جا آرام کر اس دن سے ہوش میں ہے۔ مؤلف عرض کرتا ہے۔ یہ اثر قلبی حضور مرشدی رحمۃ اللہ علیہ کا تھا، انسان پر ایسے اثرات دل کی توجہ سے پڑتے ہیں۔ اللہ نے جو جو قوتیں دل میں ودیعت فرمائی ہیں اگر ان قوتوں کا اثر پیغمبروں کی جانب سے ہو تو معجزہ کہلاتا ہے اور اگر اولیاء اللہ سے ظاہر ہو تو کرامت ہے۔ عام لوگوں سے بھی ایسے اثرات ظہور میں آتے ہیں مثلاً ایک شخص حسد کرتا ہے اگر اس کی یہ طاقت قوی ہے تو وہ نظر بد کی صورت میں ظاہر ہوگی اگر کسی خوبصورت جانور پر لگی ہو تو ہلاک ہوگا، کھانے پر پڑے گی تو زہر ہو جائے گا:

العین تدخل الرجل القبر	نظر بد آدمی کو قبر میں اور اونٹ کو ریگ میں
والجمل القدر	ڈال دیتی ہے۔

اگر ایسی خاصیت والا انسان نیک سیرت، پیرو سنت، اللہ ورسول کی اوامر و نواہی کا پابند ہو تو اسے ولی کہتے ہیں، اگر برے کاموں میں رہتا ہے تو جادوگر ہے۔ بہت سے بے سمجھ لوگ کہتے ہیں کہ ہم میں اور ان میں فرق کیا ہے؟ یہ سب ڈھکوسلے ہیں، اصل میں ان کی حقیقت سے واقف نہیں ہوتے اور اپنے رتبے سے زیادہ بات کہہ گذرتے ہیں، صورت ہندسہ سے تو ناآشنا اور علم ہندسہ کو

غلط بتلاتے ہیں بَل کَذَّبُوا بِمَا لَمْ یُحِیْطُوا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا یَاْتِهِمْ تَاْوِیْلُهٗ یعنی جھٹلانے لگے ہیں جن کے سمجھنے پر قابو نہ پایا اور انہیں آئی نہیں اس کی حقیقت کیا تھی ۔ وہی ایک نگاہ تھی جس نے مصطفےٰ پر مدہوشی کا عالم طاری کر دیا تھا ۔ اور وہی وہ نگاہ تھی جس نے جذب سے پھر سلوک میں لا ڈالا[1]

ایک روز ارشاد ہوا: "بھائی اللہ جل جلالہٗ کو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا ہے اگر حضور اکرمؐ کی ذات پاک کا ظہور نہ ہوتا تو آج کون جانتا کہ خدا کون ہے، اور کیا ہے ۔ ؟

ایک حاجت مند خدمت نبوی میں حاضر ہوا اور اپنی ضرورت بیان کی آپؐ نے حکم دیا کہ عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے پاس جاؤ ۔ جب یہ شخص عثمان رضؓ کے پاس گیا تو عرض کیا کہ خدا کے واسطے کچھ دو حضرت عثمان رضؓ نے کچھ زر نقد اس کے حوالے کیا وہ لے کر واپس تاجدار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ یہ رقم میری ضروریات کے لئے ناکافی ہے ۔ فرمایا دوبارہ جاؤ اور یہ کہو کہ پہلے جو دیا وہ اللہ کے لئے تھا اب کچھ رسول کے واسطے دو ۔ چنانچہ یہ شخص واپس گیا اور فرمان نبویؐ کے مطابق عرض کیا تو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ فوراً دروازہ سے نکل آئے اور جیب سے کنجیاں نکال کر اس کے حوالے کر دیں اور کہا سب کچھ تیرا ہے، وہ اندر گیا اور تالا کھولا اور اپنی ضرورت کے مطابق لیا اور کنجیاں حضرت عثمان رضؓ کے حوالے کیں ۔ جب حضرت عثمان رضؓ غنی حضورِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوئے تو آنحضورؐ نے دریافت فرمایا کہ عثمان رضؓ! اللہ کے نام پر تو اس قدر دیا کہ اس کی ضرورت کو بھی ناکافی تھا اور میرے نام پر سب کچھ اس کے حوالے کر دیا ؟ عرض کیا: یارسول اللہ

[1] ملت راج شاہی ص ۲۳۷ ـ ۲۳۸

امی وابی فداک اللہ کو تو آپ نے بتلایا ہے ورنہ ہم کیا جانتے تھے کہ خدا کیسا ہے، حضورؐ کے نام پر تو سب کچھ نثار ہے[1]

ایک دن ارشاد ہوا کہ دنیا کے سب جھگڑے امید سے پیدا ہوتے ہیں اگر انسان ماسوا خدا کے سب سے اپنی امیدیں منقطع کر دے تو دشمنی اور دوستی کا وجود مٹ جائے گا، یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ جس کسی کا سے خلاف توقع کوئی امر ظہور پذیر ہوتا ہے تو اس کے ساتھ گلے شکوے، جھگڑا اور فساد بھی اٹھ کھڑا ہوتا ہے جب تمنا ہی مٹ گئی تو پھر رونا کیسا، جو مرنے پر کمر باندھے بیٹھا ہو اور اسی کی امید اس کے دل میں ہو اس کی ناامیدی کیا ہوگی ۔ آہ

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید ناامیدی اس کی دیکھا چاہیئے

ایک دن ارشاد فرمایا کہ وہ شہدا جنھوں نے راہِ خدا میں جانیں دی ہیں، اور وہ عشاق جو اس کی محبت میں ساری عمر خاک بسر رہے ہیں نہ تن کا ہوش، نہ جان کی پروا، لذائذ دنیوی سے محروم ہیں اور عشاق کا درجہ افضل تر ہے شہید سر جدا ہونے سے پہلے بیشتر لذائذ دنیاوی سے محروم نہ تھا، چند ساعتوں کی محبت اسے کام دے گئی، آنکھ بند کی اور بیڑے پار ۔ ساری عمر کے راگ روگ ایک آن میں رحمت الٰہی نے صفحۂ نامۂ اعمال سے محو کر دئے، اور گوناگوں اکرامِ بے پایاں سے سرفراز فرمایا اور اب اس کو دیکھئے جیتا ہے اور پھر مردہ، دیکھتا ہے اور دنیا سے اندھا، ساری عمر کرب میں گذری اور اُف نہ کی ۔

غازی برہ شہادت اندر تگ و پوست غافل کہ شہید عشق فاضل تراز واست
در روز قیامت ایں بداں کے ماند کہ ایں کشتۂ دشمن است واں کشتۂ دوست

[1] ملت راج شاہی ص ۲۴۳ ـ ۲۴۲
[2] ؍ ؍ ؍ ص ۲۵۲ ـ ۲۵۱

ایک روز ارشاد ہوا کہ مولوی محمد حیات دہلوی صاحب نسبت آدمی تھے، توکل پر گذارا کرنا چاہا، کشمیری دروازہ سے باہر ایک ویران مسجد میں جا بیٹھے، ایک دن پورا گذر گیا کچھ نہ آیا، اور ایسے ویرانے میں کہ مسجد کا صحن خس و خاشاک سے پُر تھا کوئی چیز نظر نہ آتی تھی وہاں کون آتا، غرض یہ کہ دس یوم گذر گئے کچھ نہ ملا، فقیر تھے اور فاقوں کی عادت تھی جھیل گئے، دسویں دن ایک بندر آیا اور ایک تھیلی جس میں باجرہ کے بھنے دانے تھے ڈال کر چلا گیا، تھیلی اٹھائی اور کہا انسان ہوں مولا میں کبوتر نہیں ہوں، اسی شام سے لوگوں کی آمد شروع ہو گئی اور اس قدر ہوئی کہ مسجد تو گلزار بن گئی اور بیسیوں ان کے دستر خوان پر کھانا کھاتے تھے اور کمی نہیں آتی تھی۔ آہ کریم کی عنایت و کرم بے پایاں کے قربان بعض دفعہ اللہ جل جلالہٗ اپنے بندوں کی ضد کو بھی قائم رکھ لیتا ہے، سچ ہے:
مَنْ کانَ لِلّٰہِ کانَ اللّٰہُ لَہٗ [1]

ایک دفعہ ارشاد ہوا: "شیخ عبدالقدوس گنگوہی قدس سرہٗ اپنے دروازہ کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے کہ ہندو مسافروں کا ایک گروہ ہر ہر کہتا ہوا آپ کے سامنے سے گذرا، پوچھا بھائی کہاں جا رہے ہو، کیا ہردوار۔۔۔؟ فرمایا کہ ہر کے دوار تو ہم بھی چلیں گے" یہ کہہ کر وہیں سے ساتھ ہو لئے، چند مریدین بھی ہمرکاب تھے وہاں پہنچے تو دیکھا کہ مندر میں ٹھاکر جی کی مورتی براجمان ہے، آپ کو تنہائی کا موقع مل گیا، چوزانو بیٹھے، نظر ڈالی ؎

ہو گئیں جب چار آنکھیں اس بت بے پیر سے
سب شکایتیں مٹ گئیں سارا گلہ جاتا رہا

بت بولا اور آواز آئی کہ اس سے پہلے کبھی یاروں کو اس رنگ میں دیکھا ہے، عرض کیا سجدہ کروں؟ ندا آئی: ہیں، کیا کرتا ہے! ایسا نہ کرنا مارا جائیگا

[1] ملت راج شاہی ص ۲۴۲ - ۲۴۱

چپ چاپ سجدے سے گھر آ کر دم لیا اور برسوں تحیر میں رہے، بات تو صرف اتنی ہے کہ چاہنے والا ہونا چاہیئے معشوق کی گرم بازاری تو سب جگہ ہے ؎

ہر مرغ باغ تیری تسبیح پڑھ رہا ہے
ہر برگ کی زباں سے سنتا ہوں نام تیرا [1]

فرمایا کہ توکل علی اللہ اور توکل علی الخلق میں بڑا فرق ہے، عموماً آج کل دوسرا توکل برتا جا رہا ہے، ایک شخص کچھ کام کرتا ہے نتائج خدا کے سپرد کر دیتا ہے، یہ بھی ایک توکل ہے، دوسرا شخص کمانے کے اسباب نہیں ڈھونڈتا اور ایسی جگہ اپنی نشست رکھتا ہے جہاں سے بقدر ضرورت اس کی حاجتیں پوری ہوتی رہیں۔ خلق خدا اس کے ساتھ مسلوک ہوتی ہے اور وہ دلجمعی سے یاد ہو میں مصروف رہتا ہے، تیسرا شخص کماتا ہے نہ بولتا ہے، چپ چاپ گوشہ میں صبر کئے بیٹھا ہے، لوگ ترس کھا کر اس کی ضروریات پوری کر دیتے ہیں ..... یہ سب توکل علی الخلق ہے کیونکہ یہاں بندہ کو مخلوق سے امداد پہنچنے کی امید ہے توکل علی اللہ تو اس کے برگزیدہ بندوں کا حصہ ہے، ایک مرتبہ خواجہ ابوبکر شبلی رحمۃ اللہ علیہ سفر حج کو روانہ ہوئے، مریدوں نے بھی ہمراہی کے لئے عرض کیا۔ فرمایا کہ بھائی ہمارا یہ سفر توکل پر ہے ..... پہلی منزل پر پیر نے حکم دیا کہ کسی سے کچھ نہ مانگنا، کچھ تو یہاں کم ہوئے، دوسری منزل پر ارشاد ہوا کہ بھائی کوئی دے تو مت لینا خواہ کتنی ہی خوشامد سے دیوے اس کے بعد سفر میں صرف حضرتؒ کی ایک ذات رہ گئی۔ یہ ہے توکل علی اللہ وکفیٰ باللہ وکیلا [1]

از سید محسن شاہ: ۔ ایک دفعہ حاضر ہو کر عرض کیا کہ میاں غازی الدین حیدر شاہ کے مزار پر جانا چاہتا ہوں، آپ بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ شہر بھر تمہود

[1] ملت راج شاہی ص ۲۰۵

کے باہر گگال کنڈ پر ان کا مزار ہے، فاتحہ پڑھ آؤ، چنانچہ میں بھرت پور گیا اور میاں غازی الدین حیدر شاہ (خلیفۂ میاں راج شاہؒ) کے مزار فاتحہ پڑھ کر چلا آیا۔[1]

ایک دن ارشاد ہوا کہ بھائی دنیا کی مثال سایہ کی سی ہے۔ اگر انسان اپنے سایہ کو پکڑنے کے لئے بھاگے تو سایہ آگے آگے اور آپ پیچھے اور جو انسان اپنے سایہ سے بھاگے تو آپ آگے آگے اور سایہ پیچھے پیچھے، خداطلبی میں ایک پنتھ دو کاج اللہ اور اس کا رسولؐ بھی راضی اور یہ دنیا بھی کنیزوں کی طرح پیچھے پھرتی ہے اور خدمت کرتی ہے۔[2]

یہ کتا در در پھرے اور در در در بجھے
ایک ہی در کا ہو رہے تو در در کرے نکوی

ایک شخص ضلع بلند شہر سے آئے ان کو اللہ اللہ کرنے کا بہت شوق تھا حضور میں عرض کیا ؎

چلتے چلتے جگ گیو اور بھیک دواے دور
خرچی نبڑی پگ تھکے جا کوی کہے حضور

ارشاد فرمایا: ؎

لوگ کہیں رب دور ہے اب برے کے ماتھ
آنکھیں ٹٹی کرٹ کی یا بدھ دیکھے ناتھ

خدا تو بندہ سے شہ رگ سے بھی زیادہ نزدیک ہے ونحن اقرب الیہ من حبل الورید کوئی ڈھونڈے تو پائے ومن دق باب الکریم انفتح۔ عرض کیا

---

[1] بلت راج شاہی ص ۲۰۰
[2] 〃 〃 〃 ص ۲۰۶

کوئی بتانے والا بھی تو نظر نہیں آتا غرضکہ باتوں باتوں میں وہ ظرف نبات بذلی اولی تو بیعت کیا اور فرمایا: ؎

محنت کرے پا دورے بن محنت نہیں پان
بن محنت رجھے نہیں گرو دھنی بھگوان

اور ایک چلا کھوڑ بسی کے تجرنوں میں گرایا پھر ایک نگاہ کیمیا اثر ڈالی اور مس خام کو کندن بنا دیا۔ اور فرمایا ؎

بھیکم دوارا دور ہے ڈھونڈ ہی سو پیش
بن ڈھونڈے پارے نہیں بھیک تی پیارے پی کو دیس

سینہ سے لگایا، اشغال تعلیم فرمائے اور رخصت کیا۔ اللہ اللہ

مرشد میرا سور ماکرے شبد کی چوٹ مارے گولا پریم کا ڈھے بھرم کا کوٹ

واقعی صحیح ہے ؎

مرشد ایسا کیجئے جو صقل گرستا ہوئے
جنم جنم کے مورچے پل میں دیوے کھوئے[1]

ایک دن ارشاد ہوا کہ ترک چار قسم کے ہوتے ہیں:۔ ترکِ دنیا، ترکِ دین، ترکِ وجود، ترکِ ترک۔ ترک دنیا اور ترک دین تو کچھ آسان نظر آتے ہیں، اور ترکِ وجود اس سے مشکل اور ترکِ ترک سب سے مشکل ہے وہ۔

وفات: یہ بلبل باغ ولایت گلستان ارشاد و معرفت میں چہکتا رہا اور سترہ ذی الحجہ ۱۳۴۰ھ مطابق ۲۱ رجولائی ۱۹۲۱ء کو اللہ کو پیارا ہو گیا، اور اپنے والد بزرگوار کے گنبد کے اندر ان کے پائتیں میں دفن ہوا۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ رحمۃ الابرار۔

---

[1] بلت راج شاہی ص ۲۰۳

آپ کے اپنے براہ راست بھی کچھ خلیفہ تھے اور کچھ ایسے حضرات ہیں جن کی تکمیل مدارج تو میاں راج شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے عہد میں ہی ہو گئی مگر حضرت میاں صاحبؒ انھیں دستار خلافت نہ دے سکے ۔ اور کچھ ایسے حضرات ہیں جو مرید تو حضرت میاں صاحب کے ہیں مگر ان کی تربیت بھی آپ نے فرمائی ۔ اور آپ نے انھیں اجازت بھی مرحمت فرمائی ۔ آگے ان تمام حضرات کی فہرست دی جا رہی ہے جو آپ کے براہ راست خلفاء ہیں اور وہ جن کی آپ نے تکمیل فرمائی ہے ۔

فہرست خلفاء حضرت مجدد وقت جنکو اجازت اجراء سلسلہ دی گئی

(۱) حضرت میاں جی محمد عمر شاہ ، عرف میاں جی امراؤ ، صاحبزادہ و سجادہ نشین سوندھ
(۲) مولوی عبدالکریم صاحبؒ کرنال
(۳) قاضی سید ولی محمد صاحب ہاپوڑی ضلع کرنال ۔
(۴) لاڈ خاں میوؒ سکنہ نئی ضلع گوڑ گانوہ آپکے حقیقی پوتے مولوی حافظ عبدالرحیم ہیں ۔
(۵) پھول خانؒ میو سکنہ دُدُوَہ ، راولی ۔ ضلع گوڑ گانوہ
(۶) قاضی محمد عمر صاحب پشاوریؒ
(۷) صاحبزادہ صفی اللہ خاں صاحبؒ رئیس ٹونک

وہ مجازین مجدد وقت جو حضرت میاں راج شاہ کے مرید تھے ، تکمیل مدارج مولانا نے کرائی اور دستار خلافت و اجازت اجراء سلسلہ عنایت فرمائی

(۱) لفٹیننٹ رسالدار میجر بہادر نواب سید محسن شاہ صاحبؒ رئیس قصبہ سردھنہ ، ضلع میرٹھ ۔

(۲) سید سبز علی شاہؒ سکنہ قصبہ سردھنہ ضلع میرٹھ ۔
(۳) احمد خانؒ سکنہ بسی ضلع بلند شہر
(۴) صوفی مخدوم بخش حجامؒ سکنہ الدھن ضلع میرٹھ
(۵) امیر احمد خاں میو سکنہ دودہ ضلع گوڑ گانوہ

وہ خلفاء و مجازین جو حضرت میاں صاحب کے مریدین میں سے تھے اور تربیت بھی تقریباً مکمل تھی ، مگر دستار خلافت حضرت مولانا عبداللہ شاہ نے عنایت فرمائی

(۱) حافظ و قاری عبدالرحمٰنؒ میو سکنہ مسیت ، ضلع گوڑ گانوہ
(۲) ولایت میو سکنہ نئی ضلع گوڑ گانوہ
(۳) مرزا نجف بیگؒ سکنہ چوما کھیڑہ ، ضلع گوڑ گانوہ
(۴) مولوی عبدالرحمٰنؒ سکنہ میرٹھ شہر ، محلہ شاہ پیر گیٹ
(۵) حافظ سکندر علی صاحبؒ سکنہ ہاپوڑ
(۶) میر عاشق الٰہی سکنہ گلاؤٹھی ضلع بلند شہر
(۷) حاجی سید احمد حسین سکنہ گلاؤٹھی ضلع بلند شہر[1]

---

[1] طلعت راج شاہی ص ۳۴۵ - ۳۴۴

میاںؒ غازی الدین شاہ عیدؒ سہنہ

خلیفۂ مجاز۔ میاں راج شاہ قدس سرہٗ

یہ بزرگ اپنے وقت میں بڑے پایہ کے بزرگ تھے، درویش تھے اور درجہ فنا فی الشیخ کا رکھتے تھے۔ اور حضرت میاں صاحب فرد وقت کے نہایت چہیتے مریدوں میں سے تھے، حالت جذب و سلوک ملی ہوئی تھی، نہایت پابند شریعت اور متبع سنت تھے۔ حضور رحمۃ اللہ سے بیعت ہونے کے بعد آپ کا یہ دستور تھا کہ سہنہ سے عشاء کے بعد چلتے، پہاڑی راستہ، گھنا جنگل اور درندوں کا خوف کسی کی پروا نہ کرتے، سونہ عدرات کو پہنچتے اور میاں صاحب کے حجرہ کے سامنے صبح تک کھڑے رہتے اور ذکر و اشغال میاں صاحبؒ کے بغور سنتے۔ جب حضرت میاں صاحب نماز تہجد کے لئے باہر تشریف لاتے جمال پُر نور کی زیارت کرکے اسی وقت سہنہ کو واپس چلے جاتے۔ عرصہ تک یہ حالت رہی۔ آخر تابہ کے، دریائے محبت میں جوش آیا اور ایک دفعہ میاں صاحب رحمۃ اللہ چپکے چپکے دبے پاؤں تشریف لائے اور بے اختیار چمٹ گئے، پیار کیا، چھاتی سے لگایا، سینۂ بے کینہ کو نور سے بھر دیا۔[1]

آپ قصبہ سہنہ کے باشندے تھے۔ جو دہلی الور روڈ پر دلی سے ۴۴ میل پر واقع ہے، مگر تبلیغی و اصلاحی امور کی انجام دہی کی خاطر آپ نے شہر بھرتپور میں قیام فرمایا اور وہیں جان شیریں جان آفریں کے سپرد کی، راجہ بھرتپور آپکا معتقد تھا اسنے آپکا مزار بھرتپور شہر سے باہر گلال کنڈ پر بنوایا جو زیارتگاہ خاص و عام بنا ہوا ہے۔ رحمۃ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

---

[1] ملت راج شاہی ص ۱۷۰

میاں غازی الدین خاں قصبہ سہنہ ضلع گوڑگانوہ کے پٹھان تھے، فوج میں صوبیدار تھے، میاں راج شاہؒ سے بیعت ہو گئے اور عرض کیا: کچھ کرامات دیدو۔ میاں صاحب نے فرمایا کرامات کے طالب ہو یا ہمارے؟ خاں صاحب خاموش ہوکر چلے گئے۔ کچھ عرصہ کے بعد پھر حاضر ہوئے اور عرض کیا: ابھی کچھ کرامات حاصل نہیں ہوئیں۔ میاں صاحبؒ نے فرمایا: کسی سے کرامات چھیننا چاہتے ہو، زبردستی؟ پٹھان تو تھے ہی بھڑک گئے اور غصہ میں کہا: اگر تمہارے پاس کرامات ہیں تو مجھے ضرور دوگے، اور میں تو زبردستی لے کر جاؤں گا۔ آپ نے بڑی نرمی سے فرمایا: خانصاحب آپ کی مطلوبہ شے ضرور آپ کو ملے گی مگر زبردستی اور ہیکڑی سے نہیں بلکہ عاجزی و فروتنی اور نیاز مندی و خاکساری سے۔ پہلے غرور خواجگی دماغ سے نکال دو تب کچھ ہوگا خانصاحب نے غضبناک ہوکر کہا: کرامات لیں گے اور ڈنڈے کے زور سے لیں گے، یہ کہکر اپنے گھر آئے اور اپنی پٹھان برادری کو جمع کیا اور ان کے سامنے یہ منصوبہ رکھا کہ میاں راج شاہ پہاڑ میں چلہ کر رہے ہیں انہیں قتل کرنا ہے۔ پٹھانوں نے کہا: غازی الدین خاں میاں راج شاہ قطب عالم ہیں، ان کا قتل کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے ——— انھوں نے کہا: ان سے ضرور انتقام لینا ہے، مجھے کرامات نہیں دی اور خود چلہ کرکے کرامات حاصل کرنا چاہتے ہیں ——— (خان تھے اکڑ گئے ورنہ چلہ کرکے خود بھی تو حاصل کر سکتے تھے) ——— برادری میں با اثر تھے اور اپنے منصوبے کی تکمیل پر مصر تھے، سہنہ کے تمام پٹھانوں نے پہاڑ میں میاں راج شاہؒ کے ٹھکانے پر چڑھائی کر دی۔ وہاں جب پہنچے تو عجیب ماجرا دیکھا۔ میاں راج شاہ کی شکل کے ہزاروں آدمی گھوڑوں پر سوار اور تلوار سونتے (سنبھالے) ہوئے ہیں۔ پٹھان بولے: بتاؤ اب کیا کریں۔ ہم پہلے ہی کہہ رہے تھے کہ میاں راج شاہؒ بزرگ آدمی ہیں ان سے ٹکراؤ ٹھیک نہیں،

اس قدر مسلح افراد سے لڑنا اب ہمارے بس کا نہیں ۔ یہ کہہ کر سب پٹھان واپس ہوگئے ۔ غازی الدین خاں نے بھی محسوس کر لیا کہ معاملہ اس قدر سہل نہیں جب تمام پٹھان واپس ہو گئے تو غازی الدین اکیلا وہاں گیا جہاں میاں راج شاہ چِلّہ کر رہے تھے ۔ دیکھا کہ میاں راج شاہؒ تنہا تشریف فرما ہیں اور ذکر الٰہی میں مصروف ہیں ۔ خاں صاحب کی آتش انتقام ابھی ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی لکڑیاں اکٹھا کیں اور میاں صاحبؒ کے چاروں طرف ڈال کر مٹی کا تیل چھڑکا اور آگ لگا دی ۔ ۲-۵ دن بعد خیال آیا کہ چلو دیکھ آؤں جلے کہ نہیں جا کر دیکھا کہ چاروں طرف جنگل کی آگ پھیلی ہوئی ہے اور میاں صاحبؒ درمیان میں صحیح و سالم یاد الٰہی میں مشغول و منہمک ہیں ۔

غازی الدین کو دیکھکر آپ نے فرمایا: میرے پاس آجاؤ ۔ عرض کیا: حضور کس طرح آؤں گا آگ میں جل جاؤں گا: آپ نے فرمایا: نہیں جلو گے ۔ چنانچہ خانصاحبؒ اپنی دہکائی ہوئی آگ میں سے نکلکر میاں صاحبؒ کے نزدیک پہنچ گئے ۔ آگ میں چلتے وقت محسوس ہوا کہ پیر آگ پر نہیں پھولوں پر پڑ رہے ہیں، میاں صاحب کے پاس بیٹھ کر جنت کا سا مشاہدہ ہوا ۔ چاروں طرف گویا آگ نہیں بلکہ پھول بکھرے ہوئے ہیں ۔ یہ منظر دیکھ کر کیفیت طاری ہو گئی ۔ پھر میاں صاحبؒ نے فرمایا: ۔ غازی الدین کہیں خدا کے دوستوں کو آگ جلا سکتی ہے ؟ اس کے بعد غازی الدین شاہ پر بارہ سال تک استغراق کی کیفیت طاری رہی، پورا دن اسی حال میں گذرتا اور رات میں سونڈہ (Soonda) حاضر ہو جاتے، بارش، گرمی، سردی، کے ہر موسم میں رات کو سہنہ سے سونڈہ پہنچکر میاں صاحبؒ کا دیدار چھپ کر کرتے اور رات ہی میں سہنہ ۔۔ اپنے گھر ۔ لوٹ آتے، ایک مرتبہ آپ کی صاحبزادی نے کہا: بھائی غازی الدین آپ کو آتے ہوئے بارہ سال ہو گئے بابا سے کچھ عرض کرو ۔ یہ سنکر رو پڑے، عرض کیا: بو بو جی میں قصوروار ہوں بابا سے غلطی معاف

کرا دو ۔ صاحبزادی صاحبہ نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا: حضور غازی الدین کو آتے ہوئے بارہ سال ہو گئے، بارش آندھی، گرمی سردی کچھ ہو ضرور آتا ہے، اس کا قصور معاف کر دو ۔ فرمایا: بیٹی بلالے ۔ صاحبزادی نے خانصاحب کو اندر بلا لیا جہاں میاں صاحبؒ تشریف فرما تھے ۔ غازی الدین نے آپ کے قدموں میں گر کر عرض کیا: حضور خطا کار ہوں اور معافی کا خواستگار ہوں ۔ آپ نے اٹھا کر سینہ سے لگا لیا اور فرمایا: اب آپ خاں صاحب نہیں شاہ صاحب ہو گئے بھرتپور چلے جاؤ راجہ کے ملازم ہو جاؤ ۔ راجہ خود ہی تمہارا ملازم بن جائے گا ۔ آپ راجہ بھرتپور کی فوج میں ملازم ہو گئے، راجہ کے کوئی فرزند نہیں تھا، آپ نے دعا کی لڑکا پیدا ہوا، کچھ لوگ کہتے ہیں کہ آپ نے راجہ کو مخفی طور پر مسلمان کر لیا تھا، قرآن کریم بھی پڑھا دیا اور کلمہ کا ذکر و ورد بھی بتلا دیا ۔ بھرتپور کی جامع مسجد کے لئے راجہ نے زمین بھی آپ کی تحریک ہی پر دی ۔ اس کی تعمیر بھی راجہ نے کرنی چاہی مگر مسلمانوں نے مسجد اپنے پیسوں سے بنائی ۔ آپ بھرتپور میں بڑی شان سے رہے اور بھرتپور اور اس کے ارد گرد شہروں اور دیہات میں فیض رسانی کی ۔ آپ کا مزار قلعہ بھرتپور سے ۱ ہرپشتہ کے نزدیک ہے جسے راجہ نے خود تعمیر کرایا ۔ آج کل بھرتپور کی مسلم آبادی بہت تھوڑی ہے، یہاں کے حقیقی باشندے ۱۹۴۷ء میں ترک وطن کر کے پاکستان چلے گئے ۔ آپ میاں راج شاہ قدس سرہٗ کے خلیفۂ اول تھے ۔

منشی میر محمد تقی، سکنہ تھانہ بھون

خلیفہ و مجاز میاں راج شاہ قدس سرہٗ

اولاً آپ ملازم محکمہ بندوبست تھے، میاں راج شاہؒ سے بیعت کی، اور عرض کیا کہ صرف اللہ اللہ چاہتا ہوں، اس بیعت سے کوئی دنیوی مطلب درمیان میں نہیں، ایک روز حجرہ میں بلا اطلاع چلے گئے، اور دولت باطنی سے مالا مال ہو کر نکلے عمر بہت کم پائی۔

مؤلف کا بیان ہے کہ میں نے اپنے والد مرحوم حافظ مولوی حکیم زین الدین رحمۃ اللہ سے سنا ہے کہ میر صاحب محمد تقی گھنٹہ ٹن والی مسجد میں جو گوڑگانوہ چھاؤنی میں پکی سرائے کے سامنے بنی ہوئی ہے، بعد نماز تہجد اللہ اللہ کیا کرتے تھے، اتفاقاً کسی گھریلو ضرورت کے لئے آپ کو کچھ روپیہ کی ضرورت پڑی، قرض لینے کی عادت نہ تھی اس لئے قرض نہ لیا، مانگنے کو برا سمجھتے تھے اس لئے نہ کسی سے مانگا۔ باقی اور ذریعوں سے جو ملتا تھا اس سے بخوف خدا دست کش تھے، کام سر پر آ گیا اور پیسہ پاس نہیں، گھر سے آدمی چلکر گوڑگانوہ آ پہنچا، ماجرا بیان کیا۔ فرمایا دیکھو اللہ کہاں سے دیتا ہے، اس سے دوسرے دن مصلے کے برابر بعد نماز صبح جو دیکھتے ہیں تو دو صد روپیہ ایک رومال میں بندھے دھرے ہیں، آپ نے اٹھائے اور گنے اور عام لوگوں سے پوچھا کیا زمانہ تھا، سب انکار کر گئے کہ ہمارے نہیں۔ مجبور ہو کر وہ پوٹلی لئے سوندھ پہنچے حضرتؒ سے عرض کیا۔ آپ نے فرمایا کہ تجھے ضرورت تھی لے اور خرچ کر۔ فرمایا شریعت اجازت نہیں دیتی۔ سینہ سے لگایا سر و آنکھ مرید کی چومی اور فرمایا کہ ہم کو خبر ہے تم اس کو خرچ میں لاؤ اجازت ہے، اس درگاہ سے ملے ہیں جس نے سب کو دیا[1]

---

[1] ملت راج شاہی۔ ص ۱۲۷

حضرت مولانا سید محمد اشتیاق علی

المعروف بہ

حافظ سید محمد عابد علی شاہ رحمۃ اللہ قادری الوری

مونگس کا۔الور شہر

۱۲۹۸ھ ——— ۱۳۲۶ھ

آپ اصل میں مرادآباد یوپی کے باشندے تھے مگر اپنے محترم شیخ پیر احمد شاہؒ رامپوری کے حکم سے راجستھان کے الور شہر میں تشریف فرما ہوئے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔

خاندان | آپ شاہ شرف الدین شاہ ولایت امروہیؒ کے خاندان سے ہیں۔ شاہ ولایت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے خلیفہ ہیں۔ امروہہ میں آپ کا آستانہ مرجع خلائق ہے۔

شاہ ولایتؒ بڑے اونچے بزرگ ہوئے ہیں اور اپنے پیر کے یہاں محترم و مکرم؛ چنانچہ جب آپ ہندوستان آنے لگے تو اپنے پیر کی خدمت میں حاضری کی اجازت طلب کی تو خواجہ سہروردیؒ نے شیخ سعدیؒ مصنف گلستاں اور بوستاں کے ذریعہ کہلا بھیجا کہ شرف الدین سے کہدے: میرے پاس آنے کی تکلیف نہ اٹھائے بلکہ بالا بالا ہندوستان چلے جائیں، شیخ سعدیؒ نے عرض کیا:

"حضور وہ تو محبت و عقیدے سے حاضر خدمت ہونا چاہتے ہیں اور آپ ان کو منع فرما رہے ہیں"؟

اس پر شیخؒ نے جواب میں فرمایا: "وہ ایسے شخص ہیں کہ ابھیں ان کا استقبال کرنا پڑے گا"۔

۲۹ رمضان المبارک ۱۲۹۰ھ مطابق ۱۸۰۰ء میں پیدا ہوئے ؎

خوشی ان کو ہوتی نہ کیوں سربسر
"گل باغ مادر" ہے سال پسر

لکھنے پڑھنے کا شوق آپ کو بچپن سے تھا، دوسرے بچوں کو جب درس جاتے دیکھتے تو اپنی والدہ صاحبہ سے کہتے: "ہمیں بھی پڑھایئے" جب آپ کی عمر چار سال چار ماہ کی ہوئی تو آپ کو انور شاہ کی شاگردی میں دیدیا گیا اور دینی خدمت کے جذبے سے اولاً قرآن کریم حفظ کرانے کی درخواست دی ۔ آپ نے محنت، شوق و لگن سے قرآن کریم حفظ کرنا شروع کیا اور کم عمری ہی میں تجوید و قرأت کے ساتھ آپ نے حفظ قرآن کریم مکمل کرلیا ۔ پھر اپنی والدہ ماجدہ کی اجازت سے مدرسہ شاہی مسجد مرادآباد میں داخلہ لیا ۔ اور محنت و جد و جہد، اساتذہ کی شفقت اور ان کی توجہ کی بدولت جلد ہی آپ علوم شرعیہ و فنون ادبیہ سے فارغ ہو گئے ۔

سکون و اطمینان جو علوم شریعت سے میسر ہوتا ہے اسے آپ تلاش کرنے لگے ۔ حصول علم اطمینان کی خاطر تھا، عرفان الٰہی کے لئے تھا ۔ اور مدرسہ کے ماحول میں "یہ اچھا ہے، یہ برا ہے" کے علاوہ کچھ اور نہیں ملتا ؎

تو گرفتار "یجوز" و "لا یجوز"
دید حق را کے شناسد اے عجوز
تو چہ دانی سِرِّ حق اے غافلی
تو گرفتار ابوبکرؓ و علیؓ

علم دین کے حصول میں عرصہ گزرا ۔ مسائل دین کی تعمیل میں ممکنہ کوشش سے دریغ نہیں کرتا ۔ مگر عرفان الٰہی کی ابھی کوئی پرچھائیں بھی میسر نہ ہوئی ۔ بہرحال آپ کچھ پریشان سے رہنے لگے اور فکر ہوئی عرفان الٰہی و آگہی کے حصول کی ۔ آخر رات میں اللہ کر اللہ اللہ کا ورد کرنے لگے اور اس مقصد کی خاطر کھانا بھی چھوڑ دیا کہ کہیں نیند مخل نہ ہو اور میں کام نہ کر سکوں ۔ پھر آپ حضرت احمد شاہ رامپوری سے بیعت ہوئے ۔ یہ ۱۳۱۲ھ کا قصہ ہے ۔ اس وقت آپ کی عمر ۲۱ سال تھی، پھر

آپ نے اپنے پیر صاحب کے حسب ہدایت ریاضت و مجاہدہ میں وقت لگایا، اور اتنی محنت کی کہ اپنے مرشد کے دل میں ممتاز مقام حاصل کرلیا ۔

حتیٰ کہ آپ کے مرشد نے فرمایا:

"حافظ عابد علی شاہ نے ہمارا علم تمام و کمال لے لیا اور اس کو خوب روشن کیا"۔

ان کے انتقال کے بعد فرمایا:

"ہم کو عابد علی شاہ لے گئے"، "ہم نے عابد علی شاہ کو کندن بنا دیا ہے"۔ اور بعد وصال ہم کو اگر کوئی تلاش کرے تو ہم انور میں ملیں گے"۔

عام اخلاق

نہایت صاف ستھرا لباس زیب تن فرماتے تھے، شیر خوارگی کے زمانے سے ہی نفاست اور پاکیزگی پسند تھی، گندی جگہ بیٹھنا یا کھیلنا ہرگز گوارا نہ تھا ۔ فضول کاموں سے ہمیشہ دور رہے، شرم و حیا کے پتلے اور بزرگوں کے قدر شناس تھے، بڑی سلجھی ہوئی طبیعت کے مالک لڑائی جھگڑوں سے ہمیشہ بچے رہتے، مزاج میں بے حد رواداری تھی، دنیا اور دولت دنیا کی محبت کو کبھی دل میں جگہ نہ دی ۔ خلوت پسند، کم گو ہمیشہ اپنے خیالات میں منہمک رہتے تھے فرماتے تھے: "تنہائی اور کم گوئی بہت عمدہ چیز ہے"۔

علماء و مشائخ سے ملاقات کرنے تشریف لے جاتے اور ان کی خدمت میں بیٹھ کر استفادہ فرماتے، اہل علم سے علمی مسائل میں گفتگو فرماتے اور مشائخ سے سلوک و طریقت کے سلسلہ میں مذاکرہ فرماتے ۔

ایک سادھو سے ملاقات

آپ کی چنبیلی باغ والی رہائش سے قریب ہی پرتاب بند پر ایک سادھو رہتا تھا جو اچھا گیانی اور موحد تھا اس کے پاس امیر غریب سب ہی جاتے مگر وہ کسی سے یہ نہ کہتا تھا کہ یہاں بیٹھ جا

جانے والے خود ہی جہاں چاہتے بیٹھ جاتے آپ فرماتے ہیں :

"ایک روز ہم بھی اسس طرف گئے ہم جس وقت سادھو کی قیام گاہ پر پہنچے پہنچے تو وہ اپنے مکان کی چھت پر بیٹھا ہوا تھا وہ ہمیں دیکھ کر نیچے اتر آیا، اور ایک مونڈھا اٹھاکر لایا اور ایک جگہ رکھ کر ہم سے کہا بیٹھ جائیے، میں بیٹھ گیا، وہ پھر ایک کتاب نکال کر لایا اور مجھے دیکر کہا "اسے پڑھیئے" میں نے کہا کتابیں تو ہم نے بہت دیکھیں ۔ دل کی کتاب دکھاؤ، اس وقت وہ آنکھوں میں آنسو بھر لایا اور ہماری طرف ہاتھ کرکے کہا کیا پوچھتے ہو، اور یہ کہکر مٹھی بند کی اور کھول دی ۔ میں نے کہا کیا اچھا مختصر اور جامع جواب دیا ہے ۔ اسس وقت بعض احباب کو میرے اس جواب سے قدرے حیرت ہوئی اسس لئے میں نے انھیں سمجھایا کہ میں نے سادھو سے کہا تھا کہ تم نے اپنی حقیقت کو نہیں پہچانا تو اسس نے جواب دیا کہ بیشک ہم غفلت میں تھے اور اپنی حقیقت نہیں معلوم تھی تو یہ سمجھے ہوئے تھے کہ ہم بھی کچھ ہیں اور جب اپنی حقیقت کھلی تو معلوم ہوا کہ ہم کچھ بھی نہیں ہے ہمارا وجود خیال تھا جیسے مٹھی جب تک بند ہوتی ہے تو امید ہوتی ہے کہ اسس میں کچھ ہوگا لیکن جب مٹھی کھل جاتی ہے تو بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ اسس میں کچھ نہیں تھا خالی تھی ۔ اسس کے بعد ایک مثال دیکر بات اور صاف کی کہ ایک بیل پیاسا تھا، اتفاق سے اس کی نظر سراب پر پڑی وہ سمجھا کہ پانی ہے دوڑ کر اسس کی طرف گیا جب قریب جاکر دیکھا تو پانی نہیں تھا، جسے وہ پانی سمجھا وہ سراب تھا، مایوس ہوکر واپس آیا اور دور آکر دیکھا تو پھر جو پانی معلوم ہوا دوڑ کر پھر اس کی طرف گیا مگر پہنچنے پر اسے وہی سراب ملا، غرض تین دفعہ اسس بیل نے یہ

چکر لگائے مگر جب پانی نہ ملا تو چوتھی دفعہ اسس طرف نہ گیا اور سمجھ لیا کہ یہ پانی نہیں کچھ اور ہے ؎

ہستیم جملہ خیالیست بے مثال سراب
بایقیں من نیسم و وہم و گماں باقی ست"[1]

جب آپ کے شیخ نے آپ کو ہر طرح صیقل و مصفی کردیا اور ہر کسوٹی پر پرکھا دیکھا آزمایا بحمداللہ آپ ہر طرح پورے اترے تو حکم فرمایا کہ : "عابد علی کچھ دین کی خدمت کرو"۔ آپ نے نیازمندانہ طریقہ پر عرض کیا : "جو حکم عالی ہو بسر و چشم منظور"، تو شیخ نے حکم دیا کہ لو یہ پیسے اور جنوب کی طرف جاؤ جہاں یہ پیسے ختم ہوجائیں وہیں رخت اقامت ڈال دینا ۔

حسب ارشاد شیخ آپ نے دہلی سے اجمیر جانے والی گاڑی پکڑی اور چل دیئے الور کے اسٹیشن پر آپ کے شیخ کے دیئے ہوئے پیسے ختم ہوگئے اور آپ الور میں اقامت گزیں ہوگئے ۔ الور کی جامع مسجد میں قیام کیا ۔ اتفاق سے وہ جمعہ کا دن اور رمضان المبارک ۱۳۴۳ھ کی دو تاریخ تھی، دوسرے دن قاضی فیاض الدین سے آپ کی ملاقات ہوئی ۔

قاضی صاحب قصبہ منڈاور ضلع الور کے رہنے والے تھے اور قاضی عبدالرحیم صاحب کے بھائی اور مولانا بہارالدین صاحب نقشبندی امروہوی کے مرید تھے ۔ اور فقیر دوست انسان تھے ۔ تعارف کے بعد آپ نے ان سے دریافت کیا کہ یہاں ہمارے قیام کے لئے کوئی مناسب جگہ پسند کرو ۔ انھوں نے جنبیلی باغ کو پسند کیا جو شہر کے مالاکھیڑہ دروازہ کے باہر جنوب مغرب میں دامن کوہ سے متصل واقع ہے ۔ اسس کے نزدیک ہی رسول شاہی بزرگوں کے مزارات ہیں

[1] جستہ جستہ از تجلیات مرشد، ص ۹۲

بہرحال آپنے وہاں سکونت اختیار کرلی ۔ قاضی فیاض الدین صاحب کو معلوم ہوگیا کہ آپ حافظ بھی ہیں، اس نے درخواست پیش کی: "حضرت اس رمضان میں آپ ہمیں تراویح میں قرآن کریم سنا دیجئے گا، ہم کو بھی قرآن کریم سننے کا موقع مل جائے گا۔" آپنے ان کی اس خواہش کی قدر کی اور یہ درخواست قبول فرمائی ۔ اور ۱۳۲۲ھ کا رمضان آپ نے قصبہ منڈاور میں گذارا ۔ وہاں کے لوگ آپ کے عقیدت مند ہوگئے اور آپسے فیض حاصل کرنا شروع کیا اور آپ نے بھی تعمیل ارشاد شیخ میں فیض رسانی سے دریغ نہ کیا ۔ منڈاور کے اکثر افراد آپ سے بیعت ہوگئے ۔ عید کی نماز پڑھ کر پھر اور کو واپسی ہوگئی ۔ اب اور لوگوں کو بھی کچھ کچھ آپ کا پتہ لگا اور جوق در جوق آپ کی زیارت اور آپ کی زبان فیض ترجمان سے انمول نصائح، دلگیر مواعظ اور بھلی باتیں سننے کیلئے آنے لگے، آپ نے بھی وعظ و تذکیر تعلیم و تلقین اور پند و نصائح کے ذریعہ اپنا فیض عام فرمادیا ۔ ۱۳۲۲ھ سے ۱۳۲۶ھ تک مسلسل وعظ و تبلیغ فرماتے رہے، سلوک و طریقت کے سجادہ کو بھی سنبھالا اور وعظ و نصیحت کے منبر کو بھی ۔ اور شہر، اس کے قصبات اور متفرق گاؤں میں جاجا کر اصلاح و تبلیغ کی قندیل روشن کی ۱۳۲۳ھ میں شیخ کے حکم سے آپ اپنے چھوٹے بھائی حافظ سید واحد علی شاہ کو بھی اپنے ہمراہ الور لے آئے [1]

راج گڑھ، قصبہ تجارہ وغیرہ کا آپنے بارہا سفر کیا، چنانچہ ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۹۰۵ء کو آپ نے سفر تجارہ فرمایا اور غازی غضنفر شاہ عرف غازی گدن کے مزار میں قیام کیا جو تجارہ کے مغرب میں واقع ہے ۔ اہل قصبہ کو جب معلوم ہوا کہ قصبہ سے باہر کوئی بزرگ قیام پذیر ہیں تو وہ آپ سے ملنے آئے ۔ اور آپ کو قصبہ میں لیجانے پر

---

[1] مؤلف سوانح ۔

اصرار کیا ۔ سچی طلب سے کسی کو انکار نہیں دل کے تقاضوں کو جو دل کی گہرائیوں سے اٹھتے ہوں، ٹھکرانا کم از کم اہل دل کے تو بس کا نہیں چنانچہ آپ قصبہ میں تشریف لے آئے اور حکیم سید کرم حسین[1] صاحب کے یہاں قیام فرمایا حکیم صاحب دیکھتے ہی آپکے گرویدہ ہوگئے اور

---

[1] حکیم سید کرم حسین صاحب تجارہ میں ماضی قریب کی ایک اہم شخصیت تھے، عالم، حکیم، ادیب اور شاعر ۔ اہل علم کے قدرداں سخن فہم و سخن سنج تھے قصبہ ساکرس ضلع گوڑگانوہ کے قاضی تھے آپ سید شمس الدین کی اولاد میں ہیں جو بعہد التمش گردیز سے ہندوستان آئے ان کے ایک بھائی سید شہاب الدین تھے وہ کڑہ مانک پور یوپی میں جا بسے اللہ تعالیٰ نے ہر جہت سے خوب نوازا مطب شاندار چلانے پر چلایا اور قصبہ تجارہ میں ایک مدرسہ بنوایا جس کے لئے مہاراجہ جے سنگھ حاکم الور نے ڈیڑھ ہزار کی گرانٹ دی ۔ ہر طبقہ میں آپ مقبول تھے وہ اہل علم ہوں یا دولت مند عوام ہوں یا خواص ۔ بہت سی کتابوں کے مصنف، طبی، دینی اور عام اسلامی معلومات سے متعلق ۔

۱۹۲۵ء میں ایک طبی ماہنامہ جاری کیا "مسیحائے زماں" نثر میں سلاست پسند قلم میں جدت نگار ۔ آپکے دو لڑکے ہوئے دونوں حکیم اور ماشاء اللہ اپنے باپ کے ۔ طبی حد تک صحیح جانشین ۔ حکیم سید عتیق القادر، حکیم سید فضل الرحمٰن ہنگامہ ۱۹۴۷ء میں قصبہ تجارہ کی تمام آبادی نقل مکانی پر مجبور ہوئی تو حکیم سید کرم حسین صاحب مع اہل و عیال بھوپال تشریف لے گئے اور بھوپال ہی میں بعمر اکیاسی سال وفات پائی پسماندگان میں دو صاحبزادے موصوف الصدر اور ایک پوتا چھوڑا رحمہ اللہ رحمۃ الابرار پوتے کا نام سید ظل الرحمٰن ہے جو حکیم سید فضل الرحمٰن کے فرزند ارجمند ہیں اجمل خاں طبیہ کالج میں ریڈر ہیں اور بہت ہونہار ۔ بڑے اچھے حقیقت پسند و نکتہ سنج بالغ نظر مصنف و مدبر و تجربہ کار حکیم ہیں اللہ تعالیٰ ان کی عمر دراز فرمائیں اور ملک و ملت کو انکے فیوض سے مستفیض ۔۔۔

مزید تفصیل کیلئے دیکھئے "حیات کرم حسین" مؤلفہ سید ظل الرحمٰن صفحہ ۸۴ ۔

آخر کار سلسلہ میں داخل ہوگئے اور برابر اس خانقاہ سے متعلق رہے بلکہ یہاں تک آپکی وابستگی بڑھی کہ اپنے دونوں صاحبزادوں کو مؤلف سوانح کی تربیت میں دیدیا جو صاحبِ سوانح کے چھوٹے بھائی اور ان کے جانشین ہیں ۔

الور میں کچھ عرصہ گذارنے کے بعد شیخ سے درخواست کی کہ یہاں کے لوگ ہم سے فائدہ نہیں اٹھا رہے ہیں کسی دوسری جگہ منتقل ہونے کی اجازت مرحمت فرمادیں ۔ شیخ نے فرمایا : "الور ہی میں رہو اپنا کام کئے جاؤ اور نتیجہ خدا کے اوپر چھوڑ دو"۔ پھر آپ نے الور سے باہر جانے کا کبھی ارادہ بھی نہ فرمایا اور آخر دم تک اہل الور اور پھر اہلِ میوات کو صلاح و فلاح کی طرف متوجہ کرتے رہے ، البتہ وفات سے کچھ پیشتر شہر الور سے الگ کوئی جگہ لینی چاہی کہ اس پر با اختیار اپنا قبضہ رہے ، اس حلقہ کے پٹواری اور گرداور آپ کے معتقد تھے انھوں نے پورا جغرافیہ آپ کے سامنے رکھ دیا اور آپ کے دیئے ہوئے اختیار پسندیدگی کے پیش نظر موضع مونگس کا متصل ریلوے اسٹیشن الور ایک قطعہ اراضی لے لیا گیا اور اس پر آپ کے برادر حقیقی اور جانشین حافظ واحد علی شاہ نے چار دیواری اور کچھ خس پوش چھپر ڈلوائے ۔

زندگی میں آپ اس گاؤں میں رونق افروز نہ ہوسکے البتہ وصال کے بعد آپ کو اس نئی جگہ مونگس کام میں دفن کیا گیا ، جس کی مختصر سی روداد یہ ہے کہ جب مکان وغیرہ تیار ہوگئے تو آپ سے عرض کیا گیا "حضور مکان تیار ہیں تشریف لے چلئے"۔ آپ نے فرمایا ، "آج نہیں کل چلنا ہے"۔

دوسرے دن حسبِ معمول صبح ہوئی ، دوپہر ہوئی اور تقریباً ۲ بجے دن ۲۹ رمضان ۱۳۳۶ھ آپ نے جان جان آفریں کے سپرد کی اس وقت آپ پاس انفاس میں مشغول تھے انا للہ وانا الیہ راجعون ۔

آپ کی عمر صرف ۴۰ سال ہوئی ، مگر اس چھوٹی سی عمر میں اللہ تعالیٰ نے آپ سے بہت کام لیا اور ایک خانقاہ مستقل وجود میں آگئی جس نے ۱۳۶۰ھ/۱۹۴۲ء تک اہلِ میوات خصوصاً الور کے ماحول میں علم دین کی شمع روشن رکھی ۔

آپ کی وفات کے بعد آپ کے چھوٹے بھائی آپ کے چھوٹے بھائی آپ کے جانشین ہوئے اور اس اصلاحی قندیل کے نگراں اور محافظ کرامات اور خرق عادات احوال کے متعلق آپ کا خیال تھا کہ "یہ کوئی بزرگی کی نشانی نہیں ، اصل بزرگی اتباع سنت میں ہے اگر یہ چیز میسر ہے تو سب کچھ ، ورنہ اس کے بغیر ڈھکوسلا ہے"۔

ایک دفعہ آپ کے مرید خاص فیض اللہ صاحب نے دیکھا کہ آپ پلنگ پر تشریف فرما ہیں اور آپ کے اعضاء علیحدہ علیحدہ ہوگئے وہ یہ دیکھ کر بے حد پریشان ہوئے اور آپ سے تنہائی میں اس کے متعلق پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ یہ محض تمہارا وہم ہے ۔ یہ علامات بزرگی کے نہیں ، اگر یہ بات ہوتی تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ، خلفاء راشدین ، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے ساتھ یہ سوانح پیش آتے مگر ان میں سے کسی کے ساتھ بھی ایسا واقعہ نہیں اور نہ غوث اعظم کے سوانح میں کوئی ایسا واقعہ ہم کو ملا نہ سلطان الہند خواجہ اجمیری اور قطب صاحب کے حالات میں کسی ایسے سانحے کا ذکر ہے ، اگر یہ واقعی کوئی بزرگی کی بات ہوتی تو ضرور ان پاکیزہ حضرات کی زندگی میں کبھی نہ کبھی اس کا ظہور ہوتا — یہ محض دیکھنے والوں کا وہم ہے ۔

الور کے مجاذب

آپ کے عہد میں شہر الور اور اس کے مضافات میں کچھ صاحب خدمت مجذوب تھے ۔ وہ اکثر آپکے یہاں حاضری دیتے ۔ ایک اسمٰعیل مجذوب راج گڑھ کے باشندے تھے دوسرے میاں فرید شاہ الور میں رہتے تھے ۔

خواجہ ولی محمد قدس سرہ۔ سانٹھاواڑی

آپ قطب عالم میاں راج شاہؒ کے نواسے ہیں، آپ کی والدۂ محترمہ کا نام نواز بی تھا جو میاں صاحبؒ کی منجھلی اور حقیقی صاحبزادی تھیں، اپنے والد بزرگوار کے رنگ میں رنگی ہوئی سالک مجذوب تھیں۔

حافظ محمد ابراہیم — میاں راج شاہؒ کے آخری خلیفہ — محمد اسمٰعیل شاہ فرید نگری کے حوالہ سے بیان کرتے تھے کہ خواجہ ولی محمد قدس سرہ کی والدۂ ماجدہ اپنے والد محترم کی نگرانی میں چلہ فرما رہی تھیں کیا دیکھتی ہیں کہ آسمان سے ایک تخت اترا جس پر سرور کائنات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم رونق افروز ہیں، چاروں کونوں پر خلفاء راشدین صدیق اکبرؓ، فاروق اعظمؓ، عثمان غنیؓ، علی حیدرؓ کرم اللہ وجہہ تشریف فرما ہیں، اور سرکار دوعالمؐ کے زانوئے اقدس پر حسنینؓ بیٹھے ہوئے ہیں۔ آسمان سے پے درپے سات چاند سرکار دوعالم کی گود میں نازل ہوئے آپ نے پہلا چاند صدیق اکبرؓ کے ذریعہ میری گود میں دے کر فرمایا: بیٹی نگل جا میں نگل گئی، دوسرا چاند فاروق اعظمؓ کے ذریعہ مرحمت فرمایا میں اس کو بھی نگل گئی تیسرا چاند عثمان غنیؓ کے ذریعہ عنایت فرمایا، میں اس کو بھی نگل گئی، چوتھا چاند علی حیدرؓ کے ذریعہ بخشا میں اس کو بھی نگل گئی، پانچواں چاند حسنؓ کے ذریعہ، چھٹا چاند حسینؓ کے ذریعہ اور ساتواں چاند اپنے دست مبارک سے مرحمت فرمایا میں انھیں بھی نگل گئی، پھر وہ تخت اڑنا شروع ہوا میں عقیدت و محبت کے جذبہ سے پائے تخت کے ساتھ لپٹ گئی، اتفاق کہ پایہ میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا، میں بے ہوش

ہوگئی، ہوش آنے پر اپنے والد محترم کی خدمت میں حاضر ہوکر تفصیل سے پورا واقعہ سنایا۔ میاں صاحب نے فرمایا: بیٹی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں ولی دینے آئے تھے، وہ سات چاند سات ولایتیں ہیں، تیرا جو بیٹا ہوگا وہ سات ولایت کا مالک ہوگا۔ جب وہ پیدا ہو تو اس کا نام ولی محمد رکھنا۔ چنانچہ آپ کا نام ولی محمد رکھا گیا۔ آپ جب چلنے پھرنے کے قابل ہوتے تو آپ عجیب طرح سے گم ہوجاتے بچوں کے ساتھ کھیل رہے ہیں اور کھیلتے کھیلتے غائب مگر آپ کی والدہ آنکھوں والی تھیں پریشان نہیں ہوتی تھیں۔ میاں راج شاہؒ سے نواسے کا جب یہ حال بیان کیا گیا تو آپ نے فرمایا: بیٹی تیرا بیٹا مادرزاد ولی ہے۔ بلند مقام کا آدمی ہے بڑی دلچسپ اور اہم کارگذاری ہوتی ہیں اس کی۔ والدہ ماجدہ آپ کی مجذوب سالک تھیں، کبھی جب جذب ہوتا تو پہاڑوں میں چلی جاتیں، آپ کو بھی ہمراہ لیجاتیں۔ جنگلی جانوروں سے فرماتیں: میرا لالہ (بچہ) سو رہا ہے اس کی دیکھ بھال رکھنا چنانچہ شیر چیتا وغیرہ جیسے موذی درندے آپ کی نگرانی کرتے جب والدہ محترمہ واپس آجاتیں تو شیر وغیرہ سے فرماتیں: اب تم جاؤ میں آگئی ہوں درندے آپکے پیروں پر عقیدت سے سر رکھتے اور چلے جاتے۔ جب آپ آٹھ سال کے ہوئے تو آپ کے نانا جان میاں راج شاہ قدس سرہ نے آپ کو اپنے مرید و خلیفہ مولانا عبدالرحمٰن شاہ کے پاس پڑھنے کے واسطے میرٹھ بھیجدیا۔ مولانا عبدالرحمٰن شاہ میرٹھی نے آپ کو عقیدت و محبت سے پڑھایا۔ رات کو اپنے پاس لے کر سوتے تھے ایک مرتبہ رات میں مولانا عبدالرحمٰنؒ کی آنکھ کھلی، دیکھا کہ ولی محمد غائب ہے، دروازہ کی زنجیر بدستور لگی ہوئی۔ پریشان ہوگئے، تھوڑی دیر بعد پھر جو دیکھا تو ولی محمدؒ موجود تھے۔ دریافت فرمایا: صاحبزادے کہاں چلے گئے تھے اور اس طرح کہ زنجیر لگی ہوئی ہے، آپ خاموش رہے۔ زیادہ اصرار پر فرمایا: ماموں جی ایک جگہ آگ لگ رہی

تھی جیسے سات ولی بجھا رہے تھے مگر بجھ نہیں رہی تھی ، مجھے حکم ہوا : قم باذن اللہ میں اٹھ بیٹھا اور وہاں پہنچا - الحمد للہ آگ تو بجھا دی مگر آگ کی لپٹیں میری کمر کو چھو گئیں مولانا عبد الرحمٰنؒ نے اپنے مرشد محترم میاں راج شاہؒ کو خط کے ذریعہ یہ ساری تفصیل سنائی میاں صاحب قدس سرہ نے جواب میں تحریر فرمایا : مولانا انکو تو یہ کام کرنے ہیں تم اس کی فکر مت کرو - اور اپنا کام کئے جاؤ یعنی اس کی تعلیم جاری رکھو - مولانا عبد الرحمٰنؒ شاہ کے علاوہ اور کس سے پڑھا ؟ یہ معلوم نہ ہو سکا - ممکن ہے ساری تعلیم مولانا ہی سے حاصل کی ہو - بہر حال تعلیم پوری فرما کر وطن واپس لوٹے - اپنے گاؤں میں اپنے محلہ کی شاندار اور حسین و جمیل مسجد تعمیر کرائی - اور اس کی دیکھ ریکھ کے مصارف کے لئے دو بیگہ پختہ زمین خرید کر وقف کی - اور ناواقف لوگوں کو دین کی ضروری باتیں بتلائیں ، قرآن کریم کی تعلیم سے بہرہ مند کیا اور واقف کاروں کو خدا شناس بنایا - انھیں منازل سلوک طے کرائی اور معرفت وایقان کا رمز شناس بنایا - آپ کے تربیت یافتہ میوات کے ہونہار فرزند چودھری محمد لیسین خاںؒ م ۱۹۷۱ء نے جب نوح میں ہائی اسکول کھولا تو آپ نے اسمیں ایک کمرہ عربی فارسی و دینی کلاسوں کے لئے اپنے پیسہ سے تعمیر کرایا اور عربی و فارسی طلبہ کے لئے ایک خاص وظیفہ جاری کیا[1] -

آپ کے دینی مزاج ، احتیاط و تقویٰ ، دینداری و پرہیزگاری اور آپکے معاملات کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے آپ کا ایک وصیت نامہ ہے جو سرکاری کاغذات میں محفوظ ہے - اس میں آپ ایک فقیہ ، عیالدار صوفی اور صحیح مسلمان کے پیکر میں نظر آتے ہیں - آپ کی برکت سے چودھری محمد لیسین خاں نے بڑا عروج

---

[1] روایت چودھری محمد لیسین خاں مرحوم

پایا وہ اپنے وقت میں میوات کے اکیلے قائد و رہنما تھے اور شاید پہلے گریجویٹ پنجاب اسمبلی کے پوری عمر تقریباً ممبر رہے ، سنجیدہ ، متین ، قومی وقار و عظمت کے علمبردار اور قوم کے مخلص رہنما تھے - ایک دفعہ کہنے لگے : مولوی صاحب بھو پا جی مرحوم (خواجہ ولی محمدؒ) فرمایا کرتے تھے : دین کی خدمت جتنی دار العلوم دیوبند نے کی اس قدر یہاں کوئی اور ادارہ نہ کر سکا -

چودھری محمد لیسین خاں نے اولاً ملازمت گورنمنٹ اختیار کی مگر آپ نے اسے پسند نہ فرمایا اور ان کے لئے گوڑ گانوہ میں ایک بہت بڑی حویلی بنوائی جس میں دفتر بھی ہے ، مہمان خانہ بھی اور کچھ دکانیں بھی - تقریباً ۶۵ - ۷۰ سال کی عمر ہو گی کہ اچانک آپ پر فالج گرا - علاج و معالجہ کی خاطر گوڑ گانوہ لیجایا گیا مگر آرام نہ ہوا اور ۱۷ رجب ۱۳۹۱ھ کو گوڑ گانوہ چھاونی میں وصال ہوا اور اپنے گاؤں سانتھاواڑی میں دفن ہوئے -

خواجہ چھوٹے شاہ کابلی مقیم ڈھلاوٹ

آپ کابل کے باشندے تھے ، پیر و مرشد کی تلاش میں ہندوستان آئے جس بزرگ سے بھی ملاقات کی وہ آپ کی توجہ برداشت نہ کر سکا - جس پر بھی آپ کی نظر پڑ گئی پسینہ پسینہ ہو گیا ، آپ تقریباً مرشد کامل سے مایوس ہو کر جب ممبئی پہنچے تو وہاں ایک بزرگ سے آپ کی ملاقات ہوئی : ہاتھ ملایا تو اس بزرگ نے فرمایا : سوندھ کو چھوڑ کر جا رہے ہو شاہ جی ! میاں راج شاہؒ سوندھوی کے پاس کیوں نہیں پہنچے ؟ آپ نے کہا وہ ان پڑھ ہیں ان سے بیعت ہونا درست نہیں اور بھی بڑے بڑے بزرگوں سے ملا ہوں ، مگر جو میری توجہ برداشت نہیں کر سکے

ان سے مجھے کیا فائدہ ہوگا ؟ اس بزرگ نے فرمایا: سوندھ جاکر دیکھو بے پڑھے کو بھی آزما کر دیکھ لے آخر دیکھنے میں کیا حرج ہے ؟ یہ فرما کر نظروں سے اوجھل ہوگئے شاہ جی خود فرماتے ہیں کہ میں حیرت میں پڑ گیا، بہرحال ان کی ہدایت پر سوندھ حاضر ہوا کیا دیکھتا ہوں کہ وہی بزرگ جو بمبئی میں ملے تھے چارپائی پر رونق افروز ہیں۔ میں نے توجہ ڈالی، کچھ اثر نہ ہوا میں سمجھ گیا کہ حضرت نے خود ہی مجھے دعوت دی ہے۔ آپ مسکرائے اور فرمایا: "شاہ جی ہم تو بے پڑھے ہیں۔ اور آپ پر توجہ ڈالی فوراً آپ میاں راج شاہؒ کے پیروں میں گر گئے بہت دیر میں ہوش آیا۔ بعد میں حضرت میاں صاحبؒ نے فرمایا: "شاہ جی جب اونٹ پہاڑ کے نیچے آتا ہے تب اسے معلوم ہوجاتا ہے کہ مجھ سے بھی کوئی اور اونچا ہے"، شاہ جی نے پھر قدم چومے اور عرض کیا: "حضور غلامی میں قبول فرمائیں"۔ میاں صاحبؒ نے بیعت فرمایا چھ مہینے اپنی خدمت میں رکھ کر فرمایا: "شاہ جی! اب تم بھی کسی کو اللہ کا نام بتادیا کرو۔ گویا خلافت و بیعت سے بہرہ ور فرمایا۔ اور اب دھلاوٹ (Dhulawat) میں قیام کرو جو سوندھ کے قریب ہی کوہ اردلی کے مغربی دامن میں واقع ہے۔

دھلاوٹ کے باشندے اولاً آپ سے ویسے ہی پیش آئے جیسے عموماً عوام ہوتے ہیں مگر میاں صاحبؒ کی دعا اور توجہ کی برکت سے وہ لوگ آپ کے خادم اور معتقد بن گئے۔ میاں راج شاہ نے جس وقت آپ سے فرمایا: شاہ جی تم بھی کسی کو اللہ کا نام بتادیا کرو۔ تو آپ کو خیال آیا کہ نہ تو آپ نے خلافت نامہ لکھکر دیا نہ دستار بندی فرمائی۔ اگر کسی اہل سلسلہ نے معلوم کرلیا کہ کس کے خلیفہ ہو ؟ تو میں کیا جواب دوں گا ؟ آپ مہرولی میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکی قدس سرہ کے مزار پر حاضر ہوئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ مزار کھلا اور قطب صاحبؒ اندر سے تشریف لائے، ہاتھ میں دستار۔ شاہ جی کے سر سے لپیٹ کر

فرمایا: "شاہ جی اب تو کہیں شرمندگی نہ ہوگی"۔ یہ فرما کر خواجہ صاحب غائب ہوگئے اور مزار صحیح سالم ہوگیا۔

سوندھ جب حاضر ہوئے تو میاں راج شاہؒ نے فرمایا: شاہ جی! تو قطب صاحب کی بارگاہ سے دستار خلافت حاصل کرلی۔ اب بھی اپنے پیر ہونے میں شبہ ہے۔ اب کہیں شرمندگی نہ ہونے کی ہے۔

جس وقت شاہ جی کابل سے آئے تھے سیر بھر آٹے کی روٹیاں کھاجایا کرتے تھے، میاں صاحب سے مل کر خوراک اس قدر کم ہوگئی کہ آدھی ٹکیہ چار یوم میں کھایا کرتے تھے اور فرماتے تھے: "بابا راج شاہ نے یہ خوراک چھوڑی ہے"[1]۔

آپ کا اہم کارنامہ یوپی کے مغربی اضلاع خصوصاً افغانوں کی بستیوں میں نکاح بیوگان کا رواج دینا ہے[2]۔ ہندوؤں کی طرح مسلمانوں میں بھی بیوہ کا نکاح معیوب تھا خاص طور پر شیخ زادوں میں تو اس سے قیامت صغریٰ برپا ہوجاتی تھی۔

---

[1] روایت حافظ علیم اللہ خاں قادری۔ فرید نگری۔ محلہ اسلام آباد۔ میرٹھ۔
[2] تذکرۃ العابدین بضمن ذکر میاں راج شاہؒ۔

حافظ سید محمد ابراہیم شاہ قادری رح

سراوہ ضلع میرٹھ

آپ بقول بعض تذکرہ نگاروں کے میاں راج شاہ قدس سرہ کے آخری اور کم عمر خلیفہ تھے۱؎۔ آپ کی پیدائش سے پہلے سراوہ میں ایک بزرگ بابا بیلہ رام رہتے تھے، وہ ایک دفعہ میاں راج شاہ کی بارگاہ میں جا پہنچے، اور عرض کیا: "حضور جتنی دنیا کی محبت ہے اتنی مالک کی ہو جائے، اور جس قدر مالک کا دھیان ہے اتنا دنیا کا رہ جائے، میاں صاحبؒ نے یہ سنکر بیلہ رام کو سینہ سے لگایا اور فرمایا: "اچھا بھائی خدا ایسا ہی کرے، اور انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔"

اسی بیلہ رام سے ایک دفعہ کسی نے پوچھا: "آپ ہندو ہیں یا مسلمان؟" کہنے لگا:

نہ شر قیم نہ غربیم نہ گبرم نہ مسلمانم بجز یاہو و یامن ہو دگر چیزے نمیدانم

سید نیاز علی کے کوئی فرزند نہ تھا، بابا بیلہ رام سے درخواستِ دعا کی، بابا نے کہا: نیاز علی ہم نے مالک سے فرزند تو مانگ لیا ہے مگر اپنا جیسا مانگا ہے جن کا میں چیلہ ہوں انھیں کا یہ چیلہ ہوگا اور تمہارے لئے یادگار ہوگا۔

۱۲۸۰ھ میں آپ کی پیدائش ہوئی، بڑے لاڈ پیار سے اکلوتی اولاد کو ماں باپ نے پالا پوسا، جب بارہ سال کی عمر ہوئی تو حضرت میاں صاحبؒ سے بیعت ہوئے، ۲۲ر شعبان ۱۳۰۰ھ جب آپ میاں راج شاہ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے تو میاں صاحب نے دیکھتے ہی فرمایا: آ، ابراہیم آجا، بڑی دیر سے تیرا انتظار تھا اور فوراً کھڑے ہو کر سینہ سے لگالیا، اور نور باطن سے مالا مال

۱؎ راج شاہی کرن ص ۳

کردیا اور چاروں خانوادوں میں اجازتِ بیعت مرحمت فرمادی - پھر حافظ صاحب نے میاں صاحب کے جانشینوں اور خلفاء و مجازین سے بھی آپ کی رحلت ۱۳۰۶ھ کے بعد برابر استفادہ کیا - چنانچہ مولانا عبداللہ صاحب خلف الرشید حضرت میاں صاحبؒ خواجہ ولی محمدؒ نبیرہ حضرت میاں صاحبؒ، مولانا عبدالرحمٰن میرٹھی، مولوی عبدالرحیم میرٹھی قدس اللہ اسرارہم کی خدمات عالیہ میں اکثر حاضر ہوتے اور ان کی صحبت کیمیا اثر سے مستفید ہوتے - مرشد کی محبت آپ کے رگ و پے میں سرایت کی ہوئی تھی آپ کے ملفوظات عموماً دہراتے اور مزے لے لے کر بیان کرتے: ارشاد مرشد ہے، اسی سلسلہ میں ایک دفعہ فرمایا کہ حضرت کا ارشاد ہے کہ: دس چیزیں دس چیزوں کو کھاجاتی ہیں، توبہ گناہوں کو کھاجاتی ہے، جھوٹ رزق کو چٹ کرجاتا ہے، غیبت عمل کو ملیامیٹ کردیتی ہے، غم عمر کو کوتاہ کردیتا ہے، صدقہ بلا کو دفع کردیتا ہے، غصہ عقل کو کھاجاتا ہے، نیکی بدی کو کھاجاتی ہے، پشیمانی سے سخاوت ختم ہوجاتی ہے، تکبر علم کو کھاجاتا ہے ظلم عدل کو کھالیتا ہے۔

خواجہ ولی محمد قدس سرہ نے آپ کو مخدوم الاولیاء کا خطاب مرحمت فرمایا۔ قصبہ سراوہ اور اس کے اطراف میں عرصہ تک راجشاہی مشن کو زندہ و پائندہ رکھا، ہزاروں لوگ آپ سے مستفید ہوئے، سیکڑوں کو واصل باللہ کیا۱؎۔

پیدائش بروز جمعہ ۱۲۸۰ھ وفات ۲۱ر محرم الحرام ۱۳۷۰ھ

۱؎ ماخوذ از راج شاہی کرن از علیم اللہ خاں قادری (مخطوطہ)

میاں عبداللہ شاہ عرف بدھا شاہ صاحبؒ

آپ کی جائے پیدائش قصبہ فیروز پور جھرکہ ضلع گوڑگانوہ ہے۔ بعد میں آپ نے مانڈی کھیڑہ میں قیام فرمایا، اور وہیں اپنے خلیفہ پیر جی اسمٰعیل کے یہاں وصال ہوا آپ کا قوم رانا سے تعلق تھا اور مجدد وقت مولوی عبداللہ شاہ سوندھوی سے بیعت تھے بیعت کے بعد آپ پندرہ سال موضع کربیڑہ میں رہے۔ پھر مانڈی کھیڑہ میں پیر جی اسماعیل شاہ کے دولت کدہ پر قیام رہا۔ اور پندرہ سال اپنے فیوض و برکات سے لوگوں کو فائدہ پہنچا کر اپنے رب سے جا ملے اور پیر جی محمد اسمٰعیل شاہ کو اپنا جانشین بنا گئے — ۲۴ رجب ۱۳۵۲ھ میں وفات۔ مزار مانڈی کھیڑہ آبادی کے شمال مغرب میں ہے۔ رحمہ اللہ[1]

پیر جی محمد اسمٰعیل شاہؒ

آپ قوم سے خانزادے ہیں۔ پیدائش مانڈی کھیڑہ میں ہوئی۔ آپ کے والد کا نام آلہب نمبردار تھا۔ بچپن سے فقیر منش تھے۔ اولاً آپ میاں میر احمد جھم والے سے بیعت ہوئے، پھر آپ نے میاں بدھا شاہؒ کے ہاتھ میں ہاتھ دیا۔ جنھوں نے پندرہ سال تک آپ کے گھر رہ کر آپ کو مدارج سلوک طے کرائے ہر طرح سے تربیت دے کر آپ کو خرقۂ خلافت سے سرفراز فرمایا۔
آپ زہد و ورع میں بے مثل اور عبادت و تقویٰ میں کامل تھے۔

---

[1] ملت یامین شاہی ص ۱۲۸

اکل حلال کے لئے اپنے ہاتھ سے کاشت کرتے تھے۔ آپ کے در سے کوئی خالی نہیں گیا۔ بھوکوں کو کھانا کھلانا، ننگوں کو کپڑا پہنانا آپ کا خاص شغل تھا[1]۔
مانڈی کھیڑہ میں ہی اپنے فیوض و برکات سے خلق خدا سیراب فرما رہے تھے کہ ۱۹۴۷ء کا حادثہ رونما ہوا اور آپ متعلقین سمیت پاکستان تشریف لے گئے۔

محمد یامین شاہ عرف بنگالی شاہ

— آپ کی پیدائش ماہ بھادوں ۱۳۴۴ھ میں موضع پھلا باس تحصیل تجارہ ضلع الور راجستھان میں ہوئی، آپ کے والد کا نام نبی خاں تھا۔ بچپن ہی سے کھیل کود میں کوئی دلچسپی نہ تھی، اور فقیروں سے محبت کرتے تھے، ایک مرتبہ میاں عبداللہ شاہ عرف بدھا شاہ آپ کے گاؤں موضع پھلا باس میں تشریف فرما ہوئے۔ آپ ابھی بچہ تھے، میاں صاحب نے آپ کو شفقت آمیز نظروں سے دیکھا اور جذب کے انداز میں فرمایا: "جا بیٹا! خدا تجھے کامل فقیر بنائے گا"۔
ایک مرتبہ ایک نجومی پنڈت جو تجارہ میں تحصیلدار تھا موضع پھلا باس گیا، آپ کو دیکھا تو ٹھہر گیا اور دیر تک آپ کو غور سے دیکھتا رہا، پھر کہا "یہ بچہ کسی دن بزرگ بنے گا"۔
جب آپ کی عمر گیارہ سال کی ہوئی تو آپ پیر جی اسمٰعیل شاہ سے بیعت ہوئے اور اپنے ناز و نعم میں پروردہ جسم کو ریاضت و مجاہدہ کی بھٹی میں جھونک دیا، دنیا ترک کر کے جنگل کی راہ لی، آپ اکثر فیروز پور جھرکہ کے پہاڑوں

---

[1] ملت یامین شاہی ص ۱۲۸

میں رہتے، نا ہر گھول میں، جو اس پہاڑ میں مشہور جگہ ہے آپ نے ایک کڑا مجاہدہ
کیا، کئی کئی روز تک کچھ نہ کھاتے، جب بھوک زیادہ تنگ کرتی تو درختوں کے
عموماً سور وال کے پتوں سے افطار کرتے، مجاہدات کے دوران اپنے مرشد سے
مل لیتے۔ اٹھارہ سال کی جب عمر ہوئی اور ریاضتوں کا دور ختم ہوا تو آپ کے
مرشد نے آپ کو خلافت سے سرفراز فرمایا۔ خلیق و منکسر المزاج، فقر پسند تھے
اہل علم سے محبت، مریدوں پر شفقت اور عام خلق خدا سے رواداری کا معاملہ
فرماتے تھے[1]

سنہ ۱۹۴۷ء میں پاکستان ہجرت کی۔ معلوم نہیں کہاں اقامت گزین ہیں

[1] ملت یامین شاہی ص ۱۳۰

فہرست خلفاء

جو بیعت میاں راج شاہؒ سے تھے لیکن خلافت شاہ عبد اللہؒ سے پائی

خلیفۂ اول۔ لیفٹیننٹ رسالدار میجر بہادر نواب سید محسن شاہ، قصبہ سردھنہ ضلع میرٹھ۔
خلیفۂ دوم۔ سید سبز علی صاحبؒ ——— 〃
خلیفۂ سوم۔ احمد خان صاحبؒ ——— لسی، ضلع بلند شہر
خلیفۂ چہارم۔ صوفی مخدوم شاہ حجام ——— الدھن، ضلع میرٹھ۔
خلیفۂ پنجم۔ امیر الدین احمد میو سکنہ ددوہ، تحصیل فیروز پور جھرکہ ضلع گوڑگانوہ۔

فہرست خلفاء

جو مرید میاں راج شاہؒ کے تھے مگر مدارج سلوک شاہ عبد اللہؒ نے طے کرائے اور خلافت سے نوازا

خلیفۂ اول۔ حافظ قاری عبد الرحمٰنؒ ——— سکنہ مسیت ضلع گوڑگانوہ
خلیفۂ دوم۔ ولایت خاں میو ——— موضع سی ضلع گوڑگانوہ
خلیفۂ سوم۔ مرزا نجف بیگؒ ——— چوما کھیڑہ 〃 〃
خلیفۂ چہارم۔ مولوی عبد الرحمٰن، محلہ شاہ پیر گیٹ ——— میرٹھ، ضلع میرٹھ۔
خلیفۂ پنجم۔ حافظ سکندر ——— ہاپوڑ، ضلع غازی آباد۔
خلیفۂ ششم۔ میر عاشق علی ——— گلاوٹھی، ضلع بلند شہر۔
خلیفۂ ہفتم۔ حاجی احمد حسین ——— 〃 〃 〃

[1] ملت یامین شاہی ص ۱۳۵-۱۳۷

فہرست خلفاء مولانا شاہ عبداللہ

خلیفۂ اوّل - محمد عمر شاہؒ، سجادہ نشین، سوندھ ضلع گوڑگانوہ
خلیفۂ دوم - مولوی عبدالکریمؒ ——— کرنال
خلیفۂ سوم - سید قاضی ولی محمدؒ ——— باپڑی ضلع کرنال
خلیفۂ چہارم - لاڈ خاں میوؒ ——— موضع نئی ضلع گوڑگانوہ
خلیفۂ پنجم - حضرت پھول خاںؒ میو ——— دوڈہ " "
خلیفۂ ششم - قاضی محمد عمرؒ ——— پشاور
خلیفۂ ہفتم - صاحبزادہ صفی اللہ خاںؒ ——— رئیس ٹونک
خلیفۂ ہشتم - حضرت عبداللہ عرف بدھا شاہؒ ——— فیروزپوری ثم مانڈی کھیڑہ

فہرست خلفاء حضرت عبداللہ ثانی عرف بدھا شاہؒ

قطب الاقطاب

خلیفۂ اوّل - پیر جی محمد اسمٰعیل شاہؒ ——— مانڈی کھیڑہ ضلع گوڑگانوہ

فہرست خلفاء پیر جی محمد اسمٰعیل شاہؒ

خلیفۂ اوّل - رسولا میو ——— نونکی، ضلع گوڑگانوہ
خلیفۂ دوم - قاضی بنیاد علیؒ ——— { ڈوٹانہ چاونڈی تحصیل تجارہ ضلع الور۔
خلیفۂ سوم - شیخ نصر اللہؒ ——— قصبہ نگینہ، ضلع گوڑگانوہ
خلیفۂ چہارم - نظر کردہ ساقی کوثر حضرت محمد یامین شاہ عرف بنگالی شاہ پھلا باس تجارہ۔

فہرست خلفاء حضرت محمد یامین شاہ عرف بنگالی شاہؒ

خلیفۂ اوّل - محمد مرید شاہؒ ——— موضع نگلی تحصیل تجارہ ضلع الور
خلیفۂ دوم - محمد مراد شاہ میواتیؒ ——— موضع مانچہ " " " "
خلیفۂ سوم - پیرزادہ ولی محمد میواتی ——— موضع بیڑہ " " "
خلیفۂ چہارم - کپور شاہؒ ——— موضع گھانسولی تحصیل کشن گڑھ " "
خلیفۂ پنجم - مولوی کمال الدین کمال ——— سالارپور، تحصیل تجارہ " "
خلیفۂ ششم - میاں عبدالکریم شاہ ——— موضع بچل بیڑہ " " "
خلیفۂ ہفتم - پیرزادہ محمد اسمٰعیل شاہؒ ——— موضع ڈہبیڑہ " " "
خلیفۂ ہشتم - پیرزادہ عبدالغنی ——— موضع پھلا باس " " "
خلیفۂ نہم - حاجی لاڈ شاہ عرف عزیز شاہ کھوسپوری تحصیل رام گڑھ "
خلیفۂ دہم - علی خاں میو مہاجر ——— الور[1]

[1] ملت یامین شاہی ص ۱۳۵ - ۱۳۷

پیر جی عبداللہ

موضع باؤلہ، متصل قصبہ تاؤڑو

سلسلۂ راج شاہی کے مشہور بزرگ، بافیض۔ تاریخ وفات ۱۳۵۵ھ

ہے۔

آپ بڑے صاحبِ نسبت اور متبع سنت تھے، ملت کے سوادِ اعظم کے ساتھ میل ملاپ کو اچھا سمجھتے تھے بڑے بے نیاز قسم کے آدمی تھے باؤلہ میں ایک مسجد تعمیر کرائی، جو میوات کی سب سے حسین وجمیل اور مضبوط مسجد ہے، اس میں ہر کس وناکس کی اعانت گوارا نہ فرمائی ۱۹۶۱ سمہ بکرمی میں مسجد کی تعمیر مکمل ہوئی۔ میاں جی موسیٰ گھاسیڑہ تبلیغی جماعت کے مشہور آدمی۔ اولاً پیر جی عبداللہ ہی کے مرید ہوئے تھے اور انھیں کی ہدایت ورہنمائی پر وہ بستی حضرت نظام الدینؒ اولیاء مسجد بنگلہ والی میں پہنچے[1]

میاں جی کلیم شاہؒ سیوکا

آپ کپڑے بیتے تھے، کمری بہت عمدہ بناتے تھے اور دو آنے (تیرہ نئے پیسے) اجرت مقرر تھی اصلاح نفس کے سلسلہ میں بڑے بڑے مجاہدے کئے۔ کم سے کم مجاہدہ یہ تھا کہ اکثر آپ کی خوراک اندرائن ہوتی تھی موضع سیوکا اور اس کے پڑوس کے گاؤں میں آپ کا فیض جاری تھا۔ ۱۹۲۲ء میں وصال ہوا۔ فرحمہ اللہ تعالیٰ[2]

شاہ نور علیؒ سیوکا

موضع سیوکا آپ کی اصلاحی جدوجہد کا میدان اصلی تھا مگر اردگرد کے دیہات بھی آپ کے فیض سے محروم نہ ہوئے۔ وفات تقریباً ۱۳۴۵ھ۔

---

[1] روایت از مولوی عبدالکریم خلف ممدوح مدرس مدرسہ عالیہ فتحپوری دہلی۔

[2] روایت از حافظ محمد یامین سیوکا ساکن حال بستی حضرت نظام ... ۱۹۶۰ء۔

حضرت مانو شہیدؒ

موضع روضہ چاند ولی ضلع الور (۲۰۰ م، تخمیناً)

موضع چاند ولی میں ایک شخص مسمیٰ اَلُمسدِیٔ تھا، اس کے تین فرزند تھے، ان میں سے ایک کا نام مانو تھا، جو بکریاں چرایا کرتا تھا۔ چاند ولی کے مغرب میں جو پہاڑ ہے، بکریاں عموماً اسی میں چرا کرتی تھیں۔ ایک دن مانو بکریاں لے کر جو پہاڑ میں پہنچا تو دیکھا کہ وہاں ایک درویش دھونی رمائے بیٹھا ہے، مانو کو اس میں کشش پیدا ہوئی اور اس کی صحبت اختیار کی، اور بکریوں کی نگرانی چھوڑ دی، اُدیں پہاڑ پر درویش کے پاس رات گذارنے لگا، بکریاں پہاڑ میں گھوم پھر کر واپس ہو جاتیں اور صبح گھر سے پہاڑ آ جاتیں۔ اس طرح چھ ماہ گذر گئے ــ درویش نے دودھ مانگا، اسے دودھ پلا دیا ــ اور پھر روزانہ درویش کو دودھ پلانے لگا۔

چھ ماہ بعد درویش نے کہا: "بس اب یہاں مت آنا۔ میں تجھے یہاں نہیں ملوں گا۔"

مانو اس درویش پر اس قدر فریفتہ تھا کہ اس کی جگہ سے بھی اُسے ایک قسم کا انس ہو گیا۔ دوسرے دن وہ دودھ لے کر حاضر ہوا۔ دیکھا کہ درویش کی جگہ خالی ہے مگر اس کے قریب ہی شیر بیٹھا ہے۔ درویش کی صحبت نے اسقدر جرأت وہمت تو پیدا کر دی تھی کہ وہ شیر کو دیکھ کر گھبرا نہ جائے۔ دل میں سوچا جو ہو سو ہو، دودھ تو مجھے درویش کی جگہ رکھنا ہی ہے، سر نیچا کر کے جو آگے بڑھا تو محسوس نہیں مشاہدہ کیا کہ شیر کی جگہ درویش تشریف فرما ہیں اور یوں ارشاد فرماتے ہیں ــــ "بچہ ہم نے تم سے کہا تھا کہ اب مت آنا اور تم نہیں مانے، آئندہ احتیاط رکھنا زنہار اس طرف کا رخ نہ کرنا اور ہمارے

بتلائے ہوئے راستہ پر گامزن رہنا، انشاءاللہ فائز المرام رہو گے"۔

پھر مانو نے وہاں جانا چھوڑ دیا۔ مگر اکثر یاد الٰہی میں وقت گذارتا اور بکریاں چرانے کا سلسلہ بدستور جاری و ساری تھا چاندولی کے مشرق بلکہ جنوب مشرق میں موضع مسرولی اور ٹھیکرہ کے پہاڑوں کے درمیان کچھ ہموار زمین ہے، یہ اس دور میں عام شاہراہ تھی، یہاں پہاڑ کے پہلو میں مغل ڈاکوؤں کا ایک گروہ خیمہ زن تھا، لوٹ مار کے علاوہ اس گروہ کی ایک مذموم حرکت یہ تھی کہ جو شخص بھی کسی حسین عورت کو لے کر اس راستے سے گذرتا تو یہ بدبخت اس عورت کو دو چار دن کے لئے رکھ لیتے اور پھر چھوڑ دیتے۔ ایک شخص اپنی بیوی کو لا رہا تھا۔ یہاں پہاڑوں کے درمیانی راستے میں جب پہنچے تو بیوی بولی :— "ذرا یہ سامان رکھو میں بیت الخلا ہو آؤں"۔ شوہر نے بیوی کے ہاتھ سے سامان لیا اور وہ عورت رفع حاجت کے لئے ایک طرف چلی گئی — دیہات میں عموماً جنگل میں آوٹ کی جگہ دیکھ کر پیشاب پاخانہ کرتے ہیں —۔ کافی دیر ہو گئی مگر عورت واپس نہ آئی۔ یہ آدمی یعنی اس کا شوہر ادھر ادھر اس کی تلاش میں نکلا۔ مانو اس کے قریب ہی بکریاں چرا رہا تھا اسنے دیکھ لیا کہ مغل ڈاکو اس کی بیوی کو پکڑ کے لے گئے۔ اس نے جب مانو سے پوچھا : "بھائی! ادھر ایک عورت تو نہیں آئی ؟" اصل میں وہ یہ خیال کرنے لگا تھا کہ اس کی بیوی اپنے والدین کے گھر واپس چلی گئی ہے —، مانو نے اس کی بات کا یوں جواب دیا :— "تیری عورت کہیں نہیں گئی ہے، یہیں ہے اور اس طرح اسے ڈاکوؤں نے پکڑ لیا ہے، مگر خدا نے چاہا تو میں تیری عورت تجھے واپس دلاؤں گا۔ مانو گھل گوپیا کا بہت ماہر تھا۔ اس نے دو چار پتھر رکھ کر گھل گوپیہ سے حملہ کیا، دو چار مغل مارے گئے، پھر یہ عورت کا ہاتھ پکڑ کر لایا، اور اس کے شوہر کے حوالے کر کے کہا کہ اب تو جلدی یہاں سے

بھاگ جا، میں ان ڈاکوؤں سے خود نمٹ لوں گا"— وہ شخص تو اپنی بیوی کو لے کر چلا گیا۔ اور یہ برابر ان ڈاکوؤں کو حملہ کرتا رہا۔ انھوں نے زہر میں بجھا ایک تیر مارا جو اس کی جوتی میں لگ کر انگوٹھے میں پیوست ہو گیا۔ اور یہ وہیں ڈھیر ہوئے اور درجۂ شہادت سے فائز المرام ہو گئے، آسمان سے پھولوں کی بارش محسوس ہوئی — مانو کے ساتھ ایک ہریجن چرواہا بھی تھا۔ اس نے گرتے ہی مانو کے انگوٹھے کو، جس پر تیر لگا تھا اپنے ہاتھ سے اس طرح پکڑ لیا کہ خون نہ بہے۔ مانو نے اسے ٹوکا کہ ہاتھ نہ لگا مگر اس نے حق رفاقت ادا کیا۔ مانو نے زخمی ہوتے ہی اپنے گاؤں اطلاع بھیجی کہ مجھے یہاں سے لے جائیں مگر رو دھو کر نہیں بلکہ گا بجا کر دولہا کی طرح لے جائیں گاؤں والے اس کی حسب منشا اسے دولہا کی طرح گاؤں میں لائے اور قبرستان میں دفن کر دیا — چھ ماہ بعد مانو کی ماں کو مانو خواب میں دکھائی دیا اور خواب میں ہی اپنی والدہ سے کہا — "ماں مجھے یہاں سے اکھاڑ کر کسی اچھی جگہ دفن کر دو، یہاں میرا جی گھٹ رہا ہے"۔ یہ بات تعجب خیز اور انوکھی تھی لاش کو قبر سے نکالنا اور پھر دوسری جگہ دفن کرنا۔ ماں نے کہا — "بیٹا ذرا میں اور لوگوں سے مشورہ کر لوں تب یہ کام کروں گی۔ اکیلے ہمت نہیں پڑتی۔ یہ سب گفتگو خواب کی تھی۔ خواب سے بیدار ہو کر مانو کی والدہ نے اس کے قبیلے کے لوگ جمع کئے اور ان کے سامنے مانو کی والدہ نے مانو کی گفتگو وضاحت کے ساتھ دہرائی۔ لوگوں کو تعجب تو ہوا مگر وہ اس پر آمادہ ہو گئے چنانچہ قبر کھودی گئی۔ دیکھا تو مانو کا چہرہ چاند کی طرح چمک رہا تھا۔ صرف انگوٹھا سیاہ تھا جسے ایک غیر مسلم نے چھو لیا تھا — مانو نے خواب میں یہ بھی بتا دیا تھا کہ مجھے میری فلاں زمین میں دفن کرنا۔ چنانچہ یہاں سے ان کی نعش کو نکال کر جنگل میں اس کی جو ہڑی۔ پانی کا چھوٹا سا تالاب، زمین کا نشیبی حصہ۔ کے پاس

دفن کردیا ــــ جن مغلوں نے مانو کو شہید کیا تھا، انھوں نے مانو کی شہادت کے وقت عجیب حالات دیکھے تھے اور پھر جب وہ دہلی چلے گئے تو پھر مانو انھیں خواب میں دکھائی دینے لگا۔ شاید اسی باعث ان قاتلوں نے مانو کا مزار بنوایا جس کی عمارت عہد تغلق کی عمارات سے مشابہ ہے۔ اسی لئے قیاس یہ ہے کہ مانو شہید چھ سو یا کچھ کم و بیش سال پیشتر اس تماشہ گاہ عالم میں جلوہ افروز ہوئے ہیں۔

مانو شہید کے جو دو اور بھائی تھے انھوں نے چاندولی سے رہائش ترک کرکے اپنے بھائی کے روضہ کے قریب آبادی کر لی۔ اسی روضۂ مانو شہید کی وجہ سے اس گاؤں کا نام روضہ ہے۔ اور مانو شہید کے انھیں دو بھائیوں کی اولاد سے یہ جگہ آباد و پر رونق ہے۔

روایت : سمیدی ولد رائے بھان	موضع روضہ چاندولی ضلع الور
جگرو ولد موسی	

(نوٹ) سمیدی اور جگرو اسی نسل سے ہیں (۱)

---

(۱) مئی ۱۹۸۰ء میں یہ روایت اور یہ قصہ میں نے خود سنا۔ زبان راویوں کی نہیں ہے بلکہ ان کے مفہوم کو اردو میں لکھا ہے۔

میاں لال خاں عرف لال داس

(۱۰۲۰ ــــ ۱۱۶۸)

سنہ ۱۰۲۰ھ میں بموضع دھولی دوب پرگنہ الور میں لال داس نامی ایک میو اپنی اوتاری کا دعویدار ہوا اور ہر طرف نزدیک و دور اوس کا عام اشتہار ہوا۔ مردمان ضعیف الاعتقاد اس پر ایمان لائے اور گروہ گروہ اس کے گرد آئے پھر تو اس نے خاطر خواہ پاؤں پھیلائے اور بہت روہرہ اپنی جودت طبع سے بنائے جبکہ طریق مسلمانی میں اس کی دال نہ گلی[1] تب اس نے ذوفنونی سے یہ چال چلی کہ مذہب ہنود کا پیروکار ہوا اور اسی زمانہ کا خود اوتار ہوا، مہاجن اور سنار اور تجار اکثر اعتقاد پرست ہوئے اور مریدانہ اس کے دست بدست ہوئے نہ معلوم اس نے کیا جادو کیا تھا اور ان لوگوں کو کیا دم دیا تھا کہ با وصف یقین اس کے کہ مسلمان ہندو نہیں ہو سکتا اور آپ گنگ رنگ قدرتی نہیں ہو سکتے ایسی کچھ بھنگ انھوں نے کھائی تھی اور دیدہ و دانستہ آنکھوں میں چربی ان کے چھائی تھی کہ اس پر کچھ بھی غور و توجہ نہ کی اور شراب اعتقاد اوس کی لاجرعہ پی یعنی صاف اس کو رہنما کیا اور پیالہ اس کی پرستش کا بصدق دل پیا۔ جب نئی یہ ملت پیدا

---

[1] یہ دراصل مصنف سے اظہار واقعہ میں یک گونہ کمی ہو گئی ہے ورنہ یہ بات نہ تھی جو مصنف نے سمجھی بلکہ بات یہ تھی کہ ایک تحریک مغل دور سے پہلے "بھگتی تحریک" کے نام سے ظاہر ہو چکی تھی۔ لال خاں میو اسی تحریک سے متاثر تھے ان سے پیشتر نانک پنتھی، کبیر پنتھی وغیرہ کئی ایک تحریکیں شمالی ہند میں مشہور ہو چکی تھیں۔ (آب کوثر ص ۴۶۵)

ہوئی تو اور مذاہب میں انگشت نما ہوئی، جو اس گروہ میں آیا لال داس کہلایا۔

مولود اس کا سمت ۱۵۵۵ میں بعہد شیر شاہ وقوع میں آیا تھا اور کرامات باہرہ نے ستر برس پیچھے اس سے ظہور پایا تھا۔ مسمی چاندل اس کا پدر تھا اور سمرا نام مادر تھا اور دونوں سے ہر ایک دھولی دوب میں مرا اور وہیں دفن کیا گیا جب کوئی الور سے جندولی کو آتا جاتا ہے مقبرہ دور سے پہاڑ میں ان کا نظر آتا ہے بعد رشد وکمال قلعہ الور میں بھی لال داس کا مقام رہا بلکہ ایک عرصہ وہاں اس کا قیام رہا اور مشہور ہے کہ خار دھوک اس کے لگ گیا تھا براں وجہ اس کی دعا سے درخت دھوک کا قلعہ میں نام ونشان باقی نہ رہا۔

سمت ۱۷۰۵ میں بموضع شیرپور کے بعد شکستگی پرگنہ کھلورہ رام گڑھ میں داخل داخل ہوا لال داس اس جہان سے کوچ کرکے ساتھ ارواح کے واصل ہوا اور وہیں اس کا مزار ہے اور مقبرہ تیار ہے۔ اور ایک پسر دو دختر لال داس کی موضع باندھولی میں زیارت گاہ ہے ان کی چھتری وہ خانقاہ ہے۔ میاں صاحب اسم لال داس کے پسر کا تھا اور مساۃ رذہ سدہ نام ہر دو دختر کا تھا اور علاوہ میاں صاحب کے لال داس کے دو پسر اور تھے ان کے سب میواتی طبر تھے[1]۔ مؤلف تاریخ میوچھتری نے لال داس اور شہزادہ دارا شکوہ کی گفتگو کا ذکر کیا ہے جستجو کے بعد وہ کتاب مل گئی۔

شہزادہ دارا شکوہ نے لال داس سے اپنی ذہنی الجھنوں کا حل چاہا، لال داس نے اس کی تمام الجھنیں ختم کرکے انھیں مطمئن کردیا۔ شہزادہ نے یہ تمام گفتگو فارسی میں نقل کرلی ہے۔ ہم اسی فارسی سوال وجواب کی تلخیص یہاں

[1] مرقع الور ص ۶۴، ۶۵، ۶۶

پیش کرتے ہیں:۔

سوال	جواب
شہزادہ: فقیر کا اول وآخر کیا ہے؟	لال داس جی: اول فنا، آخر بقار
〃 فقیر کی سربلندی کیا ہے؟	〃 سرنگونی
〃 فقیر کی خردمندی کیا ہے؟	〃 دل، دلربا کے ماسوا کسی کو نہ دے
〃 فقیر کی رنگینی کیا ہے؟	〃 خداشناسی وخدادانی
〃 فقیر کی روشناسی کیا ہے؟	〃 اس کا دل مراقبۂ حق میں مستغرق ہو۔
〃 فقیر کے سر پر کیا ہے؟	〃 سایۂ خداوندی
〃 ہر آدمی کے آگے پیچھے کیا ہے؟	〃 آگے رزق، پیچھے موت
〃 فکر فقیر اور اندیشہ کیا ہے؟	〃 خدمت پیر ومرشد، دل صبر پیشہ
〃 فقیر کے لیے ضروری کیا ہے؟	〃 دن رات بیداری
〃 فقیر کی چالاکی اور کاہلی کیا ہے؟	〃 کھانا پینا احتیاط سے، زیادہ کھانا۔
〃 فقیر کا آرام واستحکام کیا ہے؟	〃 گوشہ نشینی
〃 تنہائی میں توشۂ فقیر کیا ہے؟	〃 خدائے رزاق پر بھروسا اور اعتماد۔
〃 فقیر کا مہمان کون ہوتا ہے؟	〃 جسم وجان
〃 فقیر کے گھر کا چراغ کیا ہے؟	〃 چاند، سورج
〃 فقیر کا بستر وتکیہ کیا ہے؟	〃 زمین، مٹی کے ڈھیلے۔
〃 فقیر کی زندگی کس طرح ہوتی ہے؟	〃 ہمیشہ سجدہ ریز۔

سوال شہزادہ دارا شکوہ	جواب لال داس جی
فقیر کو ہمیشہ کے لئے کیا اور کیوں ضروری قرار پایا؟	پروردگار و کارساز بے نیاز کا شکر
رموز فقیر اور اسکی عبارت کیا ہے؟	بے ہودہ گفتگو، ذکر و شغل
فقیر کی حرص اور گذر اوقات کسطرح ہوتی ہے؟	ہمیشہ آرزوئے ریاضت، نہ لالچ اور نہ جمع کرنے کی فکر۔
فقیر کا آئین، انجام اور ہوس کیا ہے؟	مسکینی و عقیدت، خاموشی، حق بآغوش، امور دنیا سے بیہوش۔
فقیر کی ہوشیاری کیا اور کونسی نعمت بہترین ہے؟	دین و ایمان کی استواری نیک کرداری۔
کافر و ملحد کون ہیں؟	یہ دونوں خطاب حق پوش کو دیئے گئے ہیں۔
فقیر کا عتاب۔ اور صلاحیت کیا ہے؟	صلاح، پیر و مرشد سے پختگی عقیدت
بے فائدہ کیا ہے؟ اور علاقہ کیا ہے؟	گزشتہ پر افسوس، عیار ناقدری کا غم
شراب اور بھنگ؟	خانہ خراب، و نقص ناموس ننگ
تمباکو نوشی؟	دماغ کو دھوؤں سے بھر دیتا ہے۔
دم لگانا اور سانس کھینچنا کیسا ہے؟ جسے جوگ میں جائز رکھا ہے۔	مباح ہے اگر عادت پڑ جائے اور چھوڑ نہ سکے۔
دل کشی کیا ہے؟	دل کو ہر طرف جانے کی عادت ہو اور پاک نما و سالک ہر طرف سے کھینچ کرائے

شہزادہ دارا شکوہ (سوال)	لال داس جی (جواب)
	حق کی جانب موڑ دے۔
فقیر کی دولت، خیرات اور مستی کیا ہے؟	فرحتِ وجود، حقیقت کے راستوں کی ہدایت و رہنمائی، حق پرستی
فقیر کے کمالات، اور خوبیٔ حال کیا ہے؟	خودی و خود پرستی کی نفی کرنا اور دوسروں کی حاجت برآری۔
فقیر کا خیال کیا؟ اور اس پر شکر کیا؟	قیل و قال سے فارغ، کسی پر ظلم اور وبال پر راضی ہو جانا۔
فقیر کی برہنگی بہتر ہے یا جامہ پوشی، یا ملنگ ہونا؟	ہوشمند کے لئے ستر پوشی ضروری، مجذوب سالک کی آشنائی حق جبہ و کلاہ پر موقوف نہیں۔
فقیر کی ہوشیاری کیا ہے؟	دلبری و دلداری
عبادت کی شکل کیا ہو (کیونکر انجام پذیر ہو)؟	ریاضت و محنت سے۔
ریاضت و محنت کی عادت کیسے ہو؟	گفتگو کم سے کم اور کام زیادہ سے زیادہ۔
فقیر کی خوش طبعی کیا ہے؟	تصوف و سلوک کے ہر سوال پر محظوظ ہوتا ہے۔
فقیر کے مطلب کیسے انجام پاتے ہیں	بے طلب ہر کام ہو جاتا ہے۔
طالب مطلوب کب بنتا ہے، اور آدمی سے کیا مطالبۂ خاص ہے؟	حق کی طلب و جستجو سے، مرشد کے ساتھ اخلاص۔

شہزادہ داراشکوہ (سوال)	لال داس (جواب)
• فقیر کی تکلیف کیا ہے ؟	• اہل وعیال
• بڑے بڑے اور پرانے بزرگوں کے اہل وعیال تھے ؟	• ان کا دل یادِ الٰہی میں مست اور فکرِ اہل وعیال سے فارغ تھا
• معرفت کیا ہے ؟	• مرشد کے فرمودات کی تعمیل (پیر کی بات پر عمل کرنا)
• فقیر کا بیٹا، باپ اور بھائی کون ہے ؟	• مرید سعید، رہنمائے کامل، عامل۔
• فقیر کا دستور کیا ہے ؟	• جو کہے وہ کرے اور جو کرے وہ کہے
• فقیر کی زندگی کا کاروبار کیا ہے ؟	• خداوند قدوس کی یاد اور اس کی شکر گذاری ۔
• فقیر کی بادشاہی کیا ہے	• بے پروائی، خود آگاہی اور جہاں پناہی
• فقیر کا محبوب کون اور عاشق کون ۔ ؟	• موت، سعادت مند مرید ۔
• پیر مریدوں سے نامور ہوتا ہے !	• یہی برائی کی جڑ ہے، مشہور ہے کہ جب تک پیروں کی ڈگر پر نہ چلے راہبر نہیں بن سکتا ۔
• فقیر کی دوستی کس کس سے ہوتی ہے !	• خداوند قدوس سے اور خاصانِ خدا سے
• دنیاداروں کے ساتھ ؟	• دوستی و دشمنی دونوں اچھی نہیں
• کم کھانا بہتر ہے یا زیادہ کھانا ؟	• کم خور کم خوار، بسیار خور بسیار خوار
• سود مسلمانوں کے لئے حرام اور غیر مسلموں کے لئے حلال ۔ ؟	• غیر مسلموں کے لئے حرام سے بھی بدتر ہے ۔

شہزادہ داراشکوہ (سوال)	لال داس (جواب)
• پھر ہندو سود کیوں لیتے ہیں ؟	• رواج کے باعث اور یہ سب بے خبری کی وجہ سے ہے ۔
• فقیر کے لئے گوشت خوری خوب ہے ۔	• گفت اگر کاسب را بد محنت (کرنے والے فقیر کے لئے برا ہے)
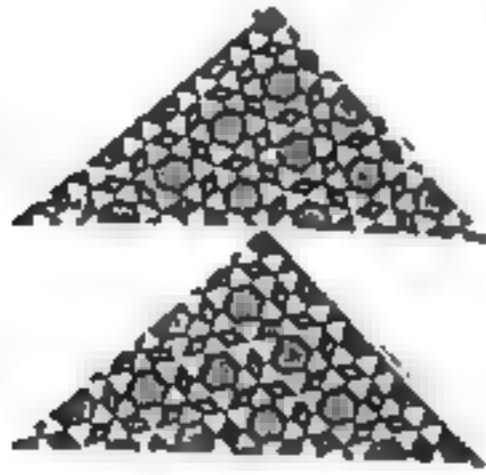
صوفی چمن شاہؒ۔ ڈھانہ

آپ سادات میں سے ہیں۔ سیر و سیاحت کرتے ہوئے اِدھر آنکلے جیسا کہ عام طور پر بزرگانِ دین کو سیرِ انفس و آفاق کا شوق ہوتا ہے۔ علاقہ میوات میں سب سے پہلے شاید آپ کی ملاقات میاں گلاب شاہؒ ہتھین سے ہوئی جو میاں راج شاہؒ سوندھ کے پہلے پیرِ طریقت تھے، پھر آپ کی آمد و رفت موضع جلال پور تحصیل ہتھین میں شروع ہوئی جو موضع رنسی کا کے پاس ہے۔ دن بھر جلال پور رونق افروز ہوتے اور شام کو بعد نمازِ مغرب میاں گلاب شاہ کی بارگاہ میں حاضر ہو جاتے۔

ایک دن بارش کی وجہ سے راستوں میں کیچڑ ہو گئی آپ رات میں ہتھین کی طرف سے تشریف لا رہے تھے اور موضع لکھنا کا میں سے گذر رہے تھے کہ راہ کے بالکل قریب ایک حویلی کے جنگلے میں سے ایک عورت نے شاہ صاحب کی عافیت کی خاطر چراغ سے روشنی کر دی۔ آپ کو یہ حرکت پسند نہ آئی اور یہ فرمایا: "چراغ گل" چنانچہ فوراً وہ چراغ بجھ گیا۔ یہی نہیں کہ صرف چراغ نے روشنی بند کر دی بلکہ اس عورت کا ہی چراغ گل ہو گیا۔ اس کے کوئی اولاد نہ ہوئی اور وہ حویلی اب بھی غیر آباد ہے۔ یہ شاید اس وجہ سے ہوا کہ وہ عورت شاہ صاحب کے مقامِ راز و نیاز میں مخل ہوئی اور اسرار اسرار نہ رہے، درویش تو تھے ہی۔ نکل گیا زبان سے۔ ایسے وقت خلل اندازی ناقابلِ برداشت ہوتی ہے۔

میانِ عاشق و معشوق رمزے است
کراماً کاتبیں را ہم خبر نیست

موضع جلال پور و ہتھین سے آپ موضع کوٹ تشریف لے گئے جو ہتھین کے جنوب مشرق میں آٹھ سات میل پر نوح ہوڈل روڈ پر واقع ہے۔ کوٹ کے تکیہ میں آپ نے اپنی بود و باش اختیار فرمائی۔ ایک دفعہ جمعرات کے دن آپ اپنے تکیہ ہی میں تھے، اس کے آس پاس چرواہے مویشی چرا رہے تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ شاہ صاحبؒ کے ہاتھ پیر اور سر وغیرہ کٹ کر علیحدہ ہو گئے ہیں، چرواہوں کو یہ دیکھ کر افسوس ہوا آپس میں کہنے لگے: "کوئی فقیر کو قتل کر گیا ہے، ابھی وہ لوگ اسی ادھیڑ بن میں تھے کہ انھوں نے شاہ صاحبؒ کو تندرست و توانا دیکھا، گویا کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ آپ کو بھی چرواہوں کی موجودگی اور ان پر اس انکشاف کا احساس ہو گیا تو محض اپنے کو چھپانے کی خاطر آپ نے ان سے فرمایا: "دیکھو بچو تمہارے گاؤں میں آگ لگ گئی"۔ چرواہے جو اپنے گاؤں کی طرف متوجہ ہوئے تو انھیں دکھائی دیا، گویا سچ مچ آگ لگ رہی ہے۔ وہ گاؤں کی طرف دوڑے وہاں جا کر دیکھا تو کچھ نہ تھا۔ نہ آگ نہ دھواں، امن و اطمینان سے اہلِ بستی اپنے اپنے کاموں میں مشغول تھے۔

لڑکے ادھر گئے اور آپ وہاں سے چھپ کر چلے گئے یوں ہی پھرتے پھراتے موضع مالی کا میں آگئے اور موضع مذکور کی چوپال میں رہنے لگے۔ نظریں آپ کی ہمیشہ نیچی رہتیں۔ چوپال میں ہمیشہ راستہ کو پیٹھ دے کر بیٹھتے چوپال چونکہ راستہ کے پاس تھی اس لئے آپ یہ احتیاط فرماتے تھے عموماً راستہ میں آنے جانے والوں سے کوئی سروکار نہ رکھتے تھے

میرے والد مرحوم ملی بھوپی نے مجھے بتلایا کہ شاہ صاحب بچوں کو بہت پیار کرتے تھے اور انھیں گود میں لے کر کھلاتے تھے چنانچہ میرے دادا

کو ۔ جو اس وقت بچّے تھے ۔ انھیں یہ گود میں کھلاتی تھی انھیں اس کی گود سے لے کر خود کھلانے لگتے تھے اور انھیں خوب پیار کرتے ، مرحوم کا نام زین خاں تھا ۔ ایک دن ایک عورت اپنے بیمار سے بچے کو لائی اور عرض کیا : شاہ جی یہ بچہ بیمار رہتا ہے ، آپ نے اس بچہ کے منہ میں تھوک دیا ، اسی وقت انگلی کی برابر موٹا ایک کیڑا اس کے منہ سے نکل کر باہر گر پڑا اس کے بعد وہ بچہ تندرست ہوتا چلا گیا ۔

موضع مالی کا میں ایک نمبردار تھا ۔ کنھیا نام کا ۔ بہت مالدار اور دھنیڑی ۔ بہت سی گائیں بکریوں اور بھینسوں کا مالک تھا ۔ اس کے کئی لڑکے تھے ۔ بطور شوق ایک ہرن کا بچہ پال رکھا تھا ۔ شاہ صاحب ایک دن اس نمبردار کے گھر گئے اور فرمایا : " بابا ، یہ ہرن کا بچہ خدا کے نام پر مجھے دیدیجئے " نمبردار بولا " شاہ جی لڑکے دکھ پائیں گے " کچھ دیر بعد پھر ہرن کا بچہ طلب کیا نمبردار نے بھی لڑکوں پر بات ٹالتے ہوئے کہدیا : " لڑکے دکھ پائیں گے " نمبردار کا یہ جواب سن کر آپ خاموش ہو گئے ۔ تیسری بار پھر یہی سوال دہرایا ، نمبردار نے بھی وہی جواب دیا ۔ آپ نے فرمایا اچھا بابا اگر دکھ پائیں گے تو دکھری پائیں گے چنانچہ نہ نمبرداری رہی اور نہ مالداری ۔ مال و متاع کچھ بھی نہ رہا ۔ آج تک اس نمبردار کی اولاد اس بحران سے نہ نکل سکی ۔ محنت مزدوری کرکے روزی حاصل کرتی ہے اور پریشانی نے ان کے نوہیرہ (گھیر) میں پڑاؤ ڈال دیا ہے اگھن کے مہینہ میں ، ار قمری تاریخ کو یہ لوگ شاہ صاحب کے مزار پر جاتے ہیں اور ایصال ثواب کرتے ہیں اور اپنے بزرگوں کی غلطی کی معافی طلب کرتے ہیں ۔ اب کچھ ان کے حالات میں سدھار آ رہا ہے ، ورنہ اب سے کچھ پہلے تک جوانی میں موت ، شادی نہ ہونا وغیرہ جیسے سماجی امراض

میں مبتلا تھے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب نے نور بصیرت سے بھانپ لیا کہ آزاد حیوان کو قید و بند میں ڈالنا جرم تو ہے ہی مگر نمبردار اس کے باعث آفت میں پڑنے والا ہے آپ نے ہرن کا بچہ مانگ کر نمبردار سے بلا کو ٹالنا چاہا تھا اگر نمبردار راضی نہ ہوئے تو آپ یہاں سے برگشتہ ہو کر چل دیئے تو راستے میں گنگوائی کا ایک چرواہا بکریاں چرا رہا تھا آپ نے ویسے ہی اس سے سوال کیا : بھائی ہمیں اللہ کے نام پر ایک بکرا دیدو " چرواہے نے ایک بکرا آپ کو دیدیا ۔ اتفاق کی بات کہ وہ بوچا تھا (ایک کان والا ، یا کسی کے ایک یا دونوں کانوں میں کوئی نقص ہو تو اسے بوچا کہتے ہیں) ۔ آپ نے چرواہے کو دعا دی اور فرمایا : " اللہ تعالیٰ تجھے فرزند عطا فرمائے ، مگر وہ بھی بوچا ہوگا جیسا کہ یہ بکرا بوچا ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا قبول فرمائی ۔ بچے کا نام بوچا ہی رکھا گیا آخری عمر میں مجھے بھی ان کے دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا واقعی اس کے ایک ہی کان تھا ۔ تقریباً سو سال عمر پائی ۔

بعد ازاں آپ موضع اکبرپور چلے گئے ، کچھ دن وہاں رہ کر موضع ڈھانہ تشریف لے گئے ، اور وہیں رہنے لگے ۔

آپ کی جائے قیام کے قریب موضع چاندڑا کا میں ایک شخص کے یہاں لڑکا پیدا ہوا ، اس نے عقیقہ کیا آپ کو دعوت عقیقہ میں یاد نہیں کیا ۔ دوسرے دن وہ لڑکا فوت ہو گیا ، لوگوں نے کہا : شاہ صاحبؒ کو کیوں نہیں بلایا ؟ ، شاید وہ ناراض ہو گئے ہیں ۔ بچے کو دفن کرکے وہ آدمی شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا : " بچے کی خوشی میں فقیر کو بھول گئے ، اللہ نے اسے اٹھا لیا " اس آدمی نے معذرت کی آپ نے دعا فرمائی : " اللہ تعالےٰ تمہیں دو لڑکے عطا فرمائے ۔ چنانچہ یکے بعد دیگر دو لڑکے پیدا ہوئے ، ایک کا

نام روڑا تھا جو کرپال کا دادا تھا، کافی عمر پائی -

ایک روز ایک گھڑیا (گھڑے سے چھوٹا برتن) میں شراب رکھی ہوئی تھی - لوگوں نے پولیس میں شکایت کی کہ یہ فقیر شراب پیتا ہے - سپاہی نے آپ کے پاس آکر ذرا درشت لہجہ میں کہا: "او فقیر تو شراب پیتا ہے ؟ ؟" آپ نے فرمایا: "نہیں بابا دودھ وا ہے"۔ گھڑیا کا منہ کھول کر دیکھا تو واقعی دودھ تھا - سپاہی نے معذرت کرتے ہوئے معافی مانگی اور چلا گیا - اس طرح کی جلالی کیفیات کا یہاں مظاہرہ ہوا

جمعہ کا دن تھا، آپ نے غسل کیا، نئے کپڑے پہنے، بالوں کو کنگھی کی اور موضع ڈھانہ کی جامع مسجد میں نماز جمعہ ادا کی - نماز کے بعد آپ نے لوگوں سے فرمایا: اب میرا وقت قریب آگیا ہے، احباب اور ملنے والوں کو خبر کردو اور دیکھو مجھے فلاں جگہ دفنانا - اسی جگہ کے متعلق فرمایا جہاں اب آپ کی قبر ہے - یہ کہکر اپنے بالوں کو لمبا کیا، جو اس قدر طویل تھے کہ زمین تک آگئے تھے اور زمین پر لیٹ گئے - لیٹے لیٹے إِلَّا اللّٰہ کی ضرب لگائی اور آپ کی روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی - اناللہ الخ

آپ کا قد درمیانہ اور رنگ سانولا تھا - زمانۂ وفات تقریباً ۱۲۸۳ھ ہے[1]

---

[1] روایت حاجی محمد حسین صاحب مالی کا سکریٹری گرام پنچایت قصبہ پنگواں - ضلع گوڑ گانوہ - میوات - (۳۰/۱/۱۹۰۳ء)

سلسلۂ نقشبندیہ

میر سیّد ابوالعلاء قدس سرّہٗ

خلف سیّد ابوالوفا متوطن اکبرآباد، سادات حسینی سے ہیں، آپ مشاہیر اولیاء و اکابر عرفائے عظام سے تھے، امیر سیّد ابوالوفا آپ کے والد نے جو اکبر بادشاہ کے پاس امیر تھے، انتقال فرمایا اور دہلی میں مدفون ہیں، آپ چچا کے ہمراہ حج کو گئے چچا کا وہاں انتقال ہوگیا - نانا خواجہ محمد فیض احراری نے آپ کی تربیت کی، علوم متداولہ میں تکمیل کراکر ہند کی طرف راہی ہوئے، ہندوستان میں آکر اکبر بادشاہ دہلی نے سہ ہزاری منصب آپ (خواجہ محمد فیض) کو عطا کیا، اور صوبہ بنگال کی طرف بھیجا - جب بردوان کی لڑائی میں خواجہ محمد فیض نے شہادت پائی، وہی منصب امارت امیر سیّد ابوالعلا کو ملا، دن کو امور انتظام لشکر و امارت میں رہا کرتے اور رات کو اپنے خالق کی عبادت میں صبح تک بیداری کرتے، کہتے ہیں کہ جد و آباء کی ارواح کی امداد نے آپ کے دل پر انوار ولایت کے بشارے (خوشخبری) دیئے - چنانچہ سیّدنا حضرت علیؓ نے ایک خرقۂ نورانی ولایت کبریٰ کا آپ کو پہنایا اور ایک لقمۂ نورانی علم لدنی کا آپ کو کھلایا اور عالم مثال میں مجلس حضرت سیّدنا سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی نصیب ہوئی اور اویسیہ نعمت سے سرفراز ہوئے - تنہائی میں مراقبات و مشاہدات کا شغل رکھتے - دنیا کی محبت آپ سے سرد ہوئی - چاہا کہ استعفیٰ دیں مگر قبول نہ ہوا - جب اکبر بادشاہ ۱۰۱۴ھ میں مرگیا اور جہانگیر تخت نشین ہوا، تمام امراء حسب طلب جمع ہوئے، آپ بھی تشریف لائے -

ایک مرتبہ جہانگیر نے جام شراب اپنے دست خاص سے آپ کو دیا، آپ نے لے کر زمین پر پھینکدیا، بادشاہ غضبناک ہوا، چوبداروں کو پکارا، اور

آپ سے کہا: توغضبِ سلطانی سے نہیں ڈرتا ہے؟ آپ نے جواب دیا تو قہرِ ربانی سے خوف نہیں کھاتا"؟ اور پھر بادشاہ نے آپ کو تکلیف دینے کا ارادہ کیا۔ آپ نے ایک نعرہ جوشِ دل سے یا ربنا کا مارا۔ دو شیر غیب سے آپ کے دونوں طرف نمودار ہوئے اور غرّانے لگے، بادشاہ اٹھ بھاگا، حاضرین سب فرار ہوگئے۔ آپ نے ان شیروں پر ہاتھ پھیرا اور فرمایا: بہر صورتیکہ می آئی می شتا اسم شیر غائب ہوگئے۔ اس دن سے ملازمت چھوڑ دی، دوسرے روز جہانگیر بہت آزردہ ہوا بہت کچھ دنیا کے لالچ دیئے اور معافی مانگی، آپ نے قبول نہ کیا اور فرمایا کہ اب راز فاش ہوگیا۔ دہلی سے اجمیر آئے اور خواجہ معین الدین کی روح سے فیض اویسیہ حاصل کیا۔

کہتے ہیں کہ خواجہ معین الدین چشتی نے برزخِ مثالیہ میں اپنی قبر سے باہر آکر توجہ چشتیہ سے آپ کو مشرف فرمایا۔ اور بعد چند روز کے روح حضرت غوث الثقلین کی عین مراقبہ میں، صورت مثالی کے ساتھ جلوہ گر ہوئی اور توجہ قادریہ سے آپکے قلب کو معمور کردیا۔ اور فرمایا کہ اس زمانہ میں سلسلۂ جدید تمہارا قوی تر ہے، اور اس میں برکات و فیوضات سب سلاسل کی شامل و داخل ہیں۔

کہتے ہیں کہ آپ نے فیض ارادت و خرقہ باطنی اپنے خسر و عم بزرگوار میر عبداللہ احراری اکبرآبادی سے پایا ہے، آپ کے خوارق اور کرامات سے کتابیں بھری ہوئی، بزرگان ابوالعلائیہ نے وہ دھوم مچا رکھی ہے کہ جا بجا اسی فیض کی نہریں جاری ہیں۔ ۹ر صفر ۱۰۶۱ھ میں آپ کا وصال ہوا۔ مزار اکبرآباد میں ہے[1]

---

[1] برکات الاولیا ص ۱۰۹ تا ۱۱۰

میوات میں عہد جہانگیری کی ایک عظیم خانقاہ
جس نے تین سو سال تک میوات کی سرزمین کو بقعۂ نور بنائے رکھا

لعل ابوالعلاء، میاں لاڈ خاں کوٹ قاسم قدس سرہٗ

★

حضرت محرم خاں المخاطب بہ لعل محمد عرف لاڈ خاں رحمۃ اللہ علیہ خلیفہ حضرت سیدنا شاہ ابوالعلاء قدس سرہٗ کے ہیں، آپ کا مولد و مسکن اور مدفن کوٹ قاسم قصباتِ میوات سے ریاست جے پور میں واقع ہے۔ ریواڑی سے باندی کوئی کی جانب پہلے اسٹیشن ریلوے باول (Bawal) سے تقریباً بارہ میل ہے، اور تجارہ (Tijara) سے بارہ تیرہ میل کا فاصلہ ہے

بعض تذکرہ نویسوں نے آپ کو بہت بڑا پہلوان لکھا ہے۔ بہر حال ادھر ادھر سے جو کچھ اور جس قدر بھی حالات معلوم ہوئے وہ پیش کئے دیتا ہوں:

آپ کے والد ماجد حسن خاں صاحب قصبہ اندری میں، جو دہلی سے جانب شمال تقریباً ایک سو بیس میل کے فاصلہ پر ہے مشغولِ کار تھے، میاں محرم خاں کو ابتداء سے حصولِ طریقت (تصوف) کا شوق تھا، ابتداءً آپ سلسلۂ چشتیہ میں حضرت مولانا معین الدین سے دست بیع ہوئے، جو اس زمانے میں حضرت خواجہ غریب نوازؒ کے سجادہ نشین تھے۔

آپ کی عمر انیس سال تھی جب آپ اپنے والد بزرگوار کے ساتھ قصبہ اندری تشریف لے گئے، وہاں ایک مسجد کے حجرے میں حضرت میراں سید عبدالواجد رحمۃ اللہ علیہ مقیم تھے، اتفاق سے محرم خاں رحمۃ اللہ علیہ جنگل کی طرف چلے

گئے اور وہاں سے چند خوشبودار پھول توڑ کر لائے ، آپ پھولوں کو دیکھتے جاتے اور مشاہدۂ قدرت قادرِ مطلق فرماتے جاتے اور مناجات کرتے تھے کہ خداوندا میرے دل کو بھی ان پھولوں کی طرح شگفتہ فرما کر اپنی محبت و معرفت کی خوشبو سے بسا دے اس خیال اور شوق کے غلبہ سے آپ پر کیفیت طاری ہوئی ، چند گھنٹے بے ہوشی کا عالم طاری رہا ۔ رفتہ رفتہ میراں صاحب مذکور کو خبر پہنچی ، آپ نے خانصاحب کو طلب فرما کر داخلِ سلسلہ کیا اور طریقۂ قادریہ کی تعلیم فرمائی ۔ ایک سال تک خدمتِ میراں صاحب میں حاضری دینے کے بعد جو کچھ آپ کا وہاں حصہ تھا وہ حاصل کیا ، پھر اپنے وطن کوٹ قاسم کو واپس تشریف لے آئے ۔

کوٹ قاسم واپس ہونے کے بعد آپ کو علم دینیات حاصل کرنے کا شوق ہوا چنانچہ قصبہ تجارہ میں مولانا ابوالخیر عثمانی سے نحو اور فقہ کا استفادہ کیا[1]

اصل نام حضرت محرم جان لاڑ خاں عرف خواجہ لعل محمد شاہ چشتی ، قادری ابوالعلائی ہے ، آپ مولانا ابوالخیر عثمانی تجاروی کے شاگرد رشید ہیں اور مولانا معین الدین صاحب سجادہ نشین اجمیری کے مرید اور میر عبدالواحد قادری اکبرآبادی اور شیخ محمد الیاس برہان پوری کے خرقہ یافتہ ہیں[2] اور امیر ابوالعلا اکبرآبادی کے خلیفۂ اجل ہیں ۔

ایک روز آپ بیٹھے ہوئے تھے یکایک دل میں علم ظاہری حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا ۔ اس کی تکمیل کے لئے تجارہ میں شیخ ابوالبرکات کی خدمت میں آئے جو خواجہ محمد شعیب (بانی خانقاہ شعیبیہ) کے اجداد میں سے تھے ، اُن سے پڑھنا شروع کیا[3]

---

[1] اذکار ابرار جدید ص ۱۳۵ ، ۱۳۶ [2] مرقع میوات ص ۲۹۲ [3] مرقع میوات ص ۲۹۳

آپ کا شوق چونکہ علم طریقت کی طرف تھا حصول علم کے زمانے میں مولانا جامی کی یہ رباعی اکثر پڑھا کرتے تھے :

اے دل در طلب کمال در مدرسہ چند   تکمیل اصول حکمت و ہندسہ چند
ہر فکر کہ جز ذکر خدا وسوسہ ایست   شرمے ز خدا بدار ، ایں وسوسہ چند

اصل نسبت آپ کو میر ابوالعلاء اکبرآبادیؒ سے تھی اور اسی سلسلہ کو آپ نے فروغ دیا ، میر صاحب کی خدمت میں آپ کی حاضری کے متعلق دو لطیفے ہیں اور دونوں دلچسپ و عبرت آموز اس لئے دونوں ذکر کئے جاتے ہیں :

سید محمد رفیع صاحب آپ کے قدیم احباب میں سے تھے ، وہ اکبرآباد سے کوٹ قاسم تشریف لے گئے تو محرم جان صاحب نے دریافت کیا کہ آپ کو اکبرآباد میں کن بزرگ سے نسبت شریفہ حاصل ہے ؟ سید صاحب نے حضرت سیدناؒ کا نام نامی اور اسم گرامی لیا ، چند روز بعد خانصاحب رحمۃ اللہ سید محمد رفیع کے ہمراہ اکبرآباد کو روانہ ہوئے اور اول وقت عصر کے دونوں صاحب شرف حاضری سے مستفیض ہوئے ۔ چند روز شیخ داؤد کے مکان پر ، جو حضرت سیدناؒ کے خدام میں سے تھے ، مقیم رہے ۔ اسی ہفتہ میں سید ناؒ نے حضرت عارف رفیعؒ کو دریا آباد ، نواح لکھنؤ ، حضرت خواجہ عبدالرحمٰن کے پاس گھوڑا پہنچانے کے واسطے بھیج دیا ، اس دوران میں کچھ نظمیں حضور سیدناؒ میں پڑھی گئیں ، شیخ داؤد کو اس پر کیفیت ہوئی ، خانصاحبؒ نے شیخ داؤد کی کمر کو پکڑ لیا حتیٰ کہ دونوں پر کیفیت طاری ہو گئی ۔ اس کے بعد چند دن گذرے تھے کہ حضرت سیدناؒ نے ایک پیالے میں آش جو تناول فرمایا کچھ حصہ باقی رہا وہ حضرت خاں صاحب کو مرحمت ہوا ، خاں صاحب نے اس کو پی لیا ، اور

پھر پیالے کو دھو کر پی گئے، اس وقت حضرت سیدناؒ نے حاضرین سے فرمایا کہ یہ خان صاحب نے پیالہ دھو کر نہیں پیا، بلکہ تمام نعمت جو ہمارے یہاں سے ملنے والی تھی اس سب کو پی گئے۔"

خواجہ محمد شعیب صاحب "یادگار ابرار" میں حافظ رحمت اللہ ابن شیخ عبدالغنی سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنے شیخ حضرت محمد حنیف خلیفہ حضرت ملا ولی محمد سے سنا، ملا ولی محمدؒ نے حضرت محرم جان عرف لاڈخاں کی نسبت فرمایا:

"ہمارے ہم طریقت احباب میں جذب و مشغولیت کی جو نسبت حضرت لاڈخاں کو پہنچی ہے وہ کسی کو حاصل نہیں۔"

حضرت شاہ غلام نبی فیروز پوریؒ متوفی [illegible]ھ فرماتے تھے کہ میاں محرم جان عرف لاڈخاں بعض اوقات یہ رباعی پڑھتے تھے۔

در مسلخ عشق جز نکو را نکشند / لاغر صفتان زشت خو را نکشند
گر عاشق صادقی ز کشتن مگریز / مردار بود ہر آنکہ او را نکشند

(عشق کی قربان گاہ میں بجز نیک آدمی کے ذبح نہیں کئے جاتے۔ کمزور اور بری عادت والے کو قتل نہیں کرتے۔ اگر تو عشق میں سچا ہے تو قتل سے مت بھاگ۔ وہ مردار ہوتا ہے جسے وہاں قتل نہیں کیا جاتا۔)

اور بعض حالتوں میں یہ شعر بھی آپ کی زبان سے سنا گیا:

سلسلۂ تصوف جملہ حلقۂ دام بلا است / ہر کہ دریں حلقہ نیست فارغ ازیں ماجرا است

(تصوف و طریقت کا سلسلہ مصیبت کا پھندا ہے۔ جو شخص اس حلقہ میں نہیں وہ اس ماجرے سے فارغ ہے۔)

زمانۂ وصال کے قریب ایک روز آپ نے اپنے خلیفہ خواجہ عبدالرحمٰنؒ سے فرمایا: ہمارے فرزندوں میں سے اگر کسی میں حالت ذوق و شوق پیدا ہو تو اپنے طریقہ

کے بزرگوں کا مسلک سمجھا دینا، ورنہ کہہ دینا کہ جو فروش گندم نما نہ بنیں، اور طریقہ کو فروخت نہ کریں چار پانچ روپیہ کی نوکری کر کے اپنی اوقات بسری کر لیں، اور ہمارا مسلک طریقت میں قدم نہ رکھیں۔

زمانۂ رحلت سے کچھ پیشتر آپ اپنے اعزہ کی ایذا رسانی سے مجبور ہو کر دکن کی جانب تشریف لے گئے۔ برہان پور پہنچ کر حضرت شیخ محمد الیاس قدس سرہٗ کی ملازمت (صحبت و معیت) اختیار کی اور حضرت شیخ محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ نے سلاسل نظامیہ، قادریہ، شطاریہ، عمرانیہ، عثمانیہ کی سند خلافت و ہدایت عطا فرمائی، چندے قیام کے بعد برہانپور سے آپ وطن مالوف کو واپس تشریف لے آئے۔

کہا جاتا ہے کہ آپ کے یوم وصال اول آسمان پر گرد و غبار جمع ہو کر تاریکی ہو گئی، بعدہٗ بارش ہو کر مطلع صاف ہو گیا۔ آپ ۱۶ رجب ۱۰۹۳ھ کو اس عالم ناسوت سے عالم جبروت کے عازم ہوئے، مزار ایک باغ میں ہے جو کوٹ قاسم کی مشرقی جانب سر راہ واقع ہے، مرقد شریف سے پورب طرف تین صاحبزادوں کی قبریں ہیں، اور پچھم کی طرف گنبد میں چوتھے صاحبزادے کا مزار ہے، پائیں گنبد میں میر عبدالرحمٰن خلف میر حسن برہانپوری، آپ کے خلیفہ آسودہ ہیں۔ آپ کے وصال کی تاریخ آپ کے سلسلہ کے موجودہ بزرگ نے یوں بتائی:

ابوالعلائی، غوثی، چشتی / سہروردی و نقشبند ارشد
جب گئے خلد کو تھی سولہ رجب / حضرت لاڈخاں ولی امجد
اور ہزار و ترانوے ہجری / دیکھو امداد شیخ لعل احمد [1]
۱۰۹۳

[1] مسلسل مضمون ماخوذ از اذکار ابرار جدید صفحہ ۱۳۵ ـ مؤلف

آپ کے مزار پر مندرجہ ذیل قطعہ ثبت ہے :

حضرت لاڈ خاں ، محرم جان — نقشبندی و قادری چشتی
سہروردی و شاذلی ، زیدی — غوثوی ، ابوالعلائی ، شطاری
جب گئے خلد کو تھی سولہ رجب — اور ہزار و ترانوے ہجری

اور اس کے نیچے لکھا ہے :

منصوبہ ولی المجید شعیبی سجادہ نشین تجارہ : تیار کردہ : رحیم خاں بن نجف خاں ۔

حضرت شیخ لعل محمد عرف لاڈ خاں کے خلفاء میں میر عبدالرحمٰن اور شاہ غلام نبی فیروز پوری مخصوص بزرگ ہیں ، جن کے حالات خانقاہ کوٹ قاسمی کی موجودہ کتب میں مفصل درج ہیں[1] ۔ افسوس کہ وہ سارا ذخیرہ ۱۹۴۷ء میں جہل و بے خبری کی لہر کا شکار ہو کر فنا ہو گیا ۔

خانصاحبؒ کے سلسلۂ ابوالعلائیہ میں آنے کا دوسرا لطیفہ وہ ہے جسے سیدنا کے سوانح نگار محمد بشیر نے " سوانح میر ابوالعلاء قدس سرہٗ " میں درج کیا ہے :۔

" زور و طاقت میں پہلوان اور بڑے بہادر تھے ، جملہ فنون سپہ گری میں آپ کو ید طولیٰ حاصل تھا اور نہایت وجیہہ ، صاحب جمال ، یوسف مثال تھے ۔ اتفاقاً ایک مرتبہ آپ بطور سیر شہر اکبر آباد میں وارد ہوئے ، تمام شہر میں آپ کا شہرہ ہو گیا ، جس طرف کوچہ و بازار میں آپ نکلتے لوگ وہ قد و قامت اور حسن و جمال دیکھ کر حیرت میں آجاتے اور جدھر آپ چلتے بھیڑ کی بھیڑ تماشائیوں کی آپ کے گرد ہو جاتی ۔ ایک دن خانصاحب بازار میں اکبری مسجد کے نیچے کھڑے ہوئے بازار کی سیر کر رہے تھے ، تماشائی آپ کو گھیرے کھڑے تھے ، اتفاقاً اسی وقت امیر ابوالعلاءؒ

[1] سوانح میر ابوالعلاء ، ص

جامع مسجد سے بعد نماز جمعہ کے اپنی خانقاہ کو جا رہے تھے جب اکبری مسجد کے برابر پہنچے تو آپ نے بھی وہ بھیڑ ملاحظہ فرمائی ۔ خادموں سے پوچھا : یہ بھیڑ کیسی ہے ؟ ! عرض کیا گیا : " ایک سپاہی بڑے بہادر و شجاع ، اور حسن و جمال والے اس شہر میں تازہ وارد ہوئے ہیں ، انھیں کو گھیرے ہوئے لوگ ان کی صورت کا تماشا دیکھ رہے ہیں " ۔

آپ نے فرمایا : " بھائی ایسے شخص کو دیکھ لینا چاہیے " ۔ چنانچہ حضرتؒ خاں صاحبؒ کے قریب تشریف لے گئے ۔ اس وقت خانصاحب اپنی سپہ گری کے طنطنے میں ان تماشائیوں سے یہ کہہ رہے تھے کہ " اس شہر میں کوئی ایسا دکھائی نہ دیا کہ کچھ زور آزمائی مجھ سے کرتا ، خواہ بانک پٹے کے کچھ کرتب کرتا ، یہ بھی نہ سہی پنجہ کلائی تو کرتا " ۔

ہمارے حضرت نے مسکرا کر ان سے یہ فرمایا : " او میاں جوان سپاہی اس فقیر کو پنجہ کلائی تو کرنا نہیں آتا ، آنکھیں لڑانا آتا ہے ، چاہو تو مجھ سے آنکھیں لڑا لو " ۔ لوگ یہ سنکر متعجب ہوئے ، جونہی خاں صاحب نے حضرت کے چہرہ کی طرف نگاہ کی فوراً حضرت نے ایسا ایک تیر نظر مارا کہ خانصاحب تڑاق سے زمین پر گر پڑے اور مدہوش و بے خود ہو گئے ۔ حضرت خانقاہ کو تشریف لے گئے ۔ خاں صاحب کو جب افاقہ ہوا تو لوگوں سے کہنے لگے : " میرے مولا کا گھر بتا دو ، میرے ہادی کا گھر بتا دو " ۔ الغرض پوچھتے پوچھتے حضرت کی خانقاہ کی طرف چلے ، مگر نشہ شراب عشق الٰہی میں جھومتے اور یہ رباعی پڑھتے جاتے تھے :۔

نے غمزہ ، نہ ناز کشت مارا — مژگان دراز کشت مارا
ناحق بخلاف دشمن امروز — آں بندہ نواز کشت مارا

ترجمہ: [مجھے نہ غمزہ نے مارا ہے نہ میں قتیلِ ناز ہوں، میں لمبی پلکوں والی آنکھوں کا شکار ہوں، دشمن کے متعلق خواہ مخواہ بدگمانی ہے مجھے اس بندہ نواز نے مارا ہے۔]

جب خانقاہ شریف میں پہنچے حضرت نے اسی وقت مشرف بہ بیعت فرماکر حلقے میں یاران طریقت کے داخل کرلیا"۔

بہت تھوڑے عرصہ میں خان صاحب قدس سرہٗ ولی کامل و اکمل ہوگئے۔ بعد اس کے حضرت محبوب جل و علا نے خان صاحب کو خرقہ خلافت کا عطا کرکے فرمایا کہ اپنے وطن میں جاکر بیٹھو رہو، اور طالبان حق کو خدا کی راہ بتلاؤ۔ پھر خان صاحب مدۃ العمر اپنی بستی سے باہر نہ گئے، وہیں متوکل رہے، خوارق و کرامات خان صاحب کے بھی روشن تر عالم تھے، بڑا فیض آپ سے جاری ہوا ہے اور بہت لوگ آپ سے فیضیاب ہوئے۔

خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خلفاء میں سے دو شخص بڑے زور شور کے شیخ ہوئے ہیں۔

اول حضرت سیّد شاہ جلال الدین دھوی قدس سرہٗ،

ان کا مزار شریف دھلی میں قریب مسجد فتحپوری واقع ہے۔ (اب یہ مزار مسجد کے احاطہ میں ہے) اور ہر پنجشنبہ کو شہر کے لوگ وہاں فاتحہ کو جاتے ہیں۔ میاں شاہ نور علی علیہ الرحمہ، جن کی حویلی الہ آباد میں مشہور ہے، انھیں حضرت شاہ جلال دھوی قدس سرہٗ کی اولاد میں سے تھے[1]

حضرت شاہ ہدایت النبی ایک بزرگ تھے کہ ان کو بلا واسطہ صرف

---

[1] سوانح میر ابوالعلاء، ص

فیضان مزار شریف سے حضرت شاہ جلال قدس سرہٗ کے تکمیل سلوک کی ہوگئی تھی، اور بلحاظ سلسلۂ خاندان کے بیعت ان بزرگوار نے میاں شاہ علی علیہ الرحمۃ سے کرلی تھی۔

ایک زمانے میں حضرت شاہ ہدایت النبی قدس سرہٗ شہر عظیم آباد میں بھی وارد ہوئے۔ صاحب "تذکرۂ نجات قاسم" لکھتے ہیں کہ اس کاتب گنہگار نے بھی ان کی زیارت کی تھی، ہر چند یہ عاصی اس وقت بہت چھوٹا تھا مگر اتنا خیال ہے کہ قد شاہ صاحب کا بہت دراز تھا اور بہت بڑے اونچے کھڑاؤں پہنا کرتے تھے، لوگ کہتے تھے کہ شاہ صاحب کی عمر ایک سو سولہ برس کی ہے۔

دوم حضرت شاہ غلام نبی قدس اللہ سرہٗ فیروز پوری: حضرت میاں لاڈ خان رحمۃ اللہ

کے دوسرے خلیفۂ عظیم الشان تھے۔ بعد انتقال خان صاحب قدس سرہٗ کے سجادہ نشینی خان صاحب قدس سرہٗ کی خانقاہ کی اب تک شاہ غلام نبی قدس سرہٗ کی اولاد میں چلی آئی ہے[1]

میوات میں اس دوسرے سلسلہ کا فیض بہت عام ہوا ہے اور یہ خوب پھیلا ہے شاہ غلام نبیؒ کے خلیفہ خواجہ محمد شعیبؒ تجاروی ہیں۔ جن کی تربیت گاہ اور روحانی مرکز خانقاہ شعیبیہ کے نام سے تجارہ میں آباد و پُر رونق تھی، تجارہ میوات کے مرکزی اور اہم قصبات میں سے ہے، اس کے چاروں طرف خالص میوؤں کی آبادی ہے۔ چھوٹے گاؤں میں عموماً دوکانیں نہیں ہوتیں بہت معمولی قسم کی دوکانیں رہتی ہیں، عموماً ضروریات زندگی کے لئے قصبہ کا رُخ کرنا پڑتا ہے اور یہ خانقاہ تجارہ کے کئی راستوں کے سنگم اور مجمع الطرق پر واقع ہے۔ پھر کیا یہ ممکن ہے کہ روشنی ہو، اس کے طالب بھی ہوں پھر بھی استفاضہ نہ ہو سکے۔

---

[1] سوانح میر ابوالعلاء، مصدر مذکور بالا۔

حضرت شاہ نصر اللہ نصرتی

ولادت :- ۱۰۷۷ھ ۱۶۶۶ م مہم، ضلع روہتک۔

وفات :- ۱۴ رجب (سن نامعلوم)

مدفن :- مہم، ضلع رہتک۔

آپ مہم ضلع کے مشہور تاریخی خاندان خانوادہٗ صدیقی کے ایک اہم رکن ہیں ——، اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے عہد حکومت میں تولد ہوئے ۱۸۵۷ء اور ۱۹۴۷ء کے حوادث میں ایک مثنوی موسوم بہ 'جنون المجانین' کے علاوہ آپ سے متعلق تحریری مواد تمام غارت ہوگیا اصل کارنامے محو ہو چکے مگر خرق عادات واقعات کا ایک انبار رہ گیا ہے، عوام اسے ہی شان ولی اللہی سمجھتے ہیں مثلاً :-

حضرت شاہ نصر اللہؒ کے بھتیجے شاہ نجم اللہ دہلی کے قلعۂ معلیٰ میں کتاب دار یعنی شاہی کتب خانے کے ناظم تھے ایک روز شاہ نصر اللہ اس کتب خانے میں تشریف لے گئے اور ایک کتاب طلب فرمائی، شاہ نجم اللہؒ نے کتابوں کی ایک گڈی پر چڑھ کر اوپر سے وہ کتاب اتار دی، اس گڈی میں کلام پاک کا ایک نسخہ بھی تھا، اس جسارت پر آپ نے سرزنش فرمائی، نوجوان شاہ نجم اللہ نے کہا : "اگر قرآن پر قرآن رکھ دیا جائے تو کیا حرج ہے" - اس غرور، زہد و علم پر آپ نے اظہار ناراضگی فرمایا، اور کہا کہ اگر تمہیں اپنے علم پر اس قدر ناز ہے تو آؤ اور قرآن کی پہلی سورت سناؤ، اب شاہ نجم اللہ اس قدر حواس باختہ ہوئے کہ بسم اللہ بھی بھول گئے، متصوفانہ زبان میں یوں کہئے کہ مرشد نے جو کچھ سکھایا وہ اپنے تصرف باطنی سے واپس لے لیا بھتیجے سے کہا کہ تم اس منصب کے لائق نہیں، میرے ساتھ چلو۔

ایک روز ایک مرید ہم سفر تھا، راستہ میں دریا پڑا، شاہ نصر اللہ نے فرمایا: "میرا ہاتھ تھام لے اور نصر اللہ کا ورد کرتا چل"، عین منجدھار میں پہنچے تھے کہ مرید نے پیر و مرشد کو اللہ کے نام کا ورد کرتے سنا تو وہ بھی بجائے نصر اللہ کے 'اللہ اللہ' کہنے لگا، مگر فوراً ہی ڈبکیاں لینے لگا، آپ نے اسے بازو سے سہارا دیا اور فرمایا : "تجھے کیا معلوم کہ اللہ کیا ہے، تو نصر اللہ کہتا چل، اس نے نصر اللہ کا ورد شروع کر دیا اور دونوں دریا کو پار کر گئے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کرا دیا کرتے تھے .... آپ کی چچازاد بہن بی بی ساجدہ زوجۂ شاہ لطف اللہ سہ ہزاری و نائب گورنر لاہور، کئی روز تک اصرار کرتی رہی کہ زیارت کرائی جائے، ایک دن آپ نے فرمایا : اچھا تو لال جوڑا پہن کر خوشبو لگالے، میں ابھی آیا"۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے شوق میں یہ خاتون سج دھج کر بیٹھ گئیں، آپ باہر سے ان کے خاوند شاہ لطف اللہ کو بلا لائے اور فرمایا : "لطف اللہ! تیری بیوی کا دل تجھ سے بھر گیا ہے، دیکھ یہ دوسرے بیاہ کی تیاری کر رہی ہے"۔ ان الفاظ نے اس عفیفہ پر بجلی کا کام کیا، وہ رونے لگیں اور روتے روتے سو گئیں اور زیارت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مشرف ہوئیں۔ وغیرہ۔ مگر ایسے واقعات سے سیر و سوانح مرتب نہیں کی جا سکتی۔

اس سلسلے میں آپ کی فارسی مثنوی جنون المجانین سے آپ کے حالات و معتقدات کا کچھ علم ہوتا ہے[1]

مثنوی کی شہادت ہے کہ اس کے مصنف کا نام نصر اللہ اور تخلص نصرتی تھا، فنا فی الرسول ہونے کے باعث اپنے آپ کو غلام احمد اور فانی فی اللہ ہونے کی حیثیت

---

[1] ص ۹۴ مآثر الاجداد

وجہ اللہ بلا تکلف لکھ دیتے تھے ؎

برغلام احمد خود کن نظر　　　تا شود مقبول اے خیر البشر

ان کے والد حضرت مفتی عزیز اللہ شہیدؒ ابن مفتی حبیب اللہ تھے۔

حضرت صدیقؓ آں جدّ من است　　　حضرت فاروقؓ آں سدّ من است

نصرتی صدیقی آمد در نسب　　　نصرتی نعمانی آمد در حسب

والدِ شیخم عزیز اللہؒ بود　　　عالم و فاضل، خدا آگاہ بود

آں حبیب اللہ مفتی جدّ من　　　بود روزے مکتبم در جدّ من

تمام تعلیمی مراحل اپنے والد بزرگوار مفتی عزیز اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے سایۂ عاطفت میں طے کیے :

ایں علوم و ایں تجلیاتِ حق　　　شد مرا از فیض والا در سبق

مخوحق آں شیخ من عبد العزیز　　　مرشد من بود او در جملہ چیز

مثنوی کے آغاز میں مصنف نے سہروردیہ اور نقشبندیہ سلاسل کے ان خانوادوں کا تذکرہ کیا ہے جن سے آپ کو عقیدت تھی، نو سال کی عمر میں آپ ابوالعلائیؒ سلسلہ کے بزرگ سید جلال سے متاثر ہوئے اور ان کے انتقال پر ایک عرصہ تک ان کے روضہ کی خاکروبی کرتے رہے :

مدتے بر روضۂ شیخ جلال　　　خاکروبی کردہ ام من ماہ و سال

سلسلۂ بیعت آپ کا خواجہ عبد الرحمٰنؒ — حضرت سید جلال الدین صوفی دہلوی کے پیر بھائی — کے مرید تھے، جو خواجہ لعل محمد عرف شیخ لاڈخاں کوٹ قاسم کے خلیفہ تھے، ان کا مرقد بھی کوٹ قاسم میں خواجہ لعل محمد کے جوار میں ہے ؎

عبد رحمٰن آں امام اہل خرد　　　نام نصر اللہ وجہ اللہ کرد

قبلہ من روئے رحمانی بود　　　کعبۂ من جان سبحانی بود

در ربیع الاول ماہِ وفات　　　پائے بوسش حاملم شد اے ثقات

از زمان ہجرت خیر البشر　　　بود یکصد یک ہزاری خوش سیر

در سیوم تاریخ ماہِ نقشبند　　　گشتہ ام از صوفیان حق پسند

فقہی مسلک میں حضرت شاہ نصرتیؒ اہل سنت و جماعت اور طریقۂ حنفیہؒ کے پیروکار تھے۔

نصرتی دارد عقائد را درست　　　بر طریق اہل سنت نیست سست

بوحنیفہؒ آں سراج امت است　　　پیشوائے عالمان ملت است

کوہ طور ایں دیدۂ بینا بود　　　بے علوم بوعلی سینا بود

آپ نے جس طرح راہ سلوک طے کی اس کا اس مثنوی میں کہیں کہیں ذکر آیا ہے مثلاً فرماتے ہیں :

"مجھے ابتدا سے عشق الٰہی ہے طفلی میں مجھے جنون سا ہو گیا تھا (جنون ذہنی مفاد سے توجہ ہٹا کر ہمہ تن اللہ کی طرف متوجہ ہو جاتا) پانچ سال کی عمر میں اپنے جدّ بزرگوار مفتی حبیب اللہ متوفی ۱۲۹۳ھ کے مکتب میں حاضری دیتا تھا جس سے میرے ضمیر میں سارا گھر بڑا ہو گیا۔ جس روز میری بسم اللہ کرائی گئی تھی اسی دن میں سب کچھ سیکھ گیا، نو سال کی عمر میں والد بزرگوار نے مزید حصول علم کے لیے طلب فرمایا، وہاں میں سید جلالؒ سے ملا کہ پہلی ہی نظر میں سب خواندہ بھول گیا سید جلالؒ نے والد صاحب سے فرمایا: "آپ کا سعادت مند بیٹا اس نو عمری میں قطب کے درجہ پر پہنچ گیا ہے"، چالیس یوم تک مجھ پر جذب حق کی واردات ہوتی رہی، تو حضرت والد نے فرمایا: "علم دین حاصل کرو" ان کے ارشاد پر میں نے پڑھنا شروع کیا، دوسرے بچوں کی طرح قرآن کریم ختم کر لیا مگر دھیان سے غافل نہ تھا۔ پھر میں نے والد صاحب

سے عرض کیا: "آپ مجھے قرآن حفظ کرا رہے ہیں اور میرا دل ہر وقت یادِ الٰہی میں لگا رہتا ہے، مجھ پر نورِ حق کی تجلیات ہوتی رہتی ہیں، میں بے اختیار ہو جاتا ہوں جس سے نسیان ہو گیا ہے"۔ والد نے فرمایا: "بیٹا یہ شیطانی وہم ہے علمِ قرآن حاصل کرو تاکہ یہ توہمات دور ہو جائیں۔ صحیح راستہ تعلیمِ دین یعنی قرآن ہے، اسی سے خدا راضی ہوتا ہے"۔

بشنوید اے عاشقانِ باصفا پارۂ حالِ من از راہِ وفا
نصرتی روزے کہ از مادر بزاد غیرِ عشقِ حق ازو نامد بیاد
سرِّ اُنْ اُعْرَفْ ازو ظاہر نمود کنت مخفیا ازو باہر نمود
نصرتی را بود در طفلی جنوں اولیا بودند اورا ہمنموں
ہادیانِ راہ یعنی انبیاء ظلِّ شاں بر نصرتی بودے فنا
نصرتی در مکتبِ مولائے خویش گفت بسم اللہ و فارغ شد ز بیش
چوں معلم دید حالِ نصرتی گفت خوش خوش بخ بخ اقبالِ نصرتی
آں حبیب اللہ مفتی جدِّ من بود روزے تبسم در جدِّ من
سادہ بود آں مرد از وہم عقول ظلِّ خویش انداخت برمن آں قبول
سادگی بانش مرا ہم سادہ کرد وہم و عقلم بندہ از سجادہ کرد
بعد ازاں دیوانگی برمن نمود آیت ہجرت بمن آید فزود
آیت ہجرت کتاب والدی آیت ہجرت خطاب والدی
حضرت والد طلب کردہ مرا شوقِ دیدارش طرب کردہ مرا
بدعز بزاز شہ نام پاکِ او جامِ رحمت از خدا بر خاکِ او
اَصْلَحَ اللّٰہُ الکَرِیْم سِرَّہٗ قَدَّسَ اللّٰہُ الرَّحِیْم سِرَّہٗ
در طلب از بہرِ علم خود شدم مجمل خود را مفصل می بدم

تا بدہلی رفتہ بودم اے جواد روزِ اوّل جذبِ حق برمن فتاد
جذبِ حق برمن چناں شورش نمود کز الف با تا فراموشے فزود
یک نگاہے سید شاہ جلال کرد نفس ما دراں دم از جلال
من ز بیہوشی شدم مدہوشِ حق من ز بے خویشی شدم از جوشِ حق
با پدر گفتا کہ ایں فرزندِ تو قطبِ حق گردد سعادتمندِ تو

اپنے مولد و مستقر مہم ضلع روہتک کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

ایں مہم را قبۃ الدہلی بخواں در مہم ایں علم بعد از من مخواں
الہم روح السلم رفع الاکم حسن وجہ اللہ فیہ ہو الاُتم
ربّنا فابق بباقی وجہنا ربّنا فاسق بساقی وجہنا
ہادیٔ شاں شو بدینِ احمدی معرفت شاں دہ بنورِ سرمدی
دین دنیا را بایشاں کن وفا برمنِ مسکین خود کن ایں عطا

یہ مثنوی ۹-۱۱۰۹ھ/ ۳-۱۶۹۸م میں مکمل ہوئی اس وقت آپ کی عمر تینتیس سال تھی[1]

سالِ عمرِ من سی و سہ سال بود کایں جنون الاولیا در من نمود
از زمانِ ہجرتِ خیرالانامؐ یک ہزار و یکصد و نہ بود تام
در مہم بودیم در شہرِ صیام منتہا شد ایں کتابِ نیک نام

---

[1] ص ۳۸-۳۹ آثارالاجداد

شیخ المشائخ حضرت شاہ غلام نبی قدس سرہٗ فیروز پور جھرکہ

آپ اپنے دور میں سلسلۂ نقشبندیہ کے میوات میں بڑے اہم ستون تھے اس سلسلہ میں ذکر واوراد سے زیادہ اتباع سنت پر زور دیا جاتا ہے۔ تربیت و سلوک میں آپ کا مقام بلند تھا۔ حضرت میاں لال خاں کوٹ قاسم کے اجل خلفاء میں سے تھے، بلکہ سلسلہ کی نشر و اشاعت میوات کی حد تک آپ ہی سے وابستہ تھی آپ کی پیدائش اور ابتدائی حالات معلوم نہ ہو سکے۔ البتہ تاریخ وفات ۲۱ رمضان ۱۱۵۵ھ / ۱۷۴۲ء ہے مزار آپ کا قصبہ فیروز پور جھرکہ کے جانب شرق، قلعۂ خام کے قریب نئی عیدگاہ کے پاس ہے اور آپ کی خانقاہ اندرون قلعہ نواب خان زماں خاں، جانب غرب پیر جی والی مسجد میں تھی اس کا نام "پیر جی والی" آپ ہی کے قیام کی بدولت ہوا۔

آپ کے خلفاء و مجاز کی تعداد صحیح طور پر معلوم نہیں، البتہ آپ کے سب سے بڑے خلیفہ شاہ محمد شعیب تجاروی ہوئے ہیں جنھوں نے آپ کے نام اور کام کو خوب روشن کیا۔

آپ کا ایک قلمی منظوم رسالہ "پند نامہ" ہے جو میاں محمد شعیب صاحبؒ کے خاندان سے متعلق دوسرے قلمی رسائل کے ساتھ مجلّد ہے۔ اس کے آخر میں یہ عبارت ہے۔

> "پند نامہ عشق انگیز کہ مناسب احوال زمرۂ عشاق است بفضل اخص شمع افروز بزم حسن و عشق کہ ہر دو را مستنیر انوار خورشید حقیقت اند بتاریخ دوئم ربیع الثانی سنہ یکہزار و یک صدی و نود و یک ہجری باتمام رسید من تصنیف خلیفہ غلام نبی ساکن ریواڑی کہ

مرد قابل بودند[1]

حضرت شاہ محمد شعیب قدس سرہٗ

شاہ محمد شعیبؒ سے قصبہ تجارہ میں سجادگی کا سلسلہ شروع ہوا، اور چھتہ محلہ قاضی واڑہ میں خانقاہ شعیبیہ قائم ہوئی۔ صدر دروازہ پر۔ خانقاہ شعیبیہ تجارہ ۱۱۵۴ھ / ۱۷۴۱ء لکھا ہوا ہے۔

شاہ محمد شعیب کے دادا علی محمد بن علی اکبر بن عبدالسلام بن محمد مراد ترخی (Ration Controller) نے تجارہ کے محلہ قاضی واڑہ میں چھتہ بنوایا ۱۰۸۵ھ / ۱۶۷۴ء نواب خاں زماں خاں بہادر کے عہد میں خدمت کروڑ گیری وغیرہ دار الخلافہ کی ان سے متعلق تھی۔ بہت صاحب اقبال شخص تھے۔ قاضی عبدالباقی صاحب[2]

---

[1] مقدمہ مفاتیح الغیب ص ۱۰، حکیم سید ظل الرحمٰن تجاروی

[2] قاضی عبدالباقی صاحب بڑے صاحب اقتدار و ریاست تھے، علم و فضل میں بے نظیر تھے۔ انھوں نے ہی قصبہ تجارہ میں باغات اور حویلیوں کی تعمیر کرائی، محلہ کے عالی شان دروازے بنوائے، اپنے بیٹے قاضی محی الدین کی شادی میں ہانڈی شیرینی تمام مضافات میوات میں تقسیم کی اور اپنے والد قاضی محمد ابراہیم کی فاتحہ خوانی بڑے دھوم دھام سے کرائی۔ قاضی محمد ابراہیم نے ۲۵ محرم الحرام ۱۰۷۶ھ / ۱۶۶۵ء میں وفات پائی تھی قطعۂ تاریخ وفات یہ ہے۔

چو قاضی ابراہیم شریعت پناہ	گذشتہ زعام خداوند راہ
خرد گفت تاریخ فوتش بگو	الف واؤ میں از محرم بماہ

۱۰۷۶

قاضی عبدالباقی شہنشاہ ابو المظفر غازی محی الدین اورنگ زیب کے حضور میں حاضر رہتے تھے، شہنشاہ ان کے علم و فضل سے بہت خوش تھے، چنانچہ ان کو مضافات تجارہ پر

باقی حاشیہ ص پر

انھیں کے زمانہ میں محلہ قاضی واڑہ کے عالی شان بلند دروازے درست کرائے تھے ۔ علی محمد صاحب کروڑی کے بڑے صاحبزادے عبدالواحد صاحب کا قصبہ سکرس ضلع گوڑگانوہ میں بی بی اللہ رکھی دختر ابومسلم سے نکاح ہوا ۔ ان سے شاہ محمد شعیبؒ پیدا ہوئے ، تاریخ ولادت حسب ذیل قطعہ سے ظاہر ہے ۔

چہ گویم حالت جسم عناصر — رود ایں آب و خاک آتش باد
بخاطر رفت تاریخ ولادت — بگوید تا کند عمرم کے باد
شب بست و دوم شہر رمضان — فقیر آمد بکوے حسرت آباد

میاں محمد شعیبؒ نے سترہ سال کی عمر میں حضرت شاہ غلام نبی رحمۃ اللہ علیہ ۔ فیروزپور جھرکہ ۔ سے بیعت کی میاں صاحبؒ کے والد شیخ عبدالواحدؒ کا وصال ۳ رجمادی الاول ۱۱۴۱ھ (۱۷۲۸) اور والدہ کا انتقال جمعہ ، ۷ رجب ۱۱۸۲ھ (۱۷۶۸) میں ہوا رحمہا اللہ تعالیٰ[1]

بقیہ حاشیہ صفحہ ۔

اختیار دیا تھا کہ وہ جس کو اہل پائیں اس کو عہدۂ قضاء پر مقرر کر دیں ہمارے سامنے امتحان کی ضرورت نہیں ہے عین جوانی میں ۳۰ رجمادی الاول ۱۱۱۳ھ (۱۷۰۱) تاریخ وصال ہے ۔

بزرگ زماں قاضی عمر بود — زمیداں ایں گوئی نیکی ربود
ز مرگش جہاں دیدہ پرخوں شدہ — فلک دست افسوس بر سر سود
چو تاریخ فوتش بجستم ز دل — بگفتہ بشنو گو خدا دوست بود
۱۱۱۳

مقدمہ مفاتیح الغیب ص (۹-۱۰)

[1] مقدمہ مفاتیح الغیب ص ۱۰ - ۸

میاں محمد شعیبؒ صاحب تصنیف اور بہت بافیض بزرگ گذرے ہیں انکی کتابوں میں اذکار الابرار ، احوال الاخیار ، نگارستان مسلمان اور منظوم تاریخ تجارہ ہیں میر مسلمان[1] متوفی ۱۱۴۸ھ (۱۷۳۶) میاں محمد شعیبؒ کے استاد تھے انہی کے نام پر یہ کتاب ہے ۔

قصبہ سکرس شاہ محمد شعیبؒ کا ننہال بھی تھا اور سسرال بھی چنانچہ آپ کی پہلی شادی اپنے ماموں کے گھر امراۃ النساء سے ہوئی جن سے ایک دختر عظمت النساء پیدا ہوئیں ۔۔۔ دوسرا نکاح بھی آپ کے بڑے ماموں محمد مکارم کی لڑکی سے ہوا جن سے تین لڑکے : محمد یونس ، محمد یحییٰ اور سمیع اللہ پیدا ہوئے اور دو لڑکیاں : بخت دولت اور صاحب النساء پیدا ہوئیں ۔

---

[1] نگارستان مسلمان میں میاں محمد شعیب لکھتے ہیں " میر مسلمان عبدالغنی خاں بن خواجہ عبدالرحیم خاں علیہم رحمۃ اللہ الغفران ۔ دہلی کے باشندوں میں عزت و حرمت میں مشہور تھے اور صاحب مقدرت تھے متصل درگاہ شاہ پیرا جو راہ بر سر بازار ان کا مکان تھا جس میں وہ سکونت فرماتے تھے ۔ حضرت میر صاحب کے دادا شہنشاہ عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے مقرب و معتمد تھے اور وقت مجرا و سلام حضور بادشاہ ان سے ہمکلامی فرماتے تھے ، عالمگیرؒ نے ان کے انتقال پر ایک رقعہ میں اظہار افسوس کرتے ہوئے لکھا ہے " وہ دیندار اور متقی تھے ، بہادری و شجاعت میں مرتبۂ کمال رکھتے تھے نیز عالمگیر نے ان کے لڑکوں کے حالات سے اپنے کو مطلع رکھنے کی ہدایت کی ہے اور عنایت اللہ خاں کے واسطے حکم دیا ہے کہ ان کے ہر لڑکے کے ساتھ رعایت کی جائے ۔
(نگارستان مسلمان قلمی ص ۲ ، رقعات عالمگیری مطبوعہ نامی پریس لکھنؤ ۱۳۱۱ھ (۱۸۹۴ء) رقعہ ۲۳ ص ۲۹) مقدمہ مفاتیح الغیب ص ۱۲ ۔

حضرت مولانا شاہ محمد رکن الدین صاحب الوری

پیدائش۔ وفات۔

آپ شیخ الاسلام حضرت عبداللہ انصاری رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں ہیں اور ان کا نسب نامہ حضرت ابوایوب انصاری ؓ سے جا ملتا ہے جن کا کاشانہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے بعد آپ کے قیام پذیر ہونے کی بدولت بقعۂ نور اور چمنستان رشد وہدایت بنا اس کے گھر کے بچوں کی سعادت کے بارے میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں زمانہ تنزل انحطاط سے دوچار ہونے کے باوجود جبلی اور خونی اثرات کو کلیۃً نہیں بدل سکتا، جب اس خانوادے کے منبع سے عرفان ویقین اور ہدایت وایمان کے چشمے پھوٹے ہیں اور دنیا کو سیراب کیا ہے تو اس کے افراد بیت نے بھی اپنی قسمت کے اس جام بلوریں کو بڑھ کر خود اٹھانے میں یقیناً سستی وکاہلی سے کام نہ لیا ہوگا۔

آپ کے خاندانی حالات معلوم نہ ہو سکے البتہ آپ کے والد صاحب موضع کیتھر متصل نوح ضلع گوڑگانوہ میں قیام پذیر تھے، یہاں کے باشندوں نے ان کی قدر کی پھر وہ یہیں کے ہو رہے۔ وہ طبیب بھی تھے، اس مقام کو گوشہ عافیت سمجھ کر اور گاؤں والوں کی پذیرائی دیکھ کر یہیں خدمت خلق میں مشغول ہوئے، اور پوری زندگی یہاں گزار دی۔

ان کے کوئی اولاد نرینہ نہ ہوتی تھی۔ مدراس کے ایک بزرگ جو سلسلۂ قادریہ سے تعلق رکھتے تھے، چلتے پھرتے یہاں آنکلے، جب ان کے سامنے اس کا ذکر آیا تو انھوں نے چلہ کھینچا اور حکم دیا کہ چلہ کے دوران کسی عورت کے ہاتھ کی روٹی ہمیں نہ ملے دن رات میں ایک روٹی تناول فرماتے تھے، اور وہ بھی صرف افطار کے وقت، آپکے

والد صاحب خود باوضو ہو کر اپنے ہاتھ سے وہ روٹی پکاتے تھے، چلہ ختم ہوا تو حجرہ کا دروازہ کھول کر مژدہ سنایا کہ رب تبارک وتعالیٰ فرزند عطا فرمائے گا اور ان کا وجود کاملین سے ہوگا۔ ان کا نام رکن الدین رکھنا۔ چنانچہ یہ نام تحریر کر لیا گیا۔

ان بزرگ کے کہنے کے مطابق آپ کی پیدائش ہوئی۔ آپ کی پیدائش کے چھ سال بعد آپ کے والد کا انتقال ہو گیا۔ ازاں بعد آپ ریاست الور کے صدر مقام الور شہر میں اپنے ماموں شیخ فریدالدین کے پاس آگئے پھر عمر بھر الور ہی میں رہے، اور یہیں وصال ہوا۔ الور اسٹیشن سے دہلی کی طرف ریلوے لائن سے متصل ہی دو فرلانگ پر آپ کا مزار ہے جسے ۱۹۴۷ء میں بلوائیوں نے توڑ پھوڑ کر زمیں دوز کر دیا تھا، خدا بھلا کرے اور کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے حضرت مولانا ابراہیم متوفی ۱۹۷۰ء کو جنھوں نے ۱۹۴۷ء کے فوراً بعد ہی یہاں اپنا ڈیرہ ڈال دیا، اور یہ مسجد و مزار دوبارہ وجود میں آگئے رحمہا اللہ تعالیٰ۔

تعلیم وتربیت ابتدائی تعلیم اپنے ماموں سے ہی حاصل کی، وہ فارسی کے استاد کامل تھے، مرزا غالب کے ہم عصر تھے، الور شہر کے بڑے بڑے رؤسا ہندو مسلم ان کے شاگرد تھے، پھر وہیں خوشنویسی کی طرف توجہ کی۔ الور شہر ۱۸۵۷ء کے بعد خوشنویس خطاطوں کا مرکز تھا۔

رئیس کی قدردانی نے اہل فضل وکمال کو الور میں کھینچ لیا تھا، پھر دوسرے علوم وفنون کی تکمیل کی اس کے بعد آپ کے دل میں طلب حق پیدا ہوئی، اور دل سب طرف سے ہٹ کر خدا جوئی میں مصروف ہو گیا جو مقصد آفرینش آدم ہے۔ یہ راہ پیر سے ملتی ہے، جب آپ کو مرشد کی تلاش ہوئی تو قدرت نے آپ کی یہ خواہش گھر بیٹھے پوری فرما دی کہ دہلی جامع مسجد فتحپوری کے امام امام العارفین حضرت مولانا شاہ رحیم بخش

المشہور بہ محمد مسعود شاہ اور تشریف لائے ، آپ زیارت کے لیے حاضر ہوئے ملاقات سے دل متاثر ہوا ، بیعت ہو گئے ۔ کہتے ہیں کہ بیعت ہونے سے قبل ایک مجذوب سے آپ نے دریافت کیا کہ حضرت کیسے ہیں ؟ بیعت ہو جاؤں ؟ اس وقت وہ اپنی دھن میں مٹی سے کھیل رہا تھا ، اسے چھوڑ دیا اور کہا : ہو جا ، ہو جا ۔ گویا گھر بیٹھے تمنا دل بر آئی ۔ آہ سچ کہا ہے کسی نے ؎

ہر کجا دردے دوا آں جا رود	ہر کجا فقرے نوا آں جا رود
ہر کجا مشکل جواب آں جا رود	ہر کجا تشنہ است آب آنجا رود
آب کم جو تشنگی آور بدست	تا بجوشد آبت از بالا و پست
سایۂ شاہاں طلب ہر دم شتاب	تا شوی زاں سایہ بہتر ز آفتاب

گھر بیٹھے یہ گوہر نایاب ملنے کے جو بھی اسباب ہوں ، مگر آپ نے اس سلسلہ میں جو آپ بیتی بیان فرمائی وہ قابل توجہ ہے ، فرماتے ہیں کہ ہمارے مکان کے قریب ایک ہندو ضعیفہ بیوہ رہتی تھی جس کو ٹھکرانی کہتے تھے ، اس کے یہاں ردی کاغذات بہت جمع ہو گئے تھے ، ایک روز اس نے ہم سے ردی کاغذ دیکھنے کو کہا کہ بے کار ایک طرف کر دو اور کام کے ایک طرف ۔ چنانچہ ہم نے ردی کے کاغذات دیکھے تو ان میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا ایک قلمی رسالہ ملا جس میں لکھا تھا کہ جسے شیخ کامل کی تلاش ہو وہ فلاں صیغۂ درود کے ساتھ فلاں وظیفہ مندرجہ شروط کی رعایت سے پڑھے انشاء اللہ شیخ کامل گھر بیٹھے مل جائے گا ۔ (کاش صیغۂ درود اور وظیفہ کی تشریح کر دیتے تو اوروں کا بھی بھلا ہوتا) ۔ ہم خوش ہوئے اور اس سے دریافت کر کے گھر لے آئے اور حسب شرائط اس پر عمل شروع کیا ۔ کچھ ہی عرصہ بعد حضرت اور تشریف لے آئے ۔

میں جب بیعت کے لیے حاضر ہوا تو جو لوگ وہاں حاضر تھے انھوں نے

کہا کہ آج حضرت کے ایک قوی الاستعداد مرید کا انتقال ہو گیا ہے آپ کو اس کا صدمہ ہے ذرا توقف کرو ۔ حضرت نے اندر سے آواز سنکر حاضر ہونے کا اشارہ فرمایا ، اندر آتے ہی مجھے شرف بیعت سے نوازا ۔ بعد میں اعلیٰ حضرت نے فرمایا :

"الحمد للہ جو رنج تھا وہ دور ہو گیا اور وہ تمام نسبت و فیض یہاں منتقل ہو گیا"

اس کے بعد آپ کے مرشد پانچ سال اسی عالم آب و گل میں رونق افروز رہے ۱۳۰۹ھ میں رحلت فرمائی ، وصال سے ایک ماہ پیشتر دہلی میں خلافت سے نوازا اور طریقۂ نقشبندیہ میں مجاز بنایا

نقل اجازت نامہ اعلیٰ حضرت دہلی رحمہ اللہ تعالیٰ

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ، نحمدہ و نصلی و نسلم علی سید الطائفۃ الصوفیۃ الصافیۃ الکرام البررۃ محمد و آلہ و آلہ اجمعین :۔ اما بعد ، پس می گوید فقیر شیخ رحیم بخش ملقب بہ محمد مسعود نقشبندی دہلوی وقتیکہ بجذبۂ الٰہی و داعیہ سرمدی مسمی شیخ رکن الدین الوری بشوق و رغبت خود رجوع بفقیر آوردہ داخل طریقۂ انیقہ علیہ نقشبندیہ شد و تا عرصۂ پنج سال مجاہدہ و ریاضات کشید و درین ضمن نسبت قلبیہ و لطائف ستہ باحسن وجہ نصیب او گردید ، و تصرف قویہ ایں قدر حاصل گشتہ کہ در صحبت او ہر کہ آمد بہدایت ابدی آمدہ ، و لہٰذا اجازت یافتند ناچار او را بنظر انتشار فیضان محمدی علیہ الصلوٰۃ والسلام برائے ہدایت طالبین اجازت دادہ شد کہ بسعی تمام برآں توجہ نمودہ بوصل خدائے تعالیٰ رسانند و ثواب عظیم و اجر فخیم حاصل کنند بمنہ و فضلہ تعالیٰ ، وصیت کردہ می شود بحسن سعی بطالبین خدا محبت بافقرا ، انسیت و شفقت باغربا ، و تنفر

بصحبت اغنیاء و اہل دنیا، و اتفاق و صحبت با یاران طریقت، و اتحاد
و صحبت با اہل طریقت و حقیقت و صلی اللہ علی خیر خلقہ محمد و آلہ و اصحابہ وسلم۔
محمد مسعود نقشبندی مجددی امامی دہلوی۔

مسجد ڈھنکپوری ہمایوں کے زمانے کی بے ویران تھی حضرت نے آباد فرمائی اور
اور ایک ہی کیا سینکڑوں ویران مساجد کو آباد و معمور بنا دیا تبتل و عزلت گزینی بھی ایک
دور میں آپ پر غالب رہی، اسی دوران اجمیری خواجہ کی طلبی پر اجمیر حاضری دی اور سلطان
غریب نواز کے فیوض و برکات سے متمتع ہوئے، پھر حق تعالےٰ نے آپکو حرمین کی زیارت
مرحمت فرمائی اس سلسلہ میں آپ کے نالہائے تب و تاب اور صدائے شوق قابل دید ہے

تو خبر جلد یا نبی دل کی — کس پہ ظاہر کروں لگی دل کی
کوئی بھی دل لگی نہیں دل کی — کس طرح بجھے لگی دل کی
کیا سبب ہے بلا سبب تو نہیں — آج جو بیکلی ہے دل دل کی
کوئی پوچھے تو کیوں گئی کملا — کل تو ابھی تھی یہ کلی دل کی الخ

حج سے فارغ ہو کر حضرت خواجہ ضیاء معصوم رحمۃ اللہ علیہ سے فیض حاصل
کرنے ان کی خدمت میں حاضری دی، وہ زبردست عالم و فاضل اور اونچے درجہ
کے بزرگ ہیں اور امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی کی اولاد میں ہیں
آپ جب ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اوّل ملاقات کے یہ الفاظ تھے:۔
"از شما معرفت سابقہ ہست" — پڑھ، پڑھ — پاس بٹھلایا
آپ کا ارشاد ہے کہ جب میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا، سب کو ہٹا دیتے اور
فرماتے:۔ "ہم کو مولوی صاحب سے تنہائی میں بات کرنا ہے" بہت کچھ اسرار کی
باتیں ہوئیں، اور کمال عنایت کے ساتھ چشتیہ، قادریہ، نقشبندیہ نسبتیں القاء
فرمائیں نیز نسبت اویسیہ، جو حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر جاکشی

کے وقت حاصل ہوئی تھی وہ بھی دی۔ اجازت نامہ اپنے ہاتھ سے تحریر فرمایا اور
بیت اللہ کے سامنے کھڑے ہو کر دیر تک دعا فرمائی:۔

بعد حمد و صلوٰۃ حقیر عباد اللہ ضیاء معصوم از اولاد امام ربانی
حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ می گوید کہ فرزند عزیز الوجود حاجی
الحرمین الشریفین زادہا اللہ تعظیماً و تشریفاً و تنویراً شیخ محمد رکن الدین
سلمہ ربہ را کہ سابق مجاز بطریقہ مبارکہ نقشبندیہ بودند و ہستند۔ ایں
حقیر عباد اللہ قابلیت و لیاقت بشارالیہ دیدہ و شب حضور خانہ
کعبہ شریفہ زادہا اللہ شرفاً ایں خیال وقوع یافتہ بدل افتاد بطریقہ
نقشبندیہ مجاز آ و اویسیہ کہ بایں حقیر است و بطریق قادریہ شریف
و بطریق چشتیہ نام بردہ اجازت کردم کہ حق تعالیٰ بفضل و کرم
بے غایت خود کہ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَاءُ
وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ است فرزندم محمد رکن الدین
سلمہ اللہ و تلامذہ او راکہ داخل طریق شریف می شوند فیضیاب گردانید
بمقاصد خودہا برساناد و بعزۃ ہذا البیت المکرم زادہ اللہ شرفاً۔
——— ضیاء معصوم سرہندی

ان گرانقدر نوازشات سے مالا مال ہو کر آپ نے تبلیغ اسلام کی طرف
توجہ فرمائی، الور شہر اگرچہ اسلامی شہر تھا مگر بدعملی تو انسانی معاشرہ کا جزو لاینفک ہے
الور کے ماحول میں میو قوم آباد تھی۔ اب سے پچاس ساٹھ سال پیشتر پورا علاقہ میوات
آپ کے فیوض و برکات سے مالا مال تھا، جگہ جگہ خانقاہیں، اور مدرسے تھے، آپ
نہایت سنجیدگی سے لوگوں کو احکام شرع کی طرف مائل کرنے کی سعی فرماتے اور
حب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب آپ کی خصوصی توجہ تھی کہ یہ اصل ایمان ہے۔ مگر

پسندؒ کچھ اس طرح کا ہے کہ اس میں افراط و تفریط سے دامن بچائے رکھنا کارے دارد ہے۔ محبت کے نشے میں لوگوں سے ایسی حرکتیں سرزد ہو جاتی ہیں کہ محبت کی لطافت و پاکیزگی اس کی متحمل نہیں، اور پھر محبت محبوب سے بُعد کا باعث بن جاتی ہے مگر افراط و تفریط سے پُر اس جذبہ کی اصلاح اس طرح نہیں ہو سکتی کہ انھیں بدعتی کہہ کر ان کے ہر ہر وظیفۂ حیات کی مخالفت کی جائے جیسا کہ آپ کے بعد لوگوں نے عام طرز اصلاح بنا لیا۔

محبت و شریعت دونوں ساتھ ساتھ ہوں تو کام چلتا ہے چنانچہ آپنے دونوں ہی پہلوؤں کا دھیان رکھ کر کام کیا، محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تلقین اور شریعت کی تعلیم و تبلیغ اور تصوف و سلوک کی نشر و اشاعت سے معاشرہ کو سنوارنے کی کوشش فرمائی، وعظ و ارشاد کی محفلیں جمائیں، تصوف کے حلقے قائم کئے اور تصنیف و تالیف کا میدان گرم کیا، چنانچہ آپ کی تصنیفات حسبِ ذیل ہیں:۔

(۱) رسالہ رکن الدین (۲) توضیح العقائد (۳) مولود محمود
(۴) رسالہ طاعون (۵) اربعین (۶) روح الصلوٰۃ

اور حسب ذیل افراد آپ کے خلفاء مجاز ہیں جنھوں نے آپ کے بعد آپکے مشن کو زندہ رکھا۔

(۱) مولانا ارشاد علی صاحب الوری (۲) مصاحب خاں
(۳) قاضی علی اکبر جھالاواڑی (راجستھان) (۴) منشی اخلاق رام پوری
(۵) حاجی عبدالعزیز بھٹنڈہ (پنجاب) (۶) مولوی محمود (فرزند ارجمند)
(۷) مولانا مفتی محمد مظہر اللہ امام و خطیب جامع مسجد فتحپوری دھلی (۱)

---

(۱) مصباح السالکین مؤلفہ مولانا مفتی محمد مکرم شاہی امام مسجد فتحپوری دھلی

شیخ نعمت اللہ بھنگ نوش بہاپوری سہروردی

بہادر پور سادات شہر الور سے بالکل جانب شمال قصبہ چکانی سے پورب میں تین میل پر واقع ہے، یہیں پر شیخ جمال رحمۃ اللہ علیہ کا مزار ایک پہاڑی پر انھیں کی خانقاہ میں واقع ہے، جو حسن خاں میواتی کے مرشد تھے اور خواجہ سید محمد گیسو دراز قدس سرہٗ کے گلبرگہ جاتے ہوئے میزبان اور مشیر طریقت و سلوک تھے رحمہم اللہ تعالیٰ۔

اس آبادی میں نعمت اللہ نامی ایک آدمی بساطی کا کام کرتے تھے، اور اس سلسلہ میں بعض مرتبہ لمبے سفر پر بھی چلے جاتے تھے، بھنگ کے بہت رسیا تھے۔ ایک مرتبہ وہ بغداد پہنچ گئے وہاں ایک آدمی رنگریزی کا کام کرتا تھا، مگر اس کا طریقہ عجیب تھا ایک ہی کونڈی کے ذریعہ ہر طرح کے رنگ کرتا تھا، کوئی سبز رنگ کا خواہاں کوئی نیلے رنگ کا کوئی سرخ رنگ کا طالب اور کوئی زرد رنگ کا خواہشمند۔ مگر وہ بزرگ ہر قسم کے رنگوں کو اسی ایک کونڈی سے کر رہا تھا جو اسکے پاس تھی، کپڑا لیا اور کونڈی میں ڈال کر مالک کے حسب منشا اسے بنایا اور اسے سونپ دیا۔ شیخ نعمت اللہ قریب ہی بیٹھ کر بھنگ پی رہا تھا مگر نشہ نہیں آ رہا تھا آپ نے اس سبز رنگ درویش سے شکایت کے لہجہ میں کہا:

"یہاں کی بھنگ کیسی ہے، بالکل نشہ نہیں لاتی۔؟ ایک سیر بھنگ پی لی، مگر حالت جوں کی توں ہے۔؟؟"

یہ سن کر سبز رنگ درویش نے درخت کے دو تین پتے دیئے اور

یہ فرمایا: "ذرا یہ گھونٹ کر پیو"۔ وہ نشہ باز تھا ہی اسے خوب اچھی طرح گھونٹ کر حسب ارشاد نوش جان کیا — پیتا تھا اور نشہ میں مست ہوتا تھا — افاقہ ہونے پر سب رنگ درویش کے قدموں میں پڑ گئے اور درخواست کی: "عالی جاہ مجھے اپنا بنا لیجیے گا"۔ سب رنگ درویش بڑے عارف باللہ تھے اور سہروردی سلسلہ سے تعلق تھا۔ اب نعمت اللہ بھنگ نوش شیخ نعمت اللہ سہروردی ہو گئے۔ سید عبدالرسول عرف رسول شاہ سہروردیہ سلسلے میں آپ کے مرید تھے، جن سے رسول شاہیوں کا سلسلہ[1]

[1] روایت شیخ بشیر الدین از اولاد شیخ نعمت اللہ بہادر پوری ۔ ۱۰ ربیع صفر ۱۴۰۳ھ مطابق ۹/۱۲/۱۹۰۱م ۔

رسول شاہیوں کا بیان

یہ طریقہ سید رسول شاہ الوری سے جاری ہوا، اس گروہ کے فقیر چہرہ پر خاک لگاتے ہیں، چار ابرو کا صفایا رکھتے ہیں اور ایک رومال سر پر مثل کلاہ رکھتے ہیں، اور رات کا سونا حرام جانتے ہیں[1]۔

مہاراجہ پرتاپ سنگھ والی الور کے عہد میں اس گروہ کا نشو و نما ہوا، رسول شاہ صاحب درویش مجذوب اس گروہ کے پیشوا ہوئے ان کے سبب سے پیروان کے لقب رسول شاہی سے مسمّی ہوئے، شاہ صاحب موصوف قدیم سے سید تھے، اور متوطن بہادر پور ضلع الور ان کے اب وجد تھے، میاں رحمت اللہ بساطی بہادر پوری سے، جو قطب وقت تھے، انھوں نے فیض کمال پایا اور ہوائے توجہ مرشد سے آتش عشق حقیقی کو مجمر دل (دل کی انگیٹھی) میں اس درجہ بھڑکایا کہ گرمی اس کی دماغ کو صعود کر گئی اور حالت ان کی مقام سلوک سے گذر گئی ؎

آنچناں آمد خم وحدت بجوش
شور افگند بگوش عقل و ہوش

چنانچہ اسی مدہوشی کے عالم میں جو وہ الور کی راہ پا گئے تو وطن چھوڑ کر وہاں آ گئے۔ چند روز ادھر ادھر پھر کر ہر جگہ کو دیکھا بھالا بعدہ لادیہ دروازہ کے باہر جہاں تاڑ کا درخت ہے، رخت اقامت ڈالا۔ اہل دنیا ان کے پاس آنے جانے لگے، اور نقد کرامت ان کی سے فیض پانے لگے۔ بھنگ نوشی و مئے خواری پر وہ ایسے چڑھ گئے تھے

[1] تذکرۃ الفقرا، ص ۲۲ بحوالہ آثار الصنادید حاشیہ صـ ۲۹۶

کہ زمانہ کے نشہ بازوں سے بڑھ گئے تھے کہ رات دن وہ مخمور رہتے تھے اور بھنگ کو سبز اور شراب کو دودھوا کہتے تھے اور "مین داری" ہر ایک سے ان کا تکیہ کلام تھا مگر خلق کہ دہر کے ساتھ عام تھا ؎

بحسن خلق تواں کرد صید اہل نظر
بدام دانہ نہ گیرند مرغ دانا را

بہت آدمی ان کے معتقد و ارادت کیش تھے چنانچہ پرتاپ سنگھ بھی ان میں سے ایک تھا[1]

آپ کا سلسلہ خانوادۂ سہروردیہ میں ہے اور حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ تک پہنچتا ہے، آپ پر جذب بہت غالب تھا اور ہمیشہ کوہستان الور میں پھرا کرتے تھے، دو دو تیسرے دن اگر کوئی ٹکڑا روٹی کا ہاتھ لگ گیا تو کھالیا ورنہ کچھ پرواہ نہیں۔ اور جس طرح کہ اہل جذب کا دستور ہے اسی طرح اپنے معبود کی عبادت میں مصروف رہتے، اور دنیا و مافیہا سے خبر نہ رکھتے تھے کثرت جذب اس قدر تھی کہ تکالیف شرعیہ ان پر سے سب کی سب ساقط ہو گئی تھیں، لباس کی کچھ قید نہ تھی۔ کوئی چیتھڑا سر کو باندھا، باندھا نہ باندھا۔ اور اسی طرح اگر کچھ ہوا تو اسی کا لنگوٹ کرلیا ورنہ اس کی کچھ پرواہ نہیں غرض کہ عالم جذب میں رہتے اور صدہا کرامات اور خرق عادات اسی عالم اور اسی حال میں صادر ہوتیں۔

آپ سادات قصبہ بہادر پور مضافات الور سے ہیں، اور اصلی نام آپ کا سید عبد الرسول ہے۔ وہاں کے لوگ نہایت معتقد تھے اور روائے

---

[1] مرقع انور ص ۱۱۲، ۱۱۳ - رسول شاہ کے مرشد شیخ رحمت اللہ بساطی نہ تھے بلکہ شیخ نعمت اللہ بساطی بہادر پوری تھے جیسا کہ تحفۃ الابرار ص ۳۲ پر مذکور ہے بروایت حکیم محمد عمر صاحب فصیح نعتی متوطن جلی حال مقیم ابتہ الور ۱۳۸۵ھ۔

حاجات ان کے انفاس متبرکہ سے جانتے تھے۔ راجہ الور بھی نشو و نما اپنی ریاست کا آپ کی ذات بفیض آیات سے سمجھتا تھا اور نہایت اعتقاد آپ کی جناب میں رکھتا تھا سلسلہ آپ کا حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ تک اس طرح پہنچتا ہے کہ رسول شاہؒ دیکھنے والے نعمت اللہ شاہؒ کے، اور وہ دیکھنے والے شاہ داؤد مصریؒ کے اور وہ دیکھنے والے سخی حبیبؒ کے اور وہ دیکھنے والے شاہ اسمٰعیلؒ کے اور وہ دیکھنے والے شاہ مرتضیٰ آنندؒ کے اور وہ دیکھنے والے شاہ رزاقؒ کے اور وہ دیکھنے والے شاہ اللہ دادؒ کے اور وہ شاہ پیرن بندگیؒ کے اور وہ شاہ بجن گوشہ نشین کے، اور وہ شاہ محمدؒ کے اور وہ شاہ حضرت اسحٰق کے اور وہ شاہ داؤد طائیؒ کے اور وہ شاہ راجو قتالؒ کے، اور وہ مخدوم جہانیان جہاں گشتؒ کے، اور وہ حضرت سید جلال بخاریؒ کے اور وہ سید احمد کبیرؒ کے، اور وہ سید شاہ جلال بزرگؒ کے اور وہ مخدوم سید شاہ بہار الدینؒ کے اور وہ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے رحمہم اللہ اجمعین[1]۔

آپ کو ابتدا سے ایک جذب تھا، بارہ برس کی عمر میں شاہ نعمت اللہ صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ایک دم جذب الی اللہ حاصل ہوگیا، اور جنگل اور پہاڑوں میں نکل گئے اور دن رات اللہ کی یاد میں بسر کی[2]

ایک مرتبہ مولوی محمد حنیف کا جو کمبوہ تھے اور میرٹھ کے تھے اتفاقاً اس طرف گذر ہوا، اور حال نامشروعی رسول شاہ سنکر دل انکا از حد بیزار ہوا، چونکہ علمائے دین پر گمراہوں کی تلقین واجبات سے ہے اور اہل شرع کو بدوضعوں کی ہدایات ضروریات سے ہے اس لئے مولوی حنیف ان کے پاس اس غرض کے

---

[1] آثار الصنادید ص ۲۹۶ - [2] ایضاً

کو راہ راست دکھلائیں اور معاصی بھنگ نوشی و بادہ ریشی سے توبہ کرائیں۔

وہاں جاکر جو رسول شاہ سے دوچار ہوئے بیک نگاہ ان کی خود اسی رنگ میں سرشار ہوئے اور تقوی و طہارت سے منہ پھیرا چار ابرو کا صفایا بستلایا —

واقعہ یہ ہے کہ میاں رسول شاہ کی مولوی محمد حنیف نے خوب آبرو بڑھائی اور ان کے علم و فضل کی وجہ سے اس خاندان نے رونق تمام پائی[1]

مولوی محمد حنیف نے اپنی مثنوی میں میاں رسول شاہ کا وہ مرتبہ بڑھایا کہ کرۂ خاک سے اٹھاکر فوق عرش پر ان کو بٹھایا ہے، چنانچہ ایک مثنوی ہے:

ہست بے ہمتائے در جود و ہم	گوہر یکتائے دریائے قدم
اسم پاکش سید عبد الرسول	مرجع مقصود مامول الفحول
شہر انور ز انور او شہر از واست	ہر کجا ظل عنایت مہر اواست
نام پاکش ہر کجا دارد ظہور	ذکرہ مشہور در ایران و تور
نور آں معمور در شرق و غرب	وصف آں معروف در عجم و عرب
مثل تو معدوم در عالم مثال	اے فرید العصر در عظم و جلال
پیش قدر شب قدر ہم بیقدر	آئینہ بردار تو شمس و قمر
رام و لچھمن رام فرمان شما است	آسماں قربان دوران شما است
ظل او محدود در آفاق خلق	حال او مبسوط در اصحاب دلق

ایک اور مثنوی:

ہادی و پیر طریقت سید عبد الرسول	سرور ار آدم، مرجع اہل قبول
منشی انشار عالم، راقم خیر قبول	سر ز اولاد آدم، سید عبد الرسول

---

[1] آثار الصنادید ص ۴۹۰

قبلۂ اہل حقیقت، کعبۂ اہل یقیں	ماہتاب عز و تمکیں، آفتاب عالمین
قافلہ سالار وحدت، کعبۂ اہل بصر	آفتاب عز و تمکیں، ماہتاب مہر ور
قدوۂ آفاق عالم، منظر رب جلیل	گوہر دریائے سرمد پیشوا خیر السبیل
مطلع انوار قدسی، محرم راز قدیم	مظہر ذات الٰہی، صورت رب کریم
گلشن باغ ہدایت، گلبن باغ بقا	بلبل اسرار وحدت، مشہد دار الشفا
باعث ایجاد عالم، نقطۂ دور جہاں	مرکز اقطاب عالم، سرور شاہ شہاں
داور ملک قدم، دارائے اقلیم وجود	مرکز دوران عالم، قبلۂ آل شہود
فاتح آیات غیبی، خاتم مہر قدیم	مالک گنج عنایت، محرم راز حکیم
والی ملک ولایت رافع علم الیقیں	مقتدائے آخرین و افتخار اولیں[1]

اور ترقی اس گروہ میں ایسی سعی موفور فرمائی کہ گروہ گروہ خلائق گرد آئی...، یہاں تک ان کی کثرت ہوئی کہ تمام ہند میں اس خاندان کی شہرت ہوئی۔

۱۱۹۵ھ میں رسول شاہ نے رحلت کی، تاریخ رحلت حنیف شاہ نے یوں کتابت کی:

چوں رسول آں شاہ تسلیم و رضا	ساختہ رحلت از یں دار فنا
گفت ہاتف بنگر و تاریخ او	یافتہ چادر حریم کبریا[2] ۱۱۹۵ھ

سواد الور میں اس مقام پر جہاں تکیہ رسول شاہیوں کا ہے ان کو دفن کیا اور بہ سبب ایک سانحہ کے آپ کے استخوان کو اکھاڑ کر فروز پور جھرکہ میں مدفون کیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ سر سید نے سید رسول شاہ کی تاریخ وفات ۲۲ جمادی الثانی ۱۱۶۷ھ لکھی ہے[3] مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ صحیح نہیں۔ سال وفات ۱۱۹۵ھ ہے۔

---

[1] تحفۃ الابرار ص ۲۲ — [2] موقع الور ص ۱۱۵ — [3] آثار الصنادید ص ۴۹۰

مولوی شاہ محمد حنیف میرٹھی

آپ کا اصل نام مولوی مظفر حسین ہے۔ وطن آپکا قصبہ میرٹھ۔ بڑے عالم زبردست اور امرائے خاندانی ہیں، نسب آپ کا نواب خیر اندیش خاں اور فرحت اندیش خاں تک پہنچتا ہے۔ ہمیشہ درس و تدریس میں مصروف رہتے۔ اور مسجد میں بیٹھے رہتے کہ یکایک رسول شاہ صاحب کا ایک فقیر پہنچا اور آپ سے کہا: "چلو رسول شاہ بلاتے ہیں۔" یہ سنتے ہی آپ سب کچھ چھوڑ چھاڑ ساتھ ہوئے اور اپنے پیر کی خدمت میں حاضر ہو کر وہی عالم ہو گیا اور اسی طرح عالم جذب میں بسر کی[1] رسول شاہ کی آپ پر نظر پڑنی تھی کہ وہی حال آپ کا ہو گیا۔ کیونکہ مشیت الٰہی یہ امر طے کر چکی تھی کہ اب آپ سے نسبی جاہ و جلال جدا ہو اور آپ نواب خیر اندیش خاں امرائے خاندانی سے ترک و تجرید اختیار کریں، طریقت و حقیقت کے مراحل و منازل طے فرمائیں اس لئے ایسا ہوا۔ آپ علاوہ فضائل باطنی علوم ظاہری سے بھی مالا مال تھے اور گاہ بگاہ عالم جذب میں آپ سے فارسی اشعار صادر ہو جایا کرتے تھے چنانچہ مثنوی گیان چوسر وغیرہ کے علاوہ کچھ اور مثنویاں بھی آپ کی اپنے مرشد کی ستائش و منقبت میں آپ کی یادگار ہیں[2]

آپ نے گلستان کی شرح بھی لکھی ہے اور یہ اشعار بھی آپ کے ہی ہیں:

دل بے خطرہ مظہر ذات است
بحر بے موج عین مرأت است

خدا را چہ جوئی تو خود را بجو
چوں خود را بیابی توئی جملہ او

۱؎ آثار الصنادید ص ۲۹۸ ۲؎ تحفۃ الابرار ص ۳۲، ۳۳

تو مبین خود را اسیر یک نفس
تا بدانی خالق خود ہر نفس

گر نہ بودی خود مقیم اندر بدن
کے شدی قائم ز خود دیوار تن

گر نہ بودی باغبان در باغ تن
کے شدی رونق بہار ایں چمن[1]

آخر سترہویں شعبان ۱۲۴۶ھ میں انتقال فرمایا اور اپنے پیر کی طرح پہلے الور میں اور بعد اس کے فیروز پور جھرکہ میں مدفون ہوئے۔ آپ کے خلیفہ میاں فدا حسین نے تاریخ وفات یوں رقم فرمائی ؎

چونکہ شاہ حنیف نزد رسول
شد ازیں دودماں بملک صمد

گفت ہاتف بگوش من روشن
ہست تاریخ او چراغ احمد[2]
۱۲۴۶ھ

شاہ فدا حسین صاحبؒ

آپ کا اصلی نام خواجہ نجیب الدین احمد ہے اور آپ اولاد حضرت خواجہ سید ہمدانی سے ہیں، اٹھارہ برس کی عمر میں فقیری اور خاکساری اختیار کی، اور اپنے پیر کی خدمت

۱؎ آثار الصنادید ص ۲۹۸ - ۷ ۲؎ مرقع انور ص ۱۲۱

میں فراغت تحصیل علوم سے کی۔

تصوّف میں بہت بڑا ملکہ تھا اور فصوص الحکم وغیرہ جیسی تصوف کی مشکل کتابوں کو بہت آسانی سے پڑھاتے تھے، دنیا سے مطلق لگاؤ نہ تھا، اخلاق وخاکساری بدرجۂ کمال تھی، گوشہ نشینی وزاویہ گزینی حد سے سوا تھی، صحبت عوام الناس بہت ناپسند فرماتے اور ہمیشہ تنہا بیٹھے رہتے، تمام عمر خاک بدن سے ملی اور اینٹ سرہانے رکھی اور زمین پر یا پتھر پر پڑے رہتے۔ اگرچہ آپ کے مزاج میں سلوک جذب پر غالب تھا لیکن کبھی کبھی شان جذب بھی ظہور کرتی تھی۔

بیس برس الور میں اپنے پیر کی خدمت میں رہے اور طرح طرح کی ریاضتیں کی، اور تحصیل وتکمیل ظاہری وباطنی میں مشغول ومنہمک رہے۔

مولوی محمد حنیف کے انتقال کے بعد، جو ان کے پیر ومرشد تھے، انکی جگہ سجادہ نشین ہوئے، پھر بسبب بعض سوانح کے دلّی تشریف لائے اور چالیس برس ایک حجرہ میں بیٹھے رہے۔ بعد اس کے راجہ بنے سنگ والی الور نے نہایت تمنا کی اور ازبس خواہش کی آپ پھر الور اپنے تکیہ میں رونق افروز ہوں۔ اگرچہ اس زمانہ میں آپ کو بسبب لحوق امراض متعددہ حواس ظاہری نہ تھے لیکن آپ کے مرید اسی حال میں وہاں لے گئے اور چند مدّت بعد وہاں جاکر ۸ ار محرم الحرام ۱۲۵۹ھ بروز جمعرات انتقال کیا اور وہیں مدفون ہوئے۔ آپ کی ذات بھی مغتنماتِ روزگار سے تھی، اور بیسیوں خرق عادات آپ سے ظہور میں آئی ہیں۔ حقیقت میں خاتم سلسلہ رسول شاہیہ ہوئے اور آپ کی ذات فیض آیات سے اس سلسلہ کو رونق تازہ ہوگئی تھی خلفاء آپکے بلاد دور و دراز سے گئے ہیں۔ چنانچہ تبت، سراندیپ اور مشہد وغیرہ شہروں میں آپ کے خلفاء موجود ہیں[1]۔

---

[1] آثار الصنادید ص ۴۹۹

خوارقِ عادات آپ کے مشہور ومعروف ہیں چنانچہ روایت ہے کہ حضرت سید عسکری نواسۂ جناب سید رسول نما آپ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تو یہ شعر پڑھا ؎

ستم چناں مکن کہ ندانم زبیخودی
درعرصۂ خیال کہ آمد کدام رفت

یہ شعر سنکر آپ نے ایک نگاہ ڈال کر فرمایا: "جاؤ اپنے نانا کی قبر پر بیٹھو۔ اسی وقت سے جذب غالب ہوگیا اور مست الستِ حقیقی بن گئے"۔

ایک موقع پر حضرت مولوی سید حاجی غوث علی شاہ پانی پتی گئے اعتراض پر آپ نے پیام بھیجا کہ جو مرید آپ کا زیادہ متقی، نمازی، پرہیزگار اور فیضیاب صحبت ہو اس کو میرے پاس بھیجئے۔ اور میں اپنا اوباش آزاد رندمشرب خادم آپ کے پاس بھیجوں۔ پھر دیکھئے کہ میرے جام شراب کی کیفیت سے آپ کا پختہ کار مرید مسرور ہوتا ہے، یا آپ کے فیض باطن سے میرا رندمشرب غلام توبہ نصیب۔ اس بنا پر ایک بڑا ہی متقی، صوم وصلوٰۃ کا پورا پابند، حد درجہ ذکی وفہیم ادھر سے اور ادھر سے اسی طرح ایک دلدادہ، متوالا، رندمشرب اُدھر اِدھر سے بھیجنے پر یہ نتیجہ نکلا کہ حضرت غوث علی شاہ صاحب کا خاص مرید آپکی نظر پڑتے ہی ڈاڑھی مونچھ مونڈا شراب اڑانے لگا اور غوث علی شاہؒ نے ہر چند جدوجہد کی مگر آپ کے مرید پر کچھ بھی اثر صحبت نہیں پڑا جیسا تھا ویسا کا ویسا ہی رہا۔ جب غوث علی شاہؒ کے مریدوں نے اس کا سبب دریافت کیا تو آپ نے فرمایا ؎

میان عاشق ومعشوق رمزیست
کراما کاتبیں راہم خبر نیست

اسی طرح کا اور ذکر ہے کہ ایک عالم ظاہری کے زیادہ معترض ہونے پر

خاص دورِ شراب کے وقت آپ نے تیز نظر ڈالی ان پر اور یہ اشعار پڑھے :

بیا ساقی من کہ مردم کفن از برگ تاکم کن
بآب مے بدہ غسلم دریں میخانہ خاکم کن
بمل فاتحہ بدہ رو ختم دگر گورم ازیں کن
کر و تے عاقبت مارا بیک جرعہ نجاتم کن

معاً وہ حضرت از خود رفتہ ہوئے اور شاہ صاحبؒ کو اس حالت میں بھی برا بھلا کہتے رہے ، خادموں نے روکنا چاہا مگر آپ نے منع کر دیا جب حالتِ موجودہ میں کمی واقع ہوئی تو وہی حضرت معترض آپ سے رجوع لائے اور معافی خواہ ہوئے۔[1]

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ کی مجلس میں ایک دفعہ رسول شاہی فقیروں کا تذکرہ تھا - حضرت امام ربانی رحؒ نے فرمایا : رسول شاہ الور کا باشندہ ایک فقیر تھا — قوم سید تھی ، طبیعت فقیرانہ تھی — اگرچہ احکام شرع کا پابند تھا مگر شراب پیا کرتا تھا اور شاید اس کی وجہ یہ ہوگی کہ اس نے اپنی جہالت سے یوں سمجھا کہ حالت سکر میں طبیعت زیادہ لگتی ہے ، اس کا ایک مرید تھا محمد حنیف - اس نے چار ابرو کا صفایا یعنی سر ، ڈاڑھی ، بھوں اور مونچھوں کا منڈانا ایجاد کیا ، اس کا خلیفہ ہوا فدا حسین - اس نے یہ زیادتی کی کہ نماز سے منع کرتا اور جنابت کے لئے (کذا) بدن پر بھبوت کا مَل لینا کافی سمجھتا تھا ، تقریباً ساری ہی شریعت کا انکار کرتا تھا ، مگر بایں ہمہ صاحب تصرف تھا -

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ کے زمانے میں یہ شخص یعنی فدا حسین دہلی آیا تو بہت لوگ اس کے معتقد ہو گئے - شاہ صاحب نے

---

[1] تحفۃ الابرار ص ۴۴

اس کو کہلا بھیجا کہ :

"تو مسلمان کہلاتا ہے اور شریعت کا انکار کرتا ہے ، تجھے زیبا نہیں کہ دعویٰ اسلام کرے اور پھر قطعیات کا انکار ہے "

اس نے شاہ صاحب کے پاس جواب بھیجا :

" نہ تو آپ میرے پاس آئیں اور نہ میں آپ کے پاس جاؤں یوں کرو کہ اپنے کسی معتبر شاگرد کو بھیج دو کہ ہم سے مناظرہ کر جائے "

شاہ صاحبؒ کے شاگردوں میں عبداللہ بڑے ذکی اور ذی استعداد طالب علم سمجھے جاتے تھے ، انھوں نے کہا : "حضرت مجھے بھیج دیجئے " شاہ صاحبؒ نے فرمایا : "اچھا کوئی بات دریافت کرنا ہو تو کر لینا " -

گرمی کا زمانہ تھا ، دلی میں یوں بھی گرمی زیادہ ہی ہوتی ہے اور پہلے تو آجکل سے بھی زیادہ گرمی پڑتی تھی - بلکہ ہمارے زمانۂ طالب علمی میں جتنی گرمی دہلی میں پڑتی تھی اتنی اب نہیں پڑتی اس سے پہلے تو اور بھی زیادہ ہوگی - یہ انیسویں صدی کے بالکل درمیانی دور کی بات ہے - غرض سبق کے بعد عبداللہ مناظرہ کے لئے بھیجا گیا ، گرمی کا وقت تھا ، عین دوپہر کو فدا حسین کے پاس پہنچا ، اس نے ان کی بڑی خاطر کی ، اپنے چیلوں سے کہا : مولوی صاحب کو ہوا کرو ، پنکھا جھلو اور ان سے کہا کہ آپ تھوڑی دیر لیٹ رہیں - گرمی کا وقت ہے ذرا آرام لے لو تو اطمینان سے مناظرہ ہوگا ان کی جو شامت آئی تو لیٹ رہے ، ٹھنڈی ہوا میں عافیت معلوم ہوئی لیٹتے ہی سو گئے ، اور فدا حسین پاس بیٹھ کر توجہ دینے لگا اور چیلوں سے کہا : "ہنڈیا پکاؤ " کسی نے کہا بھی کہ حضرت کوئی چیلا تو ہونے والا ہے نہیں پھر ہنڈیا کیوں پکوا رہے ہیں ؟ انھوں نے دھمکا کر کہا : "تمہیں اس سے کیا غرض ؟ " - (ان کے یہاں چیلا بناتے وقت ہنڈیا پکتی تھی کسی قسم کی) -

تھوڑی دیر بعد مولوی صاحب جو اٹھے تو یہی کہتے اٹھے کہ حضرت مجھے چیلا کر لیجئے، اس کم بخت نے اس کے سوتے سوتے اپنا کام کر لیا۔ فدا حسین نے کہا:

"میاں تم تو مناظرہ کرنے کے لئے آئے تھے۔ مرید ہونا کیسا؟"۔

یہ بولے: "بس حضرت ہو لیا مناظرہ و مباحثہ مجھے تو مرید کر لیجئے"۔ آخر فدا حسین نے مولوی صاحب کی ڈاڑھی منڈوائی اور مونچھ بھی، پھر وہ ہنڈیا منگائی جو مریدوں سے بکوائی تھی۔ جب ہنڈیا آئی تو مولوی عبداللہ سے پوچھا "تم اسے اپنے استاذ کے پاس بھی لے جا سکتے ہو"۔ عبداللہ نے کہا: "جہاں حکم ہو لے جاؤں، غلام کو کیا انکار ہے"۔ غرض ہنڈیا لے کر شاہ عبدالعزیز رح کی خدمت میں پہنچا۔ ادھر شاہ صاحب رح اس کے انتظار میں بیٹھے بار بار فرماتے تھے: "شاید مناظرہ طویل ہوگیا"۔ اتنے میں عبداللہ سر پر ہنڈیا رکھے آپہنچا۔ حضرت شاہ صاحب رح تو اس وقت نابینا ہو چکے تھے، میر محبوب علی صاحب رح جو حضرت رح کی خدمت میں بہت ہی بے تکلف تھے، عبداللہ کو چار ابرو کا صفایا کئے دیکھ کر کہنے لگے: "لیجئے حضرت آپ کے مولوی عبداللہ قلندر بنے آرہے ہیں"۔ شاہ صاحب حیران ہوئے اور فرمایا: "تم یوں ہی بکا کرتے ہو"۔ میر صاحب نے عرض کیا: اب پہنچا چاہتے ہیں معلوم ہو جائے گا۔ تھوڑی دیر میں عبداللہ پاس آیا اور کہا: "مرشد نے بھیجا ہے لینا ہو تو لیجئے، ورنہ جاتا ہوں"۔ شاہ صاحب متحیر تھے کہ کیا قصہ ہے۔ آخر فرمایا: کیا شبہ پیش آیا جس کا جواب بن نہ پڑا، تجھے کیا ہوا کس بلا میں گرفتار ہوا؟" شاہ صاحب رح نے سب کچھ کہا مگر اس نے کچھ جواب نہ دیا۔ کہا تو یہ کہا: "کچھ نہیں ہوا بس مرید ہوگیا"۔ شاہ صاحب رح نے خفا ہو کر فرمایا: "دور ہو"۔ اس نے کہا بہتر ہے مجھے اس کی بھی پرواہ نہیں۔[1]

---

[1] تذکرۃ الرشید ج ۲ ص ۲۲۳

اس کے بعد حضرت امام ربانی (حضرت گنگوہی رح) نے غالباً اسی عبداللہ کا نام لے کر فرمایا کہ اس میں یہ اثر تھا کہ جو اس کے پاس گیا وہ اسی کا ہو گیا۔ ایک شخص کا نام لے کر فرمایا کہ وہ کہتے تھے کہ ایک بار میں اس کے پاس چلا گیا۔ اس کم بخت نے مجھے گلے سے لگا لیا، اسی وقت میرے سینے میں ایک آگ سی لگ گئی اور میں فوراً اس کے پاس سے بھاگا۔ حضرت نے فرمایا:

"میری طالب علمی کے زمانے میں ۱۸۵۷ء کے بعد وہ دہلی کے اندر موجود تھا اور دہلی بھر میں یہ بات مشہور تھی کہ اس سڑک سے لوگ نہیں جاتے، ایک مرتبہ اس قصہ کے بعد فرمایا: "جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جب دجال آئے تو اسکے سامنے مت پڑنا، پہاڑ کی چوٹیوں پر اور غاروں کے اندر پناہ پکڑنا ہزارہا مخلوق اس کے مقابلہ پر آئے گی مگر اسی کی ہو رہے گی۔ جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اس تعلیم سے اہل باطل کا تصرف اور اہلِ حق پر غلبہ ظاہر ہوتا ہے آخر اس کے مقابلہ کے لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائیں گے"[1]

شاہ فدا حسین کا تذکرہ قدرے طویل ہوگیا، مگر اس قدر وضاحت و تفصیل ضروری تھی کہ بے خبری کا پردہ حائل نہ رہے۔

کبھی کبھی آپ عالم جذب میں اپنے پیر کی طرح شعر بھی فرماتے تھے اور مثنوی۔ بن سوسر۔ آپ کی طبع زاد سے موجود ہے کہ بعض معتقدین نے جمع کی ہے۔

مرا جز دیدن دیدار وجہ اللہ کارے نیست در دنیا
شفاعت ما بجز ذات رسول اللہ ایے نیست در عقبیٰ

---

[1] تذکرۃ الرشید ج ۲ ص ۲۲۳

خویشتن را خود عیاں فرمودہ	صورتے از جسم و جاں بنمودہ
کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَۃُ فرمودہ	وَاحِدٌ فِیْ کُلِّ نَفْسٍ بودہ

نسبت طاعت بخود عصیاں بود	نسبت عصیاں بخود عرفاں بود
چوں بہر صورت ببینی یار را	خود بخود واقف شوی اسرار را

عین ذات تو بود وحدت وجود	ایں صفات تو بود وحدت شہود
غیر وحدت نیست کثرت را وجود	غیر کثرت نیست وحدت را شہود

اگر بخلوت دل یک زمانہ بنشینی — درون کعبۂ دل صورت خدا بینی

خویشتن را نیست دانستن وجود حق بود
از وجودش ہست دانستن شہود حق بود[1]

یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ بزرگوار سر سید احمد خاں (موسس علیگڈھ یونیورسٹی) کے نانا خواجہ فرید الدین کے برادر حقیقی تھے چنانچہ مولانا حالیؒ نے سر سید کے خاندانی حالات میں ان کا تذکرہ کیا ہے[2]

سر سید نے آپ کی تاریخ وفات ۱۲۵۹ھ لکھی ہے۔ مگر مرقع الور میں ۱۲۲۳ھ تحریر ہے[3] ۱۰ محرم الحرام دونوں نے متفق ہو کر بتائی ہے۔ کسی شاعر

---

[1] آثار الصنادید ص ۵۰۰ — [2] حیات جاوید حصہ اول ص ۱۰
[3] مرقع الور ص ۱۵۰

نے تاریخ رحلت کہی ہے مگر اس کے اعداد صحیح نہیں ہوتے ۱۲۱۱ھ بنتے ہیں ممکن ہے صحیح ہو اور ہم اسے نہ پا سکے۔

حیف صد حیف عارفِ کامل	نام نامی او فدائے حسین
رفت زیں دار بے بقا بہ بقا	واقف سرِ مخفی کونین
فکر تاریخ رحلتش کردم	گفت ہاتف کہ اے محب حسین
از پئے فکر گوئیمت کہ بگو	گشت واصل بحق فدائے حسین[1]

شاہ توکل حسین

(متوفی ۱۲۴۳ھ تکیہ جنیلی - الور)

شاہ فدا حسین کے خلفاء میں سے ہیں۔ فنافی الشیخ کا جو رتبہ آپ نے حاصل کیا وہ آپ ہی کا حصہ تھا بعد وفات اپنے پیر کے آپ ہی سجادہ نشین ہوئے[2]

آپ کا سلسلۂ نسب تو معلوم نہ ہو سکا مگر اس قدر ظاہر ہے کہ اپنے پیر سے فیض خوب حاصل کیا۔ آخر ۱۲۴۳ھ میں انتقال کیا اور الور ہی میں دفن ہوئے[3]

"ایک بار شاہ سلیمان تونسی کے مرید میاں داد بخش جو ایک لاکھ مرتبہ اسم ذات اور کئی ہزار مرتبہ درود شریف پڑھا کرتے تھے، اس بات پر کہ فدا حسین کے خلیفہ توکل حسین نے ان کے پیر کے ایک مرید کو توڑ لیا تھا، توکل حسین کے پاس چلے گئے اور شکایت کی کہ تجھے مناسب

---

[1] مرقع الور ص ۱۵۰ - [2] تحفۃ الابرار ص ۴۴ - [3] آثار الصنادید ص ۵۰۰

نہیں کر دوسرے کے مرید کو اپنا مرید بنائے اس نے جواب دیا: "سلیمان زخم کیا جانے درویشی اور فقیری کیا چیز ہے؟ اس لئے اس کے مریدوں کو اپنا مرید بنالیتا ہوں"۔ پیر کی شان میں یہ کلمہ ان سے ضبط نہ ہو سکا اور لگے برا بھلا کہنے کہ تو خود گمراہ دوسروں کو گمراہ بناتا ہے۔ مجھے نماز روزہ سے سروکار نہیں"۔ ان باتوں پر توکل حسین کو بھی غصہ آگیا۔ اس نے لال پیلی آنکھیں نکالیں، اور اپنے چیلوں سے کہا: "نکال دو کان پکڑ کے مجھ سے شکایت کرنے آیا ہے"۔ بس اتنے ہی قلیل عرصہ میں ان پر اثر ہوگیا اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگے: "مجھے مرید کر لیجیے"۔ وہ تو خدا کا فضل تھا کہ غصہ کے جوش میں توکل حسین نے ان کی طرف التفات نہ کیا نہ ان کی درخواست پر توجہ دی۔ یہی کہے گیا: "نکال دو کان پکڑ کے"۔ مریدوں نے دونوں کان پکڑ کر انھیں باہر دھکیل دیا۔ آخر جب نیچے آئے تو آنکھ کھلی، اور ہوش آیا کہ زبان سے کیا درخواست نکلی۔ اسی وقت اٹھ کر بھاگے اور اپنے گھر آکر دم لیا۔"

اس کے بعد امام ربانی رحمۃ اللہ علیہ ۱۳۲۳ھ نے فرمایا: "یاد رکھو، ملحدوں سے ہمیشہ پرہیز کرنا چاہیئے۔ پاس جانا بہتر نہیں — اس توکل شاہ مچھندر کو میں نے بھی دور سے دیکھا ہے"۔[1]

---

[1] تذکرۃ الرشید حصہ دوم ص ۲۲۵

حضرت رنگ علی شاہ

آپ مرید و صاحب سجادہ شاہ توکل حسین ہوتے ہیں۔ پیران طریقت کی طرح وہی زاویہ گزینی اختیار کی اور اسی طریقہ صفائی چار ابرو کے ساتھ آپ کا خاتمہ ہوا۔[1] وفات ۱۳۲۳ھ میں ہوئی اور اپنے جماعتی قبرستان چنبیلی باغ انور میں مدفون ہوئے۔ پھر فیروز پوری جعفر کہیں "سال تاریخ وفات رنگ علی شاہ بزرگوار" تاریخ مندرجہ تحت سے آشکار۔

جناب رنگ علی شاہ پیر و مرشد دیں
چوں رو بہ گلشن فردوس آں ولی کردہ

بسال رحلت او زد رقم قلم تاریخ
رہے بکوئے جناں شاہ رنگ علی کردہ[2]

ناں بس کچھ دنوں صادق حسین سرگردہ رسول شاہیاں ہوئے، آخر بار اس کا نہ اٹھا سکے اور چھوڑ کر چل دیئے

حضرت اکبر حسین

بعد ازاں سجادہ نشینی میاں اکبر حسین کی باری آئی۔ ان سے چنبیلی باغ کو ہنوز رونق اور زیبائی ہے۔[3] آپ خلیفہ و مرید و سجادہ نشین رنگ علی شاہ کے ہوئے ہیں۔ راج انور سے آپ کو پچاس روپیہ ماہانہ خرچ خانقاہ وغیرہ کے لئے ملتے رہے، جس سے آپ نے تکیہ اور آسودگان تکیہ کے نام کو قائم رکھا۔ اکثر ذکر الٰہی "اللہ اللہ" کرتے ہیں۔ نقل ہے کہ ایک روز ایک شخص متقی پرہیزگار

---

[1] تحفۃ الابرار ص ۳۴، [2] مرقع انور ص ۱۵۰ – ۱، [3] مرقع انور ۱۵۰

سیاح درویش نے حضرت سعدی شیرازیؒ کا طنزاً یہ شعر پڑھا ؎

خلاف پیمبر کسے رہ گزید — کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

آپ نے معاً اس کے جواب میں یہ شعر حافظ خواجہ شیرازؒ کا پڑھا ؎

در کوئے نیک نامی مارا گذر ندادند
گر تو نمی پسندی معذور دار مارا

پھر اس شخص کو جواب الجواب کی جرأت نہ ہوئی۔ جب آپ کا انتقال ہوا تو مستجاب خاں اکبرآبادی نے یہ قطعہ پڑھا۔

از واقفان سرّ الٰہی شنیدہ ام	ایں نکتہ کہ شاہ گدا را پسند کرد
راہ بقا بیافت ہر آنکس کہ شد فنا	زیں وجہ او طریق فنا را پسند کرد
دو ثلث از جمادی الآخر گذشتہ بود	رخت جہاں گذاشت قضا را پسند کرد
مشتاق شد گرچہ غمی از فراق او	آخر رہ رضائے خدا را پسند کرد
سال وفات بے سر اندیشہ زد رقم	اکبر حسین شاہ بقا را پسند کرد

۱۳۰۱ھ

باقر حسین عرف بکر حسین بروایت حکیم محمد عمر فصیح دہلوی، آپ نہ اپنے اصلی نام بتاتے ہیں، نہ باپ دادا کا پتہ نشان، بہ سوائے اس کے کہ ہم نے قلعۂ شاہی میں پرورش پائی۔ اور عمر ۱۹ سال کی میں ہنگامہ غدر شاہجہاں آباد سے نکل کر الور پہنچے۔ داتا اکبر حسین شاہ نے مرید کرلیا۔ چنانچہ آپ ۲۰ سال تک اپنے پیر کی حیات میں حاضر حضور رہے، اور اب بجائے پیر بیس برس سے تکیہ رسول شاہی میں گدی نشین اپنے پیر صاحب کے ہیں۔ خوش رو ہیں، خوش خو ہیں، خوش مزاج ہیں ضروری نوشت و خواند بھی کرلیتے ہیں، روپیہ روز جو راج الور سے ملتا ہے اس پر قانع ہیں۔ غنیمت ہے کہ ان کے وجود سے خانقاہ کا نام چلا جاتا ہے اور فرقہ رسول شاہی

کے نام لیوا سے نظر آتے ہیں۔[1]

۱۹۴۷ء میں الور شہر سے مسلم ثقافت و تہذیب، مذہب و تمدن کے جملہ آثار کو اس طرح محو کیا گیا ہے کہ موجودہ دور کے سیاح حقیقت کے سراغ تک نہیں پہنچ سکتے، مسجد، مزار، خانقاہ، کربلا جیسے مذہبی مقامات کو زمیں بوس کرکے نئے زمانے کے مکانات تعمیر کر لئے گئے۔ پھر بھی قدیم الور شہر قلعہ کوہ، موتی ڈونگری، مقبرہ فتح جنگ ریلوے اسٹیشن انگریز ملٹری ہوسپٹل جیسے مقامات پر مسلم کلچر کی چھاپ صاف دکھائی دیتی ہے ع

کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی۔ ....

رسول شاہی فقراء کا تذکرہ اکثر کتب تاریخ و تذکرہ میں مرقوم ہے، اور کئی ایک نقطۂ نظر ان کے متعلق مشہور و معروف ہیں، وطن ان کا چونکہ میوات ہے انکی نشو و نما الور میں ہوئی جو میوات کا مرکزی مقام ہے اور ان کی زندگی کے سوانح بڑے عبرت انگیز و سبق آموز ہیں، میں نے یہ کتاب کسی ایک طبقہ، فرقہ، جماعت اور کسی گروہ کے ساتھ خاص طور پر مخصوص نہیں کی ہے، اس میں صوفیائے کرام کا ذکر خیر ہے، اسلئے رسول شاہی مجذوبوں کا تذکرہ کیا گیا۔

مؤلف تحفۃ الابرار اس گروہ کا تذکرہ کرنے کے بعد ایک فکر پیش کرتے ہیں، اس کے تمام اجزاء سے اتفاق تو مشکل ہے مگر چونکہ دلچسپ بھی ہے اور دلگیر بھی اس لئے اس کے یہاں درج کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں:۔

"مجھے خیال گذرتا ہے کہ خانوادہ سہروردیہ کے خاصکر بڑے متشرع اور پابند شریعت رہے ہیں، شریعت کے خلاف قدم نہیں رکھتے اور سماع

---

[1] مرقع الورض ۱۵۰

تک کے روادار نہیں محفل سماع اپنی جملہ شرائط کے باوجود ان کے نزدیک ناجائز ہے، پھر ایسے خانوادہ میں ایسے غیر متشرع اور رند مشرب کو کیوں اور کیسے روا رکھا گیا۔ شاید اسی خیال سے سیّد احمد خاں صاحب مرحوم نیچری نے سیر فریدیہ میں لکھا ہے کہ وہ فرقہ رسول شاہیوں کا یہ نہیں ہے وہ اور ہے مگر اس کا پتہ نشان نہیں لکھا۔ جب یہ صورت ہے تو ناچار اسی فرقہ کو رسول شاہی ماننا پڑا۔ کیا عجب ہے کہ ظاہری اطوار اس فرقے نے فرقۂ ملامتیہ ہونے کے جیسے اختیار کرلئے ہوں، جو ظاہر بینوں کی آنکھوں میں ایسے ہی نظر آتے ہوں یا اس کا کوئی خاص واقعہ اور سبب ہو جس کا علم ہم کو نہیں جیسا کہ "سدا سہاگ" کے فرقہ کے حضرت شاہ صاحبؒ کا واقعہ گذرا ہے[1]

شواہد نظامی نامی کتاب میں لکھا ہے کہ:

"ایک دن حضرت شاہ موسیٰؒ احمد آبادی حضرت محبوب الٰہی سلطان المشائخؒ کے مزار کی زیارت کو آئے، اتفاقاً اس وقت کچھ گانے والی عورتیں بھی کسی منت کے پورا ہونے کی نذر میں مع باجہ وغیرہ کے گانا گا رہی تھیں۔ چونکہ یہ نہایت متقی و پرہیزگار، پابند شریعت تھے، انکو عورتوں کا یہ فعل برا معلوم ہوا اور ساتھ ہی اس کے آپ کے دل میں یہ بھی خطرہ گذرا کہ شاید محبوب الٰہیؒ کو بھی یہ فعل پسند ہے جو ایسے لوگ آن کر ایسی ناشائستہ حرکتیں انکے مزار پر کرتے ہیں، اگر آپ کو پسند نہ ہوتا تو ہرگز یہ نہ آسکتے تھے اور نہ ایسی حرکتیں کرتے۔ گویا اس خطرہ سے ایک نوع کا

سوءِ ظن حضرت محبوب الٰہیؒ کی طرف سے آپ کے دل میں پیدا ہوا۔ اس کے کچھ عرصہ کے بعد آپ حج کو تشریف لے گئے وہاں سے فارغ ہوکر مدینہ منورہ کا قصد کیا تو آپ کو خواب میں کسی بزرگ صورت نے مدینہ جانے سے منع کیا۔ مگر آپ وسوسۂ شیطان سمجھ کر چل پڑے، پھر شب کو اسی طرح سے مدینہ شریف کے جانے سے روکا، اور اس بزرگ نے کہا کہ اگر تو مدینہ شریف جائے گا تو تیرا ایمان سلب ہو جائے گا۔ اس وقت یہ بہت حیران ہوئے، اور قافلے میں ایک بزرگ تھے ان سے رجوع کی، ان بزرگ نے مراقبہ کرکے روحِ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کی بابت استفسار کیا۔ جواب ملا کہ اس شخص نے ہمارا کچھ نقصان نہیں کیا مگر ہندوستان میں جو ہماری امت کے اولیاء اللہ ہیں ان میں سے شیخ نظام الدین مشہور محبوب الٰہیؒ کی روح کسی وجہ سے اس شخص سے ناراض ہے، اس لئے ہم نہیں چاہتے کہ جو شخص ہمارے اولیاء اللہ میں سے کسی کا معتوب و مغضوب ہوئے وہ ہمارے مزار پر حاضر ہووے اس سے کہو کہ ان سے اپنا قصور معاف کرائے، ان بزرگ نے یہ سب قصہ شاہ موسیٰؒ سے از روئے کشف بیان کیا، وہ بہت حیران ہوئے کہ حضرت محبوب الٰہیؒ کی روح مجھ سے کیوں ناراض ہے؟ غرض بعد تامل بسیار واقعہ مذکورہ یاد آیا اور انھوں نے ان بزرگ سے سارا ماجرا عرض بیان کیا، ان بزرگ نے فرمایا: "میری رائے

کہ تم فوراً ہندوستان جاؤ اور جس فعل کے اعتراض کی وجہ سے انھوں کو رد کیا تم سے ناراض ہوئے وہ فعل تم خود حضرت محبوب الٰہی کے مزار پر جا کر کرو۔ غرض آپ (شاہ موسیٰ) بموجب ہدایت ان بزرگ کے ہندوستان کو واپس آئے اور پھر ابرو ہمن داڑھی مونچھیں صفا کرا کے زنانہ لباس پہن کر گلے میں ڈھولکی ڈال کر گاتے ہوئے حضرت محبوب الٰہی کے مزار پر جا وارد ہوئے طوائف کرنا شروع کیا ناچتا ناچتے بے ہوش ہو کر گر پڑے اور حضرت محبوب الٰہی کے الطاف کریمانہ سے قلب کے پردے کھل گئے، اور اس فعل کی بدولت مقبول و واصلان خدا سے ہوئے۔ جب ہوش میں آئے تو لوگوں نے زنانہ لباس ترک کرنے کے واسطے کہا آپ نے فرمایا: اب میں اس وضع اور لباس کو ترک نہیں کروں گا کیونکہ جو کچھ مجھے ملا ہے اسی کی بدولت ملا ہے۔[1]

اور تب سے آپ سرمنشاء فرقہ سدا سہاگ سہروردیہ قرار دیئے گئے۔

بے غایت حق و خواصان حق
گر ملک باشد سیہ ہستش ورق

شیخ موسیٰ رحمۃ اللہ علیہ کی وفات [illegible]ھ میں ہوئی، مدفن احمد آباد گجرات ہے۔

[1] تحفۃ الابرار ص ۱۸ بحوالہ مناقب فریدی و رشحۂ بدنظامی۔

سید نور محمد عرف حضرت مدنی شاہؒ (پیدائش ۱۲۰۸ھ، وفات ۲۲/۲/۱۳۱۲ھ) آپ حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مراد آبادیؒ کے اکابر خلفاء میں سے تھے۔ ان کے ایک خلیفہ تھے میاں محبوب لعل شاہؒ تھے۔ باغیض بزرگ حضرت مدنی شاہؒ کا مزار الور میں اسٹیشن روڈ پر متصل ہسپتال واقع تھا۔ آپ کی وفات بروز شنبہ ۲۸ رجب ۱۳۱۲ھ) آپ کے ایک اور خلیفہ سید اعجاز حسین شاہؒ نے ایک مجموعہ رسائل رحمانی کے نام سے مرتب کیا ہے جس میں نور رحمانی، لطف رحمانی، اور انوار رحمانی تین رسائل شامل ہیں۔ مطبع نامی کانپور محمد رحمت اللہ میں ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء میں طبع ہوا۔ یہ رسائل حضرت مدنی شاہؒ کی تعلیمات، ملفوظات اور حالات پر مشتمل ہیں۔ ان کی ایک کتاب مثنوی حقائق الاسرار بھی ہے۔[1]

مولوی حافظ محمد ابراہیمؒ شاماکا۔ الور پیدائش سے پانچ ماہ پہلے آپ کے والد کی وفات ہو گئی۔ ماں اور ماموں نے پرورش کی۔ خاندانی پیشہ زراعت تھا۔ بارہ سال کی عمر تک بکریاں چرائیں۔ پھر اچانک جاذبۂ توفیق نے مدرسہ معین الاسلام قصبہ نوح پہنچا دیا۔ وہاں قرآن کریم حفظ کیا۔ اور اردو دینیات پڑھیں۔ پھر مدرسہ حسین بخش دہلی میں عربی و فارسی کا اعلیٰ نصاب پڑھا۔ ۱۳۴۵ھ میں دورۂ حدیث سے فراغت حاصل کی۔ دورانِ تعلیم ہی شادی ہو گئی تھی۔ تبلیغی جماعت سے ابتدا ہی میں دلچسپی تھی۔ باقاعدہ چلے لگائے، اپنے گاؤں کے ماحول میں اسمٰعیل پور کے نزدیک ایک مدرسہ جاری کیا، پھر حضرت مولانا محمد الیاسؒ قدس سرہٗ کے حکم سے مدارس میوات کے ممتحن ہو گئے۔ سیاست سے بھی شغل رہا، پرجا منڈل کے سرگرم رکن رہے۔ مولانا عبد القدوسؒ کے ساتھ رات کا نڈھ میں پولیس کے تصادم میں ایک ٹانگ ٹوٹ گئی جو آخر تک صحیح نہ ہو سکی۔ جیل گئے، انگریز افسر نے پوچھا پھر بلاؤ گے

[1] حیات کرم حسین، ص ۲۰۲-۲۰۳۔

حسین احمدؒ کو یہ فرمایا: انشاء اللہ۔ مزید سزا ہو گئی۔ ۱۹۴۷ء میں میوؤں کو پاکستان جانے سے روکا۔ ۱۹۴۹ء میں مسجد مولانا رکن الدینؒ کو اپنے علمی و رفاہی امور کا مرکز و مدرسہ بنایا۔ ۱۹۵۱ء میں میو پنچایت کا احیاء کیا اور میو بورڈنگ الور واگذار کرائی۔ آخر عمر تک میو بورڈنگ، جمعیۃ علماء ضلع الور اور مدرسہ اشرف العلوم داؤد پور کے صدر و مہتمم رہے۔ ۱۹۵۲ء میں حلقہ کامنہ بھرت پور سے راجستھان اسمبلی کے ممبر چنے گئے اور اسمبلی کو حق آشنا کیا۔ وزیر اعلیٰ آپ کی صدق گفتاری و جرأت سے لرزتا تھا۔ الور، بھرت پور، جے پور اور پورے راجستھان کے مسلمانوں کے مخلص خادم اور نمائندے تھے۔ ۱۹۶۷ء میں فالج کا حملہ ہوا۔ اسی میں ۳ رمضان مطابق ۲ نومبر ۱۳۹۰ھ / ۱۹۷۰ء کو عازم آخرت ہوئے اور مولانا رکن الدین کے مزار سے متصل جانب شرق مدفون ہوئے۔ فرحمہ اللہ تعالیٰ وادخلہ فی جنٰت تجری من تحتہا الانہار[1]

ابو محمد مولانا دیدار علی ابن سید نجف علی الوریؒ

آپ کے اجداد مشہد سے بلگرام آئے اور وہاں سے فرخ آباد قیام کرتے ہوئے الور پہنچے۔ ان کے چچا مولانا سید نثار علی بھی الور کے مشہور عالم تھے۔ مولانا دیدار علی ۱۲۷۰ھ / ۱۸۵۴ء میں الور میں پیدا ہوئے۔ مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ کے مرید اور خلیفہ تھے۔ الور میں انہوں نے مدرسہ قوت الاسلام قائم کیا تھا۔ ۱۹۱۲ء میں آگرہ کی جامع مسجد میں خطیب و مفتی رہے۔ بعد میں لاہور چلے گئے وہاں حزب الاحناف قائم کی۔ تلامذہ کی وسیع تعداد ہے۔ شیخ عبد القادر جیلانیؒ کی کتاب فتوح الغیب کے فارسی ترجمہ از شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ کو اردو میں نظم کیا ہے۔ ۲۲ رجب ۱۳۵۴ھ / ۱۹۳۵ء لاہور میں وفات پائی۔ الور میں محلہ نواب پورہ میں قیام تھا۔

---

[1] سوانح مولانا محمد ابراہیم (مخطوطہ) مولوی محمد خالد الوری۔

آپ کے دو صاحبزادے تھے۔ بڑے لڑکے ابو الحسنات مولانا حکیم محمد احمد نے عـ[...] درسیات کی تکمیل کے علاوہ طب کی تعلیم حکیم محمد حسین الوری اور حکیم حامی الدین مرادآبادی [...] حاصل کی۔ شاہ علی حسین کچھوچھویؒ سے بیعت تھے اور حضرت میاں واحد علی شاہؒ سے خلا[فت] پائی تھی۔ لاہور میں خطیب مسجد وزیر خاں اور ناظم حزب الاحناف ہند رہے۔ آپکی تصا[نیف] میں اوراق غم، فرشتۂ رحمت، القول المنیر فی احکام المزامیر، تنقیح الاحکام فی ثبوت [...] توافق الحکمۃ والاسلام، رسالہ الناصح، بلوغ المرام فی مولد النبی علیہ السلام، سرگذشت [...] بلا کشان محبت، بیاض العوارض، اکسیر احمدی، مونس الاطباء وغیرہ۔ ۷ رشعبان ۱۳۸۰ھ / ۱۹۶۰ء [...] لاہور میں وفات پائی۔ دوسرے ابو البرکات مولانا سید احمد الور میں پیدا ہوئے ۱۳۱۶ھ / ۱۸۹۹ء حا[...] عبد الحکیم، حافظ عبد العزیز اور حافظ قادر علی سے قرآن کریم اور دیگر کتب پڑھیں۔ مولا[نا] ظہور اللہ الوری سے بھی تحصیل علم کی۔ شاہ علی حسین کچھوچھوی سے بیعت تھے۔ قابل [...] عالم تھے۔ آگرہ میں مفتی رہے۔[1]

میاں جی الف خاںؒ گلپاڑہ بھرتپور

سلسلۂ راج شاہی کے مشہور صاحب[...] کشف بزرگ، مولانا مفتی محمد حسـ[...] فیروزپوریؒ کے مصاحب، میاں جی عبد اللہ عرف میاں صاحب کے پیر و مرشد، جب [...] آپ کشف کی بات فرماتے تو حضرت مولانا محمد الیاسؒ ارشاد فرماتے: "راز مشیت فاش [نہ] کرو میاں"۔ اسی طرح مولانا حسن صاحبؒ نے فرمایا تو آپ کہنے لگے۔ توبہ توبہ آئندہ انشا[ءاللہ] ایسا نہیں کہوں گا۔ قصبہ فیروزپور کے جانب شرق مدرسہ کالینڈہ کے نزدیک مولانا حسنؒ [کے] مزار کے پاس آپ کا مزار ہے۔

---

[1] حیات کرم حسین، حاشیہ ص ۱۷۵، ۱۷۴۔

کتابیات (مراجع و مصادر)

۱۔ شیخ محمد اکرام — آبِ کوثر — ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور ۱۹۶۸ء

۲۔ ولایت حسین ریواڑی — آپ بیتی — سید بادی حسین زیدی علی گڑھ ۱۹۷۰ء

۳۔ سرسید احمد خان — آثار الصنادید — پاکستان ہسٹوریکل سوسائٹی کراچی ۱۹۶۶ء

۴۔ پیرزادہ محمد حنیف (مہم) — آلِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم

۵۔ اکبر شاہ نجیب آبادی — آئینہ حقیقت نما

۶۔ شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ — اخبار الاخیار، مترجم برآں

۷۔ منشی محمد مخدوم تھانویؒ — ارژنگ تجارہ

۸۔ مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ — اسلام کا نظام اراضی — ادارۂ المعارف کراچی ۱۹۴۶ء

۹۔ نذیر احمد رحمانی — اہل حدیث اور سیاست

۱۰۔ اشتیاق حسین قریشی — برصغیر کی ملتِ اسلامیہ — کراچی یونیورسٹی ۱۹۶۷ء

۱۱۔ سید امام الدین دہلی — برکات الاولیاء — افضل المطابع دہلی ۱۳۲۲ھ

۱۲۔ حکیم سید ظل الرحمن تجاوری — تاریخ تجارہ (مخطوطہ)

۱۳۔ تراب علی — تاریخ تراب — گوالیار ۱۸۹۲/۱۳۱۰

۱۴۔ میر محبوب علی دہلوی میواتیؒ — تاریخ الائمۃ فی ذکر خلفاء الائمۃ (مخطوطہ ۱۳۰۱ھ)

۱۵۔ نواب مرزا آفتاب بیگ دہلوی — تاریخ تذکرۃ الحوال اولیاء اللہ — مطبع رضوی دہلی ۱۳۲۳ھ

۱۶۔ ابو ظفر ندوی — تاریخ سندھ — دار المصنفین اعظم گڑھ

۱۷۔ محمد ایوب قادری — تبلیغی جماعت کا تاریخی جائزہ — مکتبہ معاویہ کراچی

۱۸۔ محمد عاشق الٰہی میرٹھی — تذکرۃ الرشید

۱۹۔ احمد اللہ عثمانی — تذکار احرار جدید — رفاہ عام پریس آگرہ ۱۲۵۳ھ

۲۰۔ — تذکرۃ السلوک — نیر اعظم بک ایجنسی مراد آباد

۲۱۔ محمد عاشق الٰہی میرٹھی — تذکرۃ الخلیل — خلیل پریس میرٹھ

۲۲۔ سنبھلی، رضی الدین — تذکرۃ الواصلین — ۱۳۱۸ء

۲۳۔ رحمن علی خاں — تذکرہ علماء ہند — مترجم محمد ایوب قادری۔ کراچی ۱۹۶۱ء

۲۴۔ احمد اختر گورگانی — تذکرۃ الفقراء — جیون پرکاش دہلی ۱۸۹۶ء

۲۵۔ امیر حسن مداری — تذکرۃ المتقین فی ذکر خلفاء سید بدیع الدینؒ — کانپور ۱۳۱۵ھ / ۱۸۹۸ء

۲۶۔ مرزا فضل الدین — تذکرہ مولانا ابوالکلام آزادؒ

۲۷۔ مولوی نذیر احمد دیوبندیؒ — تذکرۃ العابدین

۲۸۔ حکیم محمد عمر فصیح آباد — تذکرۃ القبور — (مخطوطہ بیت النوادر۔ ٹونک) الور میوزیم

۲۹۔ مولانا محمد میاں دیوبندیؒ — پانی پت و بزرگان پانی پت — دہلی ۱۹۴۷ء

۳۰۔ علی بن حامد بن ابی بکر الکوفیؒ — چچ نامہ — مطبع لطیفی دہلی ۱۹۳۹ء

۳۱۔ بدر الدین چینی — چین و عرب تعلقات اور ان کے نتائج

۳۲۔ محمد الطاف حسین حالیؔ — حیاتِ جاوید

۳۳۔ محمد عباس شروانی — حیات مسعودی — مسلم یونیورسٹی پریس علیگڈھ ۱۹۲۵ء

۳۴۔ حکیم سید ظل الرحمن تجاروی — حیات کرم حسین۔ — تجارہ ہاؤس دودھ پور علیگڈھ ۱۹۶۳ء

۳۵۔ مفتی غلام سرور لاہوری — خزینۃ الاصفیاء — نول کشور پریس لکھنؤ ۱۹۸۴ء

۳۶۔ قاضی اطہر مبارک پوری — خلافت بنو امیہ اور ہندوستان۔ — ندوۃ المصنفین دہلی ۱۹۷۵ء

۳۷۔ مہاکوی سعد اللہ خاں اکبر دی — داستانِ میوات حصہ دوم — مرتبہ محمد یٰسین مطبوعہ لاہور ۱۹۷۵ء / ۱۳۹۸ھ

۳۸۔ ابوالفضل علامیؒ — دربار اکبری

۳۹۔ آشوب دہلویؒ — رسوم ہند — مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۱ء

۴۰۔ شیخ محمد اکرامؒ — رود کوثر — تاج آفس کراچی

۴۱۔ کرامت علی جونپوریؒ — زاد التقویٰ

۴۲۔ احسان الحق فاروقی — سلطان التارکین (صوفی حمید الدین ناگوریؒ)

۴۳۔ میر خورد محمد کرمانیؒ — سیر الاولیاء اردو مترجم غلام احمد بریاںؒ مطبوعہ لاہور ۱۹۸۲ء

۴۴۔ سر سید احمد خاںؒ — سیرتِ فریدیہ — مفید عام آگرہ، پاک اکیڈمی کراچی ۱۸۹۶ء / ۱۹۶۴ء

۴۵۔ قاضی اطہر مبارک پوری — رجال السند والهند — ادارہ البلاغ بمبئی ۱۹۵۸ء

۴۶۔ مولوی محمد حسن خاں گنگواہیؒ — شاہ چوکھاؒ — مولوی عبدالرحیم امینی مطبوعہ دہلی

۴۷۔ حکیم محمود احمد برکاتی — شاہ ولی اللہ اور انکا خاندان۔ مجلس اشاعتِ اسلام لاہور ۱۹۷۶ء

۴۸۔ علامہ عبدالوہاب شعرانیؒ — الطبقات الکبریٰ

۴۹۔ سید سلیمان ندویؒ — عرب و ہند کے تعلقات

۵۰۔ قاضی اطہر مبارکپوری — عرب و ہند عہدِ رسالت میں — ندوۃ المصنفین دہلی

۵۱۔ 〃 〃 — عرب و ہند عہدِ بنی امیہ میں

۵۲۔ ابوالحسن علی ندوی — عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح — لکھنؤ

۵۳۔ شورش کاشمیریؒ — عطاء اللہ شاہ بخاریؒ — مکتبۂ چٹان لاہور ۱۹۵۶ء

۵۴۔ امداد صابری — دہلی کے قدیم مدارس و علماء — دہلی

۵۵۔ علامہ بلاذریؒ — فتوح البلدان اردو ترجمہ ابو الخیر مودودی، دار الترجمہ جامعہ عثمانیہ

۵۶۔ محمد اسحٰق بھٹی — فقہائے ہند، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور ۱۹۷۴ء

۵۷۔ منظور الحق صدیقی — مآثر الاجداد — مکتبہ سلفیہ لاہور ۱۹۶۴ء

۵۸۔ محمد ابرار حسین فاروقی — مآثر دلاوری — کتب خانہ فاروقی ۱۹۶۶ء

۵۹۔ فرید عباسی — مدار اعظمؒ

۶۰۔ جنرل محمد اکبر خاں — محمد بن قاسمؒ کی ہمارِ فنی حرب فیروز سنز لاہور

۶۱۔ منشی محمد مخدوم تھانویؒ — مرقع الور — آگرہ — ۱۳۰۷ھ

۶۲۔ سید علی شکوہؒ — مرقع درگاہ قطب المدار

۶۳۔ محمد ایوب قادریؒ — مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ

۶۴۔ — مختصر تاریخ ہند — دار المصنفین اعظم گڈھ

۶۵۔ محمد شاہ عالم فریدیؒ — مزارات اولیائے دہلی

۶۶۔ محمد معین کیرانویؒ — ملت راج شاہی

۶۷۔ — ملتِ یامین شاہی — ب ت لاہور پاکستان

۶۸۔ ملا عبدالقادر بدایونیؒ — منتخب التواریخ۔ اردو ترجمہ محمود فاروقی۔ لاہور

۶۹۔ جہاں آرا بنت شاہجہاںؒ — مونس الارواح — ابو الخیر اکیڈمی، ابو الخیر مارگ دہلی

۷۰۔ پروفیسر محمد سلیم تجاوری — مکاتیب بنام مؤلف۔ شکارپور سندھ پاکستان

۷۱۔ چودھری محمد اشرف خاں ایم اے۔ میو قوم اور میوات — موضع بچانکا تحصیل فرید آباد

۷۲۔ منشی شرف الدین ساتھاوڑیؒ — مرقع میوات

۷۳۔ مفتی محمود الوری — مصباح السالکین

۷۴۔ مولانا حکیم عبدالحیٔ لکھنویؒ — نزہۃ الخواطر و بہجۃ المسامع والنواظر مکمل حیدرآباد دکن

۷۵۔ جامعہ۔ جامعہ ملیہ نئی دہلی۔ (۷۶) منادی بستی حضرت نظام الدین اولیاءؒ۔

۷۷۔ معارف۔ اعظم گڈھ۔ (۷۸) برہان دہلی (۷۹) بینات۔ مولانا یوسف بنوریؒ نمبر کراچی۔

۸۰۔ البلاغ کراچی (۸۱) البلاغ بمبئی (۸۲) المورد موصل عراق۔

۸۳۔ مجلۃ العربی کویت۔